(بحر حقیقت)

اتاترک فی کربلاء

عارف الاسلام
علی گڑھ

نام کتاب : (بحر حقیقت) اتاترک فی کربلاء

مصنف : عارف الاسلام، علی گڑھ

اشاعت : 2019

طابع :

تعداد :

قیمت :

ملنے کا پتہ :

ملنے کا پتہ

- دی علی گڑھ پبلشنگ ہاؤس بذریعہ کریمی پرنٹرس، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- نیو کتاب گھر نزد سلیمان ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسلم تاریخ کے عظیم مجدد سر سید احمد

انتساب

والد مرحوم حاجی قمر الاسلام بدرؔ
اور
والدہ مرحومہ
کے نام

کانٹوں کی زبان سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

تب چاک گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں
جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

فہرست

(ا) جو طاقِ حرم میں روشن ہے

1.1 صبحِ جزا

''ہاں وہاں ہے وہ، میں نے دیکھ لیا، میں نے دیکھ لیا۔''

دس سال کا رومی مارے خوشی کے بے حال، مغربی آسمان پر نظریں جمائے زور زور سے تالیاں بجا رہا تھا۔

''رومی پلیز ہمیں بھی دکھاؤ۔ ہم بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔''

سارے بچے اس کے قریب آ گئے۔ مغربی آسمان پر نظریں جمائے وہ رومی کی خوشامد کرنے لگے۔

''پلیز ہمیں بھی دکھاؤ۔''

''پچھلے سال بھی سب سے پہلے میں نے ہی دیکھا تھا۔'' رومی نے سینہ پھلا کر کہا۔ وہ اتنی آسانی سے مدد کرنے والا نہ تھا۔

''ہاں! ہاں تم ہم سب سے زیادہ اسمارٹ ہو۔'' سب نے کورَس میں اعتراف کیا۔ ''اب دکھاؤ بھئی''

''اچھا بالکل میرے پیچھے آ جاؤ۔ سامنے والے نیم کی سب سے اونچی شاخ کے دس یا بارہ فٹ اوپر دیکھو۔ وہاں ہے وہ تنہا باریک چاند۔''

پورا ماحول چاند دیکھنے کے تجسس سے پُر تھا۔ تمام لوگ مغربی آسمان پر، جہاں ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے، نظریں جمائے انتیس کا چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اقبال اپنے چھوٹے بھائی رومی دو چھوٹی بہنوں شبانہ، رومانہ اور محلے کے چند بچوں کے ساتھ اپنی

پرانی وضع کے چھوٹی اینٹوں کے مکان کی چھت پر چاند دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آس پاس کی تمام چھتوں پر ہر عمر کے لڑکے، لڑلیاں، عورتیں اور مرد چاند ہونے کی ہے امید میں آسمان پر نظریں جمائے پورا زور لگائے ہوئے تھے۔ یہ آخر اکتوبر کی ایک خوشگوار شام تھی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ابھی چند منٹ پہلے افطار کا سائرن ہوا تھا۔ مساجد کے میناروں سے مغرب کی اذانوں کی آوازیں چاروں طرف سے بلند ہو رہی تھیں۔ زیادہ تر لوگ نماز کو بھولے ہوئے دوسرے دن عید آنے کی امید میں مغربی افق پر نظریں گاڑے ہوئے تھے۔ انتیس دن کے طویل رمضان کے مہینے کو اب ایک دن بھی نہیں بڑھانا چاہتے تھے۔ پہلے چاند دیکھنے کا ایک مقابلہ سا ہو رہا تھا۔ رومی سب سے پہلے چاند دیکھنے کی کامیابی سے بے انتہا خوش تھا۔ جلد ہی سب سے چاند دیکھ لیا۔ چاروں طرف خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ بچوں نے پٹاخے چھوڑنے شروع کر دیے۔ گولے چھوٹنے لگے۔ چھوٹے بچے اور بچیاں سب سے زیادہ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

دہلی سے تقریباً سو کلومیٹر جنوب میں واقع شہر سنبھل کا یہ ایک گنجان محلّہ تھا۔ جہاں عہدِ سلطنت سے ہی ترک آباد تھے۔ پورے شہر میں جابجا پرانے قلعوں کی شکستہ در و دیوار، مقابر، مساجد اور مندروں کا ایک سلسلہ سا نظر آتا تھا۔ ہمایوں کے زمانے میں یہ قصبہ صوبے کا دارالسلطنت بھی رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ شہاب الدین غوری کے زمانے سے ہی یہاں مسلمان آباد تھے۔ ایک نہایت عالیشان جامع مسجد کسی راجہ کے منہدم قلعہ کے ملبہ پر تعمیر کی گئی تھی جس کے بلند مینار و گنبد شہر آنے والوں کو کوسوں دور سے نظر آنے لگتے تھے۔ پورا شہر دو حصوں میں بٹا ہوا تھا جیسا کہ ہندستان کا تقریباً ہر شہر ہوتا ہے۔ ایک ہندو اور ایک مسلم علاقہ۔ دونوں علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کے محلوں میں شاذ و نادر ہی جاتے تھے۔ ان کی ملاقاتیں بس بازاروں، اسکولوں اور کالجوں تک ہی محدود تھیں۔ بہت کم مواقع پر ہی ہندو مسلمان ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے تھے جیسے دیوالی یا عید کے مواقع پر قریبی دوست مبارکباد دینے ایک دوسرے کی فیملیز میں جا سکتے تھے۔

پورے محلے میں عید کا چاند نظر آ جانے کی وجہ سے ایک عجیب ہماہمی کا ماحول تھا۔زیادہ تر نوجوان اس بات سے خوش تھے کہ رمضان کا مشکل مہینہ گزر گیا۔لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے خوبصورت کپڑوں میں رہ گئی کمی بیشیوں کو درست کرا رہے تھے اور بچے تو ہر طرف کھیل کود اور شور شرابے میں مشغول تھے۔عورتیں عید کے دن کے خاص پکوانوں کی تیاریوں میں جٹی پڑی تھیں اور مردوں کو بازار سے آنے والی چیزوں کی فہرست لکھوا رہی تھیں۔چاندرات میں شہر کے بازاروں کی چہل پہل بے انتہا بڑھ گئی تھی۔

اقبال اوراس کے دوست تقریباً پوری چاندرات دوستوں میں گزارتے تھے۔اس بار بھی سب لوگ مل کر شہر کے دوسرے محلوں میں دوستوں سے ملنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔یہ عید اس وجہ سے بھی خاص تھی کہ کئی سال کے بعد چاند صاف نظر آ گیا تھا۔لہٰذا یہ تمام فرقوں کی متفقہ عید تھی۔ بریلوی،دیوبندی علماء کے لیےلڑنے کا ایک نادر موقع ہاتھ سے جا تارہا تھا ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا کہ ایک فرقے نے عید کا اعلان کر دیا تو دوسرے فرقے کی طرف سے اعلان ہوا کہ ابھی شرعی شہادت حاصل نہیں ہوئی ہے لہٰذا کل عید نہیں ہوگی۔آخر پتہ چلا کہ تراویح وغیرہ سب ہوگئیں اور رات کو سحر کے وقت اعلان ہوا کہ شہادت حاصل ہوجانے کی وجہ سے کل ہی عید ہوگی اور کئی مرتبہ تو یہ ہوا کہ شہر میں ایک فرقہ عید منا رہا ہے تو دوسرا فرقہ روزہ رکھ رہا ہے۔ایک ہی گھر میں کچھ لوگ دیوبندی اور کچھ بریلوی،ایک کا روزہ ہے تو دوسرا عید کی نماز پڑھنے جارہا ہے۔ایک روزہ رکھنے کو حرام قرار دے رہا ہے تو دوسرا چھوڑنے کو۔

اقبال بائیس سال کا نوجوان تھا۔ابھی چند برس پہلے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد اس نے مسلم یونیورسٹی میں، جو مسلمانوں کے سیاسی وثقافتی مرکز کا درجہ رکھتی تھی،داخلہ لیا تھا اور اب ایم ایس سی پاس کرنے کے بعد پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کا انتظار کر رہا تھا۔وہ ہندی مسلمانوں کی اس انتہائی حساس نسل سے تعلق رکھتا تھا جو تقسیم شدہ ہندوستان کے فرقہ پرستانہ ماحول میں پروان چڑھی۔تاریخی،سیاسی،سماجی ہندو مسلم کشمکش اپنے عروج پر تھی۔آئے دن کے فسادات اور تقریباً ہر شہر وقصبے میں اقلیت میں ہونے کی وجہ مسلمانوں کی

سیاسی اور اقتصادی حیثیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی تھی۔اس ماحول نے اقبال اور اس کے دوستوں کو بے انتہا متاثر کیا تھا۔عید کی چھٹیوں کی وجہ سے تقریباً سارے ہی ہوسٹل خالی ہو جاتے تھے۔وہ ابھی چند روز پہلے ہاسٹل سے گھر آیا تھا۔

دوسرے دن علی الصبح عید کی نماز کے لیے اقبال اور اس کے دوست عید گاہ پہنچے۔عید گاہ مین روڈ سے نیچے اتر کر باغوں کے درمیان کچے پکے راستے پر تقریباً دو کلومیٹر دور تھی۔ایک بڑے آم کے باغ کے مغربی کنارے پر عید گاہ کی ایک طویل محرابوں اور گنبدوں والی دیوار بنی ہوئی تھی۔پیڑوں کے درمیان دور دور تک صفیں بچھی ہوئی تھیں۔صبح کی ہلکی پھلکی تازہ ہوا چل رہی تھی۔شبنم کی نمی بھی ابھی باقی تھی۔امام نے نماز سے پہلے موقع کا فائدہ اٹھا کر ایک طویل تقریر کی۔رمضان اور عید کے فضائل گنائے اور آئندہ رمضان تک سب کے زندہ رہنے کی امید کے ساتھ نماز شروع کی۔نماز کے خاتمے پر پھر عربی زبان میں خطبہ ارشاد کیا۔اور خطبے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو اللہ تعالیٰ سے دنیا جہان کی ہر خوبی اور اچھائی،مسلمانوں کی کافروں پر نصرت و فتح،فلسطین کی آزادی اور بابری مسجد کے ساتھ ساتھ تمام مساجد و مقابر کی حفاظت کی طویل دعا کی۔آخر میں یہاں تک کہا کہ اے خدا، جو ہم سے مانگنے سے رہ گیا وہ بھی ہمیں بخش دے۔

''یار جب سب کچھ اللہ ہی کو کرنا ہے تو پھر ہم کیوں پیدا کیے گئے؟'' اقبال نے طویل دعا سے تنگ آ کر آہستہ سے اپنے دوست سے پوچھا۔

''خاموش رہو! اس وقت براہ راست گفتگو ہو رہی ہے۔'' اس نے تنبیہ کی۔پچھلی کتنی صدیوں سے ہر امام یہی دعا کر رہا ہے۔''

''اچھا تو کیا اتنا بھی نہ کریں؟ ایک پتہ بھی تو اللہ کی مرضی کے بغیر نہیں ہلتا۔''

''پھر تو ساری شکستیں، رسوائیاں اس کی مرضی سے ہو رہی ہیں۔یہ تو خوشی کا مقام ہے۔''

''بیشک''

''پھر یہ رونا دھونا کیوں؟''

''کیا بتاشے بانٹیں؟''

اتنی دیر میں امام نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور سب لوگ ایک دوسرے کو گلے مل کر عید کی مبارکباد دینے لگے۔

واپسی کے سفر میں جیسے ہی مین روڈ پر قافلہ پہنچا وہاں عجیب خاموشی کا ماحول نظر آیا۔کچھ لوگ تیزی سے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے اور کئی جگہ لوگ گروپ بنا کر کھڑے تھے۔کوئی کسی کو عید کی مبارکباد نہیں دے رہا تھا۔اس کے برخلاف ہر چہرے پر ایک تجسس اور خوف کا سایہ سا تھا۔

''کیا بات ہے، بھئی کیا ہوا؟'' اقبال نے لوگوں کے پاس آ کر پوچھا۔

''ابھی ابھی ایک خبر آئی ہے کہ مراد آباد عیدگاہ پر پولس اور نمازیوں میں جھگڑا ہو گیا اور کئی لوگ مارے گئے ہیں۔'' کسی نے جواب دیا۔

''مگر یہ افواہ بھی ہو سکتی ہے۔'' دوسرے نے کہا۔

''لیکن یہ ہوا کیسے؟ اگر ایسا ہے تو یہاں بھی بہت خطرہ ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''کوئی ابھی کچھ نہیں جانتا۔خدا کرے یہ صرف افواہ ہی ہو۔'' کسی نے کہا۔

''چلو جلد گھر چلو۔ لمبے کرفیو کا انتظام بھی کرنا ہے۔'' اقبال کے ایک دوست نے کہا۔

''ہمیشہ ہی برے پہلو پر نظر رہتی ہے تمہاری۔'' اقبال نے اسے ڈانٹا۔

''بغیر آگ کے دھواں نہیں اٹھتا جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ دیکھئے کانگریس کے نیتا ایوب آ رہے ہیں۔ان کو ضرور پتا ہوگا۔'' اقبال کے کہنے پر سب نے مڑ کر دیکھا، نیتا ایوب تیزی سے چلتے ہوئے ادھر ہی آ رہے تھے۔انھوں نے بغیر پوچھے ہوئے ہی بتایا۔

''ابھی ابھی مراد آباد سے فون آیا ہے۔عیدگاہ پر نمازیوں اور پی اے سی میں زبردست تصادم ہو گیا ہے۔کئی آدمی مارے گئے ہیں اور بہت سے زخمی ہیں۔غیر معینہ مدت کا کرفیو لگا دیا گیا ہے۔سب لوگ اپنے اپنے گھر جائیں یہاں بھی کرفیو لگ سکتا ہے۔''

اس وقت تک سیکڑوں لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔مراد آباد وہاں سے صرف ۳۰ کلومیٹر دور تھا۔ پورا ضلع بہت زمانے سے فرقہ پرستی گزیدہ قرار دے دیا گیا تھا۔ جہاں

معمولی واقعات پر بھی فسادات بھڑک اٹھتے تھے۔ ہر آدمی اپنے اپنے طور سے اندازے لگا رہا تھا۔ پی اے سی فسادات میں اپنے یک طرفہ کردار کی وجہ سے اینٹی مسلم فورس مشہور ہوگئی تھی لہٰذا لوگ کچھ زیادہ ہی مایوس اور خوفزدہ تھے کہ اس فورس نے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ ابھی چہ میگوئیاں جاری ہی تھیں کہ ایک پولیس جیپ شہر میں کرفیو لگنے کا اعلان کرتی ہوئی گزر گئی۔ تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑ پڑے۔ اقبال بھی اپنے دوستوں کے ساتھ قریب کی گلی میں داخل ہوگیا اور اندرونی راستوں پر چلتے ہوئے چند ہی منٹ میں اپنے گھر پہنچ گیا۔ شام ہوتے ہوتے پتہ چلا کہ عیدگاہ کے گیٹ پر ایک نمازی اور پی اے سی کے جوان میں کسی معمولی بات پر تکرار ہوگئی۔ لوگ جمع ہوتے چلے گئے، پی اے سی نے اندھا دھند گولیاں چلا دیں۔ عیدگاہ شہر کے اندر تھی صرف ایک ہی راستہ باہر جانے کا تھا لہٰذا کافی لوگ بھگدڑ میں زخمی ہوگئے کچھ لوگ گولیوں سے زخمی ہوئے اور کئی لوگ سینے پر گولیاں لگنے کی وجہ سے جائے حادثہ پر ہی دم توڑ گئے۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی۔ ہر جگہ ہندو مسلمان ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ جہاں جس کو دوسرے فرقے کا فرد ہاتھ آیا زخمی ہوا یا قتل کر دیا گیا۔ سیکڑوں دوکانوں اور مکانوں میں آگ لگا دی گئی۔ چند ہی گھنٹوں میں ایک بھیانک فساد نے پورے شہر کو اپنی زد میں لے لیا۔ ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اپنے ہر نیوز بلیٹن میں تفصیلات بیان کرنے لگے۔ ایسے مواقع پر مسلمانوں کے لیے بی بی سی نیوز سروس ہی زیادہ قابل اعتماد ذریعۂ نیوز بن جاتی تھی۔ کرفیو کی وجہ سے تمام لوگ اپنے اپنے گھروں میں قید ریڈیو سے کان لگائے تازہ خبریں سن رہے تھے۔ اقبال کا گھر چونکہ مین سڑک سے ہٹ کر ایک گلی میں تھا لہٰذا محلے کے لوگوں کے لیے اس کا مردانہ حصہ عوامی بیٹھک بن گیا جو ہر وقت لوگوں سے بھرا رہتا تھا اور ہر طرح کا بحث مباحثہ، ہندو مسلم فسادات کی وجوہات، آئندہ ہونے والے واقعات پر طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی آپس میں تلخ کلامی کا بھی موقع آ جاتا تھا۔

لگاتار تین دن کے کرفیو کے بعد ایک گھنٹہ کے لیے کرفیو کھولا گیا تو لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں لینے کے لیے محلے کے بازاروں کی طرف دوڑ پڑے۔ اقبال اپنے

گھر کے سامنے کچھ لوگوں کے ساتھ سڑک پر کھڑا تھا کہ دور سے ایک آدمی دوڑتا ہوا نظر آیا قریب آنے پر پتہ چلا کہ اس کے سر سے بے انتہا خون بہہ رہا تھا۔

''یہ تو ظہیر ہے۔کیا ہوا ہے اسے؟'' اقبال نے کہا۔سب لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ چلو فوراً کلینک چلو!'' کئی لوگوں نے اسے سنبھال لیا۔

''ان لوگوں نے دہلی سے آتی ہوئی ایک بس کو روک لیا۔صرف مسلمانوں کو نیچے اتارا اور لاٹھویں سے بری طرح پٹائی کی۔میں کسی طرح دوڑ کر بچ گیا۔اوروں کا نہ جانے کیا حال ہوا ہوگا۔'' ظہیر اب بھی بری طرح ڈرا ہوا تھا۔خوف ودہشت سے اس کا بولنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔وہ تقریباً تیس سال کا شادی شدہ آدمی تھا جو قریبی محلے میں رہتا تھا اور ریڈی میڈ گارمنٹس کی چھوٹی سی دوکان چلاتا تھا۔اسی سلسلہ میں دہلی سے واپس آرہا تھا کہ شہر کے قریب ہی یہ واقعہ پیش آگیا۔دہلی جانے والی سڑک اسی محلے کے پاس ہو کر گزرتی تھی لہٰذا دوڑتا ہوا وہ یہاں داخل ہوگیا۔محلے کے ہی ایک ڈاکٹر کی دکان کھلوائی گئی۔کئی ٹانکے لگے مرہم پٹی ہوئی اور ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔خبر کے پھیلتے ہی بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ نوجوانوں نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔وہ انتقام کی بات کر رہے تھے۔کچھ جوشیلے لڑکے نعرے لگاتے ہوئے قریبی ہندو محلے کی طرف دوڑ پڑے اور ایک ہندو پنڈت کے گھر میں آگ لگا دی اور اس کے ایک نوجوان بیٹے کو مار ڈالا۔چند ہی منٹ میں پولیس بھی وہاں آگئی۔گولی چلی، پتھراؤ ہوا، کئی لڑکے زخمی ہوئے۔بہت سوں کو پولیس نے گھروں میں گھس کر گرفتار کیا اور ایک سخت کرفیو نافذ کر دیا گیا۔شہر میں ہونے والا یہ پہلا سنگین واقعہ تھا۔پنڈت کی طرف سے ایف آئی آر ہوئی۔محلے کے سارے معزز لوگوں کے نام حملہ کرنے والوں میں شامل کیے گئے۔کئی لوگ گرفتار بھی ہوئے اور کچھ فرار ہوگئے۔ گرفتاریوں کی خبر پھیلتے ہی پورے شہر میں فساد پھیل گیا۔ہندو مسلمان ایک دوسرے پر حملے کرنے لگے۔ایک دوسرے کی دوکانوں میں آگ لگا دی گئی۔آخر کار فوج طلب کی گئی۔ فلیگ مارچ ہوا۔پورا ایک ہفتہ فساد پر قابو پانے میں لگ گیا۔سیکڑوں لوگ گرفتار کیے گئے۔آٹھویں دن کرفیو میں ایک گھنٹے کی ڈھیل دی گئی۔بھوک اور بیماری سے بے حال لوگ

اپنے گھروں سے نکل پڑے۔غریبوں اور مزدوروں کا برا حال تھا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو روز مزدوری کرتے اور روز کھاتے تھے۔ان کے لیے ایک دن کام نہ ملنے کا مطلب بہت بڑا نقصان تھا۔کسی طرح اپنے امیر رشتہ داروں اور دوستوں سے قرضہ لے کر گزارہ کر رہے تھے۔بچوں، بوڑھوں اور مریضوں کا برا حال تھا۔بچوں کو دودھ اور مریضوں کو دوائیاں تک میسر نہ تھیں۔آسودہ حال لوگ بھی حد سے بڑھی ہوئی قیمتوں پر ضروریات کی خراب چیزیں خرید خرید کر تنگ آ چکے تھے۔اقبال بچپن سے ہی فسادات کے واقعات سنتا چلا آ رہا تھا لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے فساد کا بھیانک روپ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔اپنے ہی جیسے انسانوں سے پرتشدد نفرت اورنفرت کا یہ عالم،غریبوں کی بھوک سے بے حالی،بچوں،ضعیفوں اور عورتوں کی بے بسی، پولیس اور ایڈمنسٹریشن کا ظلم۔اب وہ زیادہ دیر اس ماحول میں گھر نہ ٹھہر سکا اور پہلے ہی موقع پر علی گڑھ اپنے ہاسٹل میں پہنچ گیا۔

1.2 عشقِ بلا خیز

''اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان کے بٹوارے کے ساتھ شروع ہوئے حالانکہ پہلا فساد ۱۸۰۷ء میں بنارس میں ہوا تھا۔ایک قبرستان کی جگہ پر جھگڑے کی وجہ سے۔اکثریتی فرقے کے لوگوں کو اس جگہ قبریں بنانے پر اعتراض تھا۔ابھی ملک پوری طرح غلام بھی نہیں ہوا تھا کہ یہ جھگڑے شروع ہو گئے۔''اقبال نے کہنا شروع کیا۔

وہ اس وقت یونیورسٹی کینٹین کی وکٹورین عمارت کے سامنے وسیع لان میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔لان میں مختلف قسم کے چھوٹے بڑے پیڑ ہلکی ہلکی ہوا سے جھوم رہے تھے۔یہ شروع نومبر کی ایک سہانی شام تھی۔طلباء گروپ بنائے ہوئے دور دور تک پھیلی ہوئی کرسی میزوں پر بیٹھے چائے کا مزہ لے رہے تھے۔کینٹین کی بائیں طرف سائنس فیکلٹی کی وسیع عمارتیں تھیں۔داہنی طرف کنیڈی ہال کی عمارتیں اور اس کے پیچھے یونیورسٹی لائبریری کی عظیم الشان عمارت۔سامنے سڑک کے دوسرے طرف اونچے اونچے پام کے درختوں سے گھرا ہوا انجینئرنگ کالج کیمپس تھا۔کینٹین کا یہ وسیع لان طلباء برادری

کا سیاسی اور سماجی مرکز تھا۔ جہاں انجینئرنگ اور سائنس فیکلٹی کے پڑھا کو طلبا کے علاوہ یونیورسٹی کے تقریباً تمام ہی سیاسی گروپس بیٹھ کر گھنٹوں بحث وتکرار کرتے، آپس میں ہنسی مذاق اور جھگڑتے رہتے تھے۔ یونیورسٹی ڈرامہ اور لٹریچر کلب کے گروپس بھی اکثر و بیشتر یہیں نظر آتے تھے۔ اقبال اور اس کے دوست مختلف کلاسس میں پڑھنے والے ذہین طلباء کا گروپ تھا جو یونیورسٹی کے سیاسی و تعلیمی مسائل سے لے کر نیشنل اور انٹرنیشنل اشوز پر ہمہ وقت بحث ومباحثہ کرنے اور ضرورت پڑنے پر تحریکات چلانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ ملک میں بڑھتے ہوئے ہندو نیشنل ازم کی وجہ سے یہ لوگ شدید تشویش میں مبتلا تھے اور اکثر اسی موضوع پر بحث وتکرار کرتے رہتے تھے۔ جس دن سے اقبال علی گڑھ پہنچا تھا فساد کی ہر تفصیل کرید کرید کر پوچھی جا رہی تھی۔ اخبارات کی خبروں کے علاوہ یہ لوگ فرسٹ ہینڈ خبریں سننا چاہتے تھے۔ اس وقت بھی ہندو مسلمانوں کے بگڑتے ہوئے رشتوں، فسادات کی وجوہات اور ماضی و مستقبل کے تمام معاملات پر باتیں چل رہی تھیں۔

''یہ مسلمانوں کے حاکم سے محکوم ہونے کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ایک زمانے سے چلی آ رہی مسلم حکومتیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے دم توڑتی جا رہی تھیں۔ ۱۷۵۷ء میں بنگال میں سراج الدولہ کی شکست کے بعد انگریز آہستہ آہستہ دہلی کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید برادران وطن نے مسلم اقلیت پر دباؤ بڑھانا شروع کیا اور فسادات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو پچھلے تقریباً دوسو سال سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے۔'' اقبال کی گفتگو کے دوران سب لوگ خاموش رہے۔ اس کے حالیہ تجربے کی وجہ سے وہ اس کی لمبی تقریر برداشت کر رہے تھے۔

''پلیز اقبال! یہ اپنے ہسٹری لیکچرز بند کرو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمیشہ حال سے بھاگتے ہو۔ اسی وجہ سے تم اپنے لوگوں کی مدد کرنے کے بجائے کیمپس میں عیش کرنے آ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہاں رہتے کچھ ریلیف کام کرتے، ٹھنڈی ہوا میں گرم گرم چائے کے مزے لے رہے ہو۔'' ضمیر نے طنز کیا، وہ جغرافیہ میں ایم ایس سی فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ گرام مزاج گوراچٹا اور ہر معاملے میں کود پڑنے کو تیار۔

''ہم جانتے ہیں کہ تم کسی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔بس بیٹھ کر لمبی لمبی ہانک سکتے ہو۔تاریخ فلسفہ اور نہ جانے کیا کیا۔وہاں رہتے کچھ کرتے'' احمد نے، جس نے پچھلے سال ایم اے اکونامکس میں ٹاپ کیا تھا، ضمیر کی تائید کی۔

''یار مستقل تو کرفیو تھا۔گھر تک سے تو نکلنے دے نہیں رہے تھے۔ریلیف کیا خاک کرتے۔'' اقبال نے صفائی پیش کی۔

''اب خاموشی سے اقبال کی بات سنو۔ہاں کیا ہوا تھا بتاؤ۔تمہارے شہر میں کتنے لوگ مارے گئے؟'' کلیم نے دونوں کو خاموش کیا۔وہ انجینئرنگ فائنل ایئر کا طالب علم تھا، سانولے رنگ لمبے قد کا بہت اچھا مقرر، ہسٹری میں خاص دلچسپی رکھتا تھا۔

''یہی تو پوچھ رہے تھے، یہ ہسٹری بگھارنے لگا''، ضمیر نے پھر ٹانگ اڑائی۔

''فساد میں کتنے لوگ کہاں کہاں مارے گئے، کتنی دوکانیں ومکان جلائے گئے کوئی نہیں بتا سکتا۔ہاں میرے وہاں سے آنے تک سرکاری اطلاع کے برخلاف خبر یہ تھی کہ چار مسلمان اور ایک ہندو مارا گیا۔'' اقبال نے آخر بتایا۔

''جی میرے وہاں سے آنے تک! یہ کہو کہ وہاں سے بھاگ آنے تک۔تمہاری بزدلی تو مشہور ہے۔اچھا عیدگاہ میں فائرنگ کے پیچھے کی حقیقت کیا ہے۔'' انیس نے پوچھا۔وہ شعبۂ ہسٹری میں جہانگیر کی زندگی پر ریسرچ کر رہا تھا۔

''یہ دن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں سیاہ دن کے طور پر یاد کیا جائے گا، جب حکومت کی فورس نے نہتے نمازیں پر بے وجہ گولیاں چلائیں۔کتنے لوگ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔پندرہ دن گزرنے کے بعد بھی آج تک فسادات پر قابو نہیں پایا جا سکا۔تمام اخبارات میں تفصیل سے خبریں شائع ہو ہی ہیں۔یہ قوموں کے درمیان قدیم منافرت کا نتیجہ ہے۔صرف نفرت ہے اس کا سبب اور کچھ نہیں۔'' اقبال نے بات ختم کی۔

''مگر گولی چلانے کا سبب کیا تھا؟'' نفیس نے سوال کیا۔وہ فلاسفی میں ایم اے فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔

''بیوقوف مت بنو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مسلمان تھے''، کلیم نے فوراً ہی جواب دیا۔

''لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ اقبال کو وہیں رک کر ریلیف کا کام کرنا چاہیے تھا؟''ضمیر نے پھر اقبال کو گھسیٹا۔

''دیکھو ضمیر! یہ وہاں وہ کر کچھ بھی نہیں سکتا تھا۔تم بار بار اسے الزام نہ دو۔''کلیم نے اقبال کی طرفداری کی۔

''کلیم!اس کو کچھ بتانے کی کوشش نہ کرو وہ تم سے زیادہ جانتا ہےاوراس میں جوش بھی زیادہ ہے۔'' آخر شمیر کوان دونوں کولڑانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔شمیر فزکس میں پی ایچ ڈی کررہا تھا۔ایک ذہین طالب علم اوراچھا ڈبیٹر تھا۔ پتہ نہیں کب اور کیسے اس کا نام باس پڑ گیا تھااوراب ہر آدمی اسی نام سے پکارتا تھا۔

''ہاں کلیم مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش مت کرو۔میں تم سے زیادہ حالات کو سمجھتا ہوں۔''شمیر کی بات کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا تھا۔ضمیر کوکلیم پر واقعی غصہ آ گیا تھا۔چاروں طرف ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

''ذرا ذرا سی بات پر تو غصہ ہو جاتے ہواس کے علاوہ تمہیں آتا ہی کیا ہے؟''کلیم نے بھی غصہ میں جواب دیا۔

''اورتم ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگریٹ پر سگریٹ پیتے رہتے ہواوراپنے آپ کو بڑا فلاسفر سمجھتے ہو۔''ضمیر نے سختی سے جواب دیا۔اس کا منہ غصے سے لال ہو گیا تھا۔تمام لوگ زورزور سے ہنسنے لگے۔

''یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ذاتی کمنٹ بالکل نہ کئے جائیں۔کلیم واقعات کی گہرائی تک جانے کی کوشش میں سگریٹ پیتا ہے تاکہ قوم کواوپر اٹھایا جاسکے۔''اس بار شمیر نے ضمیر کے خلاف کلیم کوسپورٹ کیا تاکہ لڑائی کا اور لطف لیا جاسکے۔اس کے چہرے پر شرارت پوری طرح عیاں تھی۔

''باس یہ مت کہو۔میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔پچھلے ایک سال میں تم نے کیا کیا ہے۔ایک بھی ریسرچ پیپر شائع کرنا تو درکنار بھیجا تک نہیں ہے۔گیارہ بجے تو جناب سوکر اٹھتے ہیں بارہ بجے تک ناشتہ کرتے ہیں ساڑھے بارہ تک ڈپارٹمنٹ پہنچتے ہیں اور اگر

سپروائز موجود ہوا تو ایک آدھ ریڈنگ لی، ورنہ دوسرے ریسرچ اسکالرز کو لیا اور چنگی پر چائے پینے چلے گئے۔ دوڈھائی بجے تک کمرے واپس۔ پھر دوپہر کا قیلولہ، شام کی چائے، رات گئے تک ڈھابے پر چائے پر چائے۔ رات میں اک بجے بستر پر اور پھر دوسرا دن اسی طرح شروع۔' اب ضمیر شمیر پر پل پڑا۔ سب لوگ بڑھ چڑھ کر اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور زور زور سے قہقہے پڑتے رہے۔

''کیا بات ہے ضمیر! ہاں جاری رہو۔ رکو نہیں۔ باس کا بالکل ٹھیک علاج کیا ہے تم نے۔''

''لیکن ضمیر، قیلولے کے بعد کی چائے سے لے کر رات گئے تک تم بھی تو باس کے ساتھ ہی رہتے ہو۔'' امین نے آخر گفتگو میں حصہ لیا وہ کئی سالوں سے ایم بی بی ایس فائنل ایئر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ وہ ایک بہترین ڈبیٹر تھا اور اسٹوڈنٹس یونین کا سکریٹری بھی رہ چکا تھا۔

''تو طے یہ پایا کہ ہم سب لوگ اپنا وقت خراب کر رہے ہیں۔'' شمیر نے ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے یہ تو ہے!'' سب نے مکمل اتفاق کا اظہار کیا۔

''اچھا ضمیر! اب ٹھنڈے ہو جاؤ۔ آج تم نے باس اور کلیم دونوں کی خاصی خبر لی ہے۔ اب اس کا جرمانہ یہ ہے کہ تم سب کے لیے چائے منگواؤ اور آج جتنی بھی چائے منگائی جائے گی سب کا پیمنٹ تم کرو گے۔'' امین نے معاہدے کی شرائط پیش کیں اور سب نے سپورٹ کیا۔

''اس کو کہتے ہیں انصاف۔ واہ امین، کیا فارمولہ پیش کیا ہے۔'' احمد نے تائید کی۔

''میری بھی تو سنیں آپ لوگ!'' ضمیر نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ابھی انصاف کہاں ہوا ہے۔ سب گواہ ہیں کہ پہلے باس نے مجھے کلیم کے خلاف اکسایا۔ پھر کلیم کو میرے خلاف بھڑکایا۔ اس وجہ سے ہم دونوں کو غصہ آیا۔ لہٰذا انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ سزا باس کو دی جائے مجھے نہیں۔'' اب تمام لوگ ضمیر کے ساتھ ہو گئے۔

''بات میں دم ہے۔ آگ تو باس نے ہی لگائی تھی۔'' کلیم نے تائید کی۔

''باس! اب بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔'' امین نے شمیر کو مخاطب کیا۔
''ٹھیک ہے، ہمیں جرمانہ قبول ہے۔'' شمیر نے اکبری انداز میں جواب دیا۔
''باس میں سگریٹ بھی پیوں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ بغیر ولس فلٹر کے میں چائے نہیں پیتا۔'' کلیم نے مزید فرمائش کی۔
''اب تو چاہے جو کرلو۔ آج تمہارا ہی راج ہے۔'' شمیر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔
''کیا کوئی خاص معاملہ ہے؟ اجازت ہو و میں بھی شامل ہو جاؤں۔'' کسی نے قریب آتے ہوئے کہا۔ سب نے مڑ کر دیکھا۔
''آیئے بس آپ ہی کی کمی تھی۔ ہمارے سب سے پیارے سیکولر ہندو دوست پشیند رجی! تشریف لایئے میرے پاس بیٹھئے۔'' کلیم نے کرسی پیش کرتے ہوئے کہا۔
''لیکن یہاں تمام لوگ میرے سینئر ہیں اور میں اولڈ علی گڑھ اسکول کا پروردہ ہوں۔ لہٰذا پہلے ٹریڈیشن فالو کرنا ضروری ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے باری باری سب سے ہاتھ ملایا، خیریت پوچھی۔ ایک میٹھی مسکراہٹ ہمیشہ اس کے سانولے چہرے پر سجی رہتی تھی۔ وہ ماسٹر ان جرنلزم فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ اس کے والد بھی پرانے علیگ تھے اور ابھی ایک ماہ پہلے یونیورسٹی سروس سے ریٹائر ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی بھی فساد کو انسانی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی تھے اور اسے مسلمانوں کے نقصان پر اتنا ہی افسوس ہوتا تھا جتنا کسی فساد زدہ کو۔
''آج کس مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
''باس پر ابھی ابھی فائن لگایا گیا ہے۔ کلیم اور ضمیر کو لڑانے کے جرم میں'' امین نے صورت حال سے آگاہ کیا۔

''میں جانتا ہوں ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ ہر شرارت ے پیچھے باس کا ہاتھ ہونا لازمی ہے۔'' پشیند ر نے ہنستے ہوئے شمیر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لیکن باس! میں بغیر سموسے کے چائے نہیں پیتا۔'' اس مطالبے پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ دور دور تک بیٹھے ہوئے لوگوں

نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دیے۔

''اگر یہی ہوتا رہا تو میں تو لٹ جاؤں گا۔'' شمیر نے احتجاج کیا۔

''باس! اتنی اسکالرشپ ملتی ہے۔ دوستوں پر خرچ نہیں کرو گے تو ریسرچ میں کیسے برکت ہوگی۔'' کلیم نے چٹکی لی۔

''بس یہ آخری برکت ہے۔ سموسہ بھی منگا لیا جائے۔'' شمیر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ آخری موقع نہیں ہے بغیر شر پھیلائے نہیں رہ سکتے تم۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ یار زندہ صحت باقی۔ باس زندہ شر باقی۔'' اقبال نے فی البدیہہ جوڑا۔

''باس زندہ شر باقی! واہ کیا خوب کہا۔'' چاروں طرف سے ایک شور سا اٹھا۔

''آداب، جی بندہ نوازی ہے۔'' اقبال نے جھک کر سلام کیا۔

''بندہ نوازی چھوڑیے حضور! ذرا وہ دیکھئے کون آرہا ہے۔'' کلیم نے مین گیٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں بصیر کالی شیروانی، چوڑی دار پائجامہ اور جناح کیپ لگائے ہاتھ میں اخبار لیے ہوئے کئی دوستوں کے ساتھ ان ہی لوگوں کی طرف آرہا تھا۔ وہ ایک انتہائی ذہین ایل ایل ایم فائنل ایئر کا طالب علم تھا اور اسی سال بیس ہزار طلبا کی یونین کا صدر منتخب ہوا تھا یہی گروپ بصیر کا چیف الیکشن گروپ تھا جس نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے الیکشن جتوانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ لہٰذا کوئی بھی مسئلہ اٹھتا تو بصیر سب سے پہلے انہیں لوگوں سے مشورہ کرتا تھا۔

''آئیے آئیے صدر صاحب، تشریف لائیں۔'' سب لوگوں نے اٹھ کر استقبال کیا۔ آس پاس کی میزوں سے کرسیاں گھسیٹی گئیں۔ سلام ودعا اور مصافحہ کے بعد سب لوگ بیٹھ گئے۔

''اور کیا ہو رہا ہے؟'' بصیر نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''باس کی ریسرچ کے لیے برکت کرائی جارہی ہے۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''بھئی یہ Ph.d برکت سے کب سے ہونے لگی۔ اس کے لیے تو لیب وغیرہ میں بھی بیٹھنا پڑتا ہے۔'' بصیر نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

''یہ بھی، سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' امین نے بات بڑھائی۔

''یعنی اگر برکت دعاؤں وغیرہ کا بھی کوئی رول ہے تو اس فقیر کے حصہ میں بھی کچھ آنا چاہیے۔'' بصیر نے ساری سچویشن سمجھتے ہوئے مطالبہ کیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔

''اور آپ ٹھہرے صدر، حصہ بھی کافی بڑا ہوگا۔'' ضمیر نے شرارت کی۔

''ظاہر ہے، یعنی کالے جام وغیرہ۔'' کلیم نے بصیر کی جگہ جواب دیا۔

''میں تو اب چلا لیب۔ برکت سے میں Ph.d نہیں کرنا چاہتا۔ اسے برکت کہتے ہیں تو زحمت کیا ہوگی۔'' شمیر اٹھ کر جانے لگا۔ ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ ضمیر نے بڑھ کر شمیر کو پکڑ لیا اور زبردست بٹھاتے ہوئے کہا ''یہاں سے بچ کر جانا مشکل ہے۔''

''ایسا ہے کہ صرف دو سو گرام نمک پارے منگا لیے جائیں۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟'' امین نے صلح کرانی چاہی۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' سب نے تائید کی۔

''اب آرڈر بھی آپ ہی دے دیں۔'' شمیر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے امین سے کہا۔

''اب ذرا کچھ سیریس باتیں ہو جائیں۔'' بصیر نے اخبار نکال کر میز پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

''یہ آج کا ٹائمس آف انڈیا ہے۔ اس کا ایڈیٹوریل پڑھیے۔ سب جانتے ہیں کہ فساد میں کیا ہوا۔ لیکن گری لال جین صاحب ایڈیٹوریل میں فرماتے ہیں کہ ان فسادات کے پیچھے فارن ہینڈ ہے۔ فارن ہینڈ کا مطلب سبھی جانتے ہیں کہ پاکستان کا ہاتھ ہے۔ یعنی بہ الفاظ دیگر یہ فساد خود مسلمانوں کی سازش ہے۔ لہٰذا ان پر گولیاں چلایا جانا اور اتنے لوگوں کا قتل جائزہ ٹھہرتا ہے اور پی اے سی نے جو کچھ کیا وہ قومی مفاد میں کیا۔ یہ ہے ہماری نام نہاد سیکولر دانشوری۔ یہ کوئی آر ایس ایس کا آدمی نہیں کہہ رہا ہے۔ ملک کا بہت بڑا سیکولرازم کا علمبردار لکھ رہا ہے۔''

''یہ تو بہت خطرناک تھیوری ہے۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔ ''یعنی یہ کہ نمازیوں پر گولی چلی، ٹھیک چھلی، اتنے لوگ مارے گئے دکانیں جلیں، مکانات جلے سیکڑوں لوگ گرفتار ہوئے اور جیلوں میں بند ہیں۔ یہ سب نیشنل انٹرسٹ میں ہو رہا ہے۔''

''یہ تو قاتل پی اے سی کو کھلی چھوٹ دینا ہوا۔'' کلیم کو غصہ آ گیا۔

''اس تھیوری کے تو دور رس اثرات ہوں گے۔ ہم لوگوں کو کچھ کرنا چاہیے۔'' امین نے بھی طیش میں آ کر کہا۔

''صدر صاحب! آپ ابتداء کریں ہم سب ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں۔'' اقبال نے بصیر سے کہا۔

''میں نے کل صبح کابینہ کی میٹنگ بلائی ہے۔ اس میں کچھ فیصلہ کر کے شروعات کریں گے۔'' بصیر نے جواب دیا۔

''اسٹوڈنٹس یونین باقاعدہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے تو زیادہ ٹھیک رہے گا۔'' پشیندر نے بھی رائے دی۔

''میرے خیال سے جیوڈیشل انکوائری کی ڈیمانڈ کی جانی چاہیے۔'' ضمیر نے مشورہ دیا۔

''جیوڈیشیل انکوائری سے کیا ہوگا؟ تقریباً سب سیاسی پارٹیاں عدالتی انکوائری کی ڈیمانڈ کر چکی ہیں۔ گورنمنٹ ضرور انکوائری سیٹ اپ کرے گی مگر نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ تو صرف مسئلہ کو دفن کر دینے کا طریقہ ہے۔ لوگ مطمئن ہو جائیں کہ انکوائری ہو رہی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کسی ایم پی کے سوال کے جواب میں ہوم منسٹر نے پارلیمنٹ میں کہا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد تقریباً پچاس ہزار فسادات ہو چکے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کیا کبھی کسی کو سزا دی گئی؟ کسی کو پھانسی یا عمر قید دی گئی؟ آج تک ایک بھی فسادی کو کسی کورٹ نے سزا نہیں دی۔ اگر آپ صرف پانچ آدمی فی فساد مقتول مان لیں تب بھی تقریباً ڈھائی لاکھ کا حساب آتا ہے۔ ان میں 90% سے زیادہ مسلمان تھے انہیں کی پراپرٹی جلی، وہی لٹے اور انہیں کو گرفتار کیا گیا کیا حکومت ہے، اور کیا انصاف ہے؟'' بصیر نے پر جوش انداز میں کہا۔

''گاندھی کے فلسفۂ عدم تشدد کی جیتی جاگتی تصویر ہے ہمارا بھارت۔'' کلیم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اگر یہ عدم تشدد ہے تو تشدد کی تعریف کیا ہوگی۔'' امین نے سوال کیا۔

''اسپین جا کر معلوم کرنا پڑے گا۔'' شمیر نے جواب دیا۔

''اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی بتائے دیتا ہوں۔ عرض کیا ہے۔

اقبال نے فی البدیہ تضمین کرنے کی کوشش کی۔

عدم کا نام تشدد رکھ دیا اورتشدد کا عدم
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

''بھئی واہواہ!'' ہرطرف ایک شورسا اٹا۔

''پورا فلسفہ بیان کر کے رکھ دیا۔''بصیر نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''آداب''اقبال نے سر جھکا دیا۔

''کیا خوب! بھید کھولنا اس کو کہتے ہیں۔''کلیم نے اقبال کی کمر تھپتھپائی۔

''اجی حضرت بھید تو ہمیشہ سے کھلا ہوا ہی تھا۔بس نظر چاہیے تھی۔آخر ایک فٹی دھوتی کیا چھپاتی اورکیا ظاہر کرتی۔مگر یہ کہ اہل مدرسہ باطل کو حق ثابت کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔''اقبال نے بیان کیا۔

''اورحق کو باطل۔''امین نے جوڑا۔

''یہ تو ہونا ہی تھا کہ بقول مشتاق احمد یوسفی یہ دھوتی پیچھے سے جو کھلتی ہے۔لہٰذا ہر کام الٹا ہونا تھا۔صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح ٹھہرانا لازم ہوا۔''کلیم نے کہا۔

''یہ داڑھی اوردھوتی کا عشق بلاخیز تھا جو ہنوز جاری ہے۔داڑھی،دھوتی کے عشق میں عقل وخرد سے بیگانہ ہو چکی ہے۔''اقبال نے آہ کھینچی۔

''عشق تو خیر چیز ہی ایسی ہے کوئی کیا کرسکتا ہے۔'' امین نے مایوسی سے ہاتھ اٹھادیے۔

''ابھی تک بجھائے نہیں بجھ رہی۔آخر کتنا خون چاہیے اس آتش عشق کو سرد ہونے کے لیے؟''امین نے خود سے سوال کیا۔

''دارالعلوم دیوبند سے فتویٰ منگایا جائے؟''کلیم نے تجویز رکھی۔

''مفتیان عالی وقار ہی بتائیں گے خون کی ندیوں کی گہرائی اورسروں کی تعداد''امین نے آہ بھری۔

''وہ نہ بتاسکیں گے۔ان سے تو صدقہ،فطرہ اورخیرات کی مقدار پوچھئے۔بصیر نے

کہا۔''یہ بات تو ہمارے سید بابا ہی بتائیں گے۔انہیں سے پوچھا جائے گا۔''

''پشیندر! حکومت مسلم نوجوانوں کو علیحدگی پسندی اور تشدد کی طرف لے جارہی ہے۔ جو ملک کے مستقبل کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''اقبال کے اس جملے پر پشیندر کے جواب کے انتظار میں سب ہمہ تن گوش بن گئے۔اس نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔

''میرے خیال میں ہم سب لوگ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئے ہیں۔یہ ایک غیر ذمہ دار فورس کو ڈسپلن کے دائرے میں لانے کا معاملہ ہے۔اس کو صحیح ٹریننگ دینے کی ضرورت ہے۔یہ ہندو اور مسلمان کا سوال ہی نہیں ہے۔پی اے سی نہ جانے کتنی بار قانون کو اپنے ہاتھ میں لے چکی ہے اور نہ جانے کتنی بار اس نے معصوم ہندوؤں پر بھی گولیاں چلائی ہیں۔ ابھی چند سال پہلے غازی آباد میں کیا ہوا تھا؟ کتنے ہندوؤں کو بلاوجہ گولیوں سے بھون دیا گیا تھا۔اس سے پہلے اتراکھنڈ میں ایجیٹیشن کرتی عورتوں پر گولیاں چلا کر کئی کو مار ڈالا گیا تھا۔مرنے والوں میں ایک بھی مسلمان نہیں تھی۔سوال صرف یہ ہے کہ حکومت پی اے سی کے خلاف کچھ ایکشن لے گی یا نہیں۔''

کچھ دیر کے لیے چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔پھر بصیر نے بولنا شروع کیا۔

''پشیندر! تمہاری بات کا صرف ایک پہلو صحیح ہے۔ٹھیک ہے پی اے سی کو ٹریننگ کی ضرورت ہے۔لیکن مسلمانوں کے لیے یہ سوال صرف پی اے سی کا نہیں ہے۔یہ فورس تو صرف یوپی میں ہے۔تقریباً پچاس ہزار فسادات پورے ملک میں اب تک ہوئے، ہر جگہ یہ فورس یوپی میں بھی نہیں ملوث تھی۔یہ پورے ملک کے رویے کا سوال ہے کہ کیا یوں ہی فسادات ہوتے رہیں گے اور مسلمان نشانہ بنتے رہیں گے؟ غازی آباد میں اگر پی اے سی نے گولی چلائی تو اس لیے نہیں کہ دھرنا دینے والے ہندو تھے، حکمراں پارٹی حزب اختلاف کو دبانا چاہتی تھی۔لیکن اگر نمازیوں پر گولی چلائی تھی تو اس لیے کہ وہ مسلمان تھے اور تم دیکھو گے کہ بیوروکریسی، جوڈیشری اور سیاست دانوں کا رویہ کیا ہوتا ہے۔بلکہ دانشوران وطن کیا کہتے ہیں۔ایک مثال یہ ایڈیٹوریل ہی ہے۔ایک طرح کا معاہدہ سا ہے۔ مسلمانوں کے مسائل سے متعلق۔اگر انکوائری ہوتی ہے اور پی اے سی کے کچھ افسران

نامزد بھی ہوتے ہیں تب بھی کوئی حکومت ان پر ایکشن نہیں لے گی۔ کہا جائے گا کہ اس سے فورس کا مارل ٹوٹ جائے گا۔ جب تک نہ جانے کتنے فسادات اور ہو چکے ہوں گے۔ پرانے حادثات داخل دفتر ہو جائیں گے اور نئے فسادات کی انکوائی کا مطالبہ ہونے لگے گا۔ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔'' بصیر کے خاموش ہوتے ہی کلیم نے فلسفیانہ انداز میں بولنا شروع کیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں تھوڑا تاریخ میں جھانکنا پڑے گا۔ تمام ہندو مسلم فسادات کے پیچھے اکثریتی فرقہ کی مجروح نفسیات کام کرتی ہے۔ یعنی اس کی یہ ناکامی کہ وہ صدیوں تک دہلی کے تخت پر قبضہ کرنے باہر سے آئے لوگوں کو نہیں روک سکے۔''

''بھئی یہ بات کسی کی سمجھ میں آئی؟'' ضمیر نے حیران ہو کر سب سے پوچھا۔

''اس میں فلسفہ ہے، تاریخ بھی اور نفسیات بھی، ہم کیا سمجھیں۔'' امین نے بھی مایوسی کا اظہار کیا۔

''کلیم تمہاری یہ بری عادت ہے۔ سیدھی بات تو کر ہی نہیں سکتے۔ صاف بات کرو تاکہ سب لوگ سمجھیں۔'' ضمیر نے پھر حملہ کیا۔

''سمجھنے کے لیے دماغ چاہیے۔'' کلیم نے بھی وار کیا۔

''یعنی یہ کہ ضمیر کے پاس دماغ نہیں ہے۔ بھئی یہ تو بہت غلط بات ہے۔ تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔'' شمیر نے پھر موقع دیکھ کر ان دونوں کو لڑانا چاہا۔

''لیکن پہلے ضمیر نے کلیم پر حملہ کیا تھا۔'' امین نے ضمیر کی وکالت کی تاکہ معاملہ اور آگے بڑھے۔ دونوں میں جھگڑا شروع ہی ہونے والا تھا کہ بصیر نے سب کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔

''سب لوگ خاموش رہیں! یہ لوگ، آپ دونوں کو پھر لڑانا چاہ رہے ہیں۔ ان کی شرارت کو سمجھو یار وا ور جھگڑا ختم۔''

''باس! تم ہمیشہ مجھے کلیم کے خلاف بولنے پر اکساتے ہو۔'' ضمیر نے شمیر کو آنکھیں دکھائیں۔

''صرف اکسانا تو کوئی جرم نہیں ہے۔ تم کلیم پر ہی نہیں ہر ایک پر گرم پڑ جاتے ہو۔''

شمیر نے ہنستے ہوئے صفائی دی۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے۔'' سب نے شمیر سے اتفاق کیا۔

''تمہیں اب بڑا ہو جانا چاہیے۔ اب تم بچے نہیں ہو۔'' امین نے ضمیر کو نصیحت کی۔

''لیکن میں تمہاری طرح اولڈ بھی نہیں ہوں۔'' وہ چونکہ ایک یا دو سال امین سے چھوٹا تھا لہٰذا وہ اس کو ہمیشہ گروپ کا اولڈ بوائے کہہ کر چڑاتا تھا۔

''اسی لیے تو میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ بڑے ہو جاؤ اور تم ہمیشہ مجھ پر بگڑنے لگتے ہو۔'' امین بھی آسانی سے ہار جانے والا نہیں تھا۔

''بہت بہت شکریہ آپ کا اولڈ برادر۔'' ضمیر بھی کم نہیں تھا۔

''بھئی ہم تو تنگ آ گئے۔ یہ سب ختم کرو۔ کوئی نیا موضوع چھیڑتے ہیں۔'' اقبال نے بلا آخر کہا۔

''وہ دیکھو ٹیڑھا زیدی آ رہا ہے۔'' سب نے مڑ کر دیکھا، زیدی ایک ہاتھ میں رجسٹر، منہ میں سگریٹ دبائے داہنی طرف کو ہلکا سا جھکا ہوا کنیڈی ہال کی طرف سے تار پھلانگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ وہ ایم ایس سی (باٹنی) فائنل ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا، بریلی کی پرانی سادات کی بستی سے اس کا تعلق تھا۔ بقول خود اس سال تیسری بار کسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ قریب آتے ہی چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے بولا:

''اوہ صدر صاحب بھی تشریف رکھتے ہیں۔'' جھک کر تین مرتبہ سلام کیا۔

''ایکٹنگ چھوڑو اور یہاں بیٹھو۔'' بصیر نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''باس! دیکھو اسے کہتے ہیں پوزیشن، صدر یونین خود کرسی پیش کر رہا ہے۔ ہم سے کچھ سیکھو۔'' اس نے فلمی اسٹائل میں کہا۔

''ٹیپو ہائی جا رہا ہے۔'' سب نے ہنستے ہوئے تسلیم کیا۔

''ہم یونہی ٹیڑھے زیدی نہیں کہلاتے۔'' اس کی ایکٹنگ اب بھی جاری تھی۔

''اور بھئی سب خیریت ہے؟'' شمیر نے اسے گھیرنے کا پلان بناتے ہوئے پوچھا۔

''اماں! جس دن ہماری خیریت نہ ہوگی کوئی بھی اس گروپ میں خیریت سے نہ

ہوگا۔''اس نے پھر ڈائیلاگ بولا۔

''اور نئے عشق کا کیا حال ہے؟''شمیر نے کلیم کو اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''کون سا نیا عشق؟'' کیا تم نیلم کی بات کر رہے ہو؟''اس سے پہلے کہ زیدی بولتا کلیم نے جال بچھاتے ہوئے کہا۔''اس کو تو یہ بہن سمجھتا ہے اور تم لوگ ہو کہ اسے محبوبہ مشہور کر دیا ہے۔''

''کبھی کبھی اس کے کپڑے دھلوا لاتا ہے۔بازار کا کوئی کام کر دیتا ہے یا نوٹس پہنچا دیتا ہے۔''امین نے ہنستے ہوئے بات آگے بڑھائی۔گویا بال ڈی تک پہنچا دی۔''نیا فلسفہ ہے کہ اب دنیا کی سب لڑکیوں کو بہن سمجھو گے؟''شمیر نے آخر گول مارنے کے لیے بال ہٹ کی۔

''باس! تمہارے حرامی پنوں سے دنیا واقف ہے۔ہاں نیلم ہی کیا دنیا کی ساری لڑکیاں میرے پورے جسم کی بہنیں ہیں۔سوائے ایک چیز کے۔دکھاؤں؟'' زیدی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔''اب سکون آیا۔سالے سب مجھے گھیرنا چاہ رہے تھے۔''

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔دیر تک قہقہوں کی آوازیں گونجتی رہیں۔ہنسی کا دور ختم ہونے پر شمیر نے کہنا شروع کیا۔

''صرف تین سال پہلے تک ہی یہ ایک نہایت معصوم قسم کا لڑکا تھا۔ایک دن باٹنی کے ایک پروفیسر کے ایک جملے نے اس کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ہوا کیا کہ یہ اپنے دوستوں کے ساتھ بار بار مہندی کی باڑھ پھلانگ لگا رہا تھا۔لان کے اندر کیاری میں پروفیسر نے ریسرچ کے سلسلے میں کچھ پودے لگائے تھے جو خراب ہو گئے۔پروفیسر نے دیکھ لیا۔زیدی کو آواز دے کر بلایا اور سمجھایا کہ بیٹا آئندہ ایسا نہ کرنا ورنہ پیچھے سے ساری پینٹ پھٹ جائے گی رسوائی ہوگی سو الگ۔زیدی کا کیا حال ہوا ہوگا؟ چہرہ لال،منہ کھلا ہوا اور آنکھوں میں پانی۔وہ دن ہے آج کا دن اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔پروفیسر کی دکھائی ہوئی شاہراہ پر چلا جا رہا ہے۔''تمام لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔زیدی اٹھا اور رجسٹر رول کرتے ہوئے شمیر کو مارنے دوڑا۔وہ اٹھ کر بھاگا۔

''سالے تجھے چھوڑوں گا نہیں۔''

درمیان میں ہی کلیم نے زیدی کو پکڑ لیا اور زبردستی کرسی پر بٹھا دیا۔

''آج تو کلیم نے بچا دیا۔مگر کب تک! ایک دن میرے ہاتھ سے تیری پٹائی لکھی ہوئی ہے۔'' زیدی نے غصہ سے کہا۔

''اچھا اب اٹھا جائے۔ بہت دیر ہوگئی کل ملاقات ہوگی۔''

بصیر کے ساتھ ساتھ ہی سب لوگ اٹھ گئے۔شمیر نے بل ادا کیا اور زیدی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔سب لوگ ہنستے ہوئے اپنے اپنے ہاسٹل روانہ ہو گئے۔جاتے جاتے امین نے کہا: ''ضمیر تیاری کر کے آنا،کل کلیم کا فلسفہ اور تاریخ پر لیکچر ہوگا۔''

''اس سے کہو کہ معاشیات اور سیاسیات بھی شامل کر لے۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔

''ہاں بیٹا آؤ تو سہی اور بھی بہت کچھ باقی ہے۔'' کلیم نے جواب دیا۔

یونہی سب باتیں کرتے ہوئے اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے۔

○

(۲)مسلم پاکستان ہندو ہندوستان

2.1 قرارداد، پاکستان

دوسری شام جب اقبال، رضا کے ڈھابے پر پہنچا تو ابھی تک وہاں کوئی نہیں آیا تھا۔ یہ ایک عام سا اوپن ایئر ریسٹورنٹ تھا۔ سڑک اور چھپر کی دوکان کے درمیان تقریباً پچاس فٹ خالی زمین تھی جس میں کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں۔ دوکان کے ایکطرف بریانی کی دوکان اور بائیں طرف پان سگریٹ والے کا کھوکھا رکھا ہوا تھا دوسرے کنارے سیخ کباب بیچنے والے کا تخت پڑا ہوا تھا جس پر وہ شام سے رات گئے تک کباب بیچتا تھا۔ اسی میدان میں ایک بڑا سا نیم کا پیڑ تھا۔ جس کی چھاؤں گرمیوں میں بہت آرام دیتی تھی۔ یہ ڈھابہ یونیورسٹی کے مشہور شمشاد مارکیٹ سے متصل تھا۔ شمشاد بلڈنگ اور اس سے متصل بیگم سلطان جہاں منزل سرخ پتھر کی قابل دید عمارت تھی جو والیِ بھوپال بیگم سلطان جہاں کے زرِکثیر سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دفاتر کے لیے بنوائی گئی تھی۔ بلڈنگ کے داہنی طرف یونیورسٹی ٹینس کورٹس اور سوئمنگ پول کی شاندار عمارتیں تھیں۔

اقبال نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بیئرر کو آواز دی، کھوکے سے سگریٹ منگائی اور بغیر سلگائے منہ میں لگا کر بیٹھ گیا۔ تبھی اس نے دیکھا کہ کلیم اپنے اسکوٹر کو گھسیٹے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ چونکہ یہ بہت پرانا اسکوٹر تھا لہٰذا ہمیشہ اس میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہوتی رہتی تھی۔

''پھر کوئی خرابی ہوگئی! کسی کباڑیئے کو بیچ کیوں نہیں دیتے۔'' اقبال نے کلیم کے قریب آتے ہی مشورے سے نوازا۔

''کھڑا تو کر لینے دو۔ آتے ہی شروع ہوگئے۔'' کلیم نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے

ہوئے جواب دیا۔ ''الیکشن میں کس قدر کام آتا ہے۔ آپ تو بھول جاتے ہیں اور پھر دوسرا اسکوٹر کہاں سے آئے گا۔ یہ ہاتھ آگیا ہے تو چلا رہے ہیں۔''

''یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ آپ ہی اسے چلا رہے ہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ آدمی اور مشین کے بیچ کچھ لوافیر کا معاملہ سا بھی ہے۔'' اقبال نے پھر وار کیا۔

''بیٹھنے تو دو یار۔ ابھی ٹیڑھے زیدی سے تمہارا علاج کراتا ہوں۔ آنے دو اسے اور یہ منہ میں سگریٹ کیوں لگا رکھی ہے۔'' اس نے سگریٹ چھینتے ہوئے بیئرر سے ماچس لانے کو کہا۔

''آپ ہی کے لیے حضور! میں تو پیتا ہی نہیں۔'' اقبال نے بیئرر سے ماچس لے کر کلیم کے منہ میں لگی سگریٹ سلگاتے ہوئے بتایا۔

''اب آداب سلام شکریہ وغیرہ کچھ تو کہیں؟''

''یہ اتنی دیر سے آداب و سلام ہی تو ہو رہا تھا۔ اچھا جلدی سے ایک چائے ہو جائے۔'' کلیم نے چائے کا آرڈر دیا۔

''یہ آج کوئی آیا کیوں نہیں ابھی تک؟''

''بس اب کچھ دیر میں سب آجائیں گے۔ یاد ہے کل کیا بات ہو رہی تھی؟'' اقبال نے یاد دلایا۔

''وہی فساد وغیرہ کی باتیں۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''جب تک زندگی ہے یہی سب کرنا ہے۔ یہ سب سید بابا کی کرامت ہے، نہ وہ قوم قوم کرتے اور نہ ہم اس فکر میں پڑتے۔'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اچھا ہی ہوا۔ نہ ہوتا یہ تو کیا ہوتا۔ زندگی اسی کی نذر رہی۔'' کلیم نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اتنے میں شمیر، ضمیر، اقبال اور پشیند روغیرہ بھی ایک ایک کر کے آگئے۔

''بھئی ابھی تک چائے شائے نہیں آئی۔'' شمیر نے بیٹھتے ہی شکایت کی اور لڑکے کو آواز دے کر چائے کا آرڈر دیا۔

''آج یونین کابینہ کی میٹنگ ہوئی ہوگی۔ پتہ نہیں کیا طے کیا گیا۔'' شمیر نے یاد دلاتے

ہوئے کہا۔

''ہاں کل صدر صاحب کہہ تو رہے تھے کہ آج لائن آف ایکشن طے کریں گے۔''
پشیندر نے بھی یاددہانی کرائی۔

''کیالائن آف ایکشن طے ہوگی؟'' کیا کرسکتی ہے یونین، بلکہ سارے مسلمان بھی مل کر کیا کر سکتے ہیں؟ اگر کانگریس اور کمیونسٹ سیکولرسٹوں کو بھی شامل کرلیا جائے تو بھی کیا ہوسکتا ہے؟ ملک جب آزاد ہوا تو یہ گاندھی وادی ہی تھے جن کے ہاتھ میں حکومت آئی۔ سب سے پہلا کام ان لوگوں نے کیا کیا؟ سومناتھ مندر کو نئے سرے سے بنائے جانے کا حکم جاری کیا۔ اردو کو دیش سے نکال دیا گیا۔ یوپی میں زمینداری ختم کی گئی۔ ہزارہا فسادات کرائے گئے اور فسادیوں کو پوری چھوٹ دی گئی۔'' کلیم بغیر رکے ہوئے پورے جوش سے شروع ہوگیا۔

''ذرا رکو بھی یار۔ آ کے بیٹھے بھی نہیں اور نکالے بھی گئے والی بات ہوگئی۔''، شمیر نے کلیم کو خاموش کرتے ہوئے کہا۔

''بس یہ تو شروع ہوجاتے ہیں۔ مجھے بتایئے۔ کیا کوئی ایکشن یک طرفہ بھی ہوسکتا ہے؟ پشیندر نے بھی جوابی حملہ کیا۔

''کیوں نہیں ہوسکتا؟ نہ جانے کتنی مثالیں دنیا میں ایسی ہیں۔ سکندر نے انڈیا پر حملہ کیوں کیا؟ غزنوی کے خلاف یہاں کے لوگوں نے کیا کیا تھا؟ احمد شاہ ابدالی اور نادر شاہ درانی کے خلاف مغل بادشاہوں نے کیا کیا تھا کہ انھوں نے دہلی کو مسلمانوں کے خون سے سرخ کر دیا اور ساری دولت لوٹ کر افغانستان لے گئے۔ اتنا کمزور کر دیا کہ دہلی کی حکومت کو کہ وہ اپنے ملازمین تک کی تنخواہ بھی دینے کے قابل نہ رہی۔ حتیٰ کہ ہزاروں میل دور سے آئے انگریزوں سے بھی مقابلہ نہ کرسکی۔'' کلیم کی بجائے شمیر نے جواب دیا۔

''باس! اتنی پرانی باتیں مت بیان کریں۔ یہ بتایئے کہ جب آپ نے اسلام کے نام پر پاکستان بنالیا تو ہم انڈیا کو ہندوراشٹر کیوں نہیں بنا سکتے؟ ایک طرف تو قائداعظم آپ کے لیڈر ہوں اور دوسری طرف ہندوؤں سے بھی یہ توقع کریں کہ وہ آپ کے ساتھ

انصاف کریں۔ یہ کہاں کی لاجک ہے؟ آپ تو دونوں ہاتھوں میں لڈو رکھنا چاہتے ہیں۔''
پشیندر نے آخر ترپ کا اکا استعمال کر دیا۔

تمام لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ کسی کو یہ امید نہیں تھی کہ بات یہاں تک پہنچ جائے گی اور وہ بھی پشیندر کے منہ سے ایسی بات نکلے گی۔ اس نے تمام لوگوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک ماحول میں تناؤ رہا اور ہر طرف خاموشی چھائی رہی آخر کار امین نے خاموشی توڑی۔ ''اب بولیں آپ لوگ؟''

''بھئی سب لوگ خاموش کیوں ہو گئے؟ ہے کسی کے پاس پشیندر کی بات کا جواب؟''
ضمیر نے بھی امین کو چھیڑا۔ وہ درحقیقت خاندانی کانگریسی تھا اور اس کے گھر والے اپنے آپ کو گاندھی وادی کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس کے دادا نے گاندھی کے ساتھ ستیہ گرہ میں حصہ لیا تھا۔

''جواب تو ہے۔ مگر آپ سن نہ سکیں گے۔'' اقبال نے آخر کار خاموشی توڑی۔

''سن کیوں نہیں سکیں گے۔ بلکہ آپ کے پاس کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات کہہ رہے ہیں۔'' ضمیر نے پھر وار کیا۔

''تو پھر آدھے گھنٹے تک کسی اور موضوع پر بات نہیں ہوگی۔ منظور؟'' اقبال نے شرط پیش کی۔

''منظور ہے۔ سب کو منظور ہے۔'' سب نے بیک وقت جواب دیا۔

''اب سنئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ نے مان لیا کہ آخر کار کانگریس نے بھی وہی رخ اختیار کیا جو قائداعظم نے کیا۔ یعنی ایک مسلمان کی بات کر رہا تھا تو دوسرا ہندوؤں کی۔ لہٰذا پاکستان بننے کے بعد ہی سہی کانگریس اور مسلم لیگ ایک ہی تھیوری کے علمبردار ثابت ہوئے۔ ایک مسلم نیشنل ازم کا علمبردار تو دوسرا ہندو نیشنلزم کا! ٹھیک ہے؟''
اقبال نے سب کی طرف دیکھ کر جواب دینا شروع کیا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ میں نے ایسا تو نہیں کہا۔'' پشیندر نے جلدی سے صفائی دی۔

''نہیں تم نے ایسا ہی کہا۔ یعنی فسادات نہیں روکے جا سکتے تھے اردو کو نہیں بچایا جا سکتا

تھا اور سومناتھ مندر کی تعمیر ضروری تھی اس کے علاوہ مسلمانوں کو نوکریوں سے بھی نکالا جانا ضروری تھا۔اس لیے کہ پاکستان بن گیا تھا۔لہٰذا آٹومیٹکلی ہندوستان ہندوراشٹر ٹھہرا۔ چاہے اس کا اعلان ہوا یا نہیں ہوا۔اور اعلان تو بیوقوف لوگ کرتے ہیں۔'' اقبال نے بات کو آگے بڑھایا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ایسا تو کسی نے نہیں کہا۔'' اب ضمیر، پشیندر کے ڈیفنس میں بولا

''بیٹا ایسا ہی کہا گیا کہ اسلام کے نام پر پاکستان بن گیا تو خودبخود ہندوستان ہندوراشٹر بن گیا۔جہاں پر فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام بھی جائز ٹھہرا۔'' اقبال نے زور دے کر کہا۔

''اقبال کی بات میں دم ہے اگر اسلام کے نام پر پاکستان بن گیا تو انڈیا کیا بنا؟ حالانکہ کانسٹی ٹیوشن میں اس کو سیکولر ڈیموکریٹک ری پبلک لکھا گیا مگر مسلمانوں کو سزا تو دی گئی۔'' کلیم نے اقبال کو سپورٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ضمیر تم بہت ٹرٹر کرتے ہو۔اب غور سے میری بات سنو۔'' اقبال نے ضمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''ٹرٹر غیر پارلیمانی لفظ ہے۔اسے واپس لیا جائے۔'' امین نے جلدی سے دخل اندازی کی۔

''جی واپس لے لیا۔واپس نہ لوں گا تو تم میری بات نہیں سنو گے۔'' اقبال نے فوراً ہی جواب دیا۔

''عقلمند ہو۔'' امین نے کہا۔

''یہی بات تو مسلم لیگ پہلے دن سے ہی کہہ رہی تھی کہ کانگریس صرف ہندو مفادات کی نگہبان ہے اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لیے اس نے کچھ نظریات گھڑ لیے ہیں جو آخر کار پاکستان بننے کے بعد ثابت ہو کر رہی۔تمام کھوکھلے دعوؤں کے باوجود ہندوستان ہندوراشٹر ہے۔مسلمان رہے تو دوسرے درجہ کا شہری بن کر رہے۔کروڑوں لوگوں کو مارا تو نہیں جاسکتا لیکن فقیر بنا کر تو رکھا جاسکتا ہے۔اب رہی اسلام کے نام پر پاکستان بننے کی

بات۔ مسلم لیگ نے کبھی بھی اسلام کے نام پر پاکستان کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے ہوم لینڈ کا مطالبہ کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے لیے پاکستان بنا اور نہ مانگا گیا۔ پشیندر جی آپ اور ضمیر صاحب آپ یا کوئی بھی بڑے سے بڑا تاریخ داں یہ اگر ثابت کر دے کہ پاکستان مسلمانوں کے لیے مانگا گیا تھا یا بنایا گیا تھا تو میں بھی یہ کہوں گا کہ ہاں ہمیں ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' اقبال نے پورے جوش میں آ کر دعویٰ کیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' پاکستان مسلمانوں کے لیے نہیں بنا تو پھر کس کے لیے بنا۔ پھر کیا مطالبہ کیا تھا مسلم لیگ نے؟'' اب کلیم نے بھی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے اقبال سے پوچھا۔

''یہی تو المیہ ہے ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا۔ انہیں غلط سبق پڑھایا گیا ہے۔ اول تو یہ کہ مسلم لیگ اسلام کے دفاع کے لیے نہیں، مسلمانوں کے قانونی حقوق کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی۔ اسلام کی حفاظت کا دعویٰ تو بقول خود جماعت اسلامی یا تبلیغی جماعت یا مذہبی ادارے کرتے ہیں۔ مسلم لیگ تو ایک غیر مذہبی سیاسی جماعت تھی جس کے پیش نظر صرف یہ سوال تھا کہ مستقبل کے دستور میں مسلمانوں کا کیا مقام ہوگا اور مطالبہ یہ تھا............ وہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ سب سے پہلے میں ضمیر سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ضمیر سے مخاطب ہوکر کہا ''کیا آپ نے قرارداد پاکستان پڑھی ہے جو ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور مسلم لیگ سیشن میں پاس کی گئی؟ جس کی بنیاد سات سال تحریک چلی، کیا وہ ڈاکومینٹ آپ نے پڑھا ہے؟''

''اس سے کیا ہوتا ہے۔ نہیں پڑھا تو کیا ہوا۔ سب جانتے ہیں کہ مسلم لیگ اسلام کے نام پر مسلمانوں کے لیے پاکستان کا مطالبہ کر رہی تھی۔'' ضمیر نے فوراً ہی جواب دیا۔

''اگر آپ پڑھ لیتے تو حالات بالکل دوسرے ہوتے۔ اگر کانگریس نے اور خاص طور سے کانگریسی مسلمانوں نے جھوٹ نہ بولا ہوتا۔ اگر عوام کو یہ بتایا گیا ہوتا کہ مسلم لیگ نے صرف مشرق اور مغرب میں مسلم اکثریتی علاقوں کی آزادی کی بات کہی تھی کہ مسلم اکثریتی

علاقوں کوآزادحکومتیں بنانے کا حق دیا جائے۔بس یہی مطالبہ تھا۔مسلمانوں کے لیے ملک کی نہیں بلکہ مسلم اکثریتی علاقوں کی آزادی کی ڈمانڈ کی تھی مسلم لیگ نے۔جہاں پہلے سے ہی مسلمان اکثریت میں رہتے تھے جیسے بنگال،پنجاب،سندھ،بلوچستان،سرحداورکشمیر میں۔حضور یہی وجہ ہے مسئلہ کشمیر کے آج تک حل نہ ہونے کی۔بنگال اور پنجاب کانگریس نے ماؤنٹبیٹن پر اپنے اثر رسوخ سے بٹوالیا۔تینوں پارٹیوں حکومت برطانیہ،مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ۱۹۴۷ء میں یہ معاہدہ ہوااوراس طرح پاکستان وجود میں آیا۔''

''پھر یہاں کے مسلمان کیوں یہ بیوقوفی کرر ہے تھے انھوں نے کیوں جناح کوسپورٹ کیا؟''امین نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس کی دواہم وجوہ تھیں۔پہلی یہ کہ قرارداد پاکستان میں ہی دوسرامطالبہ یہ تھا کہ ہندواقلیت جومسلم اکثریتی علاقوں میں رہتی ہےاورمسلم اقلیت جو ہندوا کثریتی علاقوں میں رہتی ہے،کوبرابر کے بنیادی حقوق دیے جائیں۔اقبال نے بتایا۔

''یہ قراردادِ پاکستان کا حصہ ہے؟''امین نے مزید حیران ہوکر پوچھا۔

''ہاں جان من! یہ صرف دو پیراگراف کا ڈکومنٹ ہے نہ جانے کتنی کتابوں میں شائع کیا جاچکا ہے۔ابھی ایچ ایم سیروائی کی پارٹیشن آف انڈیا میں ریپروڈیوس کیا گیا ہے۔میں کل ہی اس کی فوٹو کاپی لاکرآپ لوگوں کودوں گا۔ہندوستان کےسب سے نامور وکیل نے اسے ڈرافٹ کیا تھا مگر آج تک ہم یہ دو پیراگراف بھی نہ پڑھ سکے۔وہ دو پیراگراف جنھوں نے ہماری زندگی بدل کرر کھ دی۔''

''اوردوسری وجہ کیا تھی؟''امین نے پھر سوال کیا۔

''ایک بارقائداعظم سے مرادآباد کے بااثر مسلمانوں نے یہ سوال کیا کہ ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔ہم کیوں آپ کوسپورٹ کریں۔تواس کے جواب میں قائداعظم نے کہا کہ کسی بھی صورت میں ہندوا کثریتی علاقوں کے مسلمان اکثریت نہیں ہوسکتے۔انہیں بہرصورت اقلیت رہنا ہے۔آپ کی مدد سے مسلم اکثریتی علاقے آزاد ہوسکتے ہیں اور آپ لوگ اپنی جماعت میں رہ کراپنے لیے لڑتے ہی رہیں گے۔اس جواب سے لوگ

قائل ہو گئے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''کیا خوب منطق تھی۔ جواب نہیں۔'' کلیم نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔'' اگر مسلمان اپنی پارٹی بنا کر رکھتے تو یہ جو آج بھیک سی مانگتے پھرتے ہیں یہ نہ ہوتا بلکہ دوسری پارٹیاں خود چل کر ہمارے دروازے پر آتیں۔ قائد اعظم نے بالکل صحیح کہا تھا۔''

''اچھا اب اس بحث کو ختم کیا جائے۔ فسادات سے بات شروع ہوئی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔'' پشپیندر نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش کیا۔

''تم نے ہی تو ایسی بات کہی کہ اقبال کو غصہ آ گیا۔'' امین نے یاد دلایا۔

''نہیں مجھے غصہ نہیں آیا۔ بلکہ ایک نہایت ضروری بات نکل آئی۔'' اقبال نے جواب دیتے ہوئے کہا'' بلکہ میں تو پشپیندر کا شکر گزار ہوں کہ ایک سوال جو کانٹے کی طرح تمام لوگوں کے دلوں میں چبھتا ہے اور جس پر صاف صاف گفتگو بھی نہیں ہوتی وہ اس نے پیش کر دیا اور کھل کر بات کرنے کا موقع نکل آیا۔ درحقیقت ہندو اور مسلمان کا سوال پیدا ہی جب ہوا جب تیسری طاقت انگریزوں نے مسلمانوں کو ہٹا کر حکومت پر قبضہ کر لیا۔ ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی ہار نے پاور اکویشن پوری طرح بدل ڈالی۔ مسلمان چونکہ حکمراں تھے لہٰذا لڑائیاں بھی انھوں نے ہی لڑیں۔ مارے بھی وہی گئے۔ ہندو تو خاموش تماشائی تھے۔ انگریزوں کو اپنی حکومت چلانی تھی لہٰذا انھوں نے ہندوؤں کو اپنی طرف ملا لیا۔ تمام نوکریاں مسلمانوں سے چھین لی گئیں اور زمانہ ساز لوگوں کو دے دی گئیں۔ ہنٹر نے اپنی مشہور کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں صاف صاف اعتراض کیا ہے کہ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت مسلمانوں سے نوکریاں چھین کر ہندوؤں کو دی گئیں۔ جیسا کہ آزادی کے بعد حکومت نے کیا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں نے انگریزوں کی نئی تعلیم کو پوری طرح اپنانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ راجہ رام موہن رائے نے انگریزوں کی مدد سے پہلا ماڈرن ایجوکیشن ادارہ کلکتہ میں ۱۸۱۲ء میں ہی بنا لیا اور اس کا نام رکھا ہندو کالج۔''

''پھر وہی بات! کیا وہ اس کا نام اسلامیہ کالج رکھتے؟'' پشپیندر نے اقبال کی بات کاٹتے ہوئے کہنا شروع کیا۔'' ہر خرابی کے لیے دوسروں کو ذمہ دار قرار دینا کوئی اچھی بات

نہیں ہے۔آپ کی قوم تو آج بھی ماڈرن ایجوکیشن کو اپنانے کے لیے تیار نہیں ہے۔آج بھی وہ مولوی کے غلام ہیں۔اس میں ہندوؤں کی کیا خطا ہے یار؟ بس انہی باتوں پر مجھے غصہ آجاتا ہے۔جب آپ لوگ بھی انصاف کی بات نہیں کر سکتے تو کس سے امید رکھی جائے۔''

''کیا بات ہے پشپندر!اب جا کر اقبال کا منہ بند ہوا۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بہت دیر سے اکیلا ہی بکواس کیے جارہا تھا۔اب ہے اس کا جواب تمہارے پاس؟'' ضمیر نے بھی اقبال کو لتاڑا۔

''نہیں ہے۔میں بالکل مان گیا پشپندر کی بات لیکن......'' اقبال نے کہنا شروع ہی کیا تھا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ہم لوگ یہاں تمہارے تاریخ پر لیکچرز سننے نہیں آتے۔ہنسی خوشی کا ماحول رہے،گپ شپ ہو یاری دوستی بڑھتی رہے۔اس لیے آتے ہیں۔بس اور کوئی مقصد نہیں ہے۔'' ضمیر کو واقعی غصہ آ گیا۔

''اور اگر کچھ سنانا ہے تو سب کے لیے چائے وغیرہ منگاؤ۔کافی دیر سے تمہاری بکواس سن رہے ہیں۔'' شمیر نے بھی ماحول بدلنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی پہلے سموسے وغیرہ اور پھر لیکچر۔'' کلیم نے بھی بات بڑھائی۔

''ٹھیک ہے اگر آپ لوگ تاریخ سے بالکل نابلد رہنا چاہتے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔اور سینے میں کوئی اسعد بدایونی تو ہوں نہیں کہ اپنی غزلیں سنانے کے لیے لوگوں کو چائے پلاتا پھروں۔'' اقبال نے بھی تفریح کے موڈ میں جواب دیا۔اس بات سے بے خبر کہ ابھی ابھی اسعد بدایونی اس کی کرسی کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا۔چھوٹے قد سانولے رنگ کا ایم اے اردو (فائنل) کا طالب علم تھا۔یونیورسٹی کے بہترین شعراء میں اس کا شمار ہوتا تھا۔نئے انداز کی شاعری کرتا تھا لہٰذا اس کی شہرت لکھنؤ اور دہلی تک پہنچ چکی تھی۔حساس ہونے کی وجہ سے فوراً غصہ میں آجاتا تھا۔سب اس کو دیکھ کر زور زور سے ہنسنے لگے جو غصہ سے بالکل لال پیلا ہو رہا تھا۔

''کون الّو کا پٹھا چائے پلاتا ہے؟'' اسعد نے پیچھے سے آ کر موٹی سی گالی بکتے ہوئے کہا۔ ''اور اقبال تم تو بالکل ہی چغد ہو۔ تم شاعری کیا سمجھو۔ اس کے لیے دماغ چاہیے۔ دل چاہیے اور حساس طبیعت چاہیے۔ تم جیسے ٹھس لوگوں کی سمجھ میں میری شاعری نہیں آئے گی۔''

اقبال نے مڑ کر دیکھا اور یکدم سناٹے میں آ گیا۔

''ہاں اسعد تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' کلیم نے اس کو سپورٹ کیا۔

''تمہیں بھی میں جانتا ہوں سالے۔ تم بھی ایسے ہی ہو۔ اردو سمجھنا تمہارے بس کی بات نہیں۔ یہ زبان ہر ایرے غیرے کے لیے نہیں ہے اور تمہارا تو تلفظ بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' وہ کلیم پر ہی پلٹ پڑا۔ وہ نہ ہنسنے کا رہا نہ رونے کا۔

''یہ سب لوگ شاعری سے بالکل نابلد ہیں اور تمہاری شاعری کی تو شان ہی الگ ہے۔ غالب کی شاعری بھی ان کے دوستوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔'' امین نے سنجیدہ ہو کر اس کی شاعری کی تعریف کی۔

''بس یہ ایک امین ہے تو لوگوں میں جو کچھ شدبد رکھتا ہے۔'' اسعد نے ٹھنڈا پڑتے ہوئے کہا۔ ''ہاں امین! تم کسی دن میرے کمرے آنا۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ چائے بھی ہو گی۔''

''ہاں ہاں ضرور آؤں گا۔'' امین نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے کہا، ''بیٹھو چائے پیو۔''

''نہیں مجھے جانا ہے۔ اس سالے اقبال نے میرا موڈ خراب کر دیا۔ وہاں چنگیزی وغیرہ میرا انتظار کر رہے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ سڑک کے دوسری طرف چلا گیا، جہاں اس کے کچھ شاعر دوست انتظار کر رہے تھے۔

''جان بچی تو لاکھوں پائے۔'' اقبال نے گہری سانس بھری۔

''وہ تو خیر ہوئی کہ اس کے کچھ دوست انتظار کر رہے تھے۔'' کلیم نے بھی سکون کا سانس لیا۔

''غالبًا وہ یہاں سگریٹ لینے آیا تھا۔'' اقبال نے پیچھے کھوکھے کی طرف دیکھتے ہوئے اندازہ لگایا۔

''اور اگر میں تعریف نہ کرتا تو آسانی سے ٹلنے والا تھوڑی تھا۔ باری باری سب کا نمبر لگاتا۔'' امین نے ہنستے ہوئے یاد دلایا۔

''اور تعریف بھی کیسی کہ غالب سے ہی ملا دیا!'' کلیم نے امین کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اس سے کم پر راضی ہونے والا نہ تھا میں اسے خوب جانتا ہوں۔ آخر ہاسٹل فیلو ہوں اس کا۔'' امین نے جواب دیا۔

''اب یہ لوگ کسی کے کمرے پر جائیں گے جہاں کچھ پینے پلانے کا انتظام ہوگا۔ آدھی رات تک ایک دوسرے کو اپنے اپنے اشعار سنائیں گے اور وہیں سب پیتے پیتے سو جائیں گے۔'' کلیم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''بھئی آپ کیوں ٹھنڈی سانس بھر رہے ہیں۔ یہ اوریجنل لوگ ہیں۔ ایک دن سب کا نہیں تو ایک دو کا ضرور اردو لٹریچر میں نام ہوگا۔'' امین نے اسعد کی طرفداری کی۔

''اب تم لٹریچر پر لیکچر مت شروع کر دینا کہ لٹریچر سماج کا آئینہ ہے۔ اگر کسی زمانے کا جاننا ہو تو اس وقت کے لٹریچر کو پڑھو وغیرہ وغیرہ۔'' شمیر نے امین کو ٹوکا۔ وہ جانتا تھا کہ امین کا یہ محبوب موضوع تھا اور ادب سے متعلق اسے اچھی خاصی معلومات تھیں۔

''یہ تو میں جانتا ہوں کہ آپ سب لوگ ماشاءاللہ اس میدان میں بالکل کورے ہیں لہٰذا میں بھینس کے آگے بین بجانے سے تو رہا۔'' امین نے سب کو گھیرتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔ اسی وقت ٹیڑھا زیدی اپنی سائیکل پر وہاں آ گیا اور آخری جملہ سن لیا۔ جلدی سے سائیکل کھڑی کرتے ہوئے بولا۔

''اماں بھینس کے آگے کون بین بجا رہا ہے۔ ایک دن ہم نے بجائی تھی بھینس کے آگے بین۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہی شروع ہو گیا۔ ''ہم بین بجا رہے تھے تو بھینس ناچنے لگی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ بھینس کو ڈانس کرتا دیکھ ادھر سے بجار پھنکارتا ہوا آ گیا۔ بھئی ہم

تو جان بچا کر پتلی گلی میں گھس گئے اور بھینس کا نہ جانے کیا حشر ہوا۔''

''یہ ٹیڑھا زیدی نہیں سدھر سکتا۔'' کلیم نے مایوسی سے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''ایں ہم نہیں سدھر سکتے! ہم انگریزوں کے زمانے کے جیلر ہیں۔ہمیں کون سدھارے گا۔'' اس نے شعلے کا ڈائیلاگ مع ایکٹنگ ادا کیا۔ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ سب لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

''بھئی ہم ہارے اور تو جیتا۔'' کلیم نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''جلد ہی عقل آ گئی ورنہ یہ نہ جانے کیا کیا بکواس کرتا۔'' اقبال نے کلیم کو مخاطب کیا۔

''اچھا اب اٹھا جائے بہت دیر ہو گئی۔'' امین نے تجویز پیش کی۔

''اٹھا جائے! مابدولت ابھی تشریف لائے ہیں اور ابھی انھوں نے چائے بھی نہیں پی۔'' زیدی نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے مغلیہ ڈائیلاگ بولا۔

''اسے تو آج ایکٹنگ کا دورہ پڑا ہے خدا خیر کرے۔'' شمیر نے زیدی کی کمر پر ہاتھ مارا۔

''مابدولت کا تھکا ہوا دماغ شاید چائے سے سکون محسوس کرے۔ پیش کی جائے۔'' زیدی نے پھر ڈائیلاگ بولا۔

''رضا'' شمیر نے ڈھابے والے کو پکارا۔'' چائے سے اس کا منہ بند کرو۔''

''باس تمہارا بھی جواب نہیں۔اماں واقعی سر میں درد سا ہو رہا ہے۔سبھی کے لیے منگاؤ۔'' زیدی نے نارمل ہوتے ہوئے شکایت کی۔

''کئی دور چل چکے ہیں۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''باس علی گڑھ میں ابھی تک تو اکیلے چائے پینے کی ٹریڈیشن نہیں ہے۔'' زیدی نے یاد دلایا۔

''کہاں تک بھگتا جائے۔ایک سے ایک آتا ہے یہاں۔'' شمیر نے ناراضگی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آواز لگائی۔''اچھا میرے لیے بھی لاؤ۔

2.2 فردوس گوش

یہ پیر کا دن تھا۔ یونیورسٹی تین دن کی چھٹیوں کے بعد آج ہی کھلنے والی تھی۔ اقبال ابھی بھی اپنے بستر میں تھا۔ حالانکہ دن کے ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ اسے پتہ تھا کہ ابھی ایک دو دن کلاسس یونہی چلیں گے کیونکہ چھٹیوں کی وجہ سے آس پاس کے علاقوں کے تمام طلباء اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ ان دنوں اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ابھی حال ہی میں اس کا پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن ہوا تھا۔ اس کے سپروائزر دو مہینہ کے لیے امریکہ کانفرنس اٹینڈ کرنے گئے ہوئے تھے۔ ان کے لوٹنے کے بعد ہی ریسرچ پر کام کی شروعات ہوسکتی تھی۔ تمام وقت ہوسٹل کے کمروں میں خوش گپیاں کرنے یہاں وہاں ہوٹلوں اور چائے خانوں میں بحث ومباحثہ اور ہنسی مذاق میں صرف ہورہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی اچھی فلم آجاتی تھی تو وہ بھی دیکھ آتے تھے۔ موڈرن ہسٹری، مذہبیات اور اہم شخصیات پر اس کے پاس کافی کتابیں جمع تھیں۔

گزشتہ رات یہ لوگ تقریباً دو بجے ڈھابے سے اٹھے تھے۔ ایک پرانے دوست کے آنے کی وجہ سے جو انجینئرنگ کرنے کے بعد تقریباً ایک سال سے دلی میونسپل کارپوریشن میں اسسٹنٹ انجینئر کے عہدے پر کام کر رہا تھا، بہت سی پرانی باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور وقت کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اقبال بہت تھکا ہوا تھا اس نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ اقبال دو سال سے ایس ایس نارتھ ہاسٹل کے ایک بیک روم میں رہ رہا تھا۔ یہ ایس ایس ہال کا ایک ہاسٹل تھا۔ ایم اے او کالج کے زمانے میں بس یہی کیمپس تھا جسے سرسید احمد نے اپنی ذاتی نگرانی میں بنوایا تھا۔ یہاں تک کہ کون سا پتھر کہاں لگے گا، کمروں کا کیا سائز ہوگا، عمارتوں کا کیا آرکیٹکچر ہوگا، دروازے کھڑکیاں کس طرح کی ہوں گی، وہ خود ایک ایک تفصیل کا فیصلہ کرتے تھے اور بذات خود مونڈھا ڈال کر تعمیرات کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ لہٰذا ایس ایس ہال کی تمام عمارتیں بس دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ سرخ پتھر اور اینٹوں کی یہ عمارتیں ایک عجیب شان اپنے اندر سموئے

ہوئے ہیں۔ مغل اور انگلش آرکیٹیکچر کے امتزاج سے ایک نیا اچھوتا اسٹائل پیدا ہو گیا ہے جو بعد میں بننے والی عمارتوں میں مشکل سے ہی نظر آتا ہے۔ پورا ہال ایک ٹینس کورٹ کے مشابہ ہے۔ چاروں طرف دومنزلہ ہوسٹل ہیں۔ اونچی اونچی چھتوں کے بڑے بڑے کمرے، ہر کمرے میں ایک بیک رو۔ کمروں کے سامنے بڑے بڑے دالان نما لمبے وسیع برآمدوں میں سرخ پتھروں کی محرابیں، ان کے آگے ہری گھاس کے بڑے بڑے لان اور آگے چاروں طرف گھومتی ہوئی پختہ سڑکیں۔ درمیان میں وسیع لان ہیں جن میں ہزاروں طرح کے چھوٹے بڑے پیڑ، کئی طرح کے گلاب اور موسمی پھولوں کے پودے ہر طرف ایک عجیب حسن پیدا کرتے ہیں۔

ہال کے مشرقی کنارے پر باب اسحاق اور جنوبی عمارتوں کے بالکل درمیان عظیم الشان وکٹوریہ گیٹ، ایک دم انگلش طرز پر بنا ہوا۔ سرخ پتھروں سے تراشی ہوئی محرابیں اور اونچے اونچے وسیع کھلے دروازوں کے اوپر بلند ٹاور۔ وکٹوریہ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی وسیع لان کے سامنے درمیانی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ وکٹوریہ گیٹ کے عین مقابل شاندار اسٹریچی ہال نظر آتا ہے جس کی کھپریل نما وسیع چھت اور سرخ پتھروں سے بنے ہوئے بلند و بالا دروازے، برآمدے کے ستون اور محرابیں بس دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی ہیں۔ سر جان اسٹریچی وائسرائے آف انڈیا نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ان کا پتھر پر کشیدہ ایڈریس بھی وہیں لگا ہوا ہے جس کو پڑھنے سے سرسید کی تاریخ ساز تحریک کے اغراض و مقاصد کا اندازہ ہوتا ہے۔ اتاترک نے جس طرح ترکی کے صبح و شام اور زمین و آسمان صرف چند سالوں میں بدل کر رکھ دیے، اس سے بھی کہیں وسیع اور دور رس نتائج سرسید احمد کے فہم و ادراک اور علم و جفاکشی سے برصغیر کے مسلمانوں کی زندگی میں نمودار ہوئے۔ ایک شخص جب کہ صرف سات طلباء مدرسۃ العلوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے، ایسی ایسی عظیم الشان عمارتیں بنوا رہا تھا کہ جیسے کسی دارالسلطنت کی بنیاد رکھی جا رہی ہو۔ آسمان منزل اور لٹن لائبریری کی بلند آرٹسٹک عمارتیں اور جنوبی لائن کے درمیان عالیشان مغلیہ طرز کی جامع مسجد، جس میں کئی ہزار لوگ بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہوں، صرف

سات طلباء کے لیے؟

ایس ایس ہال میں تقریباً دو ہزار طلباء قیام پذیر تھے جو مختلف کلاسس اور ڈسپلن میں تعلیم حاصل کرنے والے مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے طلباء بیرونی ممالک سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ ہر کمرے میں پانچ طلباء رہتے تھے۔ ایک سینئر بیک روم میں اور دوسرے چار طلباء بڑے سے فرنٹ روم میں۔ یہ سینئر طلباء ایک طرح سے یونیورسٹی ایڈمنسٹریشن کا حصہ تھے جو طلباء اور اساتذہ کے درمیان ایک پل کا کام کرتے تھے۔ انہیں طلباء کا ایک گروپ اسٹوڈنٹس یونین کی سرگرمیاں کنٹرول کرتا تھا جبکہ دوسرا گروپ حزب اختلاف کا فرض نبھاتا تھا۔ اس طرح طلباء کو پارلیمانی ڈیموکریسی کے طرز کار کی بھی اچھی خاصی ٹریننگ مل جاتی تھی۔

جونئر طلباء کی انٹروڈکشن پروسس ایک بہت دلچسپ اور ایک طرح سے کلچرل ٹریننگ کی پروسس تھی۔ جو تقریباً تین ماہ کے عرصے میں پوری ہو جاتی تھی۔ اگست کے شروع میں نئے طلباء ہوسٹلوں میں داخل ہوتے تھے اور دسمبر کے آخر تک ہر ہفتہ کی تقریباً پوری شب ان کا انٹروڈکشن چلتا تھا۔ ہفتہ کی شام سے ہی جونیئر طلباء کو اکٹھا کیا جاتا تھا شروع ہو جاتا تھا۔ جس میں دو یا تین سال کے سینئر طلباء بہت جوش سے حصہ لیتے تھے۔ ہوسٹل کے طویل برآمدے کے درمیانی بڑے حصہ میں نصف دائرے کی شکل میں کرسیاں لگائی جاتی تھیں۔ سینئر طلباء اپنی اپنی سینئر ٹی کے لحاظ سے کرسیوں پر آ کر بیٹھ جاتے تھے اور جونیئر طلباء کو ایک ایک کر کے اس محفل کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ چند سینئر طلباء انٹروڈکشن لینے کے ایکسپرٹ ہوتے تھے جن کے ہر جملے اور ہر بات پر پوری محفل لالہ زار بن جاتی تھی۔

جونیئر طلباء بیچارے کانپتے ہوئے، ہراساں سے پوری محفل کے روبرو پیش ہوتے تھے۔ آتے ہی جھک کر تین بار سلامی بجالاتے تھے۔ ''ایسے سلام کیا جاتا ہے؟'' بیچارے کو خوامخواہ ڈانٹ پڑی۔

''کھڑے ہو کر سلام کرو صحیح طریقے سے۔''

اب بیچارے نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔

''اکڑ کس بات کی ہے تمہارے اندر؟'' اب اس انداز پر بھی ڈانٹ پڑی۔

''کیا نام ہے؟ نام بتاؤ کس جنگل سے آئے ہو؟'' کسی نے سوال داغا۔

''میرا نام اعجاز احمد ہے اور کانپور سے آیا ہوں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''اچھا تو کانپور جنگل ہے!'' نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

اب انہیں سینئرس میں سے کوئی صاحب کانپور کے بیٹھے ہیں تو سب ان سے مخاطب ہوئے۔

''یہ آپ کے کانپور کو جنگل بتارہا ہے!''

''تو ہمارے سینئر صاحب بھی جنگل سے آئے ہیں؟'' اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔

''اچھا یہ بتاؤ تمہیں کیا کرنا آتا ہے۔'' اب کانپور والے سینئر نے سوال کیا۔

''جی؟'' وہ سٹپٹایا۔

''جیسے شاعری یا مرغا بننا۔ ان میں سے کیا آتا ہے؟''

بعض سمجھدار تیز لڑکے ہوتے تھے جو فوراً ہی مرغا بنتے ہوئے کہتے تھے۔'' جی بس مرغا بننا آتا ہے۔''

دیہی علاقوں سے آئے لڑکوں کا تلفظ درست کرانے کے لیے ان سے یہ ضرور کہلایا جاتا تھا۔

''گھوڑا سڑک پر پڑک پڑک دوڑ رہا ہے۔''

اب وہ بیچارہ لاکھ کوشش کرے۔ پانچ میں سے تین ڑ ضرور کھا جاتا تھا۔

''گھوڑا سرک......''

''ایں ٹھیک سے بولو۔'' کسی نے ڈانٹا۔

''گھوڑا سڑک پر پرک۔''

''پھر غلطی کی؟''

اسی طرح تمام انٹروڈکشن کی راتیں سینئرز کے لیے سامان تفریح اور جونیئرز کے لیے میدان حشر کا سماں ہوتی تھیں۔ زیادہ تر طلباء مختلف دیہی علاقوں سے آتے تھے لہٰذا انتہائی

ضروری تھا کہ یہ طلباء اپنی پرانی شخصیت، علاقائی اثرات کو بھول کر ایک نئے انداز کی زندگی جینا سیکھیں۔ پرانے مینرز اور طور طریقے بھول کر علی گڑھ کی روایات اور تہذیب کو اپنانے کی کوشش کریں۔ اس طرح سے ایک نئے انداز کا پائیدار رشتہ جنم لیتا تھا۔ جس کی بنیاد تھی سرسید احمد کے وژن، مقاصد اور مسلم قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ۔ اور ان سے مل کر بنتا تھا جدید ذہن کا حامل ایک صحیح معنوں میں علیگ اور سب مل کر بناتے تھے علیگ برادری۔ جو ایک خوش مزاج اور پرجوش نوجوانوں کا ہوش مند اور جدید نظریات کا حامل گروپ کہلایا جاسکتا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! اب تو اٹھیے بارہ بج گئے۔ لیجئے یہ چائے پی لیجئے۔'' بیئرر شمس الدین کی آواز سے اقبال کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

''ایں بارہ بج گئے؟'' اقبال نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے پہلے کیوں نہیں اٹھایا۔''

''صاحب کئی بار آواز دے کر چلا گیا۔ میں نے کہا آج سینئر صاحب کو سونے دو۔ رات شاید دیر سے آئے تھے۔'' شمس الدین نے اسٹول سے کتابیں اٹھا کر چائے کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

تقریباً ہر پانچ کمروں پر ایک بیئرر مقرر تھا۔ جس کی ڈیوٹی ڈائننگ ہال میں کھانا لگانا، بستر بنانا اور چھوٹے موٹے کام کرنا تھا۔ شمس الدین کافی سینئر بیئرر تھا اور ہاسٹل کے ماحول کو بخوبی سمجھتا تھا۔ لہٰذا صرف کچھ سینئرز کے ہی ذاتی کام کرتا تھا۔ باقی جونیئر لڑکوں کو ٹرخانا اسے خوب آتا تھا۔ ان کے ذاتی کاموں پر بالکل دھیان نہیں دیتا تھا۔ چند سینئر طلباء کو خوش کر کے اپنا وقت آرام سے کاٹ رہا تھا۔

''آپ کو یونین کی گھنٹی کی آوز بھی نہیں آرہی شاید؟'' اس کے کہنے پر اقبال نے غور سے سنا تو یونین کی گھنٹی کی آواز ایک تسلسل سے آرہی تھی۔ جنرل باڈی کی میٹنگ کی اطلاع عام نوٹس کے علاوہ جو ہر کمرے میں ڈالے جاتے تھے، عین میٹنگ شروع ہونے کے وقت یونین بلڈنگ کی چھت پر لگی بڑی سی گھنٹی کو بجا کر بھی کی جاتی تھی۔ جسے ایک چپراسی زور

زور سے بجا تا تھا۔ آس پاس کے ہالوں میں یہ آواز دور دور تک سنی جاتی تھی۔
''کیوں کیا ہوا ہے یہ اچانک میٹنگ؟ کوئی نوٹس بھی نہیں تھا؟'' اقبال نے شمس الدین سے پوچھا۔
''ابھی باہر کچھ لڑکے جنرل اسٹرائک کی بات کر رہے تھے۔'' اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گیا۔
''وجہ کیا ہے، کچھ پتہ ہے؟'' اقبال نے جلدی جلدی چائے پیتے ہوئے پوچھا۔
''خدا کرے کہ غلط ہو۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ اسپتال میں دو زخمی لڑکے دم توڑ گئے ہیں۔'' اقبال نے جلدی تولیہ لے کر باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''تم ناشتہ لگاؤ میں ابھی آیا۔''

2.3 جوشِ شبِ غم

چند منٹوں بعد ہی اقبال، نونین ہال کی طرف جا رہا تھا۔ یونین ہال ایک وسیع لان کے درمیان میں ایک آرٹسٹک دو منزلہ برٹش طرز حکومت کی بلند عمارت تھی۔ درمیانی ہال کے چاروں طرف اونچی اونچی محرابوں کے کھلے دروازوں کے برآمدے تھے۔ ہال کے اندر ایک منزل کی اونچائی پر چاروں طرف ایک اندرونی بالکنی تھی۔ تقریباً پانچ سو طلباء کے لیے بیٹھنے کے لیے ایک اونچے پلیٹ فارم کے سامنے گدے دار بنچیں پڑی ہوئی تھیں۔ ہر پیچھے والی بنچ آگے والی سے ذرا سی اونچی تھی۔ پلیٹ فارم پر ایک پرانے طرز کی بھاری میز کے پیچھے تین اونچی پشتوں والی نقشیں کرسیاں رکھی تھیں جن میں بیچ کی صدارتی کرسی ذرا بڑی تھی۔ اس میز کے دونوں طرف بنچیں پڑی ہوئی تھیں جن پر تقریباً پچیس لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ میز کے داہنی طرف پلیٹ فارم کے ایک کونے پر اسپیکرز کے لیے ڈائس تھا۔ میٹنگ ہال سے متصل کئی چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ جس میں ایک لائبریری، ریڈنگ روم، بلیئرڈ روم اور صدر و سکریٹری اور کابینہ کے بیٹھنے کے لیے کمرے تھے۔
اقبال وہاں پہنچا تو ہال تقریباً بھر چکا تھا۔ چاروں طرف طلباء گروپس بنائے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اس کے کئی دوست پلیٹ فارم پر بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے اقبال بھی وہیں

جا کر بیٹھ گیا۔ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ صدر،سکریٹری اور کابینہ کے تمام ممبران پلیٹ فارم کے پیچھے چھوٹے دروازے سے اندر آ گئے۔طلباء کھڑے ہوکر تالیاں بجانے لگے۔صدر وغیرہ کے بیٹھتے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔صدر نے میٹنگ کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے،ایک اسٹوڈنٹ کو تلاوت کلام پاک کے لیے ڈائس پر بلایا۔تلاوت کے خاتمے پر صدر نے مختصر الفاظ میں میٹنگ کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا:

''دوستو اور عزیز ساتھیو!''

''میں آپ لوگوں کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ اتنے قلیل وقت میں جبکہ صحیح طرح سے میٹنگ کا نوٹس بھی نہیں بٹ سکا آپ لوگ اتنی بڑی تعداد میں تشریف لائے۔ہمیں امید ہے اور قوی امید ہے کہ جس مقصد کے لیے آپ لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں اس کو حاصل کرنے کے لیے آپ کی پوری سپورٹ ہمیں ملتی رہے گی۔

''دوستو!''

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے حالیہ فسادات کے سلسلے میں یہ میٹنگ بلائی گئی ہے۔پوری دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔آئے دن کے فسادات نے مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔انہیں کا نقصان ہوتا ہے وہی مارے جاتے ہیں انہیں کی دکانیں و مکانات جلائے جاتے ہیں اور وہی گرفتار بھی کیے جاتے ہیں۔مرادآباد کے حالیہ فساد کی خبریں تمام اخبارات میں تفصیل سے شائع ہو رہی ہیں۔پی اے سی اور ضلع حکام نے مسلمانوں پر مظالم کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ہم دوستوں سے مشورہ کر ہی رہے تھے کہ ہمیں کیا اقدامات کرنا چاہئیں کہ خود ہماری یونیورسٹی کے اسپتال میں دو نوجوانوں نے دم توڑ دیا جو مرادآباد سے یہاں زخمی حالت میں لائے گئے تھے۔ہمارے بہت سے ساتھیوں نے انہیں بچانے کے لیے اپنا خون بھی دیا تھا۔ان مظالم کی ہم کس سے شکایت کریں۔

وہی قاتل وہی حاکم وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں قتل کا دعویٰ کس پر

''شمع سرسید کے پروانو!''
کیا یہ خون رائیگاں جانے دیا جائے گا؟''
اس پر تمام لڑکے کھڑے ہو گئے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے۔
''نہیں کبھی نہیں۔''
''کبھی نہیں کبھی نہیں۔''

کچھ دیر تک یہ ہنگامہ رہا۔ صدر کی بار بار اپیل کے بعد ایک ایک کر کے طلباء اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عزیز دوستو!

''میں نے زیادہ وقت لے لیا۔ اب میں سکریٹری صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کریں۔''

یونین کا آنریری سکریٹری ایک دبلا پتلا ایم بی بی ایس فائنل ایئر کا طالب علم تھا۔ گندمی رنگ ستواں ناک اور گول چہرے پر جناح کیپ اس پر خوب جچتی تھی۔ صدر کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ مائک پر آیا۔ قرآن کی ایک آیت پڑھی اور خطاب شروع کیا۔

''صدر محترم اور عزیز دوستو!''

یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم یہاں فسادات میں شہید ہونے والے معصوم انسانوں کا غم منانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ علی گڑھ نے ملت کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت ہر موقع پر دیا ہے۔ اس لیے کہ یہ ادارہ سرسید احمد کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے ملت نے ہی اپنی بقا کے لیے بنایا تھا لیکن غم منانا ہماری فطرت نہیں ہے۔ ہم وہ ہاتھ توڑنے کا حوصلہ رکھتے ہیں جو ہمارے ناموس کی طرف بڑھے گا ہم اس ظالم کو مٹا دیں گے جو ہمیں کمزور جان کر ہم پر وار کرے گا۔

ساتھیو!

پورا ملک فسادات کی زد میں ہے۔ ہزار ہا فسادات ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ حکومت خاموش تماشائی ہے بلکہ حکومت کی در پردہ حمایت کے

بغیر کوئی فساد دوسرے دن بھی جاری نہیں رہ سکتا۔ہم ایوان حکومت میں بیٹھے شاہان وقت کو بتادینا چاہتے ہیں کہ:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے
خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا

گلشن سید کے دیوانو!

''اٹھو اور ظالم کا ہاتھ مروڑ دو۔کہہ دو کہ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک کہ ظالم پی اے سے کو ختم نہیں کیا جائے گا۔اس کے ناپاک وجود سے ملک کو پاک کرا کے ہی دم لیا جائے گا۔عید گاہ پر گولی چلانے والوں کو سزا دلا کر ہی اب ہم آرام کریں گے۔''

اس پر کئی لڑکے جوش میں آ کر ڈائس پر آ گئے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے''ظالم پی اے سے ختم کرو ختم کرو'' تمام لڑکے کھڑے ہو گئے اور دیر تک نعرے بازی ہوتی رہی۔

ہنگامہ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ہال کے باہر بھی ہزار ہا لڑکے جمع ہو گئے تھے جو نعرے لگاتے ہوئے اندر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔اتنے میں صدر نے برابر بیٹھے ہوئے نائب صدر سے کہا کہ وہ باہر بھی لاؤڈ اسپیکر لگانے کا انتظام کریں تا کہ باہر کے لوگ وہیں سن سکیں۔نائب صدر نے کئی چپراسی دوڑائے اور آفس میں رکھے اسپیکرز باہر دیواروں پر لگوانے کا انتظام ہونے لگا۔کافی دیر تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔اسپیکرز جب باہر بھی لگ گئے تو صدر نے مائک سنبھالا اور اپیل کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ خاموش ہو جائیں۔نعرے بازی بند کر دیں۔پلیز نعرے بند کریں۔''

آہستہ آہستہ نعرے بند ہوئے اور طلباء اپنی سیٹوں پر بیٹھنے لگے۔اب باہر بھی آواز پہنچ رہی تھی لہٰذا وہاں کھڑے طلباء لانز میں گھاس اور پیڑوں کے نیچے پڑی ہوئی بنچوں پر بیٹھ گئے۔صدر نے کہنا جاری رکھا۔

''دوستو!''

''ہنگامہ ہم بھی کریں گے مگر یہاں نہیں۔آپ لوگ سکون سے رہیں۔ابھی بہت سے مقرر آئیں گے اور اپنی اپنی بات کہیں گے۔میں آنے والے مقررین سے کہوں گا کہ مختصر

تقاریر کریں اور لائحہ عمل یا ایکشن پلان بھی پیش کریں تا کہ جنرل باڈی سے پاس کرایا جا سکے۔ اب میں درخواست کروں گا جناب انور صاحب سے کہ وہ آئیں اور اپنی بات کہیں۔ انور صاحب پلیز۔''

انور ایم اے (فائنل) انگلش کر رہا تھا۔ لمبا چھریرا اور ہلکے سانولے رنگ کا پر جوش نوجوان تھا۔ صدارتی الیکشن صرف چند سو ووٹوں سے ہار گیا تھا لہٰذا ایک طرح سے وہ اپوزیشن لیڈر تھا اور اس کی حمایت کا مطلب تھا کہ طلباء برادری اس مسئلہ پر پوری طرح اتفاق رکھتی ہے۔ کالی شیروانی چوڑی دار پائجامہ اور گرے کلر کی جناح کیپ میں وہ خوب جمتا تھا۔ یونیورسٹی کے عمدہ مقررین میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ ڈائس پر آیا اور مائک سنبھال لیا۔ طلباء تالیاں بجانے لگے۔

''محترم صدر صاحب، سکریٹری صاحب اور عزیز ساتھیو!''

''سکریٹری صاحب نے غم منانے کی بات کہی اور صدر صاحب سکون سے رہنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں ان دونوں حضرات کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہم یہاں نہ غم منانے آئے ہیں اور نہ سکون سے بیٹھنے کے لیے۔''

اس کے سپورٹرز نے کھڑے ہو کر زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

''دوستو!''

''گھر میں آگ لگی ہو تو سکون نہیں ہو سکتا اور غم منانا بزدلوں کا شیوہ ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

حکومت کو ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ وہ طلباء علی گڑھ کی تاریخ پر نظر ڈالیں اور ہوش کے ناخن لیں۔

ہم نے جس دور کو چاہا ہے بدل ڈالا ہے
ہم جس دور کو چاہیں گے بدل ڈالیں گے

وقت بدلا ضرور ہے لیکن اتنا بھی نہیں بدلا کہ مخالفین ہمیں اپنے پیروں تلے روند

ڈالیں۔ یہ رسی جلی ضرور ہے مگراس میں ابھی گرمی باقی ہے اوراس کے بل بھی ابھی نہیں گئے ہیں۔سرسیداحمد کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہم ہرطرح کی مخالفت، ہر بادسموم، پی اے سی کی گولی اورتمام فاشسٹ طاقتوں کو ہرادینے کی ہمت رکھتے ہیں۔طاقت کے زعم میں حکمرانان وقت فرعون بن گئے ہیں لیکن ہرفرعون کے لیےایک موسیٰ بھی پیداہوتا ہے۔

اندراور باہرتمام طلباء کھڑے ہوگئے اورزورزور سےنعرے بازی ہونے لگی۔کچھ دیر خاموش رہنے کے بعدانور نے پھرکہنا شروع کیا۔

دوستو!

یہ کام مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔اس لڑائی میں بہت ہوش مندی اورثابت قدمی کی ضرورت ہے۔میری تجویز ہے کہ ہماری طلباء یونین پارلیمنٹ اور پی ایم ہاؤس پر دھرنا دےاور یہ دھرنا اس وقت تک جاری رہے جب تک کہ ظالم پی اے سی کے خاتمہ کا اعلان حکومت نہ کردے اوراس کی جگہ اینٹی رائٹ فورس نہ قائم ہوجائے جس میں کم ازکم ۵۰ فیصد مسلمان ہوں۔ ہمارے جان ومال وآبروکی اب یہی ضمانت ہے۔''

اس تجویز پرتمام طلباء جوش میں کھڑے ہوگئے اور انور زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔کافی دیر یہ ہنگامہ جاری رہا۔

''صدرصاحب یاد کیجئے اس وقت کو کہ جب ہمارے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ اکثریت ہمارے حقوق کا تحفظ نہ کرسکے گی۔وقت نے ان کو صحیح ثابت کردیا میں سمجھتا ہوں کہ پھروہی وقت ہمارے سامنے ہے۔

''عزیز ساتھیو!''

''فسادات ہوئے تین ہفتے سے زیادہ گزرگئے لیکن ہماری یونین نے ابھی تک کچھ نہیں کیا جب تک کہ دوزخمی خود ہمارے ہسپتال میں شہید نہ ہوگئے۔تمام سیاسی جماعتیں اوراخبارات حکمراں جماعت کوذمہ دارقراردے رہے ہیں۔اچھے اچھے مضامین شائع کیے جارہے ہیں۔لیکن ہمیں کسی کے کاندھے پررکھ کر بندوق نہیں چلانی ہے۔میٹھے میٹھے

بیانات آپ کو دھوکا دینے کے لیے دیے جا رہے ہیں جیسا کہ ہر فساد کے بعد مگر مچھ کے آنسو بہانے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہمیں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونا ہے۔

اپنے پیدا کیے سورج کی دعائیں مانگو
بھیک مانگی ہوئی کرنوں کا بھروسہ کیا ہے

صرف اپاہج اور بزدل ہی دوسروں کے کاندھوں پر سر رکھ کر روتے ہیں۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور اپنے بزرگوں کے دکھائے ہوئے راستے کو نہیں بھولے ہیں۔

''دوستو!

ایسے وقت میں جب کہ فاشزم کے خلاف ہر کوئی آواز اٹھا رہا ہے ایک اخبار ایسا بھی ہے جس نے ایک نئی تھیوری پیش کی ہے کہ ان فسادات میں فارن ہینڈ ملوث ہے۔ یعنی یہ کہ خود مسلمانوں نے ملک دشمن پڑوسیوں سے مل کر یہ ہنگامے کرائے ہیں۔ یہ ہے وہ ٹائمس آف انڈیا جس کے ایڈیٹر نے یہ تھیوری پیش کی ہے (اس نے ایک ہاتھ میں اخبار دکھاتے ہوئے کہا) شرم آنی چاہیے گری لال جین جیسے دانشوروں کو۔ اس پر تمام طلبا کھڑے ہو گئے اور شیم شیم کے نعرے لگانے لگے۔ اتنے میں انور نے دوسرے ہاتھ سے لائٹر نکالا اور اخبار میں آگ لگا دی۔ تمام ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ کافی دیر تک ہنگامہ جاری رہا۔

''محترم صدر صاحب!

آخر میں ایک بار پھر میں اپنی تجویز، دہرانا چاہتا ہوں کہ ہماری یونین پارلیمنٹ اور پی ایم ہاؤس پر دھرنا دے اور دھرنا اس وقت تک جاری رہے جب تک حکومت پی اے سی کے خاتمہ کا اعلان کر کے اینٹی رائٹ فورس کے قیام کا اعلان نہ کر دے۔ خدا حافظ۔''

اس کی تقریر کے خاتمہ پر کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ ایک کے بعد ایک اسپیکرز کے ان تجاویز کی حمایت کی۔ پورا ماحول جوش اور قربانی کے جذبے سے سرشار ہو گیا۔ تمام مقررین کی تقاریر کے بعد آخر میں خود صدر بصیر احمد نے ایک مختصر تقریر کی۔

''دوستو اور ساتھیو!

میں دیکھ رہا ہوں کہ آج کا دن ہماری یونین کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم دن ہے۔ جو

رزولوشن ہم پاس کرنے جارہے ہیں اور جو ایکشن پلان طے کیا جائے گا وہ یقینی طور سے مسلم اقلیت کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ثابت ہوگا۔ ماضی میں بھی ہماری یونین نے ملت کے حقوق کی حفاظت کے لیے اہم اقدامات کیے۔ انگریز حکمرانوں اور اکثریتی فرقہ پرستی دونوں سے ہم ہی لوگ لڑتے رہے ہیں۔ ہمارا ماضی ہمیں آواز دے رہا ہے اور ہم سب ہر قربانی کے لیے تیار ہیں۔ دوستو! یہ راستہ آسان نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے بھی کئی لوگ اس راستے پر کام آجائیں۔ لیکن آگے بڑھا ہوا قدم کسی بھی حال میں پیچھے نہیں ہٹے گا۔ میں چاہوں گا کہ باقاعدہ کوئی رزولوشن جنرل باڈی کے سامنے پیش ہو اور اس کو ڈبیٹ کے بعد منظور کیا جائے۔ رزولوشن میں ایکشن پلان بھی ہونا چاہیے۔''

یہ کہہ کر پریسیڈنٹ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تمام طلباء انور اور اس کی دوستوں کی طرف دیکھنے لگے جو وہیں رزولوشن ڈرافٹ کرنے میں مشغول تھے۔ چند منٹ بعد ہی انور نے ہاتھ اٹھا کر صدر سے بولنے کی اجازت طلب کی۔

''آیئے تشریف لائیں۔'' صدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

انور نے ڈائس پر آکر رزولوشن پڑھنا شروع کیا۔

''صدر محترم، دوستو اور عزیز ساتھیو!

آپ حضرات کی اجازت سے میں یہ رزولوشن پیش کرتا ہوں:

''اے ایم یو اسٹوڈنٹس یونین جنرل باڈی کی یہ میٹنگ حکومت ہند کی فسادات روکنے میں ناکامی اور قاتل پی اے سی کے مجرمین کی گرفتاری نہ کرنے کی پرزور مذمت کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ:

(۱) صوبائی حکومت کو فسادات پر قابو نہ پانے کی جرم میں برخاست کیا جائے۔

(۲) پی اے سی کو ختم کر کے اس کی جگہ اینٹی رائٹ فورس قائم کی جائے جس میں 50% مسلم نمائندگی ہو۔

(۳) پی اے سی کے جوان جو عیدگاہ میں ڈیوٹی پر تھے ان کو گرفتار کر کے قتل کے جرم میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت مقدمات قائم کیے جائیں۔

جلد بازی میں یہ رزولوشن ڈرافٹ کیا گیا ہے۔امید ہے کہ آپ سب کے مشوروں سے یہ جامع اور قابل عمل ہو جائے گا۔شکریہ دوستو۔''

یہ کہہ کر انور نے رزولوشن صدر صاحب کو پیش کیا اور ڈائس پر سے اتر آیا۔اس کے بعد ایک کے بعد ایک مقرر نے مطالبات کی منظوری کی حمایت میں تقاریر کیں اور ایکشن پلان نہ ہونے کی شکایت بھی کی۔کافی دیر تک تجاویز آتی رہیں اور سکریٹری صاحب ان کو نوٹ کرتے گئے۔آخر کئی گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد ایک ایکشن پلان بھی تیار ہو گیا جو طلباء کی پرجوش تالیوں کے درمیان پاس ہوا۔

(۱) یونیورسٹی میں تین دن تک ہڑتال رہے گی۔آخری دن جامع مسجد سے ایک جلوس نکلے گا اور ڈی ایم کی کوٹھی تک جائے گا اور ایک میمورنڈم صدر جمہوریہ کے نام ڈی ایم کو دیا جائے گا۔

(۲) سینئر طلباء کا ایک ڈیلی گیشن ہوم منسٹر سے ملے گا اور میمورنڈم کی ایک کاپی پیش کرے گا۔

(۳) طلباء یونین پرائم منسٹر کے گھر کے سامنے غیر معینہ دھرنا اور بھوک ہڑتال کرے گی۔

(۴) طلباء یونین کابینہ کے مشورہ سے سینئر طلباء کی ایک ایکشن کمیٹی نامزد کریں گے جو تمام پروگرام چلائے گی۔

(۵) پروگرام کے اخراجات کے لیے طلباء ۲۵ روپیہ فی کس چندہ دیں گے جو ہال ڈیوز میں کٹوایا جائے گا۔

رزولوشن کے پاس ہوتے ہی صدر نے میٹنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔

اسی دن شام تک صدر یونین نے ایکشن کمیٹی بنا دی جس میں کابینہ کے ممبران کے علاوہ دس سینئر طلباء بھی شامل تھے۔رزولوشن اور ایکشن پلان کا نوٹس تمام کمروں میں بٹوا دیا گیا۔ایکشن پلان کی خبر ہوسٹل میں قیام پذیر پندرہ ہزار طلباء میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ہر محفل میں آنے والے واقعات اور یونین کی قائدانہ صلاحیتوں پر گرما

گرم بحثیں ہونے لگیں۔زیادہ تر لڑکے اسٹرائک اورایکشن پلان کی حمایت میں تھے۔ بہت سے طلباء یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ شاید انتظامیہ یونیورسٹی بند کرنے کا اعلان کردے اور یونین وانتظامیہ میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے۔دودن گزرتے گزرتے معلوم ہوا کہ یونیورسٹی کی زیادہ تر ایسوسی ایشنز خاص طور سے ٹیچراز ایسوسی ایشن،نان ٹیچنگ،ٹیکنیکل اورفورتھ ایمپلائز یونین وغیرہ نے طلباء یونین کی حمایت میں رزولوشنز پاس کردیے۔لہٰذا وائس چانسلر کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ سب سے ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرتے۔اس کے علاوہ وائس چانسلر پروفیسر خسروطبعیتاً ڈیموکریٹ واقع ہوئے تھے اورحیدرآباد کی اس فیملی سے ان کا تعلق تھا جو پولیس ایکشن کا شکار ہوئی تھی۔لہٰذا شمالی ہند کے اکثر مسلم حکام اور دانشوروں کے برخلاف، ہروقت حکومت وقت کے دباؤ میں کام نہیں کرتے تھے،جنھوں نے نہ صرف یہ تسلیم کرلیا تھا کہ وہ ہاری ہوئی قوم کے فرد ہیں بلکہ بارہی تسلیم کرلی تھی اور مختلف سیاسی پارٹیوں کی خوشامد میں ہی اپنی عزت وبقا سمجھتے تھے۔وائس چانسلراوردوسری تمام انجمنوں کا رویہ سامنے آتے ہی طلباء یونین کے پروگرام میں نیا ولولہ پیدا ہوگیا۔اب طلباء کو یونیورسٹی کے اندرلڑائی نہیں لڑنی تھی اورنہ کسی رسٹی کیشن یا معطّلی کا ڈرتھا۔لہٰذا سینئر طلباء اورلیڈران پوری طرح سے کھل کرسامنے آگئے۔ وائس چانسلر نے یونین کی اس ڈیمانڈ کوبھی منظورکرلیا کہ ہال ڈیوز میں 25 روپیہ فی کس کٹتے رہیں گے اور یونیورسٹی ایڈوانس پیسہ یونین کومہیا کرائے گی۔اب کیا تھا پورے جوش وخروش کے ساتھ ایکشن کمیٹی کی میٹنگس ہونے لگیں۔کمیٹی ممبران کے علاوہ بہت سے طلباء اکثر یونین میں موجود رہتے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ ان کی کوشش سے ضرور مجرموں کوسزا ملے گی اورملکی نظام میں کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرورآئے گی۔

دوسرے ہی دن صدر یونین کی سرپرستی میں سینئر طلباء کا ایک وفد ہوم منسٹر کومیمورنڈم دینے کے لیے دہلی روانہ ہوا۔کچھ اولڈ بوائز کی مدد سے پریس کلب میں پریس کانفرنس کا بھی انتظام کرلیا گیا تھا۔صبح گیارہ بجے تک یہ لوگ دہلی پہنچ گئے۔ وہاں پتہ چلا کہ منسٹر صاحب کہیں دورے پر گئے ہوئے ہیں لہٰذا میمورنڈم ان کے آفس میں ریسیو کرادیا گیا۔

اس کے بعد تقریباً تین بجے پریس کلب میں کانفرنس شروع ہوئی۔ یونیورسٹی طلباء کی اسٹرائک کی خبریں بھی تمام اخبارات نے جلی حروف میں شائع کی تھیں۔ ان دنوں فسادات اخبارات کا موضوع بنے ہوئے تھے اور تقریباً پورے شمالی ہند میں ہندو مسلم تعلقات انتہائی کشیدہ تھے۔ یو پی حکومت کے گرائے جانے کی ڈیمانڈ بھی کی جا رہی تھی۔ ایسے حالات میں مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کا اس موضوع پر پریس کانفرنس بلانا تھا کہ تقریباً تمام ہی اخبارات کے نمائندے وہاں آ موجود ہوئے۔

''صدر صاحب! آپ نے جو پریس ریلیز یہاں جاری کی ہے اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ اس مسئلہ کو بالکل فرقہ وارانہ رنگ میں دیکھ رہے ہیں۔'' ٹائمس آف انڈیا کے نمائندے نے پوچھا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مگر اس کا کوئی اور رنگ بھی ہے؟'' بصیر احمد نے الٹا سوال کیا۔

''یہ ایک قومی مسئلہ اور ایک لا اینڈ آرڈر کا معاملہ ہے۔ یہ صرف فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''حکومت بھی اس مسئلہ کو ہندو مسلم مسئلہ مانتی ہے۔ پریس، انتظامیہ اور پی اے سی جو سب سے اہم پارٹی اس قتل عام میں ہے، یہ سب بھی اس کو فرقہ وارانہ مسئلہ مانتے ہیں۔ تمام دنیا کا پریس اور ہیومن رائٹس آرگنائزیشنز پی اے سی کے رول کی مذمت کر رہے ہیں۔ تمام سیکولر جماعتیں پی اے سی کے خلاف ایکشن لینے کا مطالبہ کر چکی ہیں۔ اس کے باوجود تین ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ آخر کیوں؟ گرفتار ہونے والے بھی زیادہ تر مسلم ہیں۔ مارے بھی وہی گئے اور مقدمات بھی ان پر قائم کیے جا رہے ہیں۔ ہماری تو تھانے والے ایف آر بھی درج نہیں کرتے۔ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ فرقہ وارانہ مسئلہ نہیں ہے تو کیا ہے؟''

''صدر صاحب! کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ کسی بھی اسٹوڈنٹس یونین کا مقصد ہوتا ہے کہ وہ طلباء کے مسائل حل کرے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے کام کرے تا کہ طلباء

آرام اورسکون سے تعلیم حاصل کرسکیں۔اس کے برخلاف آپ لوگ مسلم یونیورسٹی کی سیاسی پوزیشن کا فائدہ اٹھارہے ہیں تاکہ آپ اخباروں کی سرخیوں میں آسکیں۔''اس نے ایک حملہ اور کیا۔

''یہ سوال تو آپ کوحکومت سے کرنا چاہیے کہ وہ ملک میں ایسے حالات پیدا کرے کہ طلباء میں بے چینی اوراضطراب نہ پیدا ہو۔ہمیں کیوں مجبور کیا جارہا ہے کہ ہم سڑکوں پر آئیں؟ آپ اگر یہ کہیں کہ یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہےتو یہ غلط ہے۔ہم صرف انصاف کا مطالبہ کررہے ہیں ہمارے بہت سے طلباء کے رشتہ دار مارے گئے،کئی نوجوان ہمارے ہوسپٹل میں دم توڑ گئے اورسب سے بڑھ کر یہ ہماری قوم کا مسئلہ ہے۔آپ تو اکثریتی حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اقلیتوں کا دکھ اور ان کا خوف آپ سمجھ ہی نہیں سکتے۔'' صدر نے بھی جوابی حملہ جاری رکھتے ہوئے کہا'' آپ کے ایڈیٹر نے تو خودمسلمانوں کو ہی قتل عام کا ذمہ دارقراردیا ہے۔اب تک حکومت کوعیدگاہ پرتعینات پی اے سی کے جوانوں کوگرفتار کرلینا چاہیے تھا۔بجائے اس کے حکومت کہہ رہی ہے کہ ہم پولیس کا مارل نہیں گرنے دیں گے اورآج تک وہی پی اے سی مرادآباد کی سڑکوں پر موجود ہے۔''

''آپ نے لکھا ہے کہ پرائم منسٹر ہاؤس کے سامنے طلباء دھرنا دیں گے؟''انڈین ایکسپریس کے نمائندے نے سوال کیا۔

''ہاں یہ ہمارا پروگرام ہے بہت جلد ہم غیرمعینہ مدت کا دھرنا پی ایم ہاؤس پر دیں گے۔اس کے علاوہ جوبھی جمہوری طریقہ ہوگا وہ اختیار کریں گے۔یہ پروگرام جاری رہے گا اس وقت تک جب تک حکومت پی اے سی ختم کرکے اینٹی رائٹ فورس نہ قائم کردے۔''صدر نے زوردے کرکہا۔

''اس پورے پروگرام کوکون فائننس کررہا ہے؟''ایک ہندی اخبار کے نمائندے نے سوال کیا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ہماری یونین اورطلباء برادری کنٹری بیوٹ کررہی ہے۔حکومت کے پاس آئی بی ہے،سی آئی ڈی ہے۔حکومت کو پتہ ہے کہ کون فائننس کررہا ہے۔''

تقریباً دو گھنٹہ تک پریس کانفرنس چلتی رہی۔ چائے کا دور بھی چلتا رہا اور ہنسی مذاق بھی ہوتا رہا۔ آخر میں دوستانہ ماحول میں سب لوگ ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر رخصت ہوئے۔ اسی رات گیارہ بجے تک یہ لوگ دہلی سے علی گڑھ لوٹ آئے اور دیر رات گئے تک یونین ہال میں مشورے کرتے رہے۔

رات دیر سے سونے اور سفر کی تھکن کی وجہ سے اقبال شام تین بجے تک سوتا رہا۔ چار بجے جب وہ ایکشن کمیٹی کے آفس پہنچا تو باقی سب لوگ وہاں موجود اخبارات دیکھنے میں مصروف تھے۔

''یہ ہمیشہ لیٹ لطیف ہی رہیں گے۔'' کلیم نے اقبال کو دیکھتے ہی کہا۔

''میں ابھی تک سویا ہوا ہوں۔'' اقبال نے یہ کہتے ہوئے کلیم کے سامنے رکھا ہوا کپ اٹھالیا۔

''ارے یہ میرا کپ ہے آدھا پی چکا ہوں۔'' کلیم نے ہاتھ بڑھا کر کپ چھیننا چاہا اتنی دیر میں اقبال ایک لمبی سپ لے چکا تھا۔

''تم اور پی لینا مجھے زبردست چہاس لگی ہے۔ وہ کمبخت شمس الدین آج نہ جانے کہاں چلا گیا۔'' اقبال نے یہ کہتے ہوئے خالی کپ کلیم کے سامنے رکھ دیا۔

''مجھے پوری امید ہے کہ ابھی تک اس نے پیپرز بھی نہیں دیکھے ہیں۔'' امین نے اخبار سے نظریں اٹھا کر کہا۔

''ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ پریس کانفرنس کی خبریں تو ضرور چھپی ہوں گی۔'' اس نے میز پر پڑے ہوئے اخبارات دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ہر اخبار میں جلی حروف میں کانفرنس کی پوری روداد شائع ہوئی تھی۔

''کیا بات ہے۔ یہ ہوئی نا بات! پورے ملک میں ہماری آواز پہنچ گئی۔ اور اس تصویر کے لیے تو صدر صاحب سے ٹریٹ لی جائے گی۔'' اس نے ایکسپریس اٹھا کر کہا، جس میں صدر کی تصویر کانفرنس ایڈریس کرتے ہوئے شائع ہوئی تھی۔

''صبح سے اس تصویر پر تبصرہ ہو رہا ہے۔ وہ آئیں تو حضرت نہ جانے کہاں ہیں۔''

امین نے شکوہ کیا۔

''کہاں ہیں کیا مطلب؟ کیا صبح سے نظر نہیں آئے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''کل جلوس نکلنا ہے۔ ڈی ایم کو میمورنڈم دینا ہے اور صدر کا پتہ ہی نہیں ہے۔ تین گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔'' کلیم نے بتایا۔

''کیا کمرے پر بھی نہیں ہیں؟'' اقبال نے پوچھا۔

''وہاں بھی نہیں ہیں۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''ارے یارو تم لوگ بھی بالکل گدھے ہو۔ بھئی وہ صبیحہ سے مبارکباد لینے گئے ہوں گے۔'' اقبال نے اندازہ لگایا۔

''کون صبیحہ؟'' ضمیر نے پوچھا۔

''ان کی سنو! بھائی نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہیں۔'' اقبال نے خبر لی۔

''نہیں پتا تو بتاؤ نا۔'' ضمیر نے زور دے کر پوچھا۔

''کہو کہ غافل ہوں۔'' اقبال بولا۔

''اچھا کیا مار کھاؤ گے۔'' ضمیر نے مارنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

''ارے یارو، ویمنس کالج اسٹوڈنٹس یونین کی صدر ہے صبیحہ خان۔ عبداللہ ہال میں رہتی ہیں۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''پارٹنر! وہ تو ایسی انگریزی میں تقریر کرتی ہے کہ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتی۔'' ضمیر نے یاد کرتے ہوئے کہا۔

''کہہ تو ایسے رہے ہو جیسے ہمارے صدر کی اردو تقریر سمجھ لیتے ہو۔'' امین نے چوٹ کی وہ تلملا کر رہ گیا۔

''تمہاری ہی کیا بات ہے، خود ہمارے صدر کی سمجھ میں اس کی تقریر نہیں آتی۔'' کلیم نے کہا۔

''نہ وہ اردو جانیں نہ یہ انگریزی۔'' اقبال نے بات آگے بڑھائی۔

''زبان یار من ترکی والا معاملہ ہے۔'' امین نے مصرع جڑا۔

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔تقریر کون کمبخت سنتا ہے دیکھنے سے فرصت ملے تب نا۔''
کلیم نے وضاحت کی۔''نہ ان کو سننے سے غرض ہے نہ ان کو سنانے سے۔''
''ٹکٹکی باندھے تو میں نے بھی دیکھا ہے۔''اقبال نے تصدیق کی۔
''ٹکٹکی تو بہت سے لوگ باندھے ہوئے تھے لیکن معاملہ یہ ہوا کہ دیوانہ اس نے کر دیا ایک بار دیکھ کر، ہم کچھ بھی کر سکے نہ لگا تار دیکھ کر۔''کلیم نے ضمیر پر چوٹ کی۔
اتنے میں صدر بصیر احمد سلام کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔
''تین گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔کمرے پر بھی نہیں تھے ہر جگہ تلاش کروالیا سوائے اس جگہ کے۔''کلیم نے احتجاج کیا۔
''سوائے اس جگہ کے، سے کیا مطلب ہے؟''بصیر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''جس جگہ سے آپ آرہے ہیں۔''اقبال نے پیوند لگا دیا۔
''تو جہاں سے ہم آرہے ہیں وہاں بھی تلاش کروالیا ہوتا۔''بصیر نے بھی مزے سے بات آگے بڑھائی۔
''وہاں جاتے ہوئے تو فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔''کلیم نے آہ سرد کھینچی۔
''بھئی یہ ٹھنڈی سانسیں کیوں بھری جارہی ہیں۔''بصیر نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔''آخر یہ ماجرا کیا ہے؟''
''اچھا بالکل ٹھیک بتائیے گا۔کیا آپ وہاں سے نہیں آرہے جہاں اس تصویر کو لیے لوگ یہ گاتے پھر رہے ہیں۔تیری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت۔ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں۔''امین نے اخبار بصیر کے سامنے کرتے ہرئے پوچھا۔
''اور یہ بھی کہ جو میں ہوتی راجہ بن کی کوئیلیا''کلیم نے بات بڑھائی۔
''یہ علی گڑھ کبھی نہیں بدل سکتا۔بس ذرا کسی سے بات کی اور یاروں کے مزے آئے۔''بصیر نے کچھ سمجھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی۔
''تو آپ سمجھ گئے۔''شمیر نے پوچھا۔
''جی سمجھ گیا۔''

''یعنی چور کی داڑھی میں تنکا۔''

''پورا تو نہیں بس تھوڑا تھوڑا۔''

''اچھا تو آپ صدر نسواں سے ملنے نہیں گئے تھے؟''شمیر نے سیدھا نشانہ سادھا۔

''اوہ تو صبیحہ کی بات ہورہی ہے۔ صبح صبح اس کا فون تو آیا تھا۔ پریس کانفرنس کی مبارکباد دے رہی تھی۔''بصیر نے کچھ یاد کر کے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''اور آپ نے قبول کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگائی یعنی مبارکباد۔'' شمیر نے شرارت سے پوچھا۔

''بدمعاشی سے باز نہیں آؤ گے۔''اچھا اور کیا کرتا قبول نہ کرتا؟''بصیر کی مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''تو آپ کو منظور ہے کہ آپ نے قبول کیا۔''

''تم لوگوں سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ ہاں میں نے مبارکباد قبول کی تھی بس۔'' بصیر نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔

''اور آپ نے سوچا اچھا موقع ہے اس کے ہال میں ہی چائے پی جائے۔''اب کلیم نے گھیرا۔

''مجرم کو اعتراف ہے۔''

''اور آپ وہیں سے آرہے ہیں؟''امین بھی پیچھے رہنے والا نہ تھا۔

''کہاں پارٹنر! جس وقت جانے کے لیے نکلا اس وقت وی سی آفس سے فون آگیا اور وائس چانسلر صاحب کسی ضروری مشورے کے لیے ملنا چاہ رہے ہیں۔ پروکٹر وغیرہ کو بھی بلا رکھا ہے۔بس میں وہیں چلا گیا۔تین گھنٹے میں میٹنگ ختم ہوئی۔''

''کیا اینٹی کلائمکس ہوا ہے۔''امین نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''تو ہائی پاور میٹنگ میں کیا ڈسکس ہوا؟''اقبال نے سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

''کل کے احتجاجی جلوس اور میمورنڈم کے بارے میں اب باقاعدہ میٹنگ شروع کی جائے۔''صدر نے ماحول بدلتے ہوئے سنجیدہ ہو کر کہنا شروع کیا۔''ہماری پریس کانفرنس

اور کل کے پروگرام کو لے کر انتظامیہ کافی متفکر ہے۔ وائس چانسلر اور پروکٹر بار بار یہی کہہ رہے تھے کہ کوئی بھی گڑبڑ نہ ہو۔ ورنہ ساری ذمہ داری اسٹوڈنٹس یونین پر عائد ہوگی۔ ڈسٹرکٹ ایڈمنسٹریشن بھی پوری طرح ہر ایمرجنسی سے نپٹنے کے لیے تیار ہے۔ ہم لوگ پروکٹر کی گاڑی میں جلوس کے راستہ سے ہوکر آئے ہیں۔ یونیورسٹی کے باہر آر اے ایف لگا دی گئی ہے۔ ہر جگہ پولیس چوکس کھڑی ہے۔ مشکوک گاڑیوں کو روکا جا رہا ہے۔ ہمارے جلوس میں دس ہزار سے زائد ہی طلباء ہوں گے۔ کچھ ٹیچرز بھی ہوں گے۔ پروکٹر نے تقریباً سو ٹیچرز کو پروپروکٹر بنایا ہے جو طلباء کو کنٹرول کرنے کے لیے کل ڈیوٹی پر رہیں گے۔ آج ہی شام کو ایک میٹنگ یونین کی ان کے ساتھ ہونی ہے۔ غرض یہ کہ اب ہمیں کل کیا انتظام کرنے ہیں اسکا فیصلہ ابھی ہو جائے۔'' بصیر نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''پہلی بات یہ کہ ہوم منسٹر کو میمورنڈم تو دیا جا چکا ہے۔ کل کا میمورنڈ صدر جمہوریہ کو ایڈریس کیا جائے'' اقبال نے مشورہ دیا۔

''یہ بالکل صحیح رہے گا۔ میمورنڈم تو تیار ہے ہی اسی کو صدر جمہوریہ کو ایڈریس کیا جائے۔'' کلیم نے تائید کی۔

''ہاں صاحبان! ایک بات تو طے ہوئی۔'' بصیر نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ایک نوٹس آپ کی جانب سے طلباء کے نام جاری ہوا اور اس میں تمام ضروری باتیں شامل ہوں کہ کس وقت کہاں سے جلوس شروع ہوگا اور کہاں ختم ہوگا۔ طلباء کو دو لائنیں بنا کر پورے ڈسپلن سے چلنا ہے۔ سب لوگ کالی پٹیاں باندھے ہوئے ہوں۔ ہر ہال کے طلبہ اپنے اپنے بینرز تیار کرلیں۔ مائک وغیرہ کا انتظام تو یونین آفس کرے گا۔'' امین نے بہت سی باتیں ایک ساتھ کہہ دیں۔

''نوٹس ایکشن کمیٹی کی جانب سے ہو۔ اس میں صدر اور سکریٹری صاحبان کا نام تو ہوگا ہی۔'' کلیم نے مشورہ دیا۔

''چلئے ایسا ہے کہ آپ دونوں، امین اور کلیم دوسرے کمرے میں بیٹھ کر یہ نوٹس تیار کرلیں۔ ہم لوگ دوسری تفصیلات طے کر رہے ہیں۔'' بصیر نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے

کہا۔ وہ دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

''میرا خیال ہے کہ ایک پوسٹر بھی ایکشن کمیٹی کی جانب سے آج رات میں لگ جانا چاہیے۔ صرف چند لائنیں اینٹی رائٹ فورس کی حمایت میں اور فسادات کے خلاف جلوس کی اطلاع کے ساتھ۔'' اقبال نے رائے پیش کی۔

''بہت اچھا خیال ہے۔ یہ کام آپ ابھی یہیں بیٹھے بیٹھے کرلیں۔ آفس کھلا ہے ابھی دو گھنٹے میں پوسٹر چھپ کر آ جائیں گے۔ میرے خیال سے سو پوسٹر کافی ہوں گے۔ صرف کیمپس میں ہی تو لگانے ہیں۔'' بصیر نے تائید چاہی اور اقبال کاغذ اور قلم لے کر پوسٹر لکھنے بیٹھ گیا۔

''اب اور کیا کرنا باقی ہے۔'' بصیر نے پھر سب کو مخاطب کیا۔

''ابھی تو بہت کچھ باقی ہے۔ جیسے پریس کو اطلاع کرنا۔ ایک نوٹس تمام پریس رپورٹرز کو بھی جلوس کی اطلاع کا جانا چاہیے۔ حالانکہ آج کے اخبارات میں جلوس نکالے جانے کی خبر بھی ہے۔ لیکن اگر الگ الگ نوٹس رپورٹرز کو جائے گا تو وہ زیادہ اچھی طرح نیوز کور کریں گے۔'' ضمیر نے مشورہ دیا۔

''بہت اچھا مشورہ ہے۔'' بصیر نے یہ کہتے ہوئے دروازے پر کھڑے چپراسی کو اشارے سے پاس بلایا۔

''ایسا ہے کہ آفس سکریٹری کو فوراً یہاں بلالاؤ۔''

چند منٹ میں ہی آفس سکریٹری پیڈ قلم لیے وہاں حاضر ہوگیا۔ بصیر نے پریس رپورٹرز کے لیے نوٹس ڈکٹیٹ کیا اور فوراً ہی ایک کاپی نکال کرلانے کے لیے کہا۔

''اور کیا ہونا چاہیے؟'' بصیر نے شمیر سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

''میرے خیال سے آپ سینئر طلباء اور ہال پوسٹ ہولڈرز کی ایک میٹنگ کل صبح دس بجے بلالیں۔ جو طلباء اس میٹنگ میں آئیں انہیں کی ڈسپلن کمیٹی بنادیں اور جلوس کو کنٹرول کرنے کی ذمہ داری سونپ دیں۔'' شمیر نے مشورہ دیا۔

''کل صبح تو بہت دیر ہوجائے گی آج ہی رات آٹھ بجے یونین ہال میں میٹنگ نہ کرلیں۔'' بصیر نے پوچھا۔

''دیکھ لیجیے ابھی چار بجے ہیں کم از کم تین گھنٹے نوٹس بٹنے میں لگیں گے۔'' شمیر نے یاد دلایا۔

''پھر رات میں دس بجے بلاتے ہیں۔ صبح ٹھیک نہیں رہے گا۔'' بصیر نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آنریری سکریٹری صاحب! اس کی ذمہ داری آپ کی رہے گی۔ آفس میں سینئر طلباء اور پوسٹ ہولڈرز کی فہرست ہے۔''

''بہتر ہے میں ابھی یہ کام کراتا ہوں۔'' آنریری سکریٹری نے ایک کابینہ ممبر کو اپنے ساتھ اٹھاتے ہوئے جواب دیا اور اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ایک نہایت ضروری بات رہ گئی۔'' ایک کابینہ ممبر نے صدر کو مخاطب کیا۔

''ہاں کیا بات رہ گئی۔'' بصیر نے پوچھا۔

''میرے خیال سے ایک لیٹر یونین کی طرف سے ڈی ایم کو بھی جانا چاہیے کہ کل ہم ایک بجے آپ کو صدر جمہوریہ کے نام میمورنڈم دینا چاہتے ہیں۔''

''بات میں دم ہے۔ حالانکہ اخباروں سے پتہ چل ہی گیا ہوگا۔ لیکن ہمارا اخلاقی فریضہ ہے کہ ایسا خط لکھا جائے۔'' اقبال نے تائید کی۔

''بالکل لکھا جائے گا۔ آفس سکریٹری سے کہو کہ اس مضمون کا ایک خط ڈی ایم کے نام ٹائپ کر کے لائے۔'' صدر نے اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''ایسا کرو کہ تم وہیں جاؤ اور اپنے سامنے وہ خط بھی ٹائپ کرالاؤ۔'' وہ فوراً ہی اٹھ کر کام پر چلا گیا۔

اتنے میں امین اور کلیم بھی نوٹس تیار کر کے لے آئے اور اقبال نے بھی پوسٹر تیار کر کے صدر کے حوالے کر دیا۔

''اتنی دیر ہو گئی چائے شائے۔ کچھ تو پلوائیے صدر صاحب۔'' شمیر نے انگڑائی لیتے ہوئے شکایت کی۔ ''سر میں درد ہونے لگا۔''

''ہاں یار وہ تو بھول ہی گئے۔'' صدر نے فوراً ایک چپراسی کو بلایا اور آفس سکریٹری کو چائے اور نمک پارے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں

سارے نوٹس تیار ہو گئے۔ پوسٹر چھپوانے ایک چپراسی کو ایک ممبر کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ ڈسپلن کمیٹی کے نوٹس بھی تیار ہو گئے۔طلباء کے نام خط کے اسٹنسل پر صدر کے دستخط ہو گئے اور ڈی ایم کو خط روانہ کر دیا گیا۔ چائے وغیرہ کا بھی انتظام ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میٹنگ کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ زیادہ تر لوگ اٹھ کر چلے گئے اب صرف خاص دوست ہی رہ گئے تھے۔اتنے میں سعید احمد جو کئی سال سے باٹنی میں ریسرچ کر رہا تھا، پوری یونیورسٹی اسے سعید گنجے کے نام سے جانتی تھی،انتہائی خوش مزاج اور کھنچائی کرنے میں ماہر تھا، کمرے میں داخل ہوااور آتے ہی بغیر سلام دعا اپنے مخصوص اسٹائل میں ہنستے ہوئے شروع ہو گیا۔

''سالے باس تم یہاں بیٹھے ہو۔اوہو! صدر صاحب اور بڑے بڑے سینئر بھی موجود ہیں۔'' باری باری سب سے ہاتھ ملا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہتا رہا۔''اسلام اور مسلمان نہ جانے کیا کیا ڈسکس ہو رہا ہوگا۔قوم کو اوپر اٹھانا ہے۔ یار ہے تو ضروری کام میں تو بڑا متاثر ہوں۔سب لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہماری یونین سر سید کے مشن کو آگے بڑھا رہی ہے۔''اس نے کلیم کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔اس کے اسٹائل سے یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ مذاق اڑا رہا ہے یا سیریس ہے۔

''باس! کچھ پتہ ہے کہ آج دوپہر ہاسٹل میں کیا ہوا؟'' سعید اور شمیر ہاسٹل فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ قریبی دوست بھی تھے۔''اب اتنی بڑی یونیورسٹی ہے ہر طرح کے لڑکے ہوسٹلوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ مسلمان اور اسلام کھیل رہے ہیں۔سب لڑکے تو اتنے سمجھدار نہیں ہوتے وہ کوئی اور کھیل کھیلیں گے۔ ہر طرح کی دنیا ہے کوئی کیا کر سکتا ہے یار۔'' وہ ہنس ہنس کر بیان کرتا رہا۔

''اب بتاؤ بھی کہ ہوا کیا؟ تم تو ہم سے کھیلنا بند کرو۔''امین نے تنگ آ کر کہا۔

''توبہ توبہ! میں آپ لوگوں سے کھیلوں گا۔ پارٹنر دل توڑنے والی بات مت کرو۔''اس نے کان پکڑ کر مسکراتے ہوئے امین سے کہا۔

'سیدھی طرح بتاؤ نا کہ کیا ہوا؟''بصیر نے سعید کو ٹوکا۔

''صدر صاحب آپ بھی اقبال کی باتوں میں آ گئے۔بھئی اس طرح تو ہمارا یونیورسٹی

میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔'' اس نے مایوسی کے انداز میں سر پکڑ لیا۔

''اب ڈنڈا اٹھاؤں یا بکو گے بھی۔'' شمیر نے اس کو ڈانٹتے ہوئے دھمکی دی۔

''باس میں تو چاہ رہا تھا کہ تمہاری عزت بچی رہے مگر اب بتانا ہی پڑے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔

''کیا سوچنے لگے۔'' کلیم نے ٹوکا۔ اب پوری محفل سعید کے ہاتھوں کا کھلونا بن چکی تھی۔ اس فن میں اسے مہارت حاصل تھی۔ جہاں جاتا تھا بس وہی بولتا تھا اور سب اسے سنتے تھے۔ ہنستے تھے ناراض ہوتے تھے مگر سب کی توجہ کا مرکز بس وہی رہتا تھا۔ اگر کوئی سچا واقعہ نہیں ہوتا تھا تو کہانی گڑھ لینا بھی اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں۔ اس دن سے جب اس گورے سے لڑکے نے ڈپلوا نجینئرنگ میں داخلہ لیا یا اس دن سے جب باس نے پہلی بار اس کا انٹروڈکشن لیا۔'' اس کے لہجے سے شرارت پوری طرح عیاں تھی۔ ''آج دوپہر باس! وہ مسجد کے برابر والے کمرے میں ہی تو رہتا ہے۔ اب ایسے مت بنو کہ تمہیں کچھ یاد ہی نہیں۔'' سعید نے شمیر کو مخاطب کر کے ہنستے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''استاد اور ان کے کئی دوست، ظفر وغیرہ، ظہر کی نماز کے بس تھوڑی دیر بعد ہی اس کے کمرے میں گھس گئے۔ استاد نے کہا کہ پارٹنر میں ان کو لایا ہوں یہ تمہیں انگریزی پڑھائیں گے۔ استاد کو تو تم جانتے ہی ہو کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور بدمعاشی سے بھی کام نکالنا جانتے ہیں۔ اماں کیسے کیسے لوگ ہیں یار توبہ توبہ۔'' اس نے کلیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر پھر زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد پھر شروع ہو گیا۔ ''استاد اور ظفر وغیرہ کا تو رسٹی کیشن بالکل طے سمجھو۔ مجھے لگ رہا ہے کہ اب کی بار فار لائف رسٹیکیٹ ہوں گے یہ لوگ۔ استاد سے اندازے کی غلطی ہو گئی۔ سمجھ رہے تھے کہ آسانی سے مان جائے گا۔ لڑکے نے زوردار بچاؤ کیا۔ برابر کے کمرے والوں نے آوازیں سنیں اور پراکٹر کو اطلاع دے دی۔ فوراً ہی پراکٹر اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اور استاد وغیرہ وہیں پکڑے گئے۔ اب ان کو پروکٹر آفس لے جایا گیا۔ لڑکے نے پورا بیان لکھوا دیا ہے۔ میں بس وہیں سے آ رہا ہوں۔''

''اچھی اسٹوری بنائی ہے۔'' اس کے خاموش ہوتے ہی امین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''کلیم کے سر کی قسم جو ذرا بھی جھوٹ ہو۔'' سعید نے فوراً ہی کلیم کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''میرے نہیں اپنے سر کی قسم کھاؤ۔'' کلیم نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

''میرا بھی کوئی سر ہے یار! بھوسا بھرا ہے اس میں۔ کسی اچھے سر کی قسم کھانی چاہیے۔ اچھا باس تمہارے سر کی قسم۔'' سعید نے شمری کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''ابھی پراکٹر سے پوچھ لیتے ہیں۔'' بصیر نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ سب لوگ صدر کے ساتھ اٹھ گئے۔ پراکٹر آفس فون کر کے معلوم کیا گیا۔ خبر بالکل صحیح نکلی۔ چند منٹ میں ہی یہ محفل برخاست ہوگئی۔

2.4 تحفۂ آزاد

دوسری صبح اقبال دیر تک بستر میں لیٹا کافی دیر تک کل والے واقعے کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب پورا شمالی ہندوستان فسادات کی آگ میں جھلس رہا ہو کچھ طلباء ہوسٹل میں ایسے بھی تھے جو اس طرح کا جرم کر سکتے تھے۔ پچھلے تین مہینوں میں کتنی ہی جگہ فسادات ہوئے تھے۔ بنارس، الہ آباد اور بھاگلپور وغیرہ میں بڑے بڑے دنگے بھڑک اٹھے تھے۔ چھوٹے موٹے فسادات تو آئے دن کا قصہ تھے۔ خود علی گڑھ شہر میں بہت زیادہ ٹینشن تھا اور کسی بھی معمولی حادثے سے فساد بھڑک سکتا تھا۔ طلباء کا شہر جانا تقریباً بند تھا۔ پراکٹر آفس کی طرف سے سخت ہدایات تھیں کہ طلباء کسی بھی حالت میں شہر کا رخ نہ کریں۔ شام ہوتے ہی پولیس اور پی اے سی شہر کے علاوہ سول لائنس میں بھی گشت لگانا شروع کر دیتی تھی۔ لہٰذا سر شام ہی طلباء اپنے ہوسٹلوں میں واپس آجاتے تھے حتیٰ کہ شمشاد مارکیٹ اور دودھ پور وغیرہ میں بھی رات آٹھ بجے کے بعد جانا بند تھا۔ ٹرینوں سے سفر کرنا بھی ایک خطرناک کام تھا۔ اگر طلباء سفر کرتے بھی تھے تو اپنی شناخت حتی الامکان چھپاتے تھے۔ شیروانی اور ٹوپی میں تو سفر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ بلکہ اردو الفاظ کی جگہ ہندی

شبدوں کا پریوگ کرنے میں ہی عافیت تھی۔

۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے ساتھ ہی حکومت مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار ختم کر دینا چاہتی تھی یعنی یہ کہ عام مسلمان اور طلباء اپنے ماضی کو بھول جائیں اور یہ بھی بھول جائیں کہ یہ ادارہ انھوں نے اپنی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لیے قائم کیا تھا۔ تعلیمی ترقی کا لازمی نتیجہ سیاسی طاقت کے اضافہ میں ہوتا ہے کانگریس حکومت اس کا مظاہرہ دیکھ ہی چکی تھی۔ لہٰذا اس وقت کے ایجوکیشن منسٹر مولانا آزد نے ۱۹۵۲ء کے ترمی ایکٹ کے ذریعہ علی گڑھ تحریک کو ایک ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ اس طرح کی ترمیمی ایکٹ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں دی گئی یہ ضروری تعریف نکال دی گئی کہ یہ ادارہ مسلمانوں نے اپنی تعلیمی وثقافتی ترقی کے لیے قائم کیا ہے۔ دوسری اہم تبدیلی یہ کی کہ اب یونیورسٹی کورٹ سپریم گورننگ باڈی نہیں رہا اور اس میں حکومت کے نامزد ممبران کی تعداد میں اضافے کے ساتھ یہ شرط بھی نکال دی گئی کہ وہ مسلمان ہوں۔ یعنی اب غیر مسلم بھی کورٹ کے ممبر ہو سکتے تھے تیسری اہم تبدیلی یہ کی کہ اب مسلم طلباء کے لیے بھی دینیات کی تعلیم ضروری مضمون نہیں رہا۔ ۱۹۶۵ء میں وائس چانسلر کی پٹائی کے بعد آرڈی نینس لاگو کر دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے عزیز پٹا کیس میں یہ فیصلہ سنایا کہ مسلم یونیورسٹی اقلیتی ادارہ نہیں ہے اس لیے کہ اب ۱۹۲۰ء کا نہیں بلکہ ۱۹۵۲ء ایکٹ یونیورسٹی پر نافذ ہے جس کے توسط سے مولانا آزاد نے یونیورسٹی کا اقلیتی تشخص مٹا کر اس کو پوری طرح نیشنلائز کر لیا تھا۔ ۱۹۷۲ء کے بلیک ایکٹ کے ذریعے پارلیمنٹ نے یونیورسٹی کی رہی سہی مسلم نشانیوں کو بھی مٹا کر رکھ دیا۔ اسی وقت سے ملت، طلبا اور اساتذہ نے ایک زبردست اقلیتی کردار بحالی تحریک کی بنیاد ڈالی۔

اس ایکٹ کے نفاذ کے بعد مسلم ایکشن کمیٹی قائم ہوئی، جو ملت کے لیڈران اور اولڈ بوائز پر مشتمل ایک ذمہ دار کمیٹی تھی، حکومت اس تحریک کو سختی سے کچل دینا چاہتی تھی۔ آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ سب سے بڑا اجتماعی سیاسی اقدام تھا جس میں نہ صرف طلبا و اساتذہ بلکہ پوری ملت نے پورے جوش سے شرکت کی۔ اقبال کو وہ دن بہت اچھی طرح

یاد تھا جب ایکشن کمیٹی کی کال پر کسی جمعہ کو یام احتجاج منایا گیا۔اس زمانے میں سنبھل کے چند ہی طلباء یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔مگر پوری ملت اس طرح اس تحریک میں شریک تھی کہ جس دن یوم سیاہ منایا گیا چندلڑکوں کے پیچھے ہزاروں مسلمان کالی پٹیاں باندھے بینرز ہاتھ میں لیے جامع مسجد سے جلوس نکالتے ہوئے کوتوالی تک پہنچے۔کوتوالی کے سامنے سیکڑوں پولیس والوں کی موجودگی میں زوردار جلسہ ہوا۔جس میں تمام اپوزیشن پارٹیوں کے مسلم لیڈران نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح وہ دن ایک یادگار بن گیا۔شمالی ہند کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے شہر میں اس دن جلوس نکالے گئے اور جلسے منعقد ہوئے۔بنارس اور مرادآباد وغیرہ میں اس دن فسادات بھی پھوٹ پڑے۔یہ تحریک اتنی بڑھی کہ مسلمانوں کی ہر محفل اور جلسہ میں اقلیتی کردار کی بحالی کے لیے رزولوشن پاس کئے جانا ایک ضروری سا کام ہو گیا۔کتنے کنونشن اور کانفرنسیں ہوئیں کہ شمار مشکل ہے۔اوراسی تحریک کی بدولت مسلم مجلس مشاورت، مسلم لیگ، مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا اور ازسرنو شمالی ہند میں مسلم سیاست کے سوکھے پیڑ میں کلیاں پھوٹنی شروع ہوئیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس نے بھی آخرکار اپنے مینی فیسٹو میں اقلیتی کردار کی بحالی کا وعدہ کیا۔

اقبال کو چند سال پہلے کا دردناک واقعہ یاد آیا جب طلباء کو دہلی جاتے ہوئے دادری اسٹیشن پر باجماعت لاٹھیوں اورڈنڈوں سے پیٹا گیا تھا۔اسٹوڈنٹس یونین کی کال پر طلباء جامع مسجد سے پارلیمنٹ ہاؤس تک مارچ نکالنے کے لیے مختلف راستوں سے دہلی میں جمع ہو رہے تھے۔بچوں کے گھر دریا گنج میں ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ڈمانسٹریشن والے دن صبح کی پسنجر ٹرین سے بہت سے طلبا ایک ساتھ دہلی جارہے تھے کہ دادری اسٹیشن پر ایک شور مچا کہ علی گڑھ کے لڑکے ہندوؤں کو گالیاں دے رہے ہیں۔بس پھر کیا تھا نہ صرف اسٹیشن پر موجود لوگوں نے بلکہ آس پاس کی آبادیوں کے لوگوں نے ٹرین سے طلباء کو گھسیٹ گھسیٹ کر پلیٹ فارم پر جی بھر کے پٹائی کی۔نہ جانے کتنے طلباء نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف کھیتوں میں بھاگ کر پناہ لی۔کچھ باتھ روم میں گھس گئے اور کچھ زورزور سے رام رام کہنے لگے کہ ان کو پہچانا نہ جاسکے۔کافی دیر تک یہ اندوہناک ہنگامہ چلتا رہا پھر

پولیس اور کچھ سمجھ دار لوگوں کی مداخلت سے اس بربریت پر قابو پایا گیا اور لڑکے کسی طرح بسوں، ٹرکوں میں بیٹھ کر علی گڑھ یا دہلی پہنچے۔ دہلی میں جب یہ خبر پہنچی تو نہ صرف طلباء بلکہ وہاں کے مسلمانوں نے بھی اس دن دریا گنج سے پارلیمنٹ ہاؤس تک مارچ کیا۔ اس دن کچھ زیادہ ہی جوش وخروش تھا لہٰذا پارلیمنٹ ہاؤس پر پولیس سے کافی کھینچا تانی ہوئی جب کسی طرح پولیس قابو نہ پاسکی تو پولیس نے بسیں لگا دیں اور کہا گیا کہ جن کو گرفتاری دینی ہے ان میں بیٹھ جائیں۔ سیکڑوں طلباء اس دن بسوں میں بیٹھ گئے۔ دوسرے دن پھر اسی طرح گرفتاریاں دی گئیں۔ لیکن اس بار پولیس نے طلباء کو عدالت میں پیش کر دیا اور پھر تقریباً ۲۵ دن تک ان کی ضمانت نہ ہوسکی لیکن دہلی کے مسلمانوں نے طلباء کی جیل میں شاندار ضیافت کی۔ روز بریانی، قورمہ اور گرم نان کباب سے تہاڑ جیل میں بھی پکنک کا مزا آ گیا۔ اخبارات میں شور مچ گیا۔ اپوزیشن پارٹیز کے لیڈران نے جیل میں طلباء سے ملنا ضروری سمجھا اور اس طرح جیل جانے سے اقلیتی کردار تحریک کو زور دار پروپیگنڈا ملا۔

اقبال اپنے خیالات میں گم تھا کہ امین، شمیر اور کلیم نے بیک روم میں آ کر اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''پوری دنیا جاگ رہی ہے اور یہ ہیں کہ ابھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔'' کہتے ہوئے کلیم نے اس کے سر سے چادر کھینچ لی۔

''حد ہے یار۔ پتہ ہے گیارہ بج گئے۔'' شمیر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔

''پتہ ہی نہیں چلا۔ دماغ کسی ٹرین کی طرح دوڑ رہا تھا۔'' اقبال نے آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔

''اب دماغ نہیں ٹانگیں دوڑانے کی ضرورت ہے۔'' کلیم نے ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

''ایس ایس نارتھ کے تمام لان لڑکوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ صدر صاحب کی تقریر جاری ہے جلوس بس نکلنے ہی والا ہے۔ اور آپ ہیں کہ مسلمانوں کی قسمت کی طرح سو رہے ہیں۔'' امین نے سائڈ ٹیبل سے اخبار اٹھاتے ہوئے اطلاع دی۔

''بس میں ابھی آیا۔'' اقبال نے ٹاول اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد وہ لوگ بھی ہجوم میں شامل لائن بنائے ہوئے ایس ایس ہال سے نکل کر شمشاد مارکیٹ کی طرف جا رہے تھے۔کئی ہزار طلباء جلوس میں شریک تھے۔اس دن ٹیچرس ایسوسی ایشن کے علاوہ تمام دیگر انجمنوں نے بھی یونیورسٹی میں اسٹرائک کردی تھی۔ سیکڑوں پلے کارڈز اور بینرز لے ہوئے طلباء شمشاد مارکیٹ، پرانی چنگی اور یونیورسٹی کی مین روڈ سے ہوتے ہوئے فیض گیٹ تک پہنچ گئے۔راستہ بھر زور زور سے نعرے بازی ہوتی رہی۔صدر یونین دیگر عہدیداران کے ساتھ ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے جلوس کے آگے چل رہے تھے۔فیض گیٹ پر سیکڑوں آر اے ایف کے جوان مستعد کھڑے تھے۔ آس پاس پولیس کی جیپیں اور ایمبولینس وغیرہ بھی کھڑی تھیں۔ایڈمنسٹریشن نے ہر طرح کے ایمرجنسی انتظامات کرر کھے تھے۔فیض گیٹ پر ہی پولیس نے جلوس کو روک دیا۔صدر یونین کو بتایا گیا کہ شہر میں تناؤ کی وجہ سے جلوس کو اس جگہ سے آگے نہیں بڑھنے دیا جائے گا اور ڈی ایم یہیں آکر میمورنڈم لیں گے۔طلباء کا جوش تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا وہ چاہتے تھے کہ جلوس ڈی ایم کی رہائش تاہ تک جائے جو وہاں سے صرف ایک کلومیٹر دور تھی۔طلباء نے پولیس اور پی اے سی کے خلاف بھی نعرے بازی شروع کردی۔والینٹیئرز بھی طلباء کو کنٹرول کرنے میں ناکام ہوگئے۔صدر نے اس وقت ایک اہم فیصلہ لیا اور ایک رکشہ پر کھڑے ہوکر نعرے لگانے والے طلباء سے مائک لے کر ایک زوردار جذباتی تقریر کرڈالی۔تقریر میں جابجا اقبال کے اشعار اور سرسید کی تعلیمات اور یونیورسٹی روایات کے حوالے سے طلباء کی تعریف کرتے ہوئے ان کو کنٹرول کیا۔پولس اور ایڈمنسٹریشن کی مجبوریوں کا حوالہ دیتے ہوئے وہیں پر میمورنڈم دینے کی بات ماننے کا اعلان کردیا۔اب مجمع کنٹرول میں آچکا تھا۔سکریٹری یونین نے بھی ایک جاندار تقریر کی۔اس کے بعد مختلف انجمنوں کے نمائندوں نے بھی اپنی اپنی انجمنوں کی جانب سے پی اے سی توڑنے اور اینٹی رائٹ فورس بنائے جانے کی حمایت میں تقاریر کیں۔کچھ دیر کے بعد اے ڈی ایم نے ڈی ایم کی جگہ صدر جمہوریہ کے نام میمورنڈم وصول کیا اور حکومت کو روانہ کرنے کا وعدہ کیا۔صدر یونین نے پھر سے مائک سنبھالا اور جلوس کے خاتمے کا اعلان کردیا۔

☆

''دوستو! ہمارے دو پروگرام نہایت کامیابی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ پہلا دہلی میں پریس کانفرنس اوردوسرا یونیورسٹی میں طلباء کا جلوس۔'' دوسرے دن صدر یونین نے ایکشن کمیٹی کی میٹنگ کی صدارت کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔''جنرل باڈی کی ہدایت کے مطابق اب ہمیں تیسرا سب سے مشکل کام انجام دیا ہےاوروہ ہے پارلیمنٹ تک مارچ کے بعد پرائم منسٹر ہاؤس پر غیر معینہ دھرنا۔دونوں کام انتہائی مشکل اور سنگین نوعیت کے ہیں۔اسی لیے آج یہ میٹنگ بلائی گئی ہے تاکہ ہر پہلو پرغور کرلیں اور تمام مشکلات طے کر لی جائیں۔'' یہ کہہ کروہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔اس وقت ایکشن کمیٹی کے ۲۵ ممبران یونین ہال کے سائڈ روم میں موجود تھے۔موجودہ ایجیٹیشن کے انتہائی سنگین مرحلے کی تکمیل کے سلسلے میں یہ میٹنگ بلائی گئی تھی۔ایک گول میز کے چاروں طرف ۱۵ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں ان کے پیچھے کرسیوں کی ایک قطار اور تھی۔میٹنگ میں موجود سب کو احساس تھا کہ اب جس پروگرام کو کرنے جا رہے ہیں وہ کوئی آسان کام نہ تھا۔لہٰذا ہر کوئی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔آخر آنریری سکریٹری نے صدر کی اجازت سے کہنا شروع کیا۔

''عزیز ساتھیو!

''جیسا کہ آپ جانتے ہیں جنرل باڈی نے ہمارے کاندھوں پر ایک اہم ذمہ داری ڈالی ہے کہ پی اے سی کے خاتمے اور اینٹی رائٹ فورس بنوانے کے لیے ہم لوگ پارلیمنٹ ہاؤس تک مارچ کریں۔وزیراعظم کی رہائش گاہ پر ایک طویل مدتی دھرنا دیں۔ہمیں عوام اور حکومت کو یہ بتانا ہے کہ فسادات کے بھیانک سلسلہ کو اب بند کرا کے ہی دم لیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت سی تنظیموں نے حکومت کو عرض داشتیں دی ہیں۔پارلیمنٹ میں کئی بار گرما گرم بحثیں ہو چکی ہیں۔تقریباً تمام ہی اخبارات فسادات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال رہے ہیں۔لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ کسی بھی پلیٹ فارم سے پی اے سی کے خلاف ایک حرف بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ہمیں حکومت کو یہ بتانا ہے کہ یوپی سے شروعات کی جائے۔پی اے سی کو توڑا جائے۔ایک اینٹی رائٹ فورس

بنائی جائے۔اس کے بعد ہندوستان کے ہرصوبہ میں اس طرح کی فورس بنائی جائے جس میں کم ازکم پچاس فیصد مسلمانوں کو رکھا جائے۔حالانکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اقدامات بھی ناکافی ہوں گے فسادات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو روکنے کے لیے۔کس کس شہر کا نام لیا جائے۔سورت میں عورتوں کو ننگا کر کے سڑکوں پر دوڑا کر ان کے ویڈیو بنائے گئے۔نیلی آسام میں ہزاروں بے گناہ بچوں اور عورتوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔تمام دنیا کے اخبارات اور میگزینز میں یہ تصاویر پر شائع ہو چکی ہیں۔پوری دنیا ان مظالم کو جانتی ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ ایک بار پھر پارلیمنٹ،حکومت اور وزیراعظم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی جائے۔اس سلسلے میں ہمارا یہ دھرنا کامیاب ہونا انتہائی ضروری ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ ایک کمیٹی بنا کر ہمیں آج ہی دہلی روانہ کر دینی چاہیے جو وہاں انتظامات کر سکے۔''
یہ کہہ کر سکریٹری نے اپنی بات ختم کی۔

''صدر صاحب!ضمیر چونکہ دہلی میں بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں،اولڈ بوائز سے بھی خاصی دوستی ہے اور پریس میں کئی لوگ ان کے دوست ہیں۔لہٰذا یہ ایک ٹیم بنا لیں اور دہلی میں ہی رہیں۔وہاں کے انتظامات اس کمیٹی کے سپرد کر دئے جائیں۔'' امین نے اپنی رائے پیش کی۔

''میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب رہے گا۔کیوں ضمیر کیا خیال ہے؟'' صدر نے پوچھا۔

''بندہ تو ہر خدمت کے لیے تیار ہے مگر سب سے پہلے تو بتایا جائے کہ یہ مارچ اور دھرنا کب ہوگا؟ تاریخ تو طے نہیں کی گئی ابھی تک۔'' اس نے یاد دلایا۔

''ہاں صاحبان! تو پہلے تاریخ طے کر لی جائے۔'' صدر نے مشورہ طلب کیا۔

'میری رائے ہے کہ اگلے جمعہ کو مارچ کا پروگرام رکھا جائے۔آج سنیچر ہے چھ دن بیچ میں انتظامات کے لیے مل جائیں گے۔'' کلیم نے مشورہ دیا۔

''جمعہ کی نماز وہیں پارلیمنٹ ہاؤس مسجد میں پڑھی جائے۔بہت سے ایم پی اور اہم افراد وہاں نماز پڑھتے ہیں۔نماز کے بعد وہاں جلسہ کیا جائے اور جلسہ کے بعد پی ایم

ہاؤس پر دھرنا لگا دیا جائے۔'' اقبال نے اپنی رائے رکھی۔

''میرے خیال سے یہ مناسب رہے گا۔'' سکریٹری نے تائید کی۔

''تو بس ٹھیک ہے۔ طے یہ ہوا کہ اگلے جمعہ کو پانچ بجے صبح نکلا جائے تاکہ آٹھ بجے تک سب لوگ دہلی پہنچ جائیں اور دس بجے دریا گنج سے پارلیمنٹ تک مارچ کیا جائے۔ تین گھنٹے میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ ڈیڑھ بجے وہاں نماز ہوتی ہے۔ نماز کے بعد وہیں جلسہ کرلیا جائے اور اس کے بعد پی ایم ہاؤس پر دھرنا دیا جائے۔'' صدر نے پروگرام بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا خیال ہے مناسب پروگرام ہے؟''

سب نے ہاتھ اٹھا کر تائید کی اور سکریٹری نے قلم اٹھا کر لکھنا شروع کر دیا۔

''مگر پھر ایک ضروری بات رہ گئی کہ کتنے طلباء کو یہاں سے لے جانا ہے وہ کیسے جائیں گے اور ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟'' شمیر نے یاد دلایا۔

''اسٹوڈنٹس کو یہاں سے لے جانا ایک مسئلہ ہے۔ حالات خراب ہیں۔ فرقہ وارانہ ٹینشن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔'' کلیم نے تشویش ظاہر کی۔

''ٹینشن کتنا ہی کیوں نا بڑھ جائے یہ پروگرام تو ہونا ہی ہے۔ میرے خیال سے پانچ سو طلباء کو یہاں سے لیا جائے اور پانچ سو کو وہاں کی یونیورسٹیز سے جمع کیا جائے۔ جامعہ ملیہ اور جے این یو طلباء یونین کے صدور سے بات کی جائے۔ ہمارے صدر صاحب ٹیلیفون پر بات کریں اور پھر خود وہاں جا کر ان سے ملیں۔ پروگرام سمجھائیں تو شاید پارلیمنٹ ہاؤس پر تو وہ شریک ہو ہی جائیں گے۔ جامعہ ملیہ اور بٹلہ ہاؤس میں تو ہزاروں علیگ رہتے ہیں ان کو آسانی سے شامل کیا جا سکتا ہے۔'' امین نے تفصیل بیان کرتے ہوئے حل پیش کیا۔

''یہ ٹھیک ہے۔ میں آج ہی ان تمام لوگوں سے ٹیلیفون پر بات کرتا ہوں۔ ضمیر کل صبح تک اپنی ٹیم لے کر دہلی چلے جائیں۔ اولڈ بوائز اور پریس وغیرہ کو موبلائز کریں۔ میں بھی سکریٹری کے ساتھ کل دہلی جاتا ہوں۔ دہلی پولیس کو بھی اپنا پروگرام لکھ کر دینا ہوگا۔ امین! تم دوستوں کے ساتھ ملکر سب کے نام خطوط تیار کرلو۔ ایک پریس ریلیز بھی جس میں ہمارا پروگرام تفصیل سے لکھا گیا ہو۔'' صدر نے فیصلہ لیتے ہوئے کہا۔

''ٹرانسپورٹ اور کھانے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے بھی ایک کمیٹی آنریری سکریٹری صاحب کی نگرانی میں بنادی جائے۔ یہاں سے بسوں کا انتظام کرنا ہوگا۔ ناشتہ تو راستے میں کسی ڈھابے پر ہوجائے گا اور لنچ کا انتظام دہلی کے اولڈ بوائز سے کرایا جاسکتا ہے۔ کیوں ضمیر ٹھیک ہے نا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''لنچ کی فکر نہ کریں۔ ایک ہزار لوگوں کے لیے بریانی وغیرہ وہاں کے چند اولڈ بوائز مل کر بنوادیں گے۔ یہ میری ذمہ داری رہی۔'' ضمیر نے سینے پر ہاتھ رکھ کر دعویٰ کیا۔

''چکن بریانی ٹھیک رہے گی۔'' شمیر نے تفریح لی۔

''بس مذاق بند۔ میرے خیال سے اسٹوڈنٹس سے کہا جائے کہ بسوں کے علاوہ جن کا انتظام یونین کرے گی، وہ اپنے اپنے طریقے سے بھی دہلی پہنچ جائیں اور مارچ میں شریک ہوں۔'' کلیم نے مشورہ دیا۔

''ایک نوٹس نکال دیتے ہیں اس سلسلے میں۔'' صدر نے فوراً ہی اتفاق کرتے ہوئے جواب دیا۔

''میرے خیال میں ہر بات طے ہوگئی ہے۔ میں نے تمام باتیں نوٹ کرلی ہیں۔ جو طے ہوا ہے وہ پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔ کوئی ترمیم یا کمی بیشی ہو تو ابھی پوری کرلی جائے۔'' آنریری سکریٹری نے کاغذات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ تمام کمیٹیوں کے ذمہ داران کے نام گنوائے اور ان کے کاموں سے آگاہ کیا۔ غرض کہ کئی گھنٹہ یہ میٹنگ چلتی رہی۔ اس دوران کئی مرتبہ چائے وغیرہ کے دور بھی چلے۔ تجاویز آتی رہیں، ہلکی پھلکی گفتگو ہوتی رہی اور ایک دوسرے کی کھنچائی بھی چلتی رہی۔ پھر سب لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طرح سے نبھانے کا وعدہ کرکے اٹھ گئے۔

2.5 مرغِ اسیر

یہ شروع دسمبر کی تاریخیں تھیں لیکن ابھی سے کہرا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ پورا شمالی ہندوستان شدید سرد لہر کی زد میں تھا۔ علی گڑھ سے دس بسیں تقریباً ۶۰۰ لڑکوں کو لے کر جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیانی لان میں آچکی تھیں۔ اتنے ہی طلباء اپنے اپنے

ذریعوں سے اس میدان میں پہنچ چکے تھے اور کئی سو کے قریب دہلی کے ہی مسلم علاقوں سے جمع ہو گئے تھے۔صبح کے تقریباً دس بج چکے تھے لیکن دھوپ کا ابھی تک پتہ نہ تھا۔کہرے کی چادر ابھی پوری طرح ہٹی نہیں تھی کہ تیز ہوائیں چلنی شروع ہوگئیں۔اس سے کہرا تو ہٹ گیا اور دھوپ بھی نکل آئی لیکن سردی اور تیز ہوگی۔جامع مسجد کے کچھ لوگوں نے وہاں پنڈال لگا دیا تھا اور انہیں کی طرف سے ایک طرف گرم پوریاں تلی جا رہی تھیں اور ایک بڑے بھگونے میں چائے ابل رہی تھی۔تمام لوگ چائے اور گرم گرم پوریوں سے سردی پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔ایکشن کمیٹی کے زیادہ تر لوگ ایک دن پہلے سے ہی دریا گنج بچوں کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے۔وہ صبح سے ہی لان میں آنے والے لوگوں کا استقبال کر رہے تھے۔

اقبال سب سے الگ تھلگ دور ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ایک طرف شاہجہانی مسجد کی گنبد و مینار یں ماضی کی داستانیں سنا رہی تھیں تو دوسری طرف لال قلعہ کی بلند سرخ دیواریں، گنبد اور دروازے شان رفتہ کی یاد دلا رہے تھے۔

اے آب رود گنا وہ دن ہے یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اسی لال قلعہ سے بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کیا گیا۔اسی قلعہ میں شہزادوں کے سر خوان میں سجا کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے گئے۔اسی جگہ عظیم الشان مغلیہ سلطنت کے امراء کے محل اور حویلیاں تھیں جن کو انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کرتے ہی زمیں بوس کرنے کا حکم صادر کر دیا کہ پورے شاہجہاں آباد میں شان رفتہ کی یادگار ایک بھی حویلی نہیں بچی۔کیسی کیسی وہ عمارتیں رہی ہوں گی اور کیسے کیسے وہ لوگ تھے کہ جن کے وارثین آج اس سرزمین پر ٹھنڈ میں ٹھٹھرتے ہوئے حکومت وقت سے یہ درخواست کرنے آئے تھے کہ فسادات میں ان کا قتل عام بند کیا جائے۔رضیہ سلطانہ اور خسرو کی دہلی کا یہ حال تھا:

چھاپ تلک سب چھینی مو سے نیناملائے کے

ہزار سال پہلے بنائی گئی قطب مینار اور اس کے آس پاس کے کھنڈرات عظمت رفتہ کی

داستانیں آج بھی سنا رہے ہیں۔شمالی ہند کی پہلی مسجد،مسجد قوت الاسلام بنانے والوں کے وہم وگمان میں یہ نہ رہا ہوگا ایک دن اس مسجد میں لگائے پتھروں کا حساب ان کی اولادوں سے مانگا جائے گا۔اسی شہر میں کبھی غالب ومیر کا بھی آشیانہ تھا۔ابدالی،درانی اور روہیلوں کے دہلی میں مسلمانوں کے قتل عام اورلوٹ مار کے بعد میر کو دہلی چھوڑنی پڑی اور لکھنؤ والوں سے یہ کہہ کر تعارف کرانا پڑا:

کیا بودوباش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دہلی جو ایک شہر تھاعالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

اور یوں بھی کہ:

حالت تو یہ کہ مجھ کوغموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

غالب کا اندازنرالا تھا۔انھوں نے غدر میں دہلی کو تاراج ہوتے ہوئے دیکھا اورمسلمان کی بے بسی کا منظر یوں بیان کیا۔

لاغرا تنا ہوں کہ گرتو بزم میں جادے مجھے
میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلادے مجھے

اور یہ بھی کہ:

قفس میں ہوں گراچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

اسی شہر کے ملبے میں ایک ایسا جواں مردو جواں طالع،دوراندیش مرد حکیم بادشاہ کے محل میں کھیلا،پرانی محفلوں اور طرزوں کا آشنا، پیدا ہوا کہ دلی کے بوسیدہ درودیوارپر،

شہزادوں اور شہزادیوں کی بھوک اور بے بسی پر وہ بیٹھ کر رو یا نہیں مرثیہ نہیں لکھا اور نہ نادان مجاہد کی طرح تلوار لے کر دانشوران فرنگ و اہل سائنس سے لڑنے نکلا۔ بلکہ آنسوؤں کو سیاہی اور دانائی کو قلم بنا کر فلسفۂ فتح و شکست کے تمام راز کھول دیئے۔ اس نے غدر میں اپنی ماں کی بھوک و پیاس سے موت کا بھول کر بھی ذکر تک نہ کیا۔ نہ چچازاد بھائیوں کی غدر میں جوان موت کا کبھی حوالہ دیا ورنہ اپنی حویلی اور خاندان کی بربادی کا کبھی بھولے سے بھی ذکر کیا۔ اگر کوئی غم تھا تو بس وہی کہ جس کی تپش میں اس کے سو سال بعد بھی یہ نوجوان ٹھٹھرتی سرد ہواؤں میں سلگ رہے تھے۔

''پارٹنر کب تک بیٹھے رہو گے۔'' کلیم نے اقبال کا کاندھا ہلایا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے چونک کر پوچھا۔

''کیا ہوا؟'' اماں کہاں ہو یار۔ سب لوگ چل دیے، جلوس جا رہا ہے۔'' کلیم نے غصہ سے بتایا۔

''اچھا چلو۔ ہم شاید پیچھے رہ گئے۔'' کلیم کے ساتھ تیز تیز چلتے ہوئے اقبال جلوس میں شامل ہو گیا۔

صدر، سکریٹری اور ایکشن کمیٹی کے دیگر ممبران سیاہ شیروانیاں پہنے ہوئے جلوس کے آگے آگے چل رہے تھے۔ پیچھے دو قطاروں میں طلباء ہاتھوں میں بینرز اور پلے کارڈ اٹھائے ہوئے تھے۔ تیز ہوا میں چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ بینرز کو سنبھالنا اور بھی مشکل تھا لیکن نوجوانوں کا جوش و خروش دیکھنے کے لائق تھا۔ کاروں تھری ویلیز اور بسوں کا ایک اژدھام تھا کہ ان کے قریب سے ہو کر گزر رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر لوگ اپنے اپنے کاموں سے آ جا رہے تھے۔ سب سے آگے کے بڑے بینر پر موٹے کالے حرفوں میں Ban PAC لکھا ہوا تھا جس کو دو لڑکے سنبھالے چل رہے تھے۔ طلباء نے اپنے اپنے طور سے بینرز اور پلے کارڈ پر سلوگن لکھ رکھے تھے۔ کچھ طلباء کے پاس ہینڈ مائک تھا جس پر وہ زور زور سے نعرے لگاتے چل رہے تھے۔ وہ we want کہتے تھے اور تمام لڑکے زور زور سے جسٹس کہتے تھے اور بھی کئی طرح کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ یہ جلوس دریا گنج سے ہوتا ہوا پارلیمنٹ

ہاؤس جارہا تھا راستے میں تماشبین اپنے کام بھول کر تھوڑی دیر تک یہ منظر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے۔تمام راستے اخباری رپورٹرز تصویریں اتار رہے تھے۔طلباء کا جوش وخروش پورے عروج پر تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ جلوس کے اختتام پر ہندوستان ایک پرسکون ملک ہوگا۔ .P.A.C پر پابندی کا آرڈر نکل جائے گا اور اینٹی رائٹ فورس بن جائے گی۔فسادیوں کو سزا دی جائے گی لیکن نہیں جانتے تھے کہ سیاسی طاقتیں محض نعروں سے مرعوب نہیں ہوتیں۔ان کے فیصلے صرف پبلک اوپینن سے نہیں بدلے جاتے۔ابھی یہاں جمہوری اقدار صرف کاغذی ہیں۔

تقریباً دس کلومیٹر طویل راستہ تین گھنٹے میں طے ہوا۔ پارلیمنٹ اسٹریٹ مسجد میں جمعہ کی نماز شروع ہو چکی تھی۔ بہت سے طلباء دوڑ کر اس میں شریک ہوگئے۔نماز کے بعد یہ جلوس ایک جلسے میں تبدیل ہوگیا۔مختلف سیاسی پارٹیوں کے لیڈران نے تقاریر کیں۔ جے این یو، جامعہ ملیہ اور دہلی یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے صدور نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔کئی اہم سماجی شخصیات نے بھی وہاں آکر تقاریر کیں۔تقریباً دو گھنٹے یہ جلسہ چلا۔ جلسے کے خاتمے کے بعد تھکے ہارے اور بھوکے بیتاب لڑکوں کو اولڈ بوائز کی طرف سے وہیں لان میں گرم گرم چکن بریانی پیش کی گئی۔اس کے ساتھ ساتھ ہی چائے کا بھی نہایت فراخدلی سے اہتمام کیا گیا تھا۔چٹکتی دھوپ میں بریانی اور چائے مل جانے سے طلباء کو بہت آرام ملا۔ دہلی کے اولڈ بوائز نے حق ادا کردیا اور اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح طلباء کی خاطر مدارات کی اور انھوں نے بھی اپنا حق جما کر خوب جم کر کھانا کھایا۔وہیں لان پر سب لوگ گروپ بنا کر بیٹھ گئے اور گپ شپ ہوتی رہی۔یونین کے کئی سابق صدور دہلی میں اچھی پوزیشن پر تھے۔ان لوگوں نے موجودہ یونین کے عہدے داروں اور ایکشن کمیٹی کے ممبران اور کئی سینئر اولڈ بوائز کے ساتھ ایک طرف محفل جمالی اور چائے کے دور کے ساتھ ساتھ اگلے اقدام کے بارے میں رائے مشورہ ہوتا رہا۔کئی لوگوں کا خیال تھا کہ غیر معینہ دھرنے کے بجائے صرف تین روز دھرنا دیا جائے۔دہلی کے زیادہ تر لوگوں کا یہی مشورہ تھا مگر صدر صاحب نے بتایا کہ جنرل باڈی نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ اب ہم یہاں وہ

فیصلہ نہیں بدل سکتے۔آخر ان لوگوں نے کہا کہ جیسا طے ہوا ہے کریں،ہم ہر طرح ساتھ ہیں۔لیکن یہاں سے جلوس بنا کر پی ایم ہاؤس تک نہ جائیں بلکہ صرف وہ ۲۵ طلباء جن کو دھرنا دینا ہے وہی ایک بس میں وہاں جائیں۔یہ مشورہ مان لیا گیا۔جلوس وہیں ختم کر دیا گیا۔طلباء سے کہہ دیا گیا کہ سوائے ایک کے تمام بسیں ابھی علی گڑھ لوٹ جائیں گی لہٰذا سب لوگ بسوں پر سوار ہو جائیں۔ایکشن کمیٹی کے ممبران کے علاوہ کچھ اور طلباء کو بھی روک لیا گیا۔یہ سب لوگ بس میں سوار ہو کر اندرا گاندھی کی رہائش گاہ کی طرف بڑھے۔تقریباً ایک فرلانگ قبل ہی پولیس نے بس کو روک لیا۔وہاں لان میں پہلے سے ہی دھرنے کے لیے ٹینٹ لگا دیا گیا تھا اور بینرز وغیرہ بھی لگا دیے گئے تھے۔سب لوگ نعرے لگاتے ہوئے ٹینٹ تک پہنچ گئے اور دھرنا شروع ہو گیا۔

''بھئی ضمیر کو مبارکباد دینی چاہیے۔کیا عمدہ انتظام کیا ہے۔صبح کو گرم گرم پوریاں،دوپہر کو بریانی اور یہاں گرم لحاف اور گدے سبھی کچھ ہے۔''اقبال نے صدر سے کہا۔

''یہ بات تو ہے۔کوئی کمی نہیں ہے۔بھئی سب لوگوں کی طرف سے بہت شکریہ۔''بصیر نے ضمیر کو گلے لگا لیا۔

''شکریے سے کام نہیں چلے گا،یہاں تھکن کے مارے برا حال ہے۔''ضمیر نے ایک گدے پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔''پتہ ہے کتنی محنت کرنی پڑی۔کبھی پرانی دلی تو کبھی اوکھلا کبھی جے این یو تو کبھی دہلی یونیورسٹی،ایک ہفتہ سے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں تب جا کر یہ ہوا ہے۔''

''اس میں شک نہیں۔بس تم ہی یہ کام کر سکتے تھے۔''کلیم نے اس کی کمر ٹھوک کر کہا۔

''اور پریس کا بھی خوب عمدہ انتظام کیا۔''امین نے بھی اس کی تعریف کی۔

''پریس میں اپنے کئی اولڈ بوائز ہیں،بس انہیں کو لگا دیا اس کام پر۔مگر کئی بار پریس کلب گیا تب ہاتھ آئے۔''ضمیر نے تفصیل بتائی۔

''اور شام کا کھانا؟''شمیر نے شرارتاً پوچھا۔

''مجھے پتہ تھا کہ تم آ رہے ہو لہٰذا ہر وقت کے کھانے اور چائے کا معقول انتظام کرا دیا

ہے۔ ہمارے سابق صدر نے ایک بڑے بزنس مین کے ذمہ یہاں کا انتظام کر دیا ہے۔''
اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

اب پورا گروپ پوری طرح مطمئن تھا کہ منزل تک بغیر کسی ناخوشگوار حادثے کے پہنچ گئے تھے۔ دھرنا جاری ہو گیا تھا۔ اب صرف ۲۵ طلباء کو روز علی گڑھ سے دہلی آنا تھا۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا۔ ہر روز نیا گروپ دھرنے پر بیٹھتا تھا۔ ایکشن کمیٹی کے اہم ممبران ہر دم وہاں موجود رہتے تھے۔ دھرنے کی خبریں تمام ہی اخباروں میں شائع ہو رہی تھیں۔ روز نئے نئے جرنلسٹ انٹرویوز لینے آتے تھے۔ آخر اندرا گاندھی جیسی سخت گیر وزیراعظم کے گھر کے سامنے دھرنا چل رہا تھا۔ انٹرنیشنل پریس کے لوگ بھی کافی دلچسپی لے رہے تھے۔ مسلم سیاسی پارٹیوں کے لیڈران ہر ضرورت فوراً پوری کراتے تھے۔ اپوزیشن پارٹیز کے اہم لیڈران نے بھی وہاں آنا ضروری سمجھا کہ اردو پریس اس دھرنے کو بہت اہمیت دے رہا تھا۔ لیکن اندرا گاندھی نے ایک بار بھی وہاں آنے کی زحمت نہیں کی۔ بس کبھی کبھی ان کے آفس کا کوئی آفیسر وہاں آ کر حالات پوچھ کر چلا جاتا تھا۔ نہ کسی اور کانگریسی لیڈر نے وہاں آنے کی جرات کی کہ یہ پارٹی لائن کے خلاف ہوتا۔ دھرنا طویل ہوتا گیا۔ طلباء اور ان کے سپورٹرز آہستہ آہستہ مایوس ہوتے چلے گئے۔ ایکشن کمیٹی کے ممبران بھی تھک کر چور ہو گئے۔ پیسہ اور دوسرے انتظامات میں بھی کمی آنے لگی۔ آخر پندرہ دن سخت مشکلات اور سردی جھیلنے کے بعد بغیر کسی نتیجہ کے دھرنا اٹھانا طے کیا گیا۔ آخری دن اتنا ہوا کہ پی ایم آفس کا ایک بڑا آفیسر میمورنڈم وصول کرنے آ گیا اور کئی مسلم جماعتوں کے لیڈران سلیمان سیٹھ، بنات والا وغیرہ اس دن وہاں موجود رہے۔ آخر بغیر کسی کامیابی یا محض وعدہ کے ہی یہ دھرنا اٹھانا پڑا اور طلباء اپنے ہوسٹل واپس آ گئے۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے
ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

○

(۳) عرب سوشلسٹ اور انقلاب اسلامی

3.1 داغِ فراق

''روؤ نہیں ماہ رو، ہمت رکھو۔ میں ہمیشہ کے لیے تمہارا ہوں۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ سب کچھ ہی دن کی بات ہے۔'' اقبال نے شاذیہ کا خوبصورت سر اپنے کاندھے سے اٹھا کر اس کے بالوں، آنکھوں اور ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے تحاشہ آنسو بہاتی اپنی ایک ماہ پرانی دلہن کو مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی چند مہینے پہلے ہی وہ بالکل اجنبی تھے۔ ایک رشتہ دار کے یہاں شادی میں ایک دوسرے سے ہلکا سا تعارف ہوا تھا اور ایسا محسوس ہوا کہ گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ ذرا سی کوششوں سے دونوں خاندانوں میں رشتہ طے ہو گیا اور ایک مہینہ قبل شادی بھی ہو گئی۔

یہ اقبال کی زندگی کا خوبصورت ترین دور تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے قدرت نے اس کی زندگی کو حسن اور خوشیوں سے بھر دینے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے اپنے سارے خواب شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ پچھلے تین سالوں میں تین اہم منزلیں اس نے آسانی سے طے کر لی تھیں جن کا کوئی بھی اسٹوڈنٹ اپنی تعلیمی زندگی کے آخری دور میں تصور کر سکتا تھا۔ پہلی یہ کہ نہایت کامیابی سے بہت کم عرصے میں پی ایچ ڈی کی تکمیل کی، اس کے فوراً بعد یونیورسٹی میں لکچرر شپ حاصل کی اور صرف ایک سال کے اندر کسی فارن یونیورسٹی میں ٹیچنگ اسائمنٹ حاصل کیا۔ اسی دوران خوابوں کی طرح حسین، انتہائی نازک، مہذب، خوش گفتار اور ذہین ہمسفر ملا ان دنوں وہ ساتویں آسمان کا مسافر تھا۔ لگتا تھا کہ تمام دنیا اس کی مٹھی میں ہے۔ زندگی ایک خوبصورت ساز کی مانند آہستہ

آہستہ اس کے دل و دماغ پر نشہ بن کر چھا رہی تھی۔جیسے کسی گویئے نے پرانے راگوں پر فیض کی غزل چھیڑ رکھی ہو۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے۔اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

یا جیسے مہدی حسن بے خودی میں پکے راگ الاپ رہے ہوں:

دن بدن بڑھتی گئیں اس حسن کی رعنائیاں

پہلے جاں پھر جان جاں پھر جان جاناں ہو گئے

یا جیسے بیگم اختر کی سریلی آواز اس کی رگ و جاں میں اتر رہی ہو۔

''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''اس نے اپنی شربتی آنسو بھری آنکھیں اٹھا کر کہا۔

''ہاں ضرور چلیں گے۔بس چند ماہ کی بات ہے۔میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔''

''کوئی ترکیب نہیں ہے ابھی ساتھ جانے کی؟''اس نے انتہائی مایوسی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ابھی تمہارا پاسپورٹ بھی تیار نہیں ہے۔کم از کم تین مہینے تو صرف پاسپورٹ بننے میں لگ جائیں گے۔پھر ویزا ٹکٹ وغیرہ، بہت سے کام ہوتے ہیں۔''اقبال نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا۔اداسی نے اس کے حسن میں ملال کا رنگ بھی شامل کر دیا تھا۔

''یہ تو بہت بڑی مشکل ہے۔''

''ایک حل ہے۔''

''وہ کیا ہے جلدی بتایئے؟''اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ میں بھی نہیں جاتا۔''اقبال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا بات ہوئی!''

''دیکھو مجھے خوشی خوشی جانے دو۔ورنہ تم اداس رہو گی تو میں بھی بہت پریشان رہوں گا۔زیادہ سے زیادہ چھ مہینہ میں آ کر میں تمہیں لے جاؤں گا۔پھر ہم بغداد، کربلا، کوفہ

سب تاریخی مقامات کی سیر کریں گے۔ وہاں سے ہم قاہرہ جاسکتے ہیں۔ اہرام فرعنہ دیکھنے کے لیے اور حالات ٹھیک رہے تو عمرہ بھی کرسکتے ہیں۔'' اقبال نے تفصیل سے بتایا تو اسے کچھ قرار آیا۔

☆

یہ شروع دسمبر تھا جب اقبال نے علی گڑھ سے بصرہ یونیوسٹی عراق جانے کے لیے استعفیٰ دیا۔ بہت سے دوستوں نے سمجھایا کہ یہاں پرمانٹ ہوجاؤ تو آئندہ کبھی چھٹی لے کر چلے جانا۔ علی گڑھ کی نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔

''مگر مجھے تو حیرت یہ ہے کہ اس کو ڈپارٹمنٹ نے کیسے رکھ لیا۔'' کلیم نے ایک دن دوستوں کے درمیان کیا۔''وہاں تو تبلیغی جماعت کے لوگ حاوی ہیں۔ نماز بھی بھائی شاذ و نادر ہی پڑھتے ہیں۔''

''نہ اٹنگا پاجامہ پہنتے ہیں اور نہ ہی داڑھی بڑھائی۔ ہے تو یہ حیرت کی بات؟'' امین نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''ہمارے چیئرمین صاحب تو انٹرنیشنل لیول کے جماعتی ہیں مگر وہ میرے استعفیٰ دینے سے بہت خوش ہیں کہ چلو ایک فاسق کم ہوا۔'' اقبال نے بتایا

''فاسق کی بھی ایک ہی۔ کیا روز قیامت والی میزان ان کے پاس بھی ہے؟'' امین نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔ سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ ہم سب بھی اب تک کا اپنا اپنا حساب کروالیتے ہیں۔'' شمیر نے تجویز پیش کی۔

''حساب کی ضرورت ہی نہیں۔ چہرہ اور لباس دیکھتے ہی بتادیں گے کہ دوزخی چلا آرہا ہے۔'' ضمیر نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔

''وہ بات تو رہ ہی گئی کہ آخر ملازمت کیسے ملی؟'' کلیم نے پھر وہی سوال کیا۔

'بات یہ تھی کہ اتفاقاً پانچ جگہیں خالی تھیں اور صرف میں ہی تنہا پی ایچ ڈی تھا۔ لہٰذا مجھے کاٹ ہی نہیں سکتے تھے۔ باقی تین اپائنٹمنٹ چیئرمین صاحب نے اپنے ریسرچ

اسکالرز کے کرا لیے جو پچھلے چھ سات سالوں سے تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں اور ایک نائب چیئر مین نے کرالیا اپنے ریسرچ اسکالر کا۔ مگر یہ سب ٹیمپریری تقرریاں ہیں لوکل سلیکشن کمیٹی سے۔ جنرل سلیکشن کمیٹی کئی سال بعد کرائی جائے گی۔ اس دوران یہ سب لوگ کسی نہ کسی طرح پی ایچ ڈی کرلیں گے اور پھر ہمارا پتہ صاف۔'' اقبال نے تفصیل سے بتایا۔

''لہٰذا یہ صرف اتفاق تھا؟'' امین نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

''جی یہ اتفاق تھا اور اتفاقات بار بار نہیں ہوتے۔ اسی لیے مجھے یہ موقع مل گیا تو میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔''

''مگر جنرل سلیکشن کمیٹی میں تو وائس چانسلر کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی ہوتے ہیں وہاچیئر مین وغیرہ کیا کرلیں گے؟'' شمیر نے سوالکیا۔

''جنرل سلیکشن کمیٹی میں تو اور بڑی سیاست ہوتی ہے۔ اس میں تو وائس چانسلر بھی پارٹی بن جاتا ہے۔ یونیورسٹی کے سارے گروپس ملوث ہوجاتے ہیں ایکسپرٹس چیئرین کے دوست ہوتے ہیں۔ پہلے سے ہی وائس چانسلر کے ساتھ مل کر ساز باز کرلی جاتی ہے۔ اور ہم ہیں کہ نہ تین میں نہ تیرہ میں، نہ اس گروپ میں نہ اس گروپ میں، تبلیغی ہم نہیں، کمیونسٹ ہم نہیں، جماعت اسلامی کے ہم نہیں، نہ ہم نیشلسٹ اور نہ کسی خاص علاقے کے۔ وائس چانسلر کے لیے مخبری ہم نہیں کرسکتے، چیئر مین، ڈین کے چمچے ہم نہیں۔ کوئی بھی گن ہم میں نہیں ہے۔ مجھے کون پنپنے دے گا یہاں۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ علی گڑھ میں میرا کوئی مستقبل نہیں اور اگر یہاں پڑا بھی رہا تو یہ لوگ بہت پریشان کریں گے۔'' اقبال نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''مارے گئے گلفام والی بات ہے۔'' امین نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ایک سال اسٹاف کلب جا کر میری سمجھ میں یہ آیا کہ یونیورسٹی کی کوئی لابی میرے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ جماعت اسلامی اور تبلیغ والے مجھے مسلمان نہیں مانتے۔ کمیونسٹ کٹر مسلمان سمجھتے ہیں۔ کانگریسی نیشنلسٹ جو یہاں کا نام نہاد مسلم گروپ کہلاتا ہے مجھے اینٹی نیشنل سمجھتا ہے۔ بس چند دوست ہیں لے دے کے جو خود ہماری طرح خوار ہیں۔ مختصر یہ

کہ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔'' اقبال نے اپنا دکھڑا رو دیا۔

''یا یوں کہئے کہ واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں۔'' امین نے پیوند لگایا۔

''اچھا اگر پوچھا جائے تو تم کیا کہو گے اپنے بارے میں۔'' شمیر نے مشکل سوال پوچھا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب لوگ سرسید احمد کے پیرو ہیں بس اتنا سا فسانہ ہے کہ تعلیم، مذہب اور سیاست ہر فیلڈ میں صرف سرسید کا پیرو ہوں۔ نہ غزالی، نہ مودودی کا نہ کسی اور مولوی کا، نہ کارل مارکس اور نہ گاندھی نہرو کا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ سرسید عقل کے قائل تھے نہ تقدیر پرست تھے اور نہ دشمن فلسفہ۔'' اقبال نے مختصر جواب دیا۔

''یہ تو بہت وسیع موضوع ہے پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ اچھا اب جانا کب ہے۔'' کلیم نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''بس میں استعفیٰ دینے گھر سے آیا تھا اور آج شام کو واپس چلا جاؤں گا۔ وہاں سے پرسوں دہلی اور اس کے دو دن بعد عراقی ایئرویز سے عمان جانا ہے اور عمان سے بغداد بس کا سفر ہے۔ جنگ کی وجہ سے بغداد ایئرپورٹ بند ہے۔ لہٰذا اردن ہو کر جانا پڑے گا۔ بغداد سے پھر بس کا سفر ہے بصرہ تک۔''

''یار جنگ چل رہی ہے یہیں رہو نا۔'' امین نے مشورہ دیا۔

''جنگ تو چند ہفتوں میں ختم ہو جائے گی کوئی ورلڈ وار تو ہے نہیں۔'' شمیر نے دوسرا پہلو بیان کیا۔

''دیکھ لینا کہ یو این او، روس، امریکہ اور یورپ سب مل کر جلد ہی یہ خون خرابہ بند کرا دیں گے۔'' اقبال نے امید ظاہر کی۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' امین نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

3.2 شمع صحبتِ شب

گیارہ بجے رات میں عراقی ایئرویز کا طیارہ نئی دہلی ایئرپورٹ سے اڑان بھر کر تقریباً

ڈھائی بجے رات عمان ایئرپورٹ پراترا۔ باقی رات وہیں اندر لاؤنج میں گزارنے کے بعدعلی الصبح عراق جانے والے مسافرایک ایئرکنڈیشنڈ بس میں بغداد کی طرف سفرکررہے تھے۔زیادہ تر مسافرانڈیا، پاکستان یابنگلہ دیش سے تھے۔کئی فیملیز بھی تھیں۔ یہ سب لوگ کہیں نہ کہیں ملازمت کررہے تھےاور جنگ ختم ہونے کاانتظارفضول جان کراب دوبارہ اپنے اپنے کاموں پرواپس جارہے تھے۔کئی لوگ یونیورسٹی ٹیچرز بھی تھے لیکن بصرہ یونیورسٹی جانے والاکوئی نہ تھا۔بس کاسفرزیادہ ترلوگ پسندنہیں کرتے لیکن اقبال کوخوشی تھی کہ اس سفرمیں عربوں کے دیہات اورقصبات، ان کے رہن سہن اورکلچرپرکم ازکم ایک سرسری نظرڈالنے کاموقع تو ملے گا۔اس نے بچپن سے ہی عربوں کے بارے میں کتنی ہی دلچسپ کہانیاں سن رکھی تھیں۔عربین نائٹس کی کہانیاں اس نےخود بھی پڑھی تھیں۔اسلام لانے کے بعدعربوں کا دنیا کومسخر کرنے کے لیے اپنے صحرائی خیابانوں اورریگستانوں کو چھوڑ کردو دراز کے علاقوں میں دوسری قوموں کواسلام کا پیغام دینا،ان کواپنے اپنے مذاہب چھوڑ دینے پرتیار کرنا، اپنے کلچر اور روایات کو خیرباد کہنے پر آمادہ کرلینا،ایک طلسماتی داستان سے کم نہیں ہے۔ مذہب بدلنااورروایات بدل دینا انسان کے لیےسب سے زیادہ مشکل کام ہوتا ہےمگرصرف چندسوسال کےعرصے میں حجاز کےعربوں نے اٹھ کر پہلے تو تمام عرب دنیا کو،عراق سے لےکرمصر، لیبیا، دمشق اورالجیریا کومشرف بہ اسلام کیااس کے بعد یہ دوسری قوموں کومسلمان کرنے نکلےاورایران وترکی کوایک کلمے کاپابند بنادیا۔ یہاں تک کہ یورپ کےبھی کئی حصوں میں توحید کے پیغام کوپہنچا کردم لیا۔اس کے بعداسی پیغام کےسہارےاورقرآنی فلسفہ کےبل بوتے پرسینٹرل ایشیا سےترکوں نے اٹھ کرروس، مشرقی یورپ سے لےکرمغربی چین اور برصغیر ہندتک اپنی حکومتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور پیغام توحید پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دیا۔تقریباً سات سوسال تک خلافت اسلامیہ پرترکوں کاسکہ چلتا رہا اورٹرکش کیپ اسلامی خلافت کانشان بن کررہی۔صنم کدۂ ہندمیں بھی توحید کاپیغام پہلےعربوں نے سندھ کےبعض حصوں تک اس کے بعدترکوں نے شمال سے جنوب تک پہنچانے کا کام کیااور ہندوستان کی سیاسی اورثقافتی

پہچان ہی بدل کر رکھ دی۔

یوں تو علی گڑھ میں بہت سے عرب لڑکے زیرِ تعلیم تھے لیکن زندگی میں پہلی بار اقبال عربوں کو ان کی سرزمین پر دیکھ رہا تھا جو اب گردش وقت سے بساطِ دنیا پر پیادوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ عمان ایک خوبصورت شہر تھا۔ اونچی نیچی پہاریوں پر بسا ہوا۔ بس پہاڑی راستوں پر چلتی ہوئی عمان شہر سے باہر جا رہی تھی۔ تمام شہر سویا ہوا تھا ابھی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تھی۔ اکثر مکانات ماڈرن طرز کے بنے ہوئے تھے۔ سوائے مساجد کے جن کی اونچی مینار یں اور گنبدوں کے سائے پہاڑوں کی چوٹیوں پر نظر آ رہے تھے۔ کچھ لوگ ٹریک سوٹ پہنے ہوئے سڑکوں پر دوڑ لگا رہے تھے کہ مساجد سے فجر کی اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اب کچھ لوگ لمبے لمبے سفید کرتے پہنے ہوئے سروں پر عمامے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے پورے اعتماد سے مساجد میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ بہت سے عمر دراز لوگ بھی ہلکے سے جھکے ہوئے ہاتھ میں اسٹک کا سہارا لئے نماز کے لیے گھروں سے نکل رہے تھے۔

عمان سے عراق بارڈر تک کا یہ سفر تقریباً چھ گھنٹے میں طے ہوا۔ راستے میں مشکل سے ایک آدھ جگہ آبادی نظر آئی۔ چند پرانے طرز کے مکانات، مٹی اور پتھروں سے بنے ہوئے، ایک دو پرانی کاریں ان کے باہر کھڑی ہوئی نظر آئیں۔ کئی لڑکے روایتی لباس پہنے بکریاں اور اونٹ بھی چراتے ہوئے نظر آئے۔ عراقی بارڈر پر ایک ہماہمی کا عالم تھا۔ پچاسوں بسیں کاریں اور سامان سے لدے ٹرک بارڈر کراس کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ عراق میں آنے جانے کے بس دو ہی زمینی راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک اردن کے ذریعہ اور دوسرا جنوب میں کویت کے راستے۔ باقی تمام ہوائی اور سمندری راستے بالکل بند تھے۔ بارڈر پوسٹ پر کئی بڑے اور انتہائی صاف ستھرے ریستوراں کھلے ہوئے تھے۔ سینڈوچیز کے چھوٹے چھوٹے اسٹال بھی تھے۔ جہاں ہر طرح کے گوشت کے سینڈویچ مناسب قیمت پر دستیاب تھے۔ ان ہوٹلوں میں پانی کی جگہ کولڈ ڈرنک پی جا رہی تھی۔ ہر میز پر شیشے کے بنے ہوئے خوبصورت حقے رکھے ہوئے تھے۔ آرڈر دینے پر بیئرر

شیشے کی خوبصورت سی دہکتی ہوئی تمبا کو کی چھوٹی سی چلم رکھ جاتا تھا۔ان ہوٹلوں میں اس وقت کافی بھیڑ تھی کہ اینٹری ایکزٹ ویزا اسٹیمپ ہونے میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔ اقبال بھی اپنے کاغذات جمع کر کے ایک ہندستانی مسافر کے ساتھ ایک ہوٹل میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ہر ٹیبل پر عرب بچے بوڑھے اورنوجوان مرد عورتیں بیٹھے ہوئے کھانے میں مصروف تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر روٹی اور روسٹیڈ چکن کھا رہے تھے کولڈ ڈرنگ بھی ساتھ ساتھ پیتے جاتے تھے۔ کچھ لوگ شوربہ، فرائڈ گوشت اور روٹی بھی کھا رہے تھے۔لوگوں کے پہناوے میں عمر کے لحاظ سے فرق انتہائی واضح تھا۔عمر درراز لوگ زیادہ تر روایتی عربی عبا پہنے اور سر پر عمامے باندھے ہوئے تھے اورنوجوان لڑکے لڑکیاں نئی تراش کے یورپین لباس پہنے ہوئے تھیں۔لڑکیاں اسکرٹ ٹی شرٹ اور ہائی ہیل سینڈل پہنے ہوئے تھیں۔ بہت کم عورتیں برقع نما چادر اوڑھے ہوئے تھیں۔لیکن چہرے اور ہاتھ پیر ان کے بھی کھلے ہوئے تھے۔ ہر ایک کی چال ڈھال اور پہناوے میں ایک خاص طرح کا اعتماد اور جوش نظر آتا تھا سب سے زیادہ واضح چیز ان کا پر جوش اعتماد تھا جو ہر ایک کے چہرے سے عیاں تھا۔لوگوں کے چہروں پر کسی طرح کی شکن یا الجھن یا وحشت، جو ہم ہندوستانیوں کی خاص پہچان ہے بالکل نظر نہیں آتی تھی۔تمام لوگ انتہائی سکون اور آرام سے اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ہوٹلوں میں شطرنج کی بساط آرڈر دینے پر ملتی تھی۔کئی لوگ شطرنج کی بساط جمائے بیٹھے تھے۔ایک ہاتھ میں حقہ کی نلی دوسرے ہاتھ سے مہرے بڑھاتے اور ساتھ ساتھ قہوے کی چسکی لیتے ہوئے وہ انتہائی عیش کا منظر پیش کر رہے تھے۔چھوٹے چھوٹے شیشے کے گلاسوں میں بغیر دودھ کی چائے سپلائی ہو رہی تھی۔ یہ اتنی تلخ تھی کہ اقبال نے ایک گھونٹ لے کر ہی توبہ کر لی۔ بعد میں پتہ چلا کہ سارے عرب بہت شوق سے یہ چائے پیتے ہیں۔دودھ والی ہندستانی چائے تو انہیں گرم پانی معلوم ہوتی ہے۔

کاغذی کارروائی میں تقریباً دو گھنٹے لگے۔بارڈر کراس کرنے کے بعد ان کی بس اب عراق کے اندر سفر کر رہی تھی۔دور دور تک کہیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی۔بس کہیں کہیں کھجوروں کے باغات کے اندر ایک آدھ مکان نظر آجاتا تھا۔صحرا میں ریت کے تودوں

کے درمیان شاندار کول تار کی سڑک پر بس انتہائی تیز رفتار سے سفر کر رہی تھی۔ اقبال کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا باہر کا ایک ایک منظر دیکھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے کسی چھوٹی آبادی سے بھی گزر ہو رہا تھا۔ کھجوروں کے درختوں کے درمیان بس دس بس مکانات، آس پاس کچھ اونٹ اور بکریاں چرتی ہوئیں۔ کئی طرح کی پک اپ اور دوسری طرح کی کاریں مکانوں کے پاس کھڑی ہوئیں۔ کچھ عورتیں اور مرد، روایتی عرب لباس میں ادھر ادھر آتے جاتے ہوئے۔ آخر چھ گھنٹے کے لگاتار سفر کے بعد بس بغداد شہر میں داخل ہونے لگی۔ چھوٹی چھوٹی زیر تعمیر رہائشی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ درمیان میں کچھ پرانے مکانات بھی تھے جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے آبادی گھنی اور عمارتیں بلند ہوتی گئیں۔ اب بس دریائے دجلہ کے کنارے کنارے چل رہی تھی۔ یہ کافی چوڑے پاٹ کا دریا تھا۔ صحرائی خاکی رنگ کا پانی لہریں مارتے ہوئے رواں دواں تھا۔ دجلہ شہر کو دو برابر حصوں میں بانٹتا تھا۔ دونوں حصوں کو جوڑنے کے لیے تقریباً درجن بھر خوبصورت پل دریا پر بنے تھے۔ ندی کے دونوں کناروں پر کھجوروں اور کئی طرح کے درختوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔ ان کے پیچھے بلند و بالا نئے طرز کی رہائشی عمارتیں اور ہوٹل تھے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی یہ سڑک اب چار لین کی ہوگئی تھی۔ سیکڑوں کاریں، ہر طرح کے ٹرک اور بسیں آہستہ آہستہ ان پر رواں دواں تھیں۔ ہر طرف ایک اژدھام کا سا عالم تھا سڑک کے دونوں طرف بازاروں اور دکانوں و ہوٹلوں کا سلسلہ تھا۔ جگہ جگہ مساجد کی بلند میناریں اور گنبد منظر کو اور دلکش بنا رہے تھے۔ پیدل چلنے والے راستوں پر نئے تراش کے لباس پہنے خوبصورت مرد اور عورتیں اپنے اپنے کاموں سے آ جا رہے تھے۔ یہ شام کا وقت تھا سورج بس ابھی ڈوبا ہی تھا۔ پورا شہر روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ چوراہوں سڑکوں اور ہر موڑ پر جگہ جگہ صدام حسین کے قد آدم اسٹیچو بلند چبوتروں پر بنے ہوئے تھے۔ ہوٹلوں میں بجتی ہوئی عربی میوزک اور نغمے دور دور تک سنے جا سکتے تھے۔ ایک بار تو اقبال نے سوچا کہ شاید جنگ کی خبر غلط ہے۔ ایک ایسا ملک جو تقریباً تین ماہ سے ایک طاقتور پڑوسی سے جنگ کر رہا تھا، اس کی دارالسلطنت اتنی رواں دواں اور ایسا پر جوش خوشی کا ماحول اور ہر طرف روشنی ہی

روشنی۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک شہر کے اندر سفر کے بعد بس اپنے اسٹیشن تک پہنچی۔بس سے اتر کر اقبال نے سب سے پہلے ایک ہمسفر عراقی نوجوان سے یہی سوال کیا کہ کیا جنگ ختم ہوگئی ہے۔اس نے حیرت سے اقبال کو دیکھا اور بتایا کہ نہیں ابھی تو یہ لمبی چلے گی۔اقبال اسے جاتے ہوئے دیکھتا ہی رہ گیا کہ کس بےفکرے انداز سے اس نے یہ بات کہی تھی۔

بصرہ جانے کا انتظام اب اسے خود کرنا تھا۔ایئر لائنس کی ذمہ داری بغداد آ کر ختم ہوگئی تھی۔بس سے اترتے ہی ٹیکسی والوں نے اسے گھیر لیا،ایک سے بات طے کی اور قریب کے ہی ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔یہ ایک چار منزلہ ہوٹل تھا۔بڑی سی لاؤنج میں قالین پر تین طرف صوفے پڑے تھے،ایک طرف ٹی وی رکھا تھا اور ایک کونے میں ریسیپشن کاؤنٹر تھا۔ٹریڈیشنل لباس میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر عرب نے مسکرا کر اقبال کو خوش آمدید کہا۔وہ تھوڑی بہت انگریزی بول رہا تھا۔معاملات طے ہونے کے بعد اس نے بیئرر کو بلایا اور آخری منزل پر ایک کمرے کی چابی دیتے ہوئے اقبال کا سامان اٹھانے کا اشارہ کیا۔ایر بیگ اور چھوٹا بریف کیس اقبال نے خود اٹھالیا اور سوٹ کیس بیئرر نے سنبھال لیا۔کمرہ کافی کشادہ اور آرام دہ تھا جس میں ایک سنگل بیڈ،دو گدے دار کرسیاں، ایک الماری،فرش پر قالین اور ایک باتھ روم متصل تھا۔تقریباً چوبیس گھنٹے اسے مسلسل سفر کرتے ہوئے ہوگئے تھے۔سنبھل سے دہلی،دہلی سے عمان اور عمان سے بغداد۔۔۔اس وقت وہ اسلامی تاریخ کے سب سے اہم شہر کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔تھکن کے مارے برا حال تھا۔گرم پانی کے شاور میں دیر تک نہانے کے بعد اس کی تھکن کافور ہوگئی اور اب وہ شیشے کی قد آدم کھڑکی سے دور دور تک نظر آنے والے روشن شہر کو دیکھ رہا تھا۔

تو یہ ہے وہ خوابوں کا شہر! بچپن سے ہی جس کے قصے کہانیاں سنتے آئے تھے۔خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید کا شہر،پیران پیر شیخ عبدالقادر،امام یوسف،امام ابوحنیفہ اور امام جعفر صادق کا شہر۔اسلامی تاریخ جس کے حوالوں اور ذکر سے بھری پڑی ہے۔تاریخ کے کتنے عروج وزوال کا گواہ رہا ہے یہ شہر۔کتنی بار اجڑا اور بسا۔چنگیز خاں کی فوجوں نے ایسا تاراج کیا اور ایسا قتل عام کیا کہ مہینوں تک دجلہ کا پانی سرخ رہا۔اپنے وقت کی تمام

عالم کی سب سے بڑی لائبریری، ہفتوں تک جلتی رہی۔ سارا علمی خزانہ جو علماء اسلام نے دنیا بھر سے صدیوں میں جمع کیا تھا چند ہی دنوں میں خاک ہو گیا اور اپنے ساتھ ریسرچ اور تحقیق کی روایت کو بھی پیوند خاک کر گیا۔ صدیوں گزر گئیں کہ اب اس سرزمین سے اور اس کے حوالے سے دنیائے اسلام کے کسی بھی شہر سے اب دانشوری اور علمی جستجو اور تحقیقی مباحثوں کی بھنک تک سنائی نہیں دیتی۔ یہ ہے وہ شہر جو صدیوں تک تحقیق ریسرچ اور تہذیب وتمدن میں دنیا بھر کا پیشوا رہا کہ اہل یورپ اس زمانے میں نہانے تک کو صحت کے لیے مضر سمجھتے تھے۔ یہیں سے علم کی وہ شمع اسپین کے ذریعے یورپ پہنچی جس کو انھوں نے اپنی محنت اور لگن سے فانوس بنا دیا۔ صد ہزار رگ فانوس۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا! ہاں ضرور ایسا ہی ہوا ہوگا کہ کسی زمانے میں آل رسول کا کوئی قافلہ مکہ مدینہ سے یہاں آ کر بسا ہوا اور انہیں میں سے کوئی شخص دہلی پہنچا اور صدیوں کی علمی اور تحقیقی تاریکی کے بعد، بغداد کی وہی چنگاری، سید احمد کے ذہن میں روشن ہوئی اور جامعہ اظہر کی جدیدیت سے بھی پہلے، محمد عبدہ اور ان کے دوستوں کی تحقیقات وتجدیدات سے بھی بہت پہلے، دنیائے اسلام کی تاریخ میں پہلی شمع عقل وسائنس اور تحقیق وجستجو علی گڑھ میں روشن ہوئی۔

جو طاق حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے

تو یہی ہے وہ شہر جہاں منصور نے انا الحق کا نعرہ لگایا اور سولی پر چڑھا دیے گئے۔ اسی شہر کی گلیوں میں معتزلہ اور اشاعرہ کے مباحث صدیوں تک گونجتے رہے اور آخر کار خود غرض حکمرانوں کی مدد سے معتزلہ عقل پرستوں کو شکست فاش ہوئی اور تقدیر پرستوں ودشمنان فلسفہ کی اسلامیات پر مکمل اجارہ داری قائم ہو کر رہی کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج تک کسی میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ مذہبی علماء کی پادریت کو چیلنج کر سکے اور عقل ودانش کی شمع دوبارہ روشن کرے حتیٰ کہ سرسید کی روشن کی ہوئی شمع پر بھی پردے ڈالنے میں پادریان دین کامیاب ہو کر رہے۔

ہاں یہی ہے وہ غزالی کا شہر کہ جہاں بیٹھ کر انھوں نے فلسفہ سیکھا اور اسی فلسفے سے عقلی علوم اور عقلیت کی میت دفن کی۔ بلکہ زندہ جاوید علوم اور حیات قومی کی شہ رگ کو تقدیر پرستی

کی الٹی چھری سے کاٹ کر پہلے میت بنایا پھر عاشق کے جنازے کی طرح دھوم دھام سے اس کا ایسا نظارہ کرایا کہ عالم اسلام کے تمام دینی عالم فرط نشاط سے محورقص ہوگئے کہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس رقص کی لے دھن اور طرز میں کسی تھکاوٹ کے بھی آثار نہیں۔شروع میں صرف دینی عالم ہی اس محفل رقص میں شامل تھے۔پھر رفتہ رفتہ اس کا نشہ عام اسلام پر ایسا چھایا کہ بلاتفریق مذہب وملت کیا شیعہ کیا سنی کیا ظاہری کیا باطنی کیا اہل حدیث واہل قرآن سب ہی اسی میت بے بس کے چاروں طرف محورقص ہیں۔ آسمانوں سے بم اور میزائل داغ جارہے ہیں مگر اہل رقص کے سرور میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔بلکہ نشہ ہے کہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔کہا جارہا ہے کہ اپنے اعمال بد کی وجہ سے اہل اسلام عذاب الٰہی کا شکار ہیں۔تمہاری نمازیں نمازیں نہیں،تمہارے روزے روزے نہیں اور تمہارا ایمان یقین سے خالی ہے۔مختصر یہ کہ دربار الٰہی سے پھٹکارا ہوا ہے مسلمان بس ایک ہی کمی ہے کہ ذلیل بندر بنادیا جائے۔

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

ہاں یہی ہے وہ پیران پیر عبدالقادر جیلانی کا شہر جہاں بیٹھ کر انھوں نے راہ سلوک میں ایسی ایسی منزلیں سر کیں کہ محفل تصوف کے شہنشاہ بن گئے۔تمام عالم میں ان کے گیت گائے جارہے ہیں،راہ سلوک کے مسافر کوان کے در پر آنا ہی پڑتا ہے۔اس عقیدے کے ساتھ گویا اللہ تک پہنچنے کا یہی واحد راستہ ہے۔

اسی شہر میں امام ابوحنیفہ امام جعفر صادق وغیرہ نے بیٹھ کر دینی علوم کے دریا بہائے اور اسلامی فقہ میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔لوگوں نے ان کو حرف آخر تسلیم کر کے عقل وخرد کے تمام در بند کر دیے۔

اور اسی شہر میں عرب نیشنل ازم اور عرب سوشل ازم کے فلسفہ کو بھی فروغ دیا گیا۔آج پورا عرب ورلڈ، امت عربیہ واحدہ کے نعرے سے گونج رہا ہے کہ طائر اپنے ہی بنائے ہوئے قفس میں قید ہوکر آزادی کے حسین تصور میں غرق ہے۔

پیروں میں درد شروع ہوا تو اقبال کو احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے کھڑکی کے پاس کھڑا ہے۔بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے سوچا کہ اب ایک دن بغداد میں ہی گزارا جائے۔ عبدالقادر جیلانی، ابوحنیفہ کے مزارات پر حاضری دی جائے۔اس کے بعد ہی اب بصرہ کا رخ کیا جائے۔ٹیلیفون اٹھا کر چکن روسٹ کا آرڈر دیا اور کھا پی کر فوراً ہی سو گیا۔

☆

تو یہاں ہے سالار طریقت پیران پیر کا مزار۔اقبال نے اس وسیع مسجد کے بلند دروازے کے سامنے کھلے میدان میں کھڑے ہو کر سوچا۔سڑک سے چند میٹر پیچھے محراب نما اونچا داخلی دروازہ بنا ہوا تھا۔جس پر نیلے اور سفید پتھروں سے خوبصورت نقاشی کی گئی تھی۔قرآنی آیات سفید پتھروں پر تراشی گئی تھیں۔اسی دروازے کے اندر ایک وسیع مسجد تھی اور دروازے کے اندر بائیں طرف ایک بڑے سے دیدہ زیب جالی دار کمرے کے اندر عبدالقادر جیلانی کی قبر تھی۔اس وقت وہاں چند ہی لوگ کھڑے ہوئے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔اسے یاد آیا علی گڑھ میں برچھی بہادر کا مزار، جو ہر وقت دلہن کی طرح سجا رہتا ہے اور یہاں چند اگربتیوں کے علاوہ کچھ نہیں، نہ منقش چادریں ہیں کہ قبر پر بچھی ہوئی ہیں نہ کسی اور طرح کا تام جھام۔نہ مزار کے باہر پھولوں اور گجروں کی دکانیں ہیں۔نہ بتاشے اور خوبصورت رنگ برنگ چنے ہوئے دوپٹے و دیگر اشیاء فاتحہ کی دکانیں ہیں اور نہ فقیروں کا اژدھام کہ برچھی بہادر کے نام پر آنے والوں سے بھیک مانگ رہا ہے۔نہ مجاوروں کی بھیڑ ہے کہ ہر آنے والے سے نذرانہ وصول کیا جا رہا ہے۔یہاں تک کہ ایک بھی مجاور یا خادم نہیں۔کیا ان کے خاندان کا ایک بھی فرد بغداد میں نہیں ہے؟ نہ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ ہے کہ مزار کے چاروں طرف جالی پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں منتیں کر رہے ہیں دہائی دے رہے ہیں، سلسلے وار پیروں کا واسطہ دے رہے ہیں اور نہ کوئی ایسا متبرک پیڑ ہے کہ اس پر دھاگے باندھے جا رہے ہیں عرضیاں ٹانگی جا رہی ہیں۔نہ مزار کی کوئی الگ سے شاندار عمارت ہے کہ گنبد اور آس پاس کی عمارتوں کو طرح طرح کے رنگین بلبوں اور پھولوں سے حجرۂ عروس کی طرح سجا دیا گیا ہے۔نہ دیگیں چڑھ رہی ہیں

اور نہ حلوے بانٹے جارہے ہیں۔ یہ کیسا مزار ہے۔ یہ کیسے پیران پیر ہیں کہ ان کے مریدین نے ذرا بھی ان کے مزار کا خیال نہیں رکھا؟ کیا یہاں کے لوگوں کو اللہ کے یہاں جواب نہیں دینا؟ کیا اسلامیان ہند سے کچھ سیکھنے کا وقت ابھی نہیں آیا کہ مشرکین کی کتنی روایات اور کتنے اصول ہم نے اپنے بزرگوں اور صوفیا کی عزت افزائی کے لیے کس پائیدار طریقے سے اپنی مذہبی روایات میں پیوست کر دیے کہ برچھی بہادر کے مزار اور سائیں بابا کے استھان میں کوئی دیکھ کر ذرا بھی فرق بتادے۔ دونوں زائرین کے عمل میں بھی کوئی فرق ہو۔ وہ فاتحہ پڑھنے کے بعد کافی دیر مسجد کے صحن میں بیٹھا رہا۔ کئی لوگ صبح کی نماز چاشت یا اشراق پڑھ رہے تھے کہ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ ظہر کی نماز میں کافی وقت تھا۔ مسجد سے نکلتے وقت ان لوگوں نے چند منٹ قبر کے سامنے کھڑے ہوکر فاتحہ پڑھی اور چلے گئے۔ اقبال کو لگا کہ یہ لوگ تو بجائے کچھ مانگنے کے، کہ پیران پیر سے کوئی درخواست کرتے، کوئی منت مانگتے، کسی مریض کی صحت یابی کی درخواست کرتے، کسی خالی گود کے لیے بچے کی التجا کرتے، الٹا اللہ کے حضور کچھ دعا ہی کر کے چلے گئے۔ فاتحہ کیا ہے؟ سوائے دعا کے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب پر اور اہل قبر پر رحمتیں نازل کرے!

یہاں آ کر اس کی سمجھ میں علی گڑھ میں اپنے ایک ٹیچر دوست سے بہت پہلے ہوئی گفتگو کے معنی سمجھ میں آئے۔ وہ حضرت خواجہ اجمیریؒ کی اولاد میں سے تھے اور خدام میں شامل تھے۔ ان کے نام دنیا بھر سے مریدین کے منی آرڈر آتے تھے۔

''اقبال، تم صوفیا کو نہیں مانتے؟'' انھوں نے جمعہ کی نماز کے بعد یونیورسٹی جامع مسجد کے باہر کھڑے ہوکر ماتھے سے سجدے کی خاک صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل مانتا ہوں۔'' اقبال نے اچانک سوال پر حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''جو تھے وہ مانتا ہوں۔'' اقبال نے ٹالنا چاہا۔

''بتاؤ نا کیا مانتے ہو، کیا سمجھتے ہو؟'' انھوں نے شیروانی اٹھا کر پائجامے کے گھٹنے سے بھی نماز کا نشان مٹاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

''یہی کہ یہ لوگ بڑے عالم اور شدید ریاضت کرنے والے تھے۔ ہمہ وقت اللہ کی یاد

میں مشغول رہتے تھے۔ انھوں نے اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں اور لوگوں تک پیغام توحید پہنچایا۔'' اقبال نے ایک سانس میں پوری بات کہہ ڈالی۔

''بس اتنا ہی؟'' انھوں نے غصہ سے کہا اور ململ کی ٹوپی بھی اتار کر جیب میں رکھ لی۔

''اور کیا مانوں بتاؤ نا؟'' اقبال نے پوچھا۔

''تم بالکل جاہل ہو۔ اولیاء اللہ کے مقام سے ناواقف ہو اور ہمیشہ رہو گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔

کچھ لوگوں سے پوچھنے کے باوجود بھی اس وقت اقبال کی سمجھ میں 'مقام' کے معنی نہیں آئے تھے۔ یہاں آ کر زائرین کے نہ ہونے سے عرضی گزارنے والوں، منتیں کرنے والوں اور نذرانے دینے والوں کی غیر حاضری سے، یہ راز کھلا کہ مقام سے مراد یہ تھی کہ صوفیاء کو اللہ تعالیٰ سے قرابت حاصل ہے اور وہ لوگوں کی حاجت روائی کے لیے اللہ سے سفارش کرتے ہیں اور بعض چھوٹے موٹے معاملات وہیں قبر میں خود ہی نبٹا دیتے ہیں اور اسی لیے ہر شہر اور قصبے میں صوفیاء کے مزارات پر رات دن حاجت مندوں کا میلہ سا لگا رہتا ہے۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز   کس نے پایا اثر نالۂ دل ہائے حزیں

ایسا لگتا ہے کہ بغداد والے پیران پیر کے اس مقام سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ ہندو فلسفہ میں ہے کہ بھگوان یا اس کے کسی اوتار کی کٹھن بھکتی کرنے والے کے اندر بھگوان سما جاتا ہے اور وہ خود بھی بھگوان سمان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستان میں سیکڑوں چلتے پھرتے بھگوان اور ان کے استھان نظر آتے ہیں اور لوگ اپنی منوکامنا پانے کے لیے ان کی آرادھنا کرتے ہیں، پوجا کرتے ہیں حتیٰ کہ اگر آپ کسی بے جان جیسے ندی یا پہاڑ کی بھی پوجا کرنے لگیں تو وہ بھی بھگوان ہو جاتا ہے اور پجاری کی حاجت روائی کر سکتا ہے۔

ظہر کی نماز کے بعد وہ ٹیکسی سے کاظمیہ چلا آیا۔ امام ابو حنیفہ کی ایک مسجد کے کونے میں عام سی قبر تھی۔ یہ ایک بڑی خوبصورت سی مسجد تھی۔ ایک عرب سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ مسجد کے داہنی طرف فقہ حنفیہ کے محقق مدفون ہیں۔ بس اتنی ہی سی بات بتا کر وہ اپنے کام

میں مشغول ہو گیا۔ نہ چادر، نہ بتاشے، نہ اگربتی، نہ لوبان، نہ زائرین۔ اسے ناقدری پر کچھ افسوس سا ہوا کہ آخر وہ بھی ہندوستانی تھا۔ لاکھ کوششوں کے باوجود اس کا دل بھی کچھ نہ کچھ صنم آشنا تو تھا ہی۔ ہندوستانی اور عرب اسلام کا فرق آج اس کی سمجھ میں آیا۔ باوجودیکہ وہ بہت محتاط تھا شرک اور توحید کے معاملے میں لیکن مزار امام پر رونق نہ ہونے سے کچھ ملال تو ضرور اس کو بھی ہوا۔ اس نے دو رکعت نماز پڑھنی چاہی۔ کافی دیر تک سر جھکائے خاموشی سے اپنے دل میں جھانکتا رہا کہ یہ ملال کہاں سے آیا۔ قبر آخر مٹی کے ڈھیر کے علاوہ کیا ہے۔ قدر تو صاحب قبر کے کارناموں کی ہونی چاہیے نہ کہ اس کے جسم کی۔ آخر وہ بھی خالق اور مخلوق کے فرق سے ناواقف نکلا۔ یہ راہ آسان نہیں ہے۔ تہذیب وتمدن کا اثر بہت گہرائی تک انسان کے قلب تک جاتا ہے۔ پہلی رکعت کے پہلے ہی سجدے میں زمین سے صدا آنے لگتی ہے۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں۔ بس وہیں نماز ختم کی ٹیکسی پکڑی اور ہوٹل واپس آ گیا۔ دیر رات تک طرح طرح کے خیالات پریشان کرتے رہے۔ نہ جانے کس وقت آنکھ لگی تھی کہ سائرن کی آواز نے اسے جگا دیا۔ جلدی سے بستر سے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہر طرف مکمل اندھیرا تھا۔ جگمگاتا ہوا شہر ایک دم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے کے باہر لوگوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ہوٹل خالی ہو رہا ہے۔ وہ بھی جلدی سے کمرے سے باہر آیا تو دیکھا کہ لوگ ماچس اور موم بتیاں جلائے ہوئے زینے سے نیچے اتر رہے تھے۔ لائٹ نہ ہونے سے لفٹ کام بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس نے ایک آدمی کو روک کر پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ سائرن فضائی حملے کا اعلان تھا۔ ایرانی طیارے بغداد پر بمباری کر رہے تھے۔ رک رک کر دھماکوں کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ وہ بھی فوراً زینے کی طرف لپکا اور گراؤنڈ فلور پر پہنچ کر دم لیا جو پہلے سے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس ہوٹل میں تقریباً چالیس کمرے تھے جو سب بھرے ہوئے تھے۔ تمام مسافر اس وقت دم سادھے کھڑے تھے۔ کسی نے کہا کہ باہر نکل جانا چاہیے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ یہیں زیادہ محفوظ ہیں۔ بہر حال پندرہ بیس منٹ تک یہ حملہ چلتا رہا۔ اینٹی ایئر کرافٹ گنس اور بم گرائے جانے کے دھماکے لگاتار سنائی دے رہے

تھے۔ایک بار تو ایسا لگا کہ بم یہیں کہیں گرا ہے۔سب لوگ دہل کر رہ گئے۔اقبال کو لگا کہ شاید دستِ قضا اس کو یہاں کھینچ لایا ہے۔جتنی بھی دعائیں یاد تھیں سب دہرانے لگا۔ایسے بہت سے گناہ بھی یاد آئے جن کو کیے ہوئے زمانہ گزر گیا تھا۔بھیگی آنکھوں سے سب کی معافی مانگ ہی رہا تھا کہ دوبارہ سائرن کی آوازیں آنے لگیں اور لائٹ بھی آ گئی۔پتہ چلا کہ یہ آل کلیر سائرن تھا اب حملہ بند ہو چکا ہے۔اس لیے لائٹ بھی آ گئی۔باقی تمام رات بہت سے لوگوں نے وہیں لاؤنج میں صوفوں پر بیٹھے بیٹھے گزاری۔اقبال بھی ایک صوفے پر بیٹھا اونگھتا رہا۔علی الصبح اسٹیشن پر پہنچ کر وہ بصرہ جانے والی ایئر کنڈیشنڈ بس سے اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

3.3 شعلۂ شط العرب

تمام راستے وہ کچھ جاگا کچھ سویا سا رہا۔بس چونکہ بہت اچھی تھی سڑک بھی ایک دم شاندار تھی لہٰذا آرام ملنے اور رات بھر جاگنے کی وجہ سے پورے بارہ گھنٹے کا سفر اونگھتے ہوئے گزر گیا۔چاروں طرف سے مغرب کی اذان کی آوازیں آ رہی تھیں جب کنڈکٹر نے اسے ایک چورائے پر یہ کہہ کر اتار دیا کہ یونیورسٹی یہاں سے قریب ہے۔اب وہ اپنے سامان کے ساتھ سڑک پر کھڑا تھا۔نہ کوئی شناسا نہ مددگار۔یہ ایک مشغول چوراہا تھا ہر طرح کی کاریں،بسیں اور ٹیکسیاں گزر رہی تھیں۔بہت سے مرد عورتیں پیدل بھی آ جا رہے تھے۔نوجوان لڑکے لڑکیاں،سب نئے طرز کے لباس پہنے ہوئے تھے جب کہ کچھ مرد عربی چغہ اور عورتیں سر پر اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔بہت دیر تک وہ حیران و پریشان کھڑا رہا کہ اس کے پاس ایک کلاس فیلو کا ڈپارٹمنٹ کا پتہ تھا رہائش کا نہیں۔ڈاکٹر انور علی، علی گڑھ میں کئی سال پہلے اس کا کلاس فیلو تھا اور ریاضیات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد تقریباً ایک سال سے بصرہ یونیورسٹی میں پڑھا رہا تھا۔بغیر مدد لیے کام چلنے والا نہیں تھا لہٰذا اس نے ایک لڑکے کو روک کر بات کی۔وہ شکل صورت، چال ڈھال سے طالب علم لگ رہا تھا۔اس کا اندازہ بالکل صحیح نکلا وہ بصرہ یونیورسٹی سے ہی ایم اے اکونومکس کر رہا تھا۔اقبال

کے بتاتے ہی کہ وہ یونیورسٹی میں استاد کی حیثیت سے آیا ہے،منع کرنے کے باوجود سامان اٹھالیا اورآس پاس کے کئی ہوٹلوں میں گیا اورایک ہوٹل میں مناسب کرائے پر معاملہ طے کرادیا اور وہاں کے اسٹاف کو بھی بتایا کہ میں کون ہوں۔کمرے میں سامان سیٹ کرانے کے بعد صبح آنے کا وعدہ کرکے وہ چلا گیا۔لڑکے کے رویے نے اقبال کے دل پر بہت گہرا اثر ڈالا۔کسی اجنبی ملک میں جہاں کی زبان تک سے ناواقف ہو اتنی اپنائیت مل جانا مسافر کے لیے کسی نعمت الٰہی سے کم نہیں۔اب اسے یونیورسٹی جانے کے لیے معتبر گائڈ بھی مل گیا تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ اسے اندازہ ہوا کہ عراقی عوام انتہائی خوش مزاج،فراخ دل،دوست نواز اور شاید دنیا کے سب سے زیادہ مہذب لوگ تھے۔اپنے طور طریقوں اور اجنبیوں کے ساتھ سلوک اور گفتگو میں دل کو تھامنے والا انداز رکھتے تھے۔

فاخر عبدالسلام موسیٰ دوسرے دن صبح ہی ہوٹل پہنچ گیا۔وہ نیلی پینٹ اور سفید شرٹ اور کالے جوتے پہنے ہوئے تھا۔نکلتا ہوا قد گھنگرالے بال اور تیکھا نقشہ، چہرہ پر ایک دبا دبا سا جوش، جو اس کی چال ڈھال ہر انداز سے ٹپکتا ہوا محسوس ہوتا تھا، وہ ایک عرب نوجوان کی زندہ تصویر تھا۔

''انت مسلم؟''اقبال کا نام جان کر اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

''یس آئی ایم۔''

''الحمدللہ،دیٹ از ویری نائس۔''

پوچھنے پر جب اقبال نے بتایا کہ ہندستان میں اتنے مسلمان رہتے ہیں تو اسے یقین کرنا مشکل ہوگیا۔ ہوٹل سے نکل کر انھوں نے ٹیکسی طے کی اور یونیورسٹی کی طرف چل دیے۔ہوٹل مین روڈ سے ذرا اندر بائیں طرف جانے والی سڑک پر تھا۔دو ہی منٹ میں وہ مین روڈ پر آ گئے۔ یہ ایک ون وے چوڑی روڈ تھی۔دونوں سڑکوں کے درمیان کوئی تیس فٹ چوڑی نہر تھی جو شط العرب سے نکل کر شہر میں کاٹ کر لائی گئی تھی۔نہر کے دونوں کناروں پر کھجوروں کے درختوں کی قطاریں تھیں۔فاخر نے بتایا کہ شط العرب سے کئی نہریں بصرہ شہر میں کاٹ کر لائی گئی ہیں۔جن سے سنچائی وغیرہ کا کام لیا جاتا ہے۔بصرہ،

شط العرب کے کنارے پر بسا ہوا ایک انتہائی قدیم شہر ہے وہ اس کی تاریخ بتا تا رہا اور عمارتوں کی بھی نشاندہی کرتا رہا۔اقبال نے اس سے ابوالحسن اشعری، رابعہ بصری اور معتزلہ فلسفی واصل بن عطاء کے بارے میں پوچھا تو اس نے اپنی ناواقفیت کا اظہار کیا کوئی پندرہ منٹ کے سفر کے بعد وہ لوگ یونیورسٹی پہنچ گئے۔ فاخر نے بتایا کہ نیا کیمپس شہر کے باہر بنایا جارہا ہے۔ پرانا کیمپس شط العرب کے دوسری طرف مشرق میں ہے۔انجینئرنگ اور میڈیکل کالج وہیں رہیں گے۔سائنس اور آرٹ فیکلٹیز یہاں شفٹ کردی گئی ہیں۔ کسی جرمن کمپنی کو عمارتیں بنانے کا ٹھیکا دیا ہوا ہے۔اس کیمپس کا مین گیٹ زیرتعمیر دو بڑے بڑے گول ستونوں پر مشتمل تھا۔ٹیکسی گیٹ کے اندر بھی تقریباً دس منٹ تک چلتی رہی۔ ہرطرف عمارتی سامان بکھرا پڑا تھا، کچھ عمارتیں زیرتعمیر تھیں اور کچھ مکمل ہوچکی تھیں۔ آخر ٹیکسی ایک بڑے شیڈ کے اندر آکر رک گئی۔ یہ سائنس فیکلٹی کا داخلی دروازہ تھا۔اندر ایک پندرہ بیس گول اونچے پلرز پر بنا ہوا بڑا سا ہال تھا۔اس کی چھت پچیس فٹ ضرور اونچی رہی ہوگی۔ ہال کے اندر ہی دونوں طرف چوڑے زینے پہلی منزل پر جانے کے لیے بنے ہوئے تھے۔سامنے ہی دو گیلیریز تھیں جو مختلف ڈپارٹمنٹس اور کلاس رومز کی طرف جاتی تھیں۔اقبال نے فاخر سے ریاضی ڈپارٹمنٹ چلنے کے لیے کہا۔سامنے والی لمبی گیلری پار کرنے کے بعد داہنی طرف دس کمروں پر مشتمل ڈپارٹمنٹ تھا۔جن میں تقریباً بیس اساتذہ کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔دوسرے ہی چیمبر میں ڈاکٹر انور سے ملاقات ہوگئی۔

''ارے یار تم کب آئے!'' اس نے اپنی کرسی سے اٹھ کر اقبال کو گلے لگالیا۔اقبال کو ایسا لگا جیسے سخت پیاس میں کسی کو ٹھنڈا پانی مل جائے۔

''بس رات ہی پہنچا۔خدا بھلا کرے فاخر کا کہ اس نے میری ساری مشکل آسان کردی۔'' اقبال نے فاخر کا انور سے تعارف کراتے ہوئے پوری تفصیل بیان کردی۔

انور نے فاخر کا شکریہ ادا کیا اور اقبال نے بھی اس سے ملتے رہنے کا وعدہ لے کر رخصت کردیا۔

''اور بتاؤ سب خیریت رہی۔ رات کیسی گزری؟'' تمہارا خط مجھے تین دن پہلے ہی ملا

تھا۔میں انتظار کرر ہا تھا۔سفر کیسا رہا؟ چلو یہ سب باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی پہلے چائے پی جائے ۔تم بیٹھو میں ابھی کہہ کرآیا۔'' انور نے اقبال کو کرسی پیش کی اور باہر چلا گیا۔اس چیمبر میں دوالماریاں،دو میزیں اور چھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔دوسری خالی میز پر کوئی عراقی ٹیچر بیٹھتا تھا۔انور کے پاس آ کر سفر کی کیفیت ختم ہوئی اوراس کے دل میں احساس پیدا ہونا شروع ہوا کہ اس اجنبی ماحول میں اجنبی لوگوں کے درمیان نوکری کرنے آئے ہو کوئی ٹورسٹ نہیں ہو کہ چند دن سیر وتفریح کے بعد نئے لوگوں اور ملک کا تجربہ کر کے گھر لوٹ جاؤ گے۔یہ احساس بڑا جان لیوا ثابت ہوا گھر کی یاد آتے ہی اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور تمام حسین یادوں نے ایک ساتھ اس پر یلغار کر دی۔ہوسٹل لائف،دوستوں سے لڑائی جھگڑے اور پارٹیاں،اسٹوڈنٹس یونین اوراسٹاف کلب کی رونقیں۔علی گڑھ کی سڑکیں اور ڈھابے،صبح کے اخبار،میگزینس اور مضامین،تقریریں اور مباحثے،ہر ہر بات بے تحاشا یاد آنے لگی۔بس اس کا دل پوری طرح بھر آیا۔رومال آنکھوں پر رکھ کر کسی طرح اپنے آپ کو کنٹرول کیا۔اتنے میں انور چھوٹی ٹرے میں چائے کے کپ اٹھائے چلا آیا۔

''لیجئے صاحب بغیر دودھ کی چائے۔''اس نے کپ میز پر رکھتے ہوئے بتایا۔

''میں یہاں نہیں رہ سکتا۔علی گڑھ جانا ہے۔''اقبال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اچانک کیا ہوا تمہیں۔''اس نے اقبال کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میری اچھی خاصی نوکری تھی اور ابھی ایک مہینہ ہے میرا استعفیٰ منظور ہونے میں۔'' اس کا دل بھر آیا تھا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے۔رفتہ رفتہ عادی ہو جاؤ گے۔''انور نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے تسلی دی۔

''میں بھی جب آیا تھا مہینوں حیران پھرتا تھا کہ آخر کیوں آ گیا۔صرف چند روپیوں کی خاطر۔پھر رفتہ رفتہ دل ٹھہر گیا۔تم بھی ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

''یہاں کوئی بھی چیز اپنی نہیں ہے۔کوئی ترکیب ہے کہ میں لوٹ جاؤں؟''اقبال نے پوچھا۔

''پہلے چائے پیو،اس کے بعد سوچتے ہیں۔''انور نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔اس نے خالی پیالی میز پر رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے چیئر مین کو دیکھ کر آتا ہوں کہ وہ آئے یا نہیں پھر جوائننگ کرائیں گے۔''

چائے پیتے ہوئے اقبال نے سوچا کہ تین سو ڈالر اس کے پاس ہیں، باقی انور سے مانگ لیں گے۔ واپسی کے ٹکٹ وغیرہ کا خرچہ پورا ہو جائے گا۔ اس کا ذہن ایک دم الٹا چلنا شروع ہوا۔ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اجنبی ملک میں اس کا دم گھٹ جائے گا۔ بس یہاں سے کسی طرح نکلا جائے۔ بغداد واپس جانا وہاں سے جارڈن اور پھر وہاں سے نئی دہلی۔ کوئی آسان سفر نہ تھا۔ ایئر ٹکٹ بک کرانا جارڈن کا ٹرانزٹ ویزا لینا ہزار دقتیں تھیں۔ اچانک خیال آیا کہ اگر یونہی لوٹ گئے تو علی گڑھ میں لوگ مذاق اڑائیں گے۔ مخالفین طرح طرح کی باتیں کریں گے اور یہاں رہنا ایسا تھا جیسے قید تنہائی کاٹنا اور تنہائی بھی صرف جسمانی نہیں بلکہ ذہن و دل، جذبات و احساسات، شوق اور خواہشات، ہر چیز جس سے فرحت حاصل ہو ان تمام سے محرومی اور جدائی۔

''میں کیسے رہوں گا یہاں۔'' اس نے انور کے آنے پر پوچھا۔

''تم ہمیشہ کے جذباتی ہو۔ سب راستے پر آجاتے ہیں۔ ایک آدھ مہینے کی بات ہے عادت پڑ جائے گی۔'' اب انور نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ذرا سختی سے کہا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم کچھ پیسے دے دو۔ تین سو ڈالر میرے پاس ہیں۔ عمان سے نئی دہلی کا ٹکٹ اتنے میں ہو جائے گا۔'' اقبال نے امید بھر نظروں سے اسے دیکھا۔

''پیسے تو میں تمہیں دے دوں گا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد ایکزٹ ویزا لینا بھی پڑتا ہے۔ اینٹری ایکزٹ میں ایک مہینے سے زیادہ لگ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ آج جوائن کرو پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ابھی میرا کلاس ہے۔ پچاس منٹ میں آتا ہوں تم یہیں بیٹھو۔'' یہ کہہ کر وہ چاک، ڈسٹر اور رجسٹر اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اقبال کو لگ رہا تھا کہ بس جس کرسی پر وہ بیٹھا ہے صرف وہی صحیح معنوں میں موجود ہے باقی ہر چیز معدوم ہے۔ باہر کی تمام دنیا اجنبی ہے۔ ایسے خلاء میں کوئی کیسے زندگی کرسکتا ہے۔ یہاں کی زبان، معاشرہ، سیاسی نظام سب یکسر اجنبی تھا۔ ابھی تک جہاں بھی وہ گیا صدام حسین کی تصاویر ہر جگہ موجود تھیں۔ بسوں، ہوٹلوں، چوراہوں، ٹیکسوں میں ہر جگہ،

بس نظر جھکانے کے بجائے ذرا سا سر اٹھایا، کہ ان کی مسکراتی ہوئی تصویر حاضر۔ وہ ایک ایسے پنجرے میں آکر پھنس گیا تھا، جہاں سے نکلنا آسان نہ تھا۔

ڈاکٹر انور کا اس دن ایک ہی کلاس تھا لیکن کوئی ٹیچر دو بجے سے پہلے ڈپارٹمنٹ چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ اقبال کو اس کے چیئرمین کے پاس لے گیا۔ سرخ سفید رنگ، درمیانہ قد اور تقریباً چالیس سال کے ڈاکٹر مصطفیٰ تھے جو ابھی دو سال پہلے ہی چیکوسلاواکیہ سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے اور پارٹی میں پوزیشن کی وجہ سے فوراً ہی ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ بن گئے تھے۔ ڈاکٹر انور نے ان سے اقبال کا تعارف کرایا۔ یہ ایک بڑا سا کمرہ تھا جس میں چاروں طرف ریکس میں کتابیں سجی رکھی ہوئی تھیں۔ لمبی چوڑی میز کے پیچھے بڑی سی کرسی پر مصطفیٰ بیٹھے تھے پیچھے دیوار پر صدام حسین کی تصویر ٹنگی تھی۔ انھوں نے اٹھ کر ہاتھ ملایا اور سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اقبال نے اپنے کاغذات پیش کیے، جو عراقی ایمبیسی نئی دہلی سے اسے ملے تھے۔ کاغذات دیکھ کر انھوں نے اپنی سکریٹری کو گھنٹی دبا کر لایا، سائڈ روم سے خوبصورت سی لڑکی اسکرٹ اور ٹاپ پہنے کاندھے تک کٹے ہوئے بال لہراتے ہوئے، مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر مصطفیٰ نے اقبال سے ملوایا۔ اس نے آگے بڑھ کر اقبال سے ہاتھ ملا کر مرحبا کہا وہ اقبال کے کاغذات لے کر فوراً ہی اپنے کمرے میں چلی گئی اور کچھ ہی منٹ بعد عربی میں لیٹر ٹائپ کر کے ڈاکٹر مصطفیٰ کے حوالے کر کے بتایا کہ اب ایڈمنسٹریشن آفس میں باقی کام ہوگا۔ ایک بار پھر اس نے اٹھ کر اقبال کو مرحبا کہا اور ہاتھ ملا کر رخصت کر دیا۔ تین چار دن تک کاغذای کارروائیاں چلتی رہیں۔ اس دوران انور نے اقبال کو شہر کے خاص مقامات دکھائے۔

مکان کے ملنے تک وہ انور ہی کے کوارٹر میں ہی رہا۔ شط العرب کے کنارے یہ ایک تین منزلہ ماڈرن عمارت تھی۔ بظاہر شط العرب پر ہی مالکانہ حقوق کے لیے ایران عراق جنگ ہو رہی تھی۔ بصرہ سے تقریباً دس کلومیٹر شمال میں فرات اور دجلہ دریاؤں کا سنگم ہوتا تھا اور بہت چوڑا پاٹ بناتے ہوئے بصرہ شہر سے گزرتا ہوا شط العرب میں مل جاتا تھا۔ شط العرب آگے چل کر بحر عرب میں مدغم ہو جاتی تھی۔ بصرہ شہر اس کے دونوں کناروں پر بسا

ہوا تھا۔شہر کے مشرقی حصہ میں جانے کے لیے بڑی کشتیاں،جن کو فیریز کہا جاتا تھا،چلتی تھیں۔جن پرلوہے کا پلیٹ فارم بنا ہوتا تھا جس پر کاریں اور دوسری چھوٹی گاریاں چڑھائی جاتی تھی۔ایک حصہ میں مسافر بنچوں پر بیٹھ جاتے تھے۔بہ مشکل تمام یہ پانچ منٹ کا سفر تھا۔دوسرے کنارے پر کشتی پلیٹ فارم سے مل جاتی تھی اور کاریں وغیرہ اتر جاتی تھیں۔دریا کے دونوں کناروں پر کھجوروں کے باغات اور پارکوں کا ایک سلسلہ سا تھا۔ جہاں جگہ جگہ اوپن ایئر ریسٹورنٹ بھی تھے۔امن کے زمانے میں یہ علاقے پکنک منانے والوں سے بھرے رہتے تھے۔لیکن اب جنگ کی وجہ سے یہ علاقہ تقریباً ویران ہو چکا تھا۔اقبال کی قسمت کہ وہ ایک جمہوری ملک سے نکل کر،فیملی اور دوستوں کی محفلیں،علی گڑھ کی زوردار شرارتیں اور مباحثے چھوڑ کر،ایک ایسے ملک میں آبسا تھا جو نہ صرف مکمل جنگ میں ملوث تھا بلکہ اس ملک کے بھی ایسے شہر میں جو دشمن ملک کے خاص نشانے پر تھا اور جہاں سے محاذ صرف دس کلومیٹر دور تھا۔بصرہ،چونکہ عراق کا واحد پورٹ سٹی تھا اور تقریباً نوے فیصد شیعہ علاقہ تھا لہٰذا ایران کی اسٹریٹجی تھی کہ جنوبی عراق کو،جس میں اہم شیعہ علاقے آتے تھے جیسے کربلا،کوفہ،نجف وغیرہ،بغداد جانے والی تنہا سڑک سے کاٹ دے۔اس طرح شیعہ علاقوں میں بدامنی پھیلا کر کم از کم آدھے عراق پر قبضہ کر کے اسلامی انقلاب کو عرب علاقوں میں بھی ایکسپورٹ کر دے اور آیت اللہ خمینی کے اسلامی انقلاب کے پرچم تلے ایرانی افواج،عرب دنیا میں بھی خمینی برانڈ اسلامی حکومتیں قائم کر دیں۔اس زمانے میں دنیا بھر کی اسلامی تحریکات بلاتفریق مذہب و ملت آیت اللہ خمینی کو خلیفۃ المسلمین سے بھی زیادہ اہمیت دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ طاغوتی نظام کو ختم کرنے کے لیے آخر ایک اسلامی شخصیت صدیوں بعد ابھر کر آئی ہے۔حالانکہ جتنی بھی جنگ ایران لڑ رہا تھا وہ سب شاہ ایران کے جمع کیے ہوئے ہتھیاروں سے لڑ رہا تھا جو امریکہ سے حاصل کیے گئے تھے اور شاہ کی ہی ٹرینڈ افواج کے بل بوتے پر لڑ رہا تھا۔خمینی کو ایران میں انقلاب لائے ہوئے تو بھی کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ اسلام پسندوں کا جوش و خروش تمام دنیا کو مسل دینے کا ارادہ اور یقین رکھتا تھا خاص طور سے یہ لوگ پوری دنیائے اسلام میں اسلامی انقلاب

برپا کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور انہیں پورا یقین تھا کہ بس اب چند ہی برسوں میں پوری دنیا میں اسلامی انقلاب بپا ہو جائے گا۔

دوسری طرف صدام حسین کی باتھسٹ بعث حکومت اسے عرب ایران جنگ بنانے پر تلی ہوئی تھی اور یہ پروپیگنڈہ کامیاب بھی ہو رہا تھا۔کویت اور سعودی عرب سمیت تمام عرب دنیا، صدام حسین کی پوری طرح مدد کر رہی تھی۔صدام حسین کے پاس بھی انتہائی ٹرینڈ فوج تھی جسے روسی بلاک نے ہتھیاروں سے لیس کر رکھا تھا۔عرب دنیا میں سوشلسٹ انقلاب کی ہراول جماعت، عرب بعث پارٹی کے صدام حسین صدر بھی تھے اور اب یہ جماعت روسی کمیونسٹوں پارٹی کے طرز پر پورے عراق پر حکمراں تھی۔اسی نظریہ کی حامل دوسری پارٹی نے شام پر قبضہ کر رکھا تھا۔یہ لوگ سوشلزم اور کمیونزم کے ساتھ ساتھ عرب نیشنل ازم کے بھی زبردست حامی تھے لہٰذا پورے عراق میں ہر جگہ امت عربیہ واحدہ کے نعرے لکھے ہوئے نظر آتے تھے۔

بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ مہذب دنیا اتنی بڑی تباہی ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی اور جلد ہی یو این او، اور عالمی طاقتیں مل کر جنگ کا خاتمہ کرا دیں گی جیسا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسے اکثر مراحل پر امریکی اور سوویت بلاک نے مل جل کر مداخلت کی تھی اور مسائل حل کرائے تھے۔لیکن یہ معاملہ کچھ دوسرا ہی تھا۔اب کی بار دونوں بلاکس ساز باز کیے ہوئے تھے کہ یہ جنگ جتنی لمبی چلے گی ان دونوں کا اتنا ہی فائدہ تھا۔اول یہ کہ ایک زمانے سے جمع کیے ہوئے ہتھیار جو امریکی اور روسی فیکٹریوں میں زنگ کھا رہے تھے، منہ مانگی قیمتوں پر فروخت ہونے لگے جس سے ان کی اقتصادی حیثیت میں بے پناہ ترقی ہونے لگی اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۷۳ء میں آئل نیشنلائزیشن کے بعد عرب دنیا اور ایران میں جو دنیا بھر کی دولت جمع ہو گئی تھی جو ٹریلنز آف ڈالرز سے بھی متجاوز تھی، ریسائیکل ہو کر پھر سے ان کے پاس پہنچنے لگی جہاں سے آئی تھی۔تیسرا زیادہ اہم پہلو یہ تھا کہ ایرانی اسلامی انقلاب کا رخ اگر روس یا اسرائیل کی طرف مڑ جاتا تو دنیائے اسلام متحد ہو سکتی تھی اور امریکہ و روس کو ایک بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔اسلامی جوش جو دنیا بھر کے مسلمانوں

میں اور خاص طور سے ایران میں پیدا ہوا تھا اس کو کہیں نہ کہیں خرچ تو ہونا ہی تھا لہٰذا بہتر یہ تھا کہ یہ آپس میں ہی لڑ بھڑ کر ختم ہو جائیں اور زخموں سے چور یہ ملت پھر سے ہمارے دروازوں پر بھیک مانگتی ہوئی نظر آئے۔

مغربی جمہوری طرز حکومت جو ہندوستان میں رائج ہے، جس میں ہر انسان کو ہر قسم کے نظریات فروغ دینے کا حق حاصل ہے اور ہر کوئی اپنی پارٹی بنا کر الیکشن لڑنے کا حق دار ہے، اخبارات اور میگزینز پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہیں۔ انڈیا سے آنے کے بعد اقبال کو ایک ایسے ملک میں رہنا تھا جہاں کوئی اختیار کسی کو نہ تھا بلکہ اختیار کے معنی ہی یہ تھے کہ سارا اختیار تو صرف ایک شخص کا ہے۔ اخبارات صرف حکومت چھاپ سکتی تھی۔ پورے ملک میں ایک لفظ بھی پارٹی کی مرضی کے بغیر چھاپنا تو بڑی بات ہے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ پورا نظام مملکت جاسوسی پر چل رہا تھا۔ ہر تیسرا شخص حکومت کے لیے مخبری کرتا تھا۔ کسی بھی محفل میں سیاسی یا معاشی مسائل پر کوئی زبان بھی نہیں کھول سکتا تھا۔ اگر کہیں ایسا ہوتا تو فوراً ہی حکومت کو خبر دی جاتی تھیں اور اگر یہ پایا گیا کہ فلاں کے نظریات پارٹی سے میل نہیں کھاتے اور وہ بیان کرتا ہوا پایا گیا تو حکومت کی طرف سے سخت سزا دی جاتی تھی۔ سزا جرم کے حساب سے پھانسی تک ہو سکتی تھی۔ ایسے مواقع پر سزا یافتہ کے رشتہ داروں کو کھل کر حکومت کی تعریف کرنی ہوتی تھی۔ وہ اپنے عزیز کا ماتم بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ماتم سے بھی ایک طرح کی بغاوت کی بو آتی تھی۔ اگر کسی گھر میں کوئی خفیہ میٹنگ ہوئی اور حکومت کو پتہ چلا گیا تو مالک مکان سمیت پورے گھر کو بلڈوزر سے مسمار کر دیا جاتا تھا۔ اسٹالن نے اپنے زمانہ حکومت میں بیس لاکھ سے زائد لوگوں کو اپنے وطن سے نکال کر ریلوں، بسوں، ٹرکوں میں بھر کر سائبیریا کے برفیلی علاقوں میں چھڑوا دیا تھا جہاں تمام ہی لقمۂ اجل بن گئے۔ یہاں بھی ہر شخص پارٹی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا۔ ذرا کسی پر شک ہوا اور پھر وہ کبھی دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس کے گھر والے کھل کر تلاش بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر بیٹا باغی ہو گیا تو باپ خود اس کی رپورٹ کرنے جاتا تھا کہ اس طرح گھر کے باقی لوگ تو زندہ رہیں گے۔ صرف پارٹی کے وفاداروں کو ہی تمام انتظامی عہدے دیے جاتے

تھے۔ڈپارٹمنٹ کا چیئرمین وفیکلٹ کا ڈین اور یونیورسٹی پریسیڈنٹ، سب کے سب پارٹی کے وفادار اور آزمودہ کارکن ہوتے تھے۔ ہر محلے میں پارٹی کے دفاتر تھے جن کا کام ہی یہ تھا کہ وہاں رہنے والے ہر شخص کی فائل بنائے رکھیں۔صدام حسین کی تصاویر کلاس رومز تک میں لگی ہوئی تھیں۔طلباء کو داخلے لینے کا اختیار تک نہیں تھا۔حکومت خود فیصلہ کرتی تھی کہ کس طالب علم کو کیا کورس کس یونیورسٹی سے کرنا ہے۔ایک دن اس کے پاس اطلاع آجاتی تھی کہ فلاں تاریخ کو فلاں یونیورسٹی میں رپورٹ کرنا ہے عام طور سے شمال کے طلباء جنوب اور مغرب کے مشرق کی یونیورسٹیوں میں بھیجے جاتے تھے کہ طلباء میں کسی طرح کی ایسوسی ایشن نہ پنپنے پائے۔ ٹیلی ویژن، اخبارات اور ریڈیو، دن رات صدام حسین کی تصاویر اور سپیچیز دکھاتے اور نشر کرتے رہتے تھے۔اس کے علاوہ دوسری کوئی بات کان میں نہیں پڑتی تھی۔صرف ایک اخبار پارٹی کا نکلتا تھا۔دنیا کا کوئی میگزین یا اخبار ملک میں لانا جرم تھا۔ایسے ماحول میں اقبال کو ایک ایک دن کاٹنا مشکل ہو رہا تھا۔اس نے شاذیہ کو لکھ دیا کہ وہ واپس آرہا ہے۔صدام حسین کے وہ ساتھی اور قریبی دوست جنھوں نے نیشنلزم کی محبت میں انقلاب لانے میں مدد کی تھی اب کہیں نظر نہیں آتے تھے۔سب یا تو ختم کردیے گئے تھے یا خود ہی ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔وہ صدام کے لیے برابر کے ساتھی تھے اور مسئلہ پیدا کرسکتے تھے۔لہٰذا آڈیالوجی کے باغی کا خطاب دے کر سب سے پہلے ان ہی کو سزائیں دی گئیں۔

ایک آزاد جمہوریہ میں بھرپور سماجی اور سیاسی زندگی گزارنے کے بعد ایک ایسے ملک میں زندگی کرنا جو پوری طرح سوشلسٹ ڈکٹیٹرشپ کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا کسی بھی حساس آدمی کے لیے انتہائی دشوار کام تھا۔اقبال کے ہندوستانی یا پاکستانی دوستوں میں زیادہ تر کا کوئی خاص بیک گراؤنڈ نہیں تھا۔بس اتنا کہ سر جھکا کر اور آنکھیں بند کر کے تعلیم کا دور پورا کیا اور کسی طرح سپروائزر کی حکم برداری کر کے پی ایچ ڈی مکمل کی اور موقع ملتے ہی یونیورسٹی ٹیچنگ میں چلے آئے اور زندگی کا مقصد پورا ہوگیا۔لہٰذا ایسے لوگوں سے اقبال کی فریکیونسی کسی نہ کسی مسئلہ کو لے کر بگڑتی رہتی تھی۔اندرونی زندگی یہ تھی اوپر سے آئے دن

ایرانی بمبار بصرہ پر بمباری کرتے رہتے تھے۔اکثر ابادان کی لانگ رینج آرٹیلری سے شہر پر بم پھینکے جاتے تھے۔میزائل اس زمانے میں دونوں میں سے کسی بھی ملک کے پاس نہیں تھے۔اگر ایسا ہوتا تو شاید بصرہ شہر میں ایک بھی گھر نہ بچتا۔بمبار طیاروں کے پائلٹوں کو بھی اپنی جان کا خطرہ ہوتا تھا کہ اینٹی ایئر کرافٹ گنز شہر میں کئی جگہ ایستادہ تھیں اور جیسے ہی ہوائی حملہ کا سائرن بجتا تھا، نیچے سے بھی فائرنگ شروع ہو جاتی تھیں۔اس لیے بمبار کہیں بھی بم گرا کر اپنی جان بچا کر بھاگتے تھے۔ان کے لیے کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ ملٹری ٹارگیٹ پر ہی بم گرائیں لہٰذا اکثر شہری آبادی ان کی زد میں آجاتی تھی۔ایک بار تو بھری ہوئی بس پر بم گرا اور اس میں آگ لگ گئی تمام مسافر زندہ جل کر راکھ ہو گئے۔لانگ رینج آرٹیلری سے جو بم پھینکے جاتے تھے وہ کئی کلومیٹر دور سے آتے تھے لہٰذا زیادہ بڑے نہیں ہوتے تھے لیکن اس میں سے نکلنے والے اسپلنٹرز جو سیکڑوں کی تعداد میں ہوتے تھے چاروں طرف گولیوں کی طرح نکلتے تھے۔اگر کسی کی ہاتھ میں لگ گیا تو ہاتھ کٹ گیا۔کسی کی ٹانگ میں لگ گیا تو ٹانگ پوری خراب ہو جاتی تھی اور اگر کسی نازک جگہ لگ گیا تو آدمی مر بھی جاتا تھا۔اس طرح کے زخمی شہریوں کی تعداد بھی سیکڑوں سے متجاوز کر گئی۔اسپتالوں میں اب اور کسی طرح کے مریضوں کے لیے بالکل جگہ نہیں تھی۔اقبال اکثر یہی دعا کرتا تھا کہ اگر ایسا ہو تو کام ہی تمام ہو جائے ورنہ یہ نہ ہو کہ لولہ یا لنگڑہ ہو کر انڈیا واپس جائے۔اس لیے جہاں تک ممکن تھا وہ لوگ عمارتوں کے اندر رہتے تھے اور اگر بازاروں میں جانا ہوتا تو بھی شیڈ میں ہی چلنے کی کوشش کرتے تھے۔ایک دن وہ سکنڈ فلور پر فائنل ایئر کلاس لے رہا تھا کہ لانگ رینج آرٹیلری سے حملہ شروع ہوا، کئی بم نیچے لان میں آکر گرے زور کا دھماکہ ہوا۔خیریت ہوئی کہ اس وقت لان بالکل خالی تھا۔تمام اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز اپنے کلاسوں سے نکل کر ایک ساتھ گراؤنڈ فلور پر جانے کے لیے نکلے اور زینوں پر بھگدڑ سی مچ گئی۔وہ بھی جان بچا کر نیچے کی طرف دوڑا۔پندرہ منٹ کے بعد حملہ بند ہوا اور آل کلیئر سائرن بجا تو اقبال یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تقریباً تمام ہی لڑکے لڑکیاں کلاس میں موجود تھے اور کسی کے چہرے سے پریشانی یا گھبراہٹ کا احساس تک نہیں ہو رہا تھا۔

عراقی عوام کے حوصلے اور زندگی کے خروش کو دیکھ کر وہ اکثر حیران رہ جاتا تھا۔ باوجود جنگ کے شہر میں ہر کام ایسے جاری تھا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔ بازار کھلتے تھے امتحان اور کلاسس اپنے وقت پر ہوتے تھے۔ تمام کاروبار آرام سے چل رہا تھا۔ تعلیم چونکہ ہر ایک کے لیے ضروری قرار دے دی گئی تھی اور طلباء کا اسکالرشپ بھی دی جاتی تھی لہٰذا یونیورسٹی میں لڑکے لڑکیاں پورے جوش سے آتے تھے۔ پورا کیمپس حسین لڑکیوں اور اسمارٹ لڑکوں سے جگمگاتا رہتا تھا۔ لڑکیاں بلیک اسکرٹ اور سفید ٹاپ پہنتی تھیں اور لڑکے بھی گرے پینٹ اور سفید شرٹ پہنتے تھے۔ لڑکیاں مکمل میک اپ میں کلاس آتی تھیں اور لڑکوں سے بالکل برابری کی سطح پر بات کرتی تھیں۔ کلاس کارکردگی میں بھی وہ کسی طرح لڑکوں سے کم نہیں تھیں۔ اقبال کے کلاس میں اوپر کی تینوں پوزیشنز لڑکیوں ہی کے پاس تھیں۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کی طرح یہاں بھی پڑھائی میں طلباء بہت اچھے تھے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت ہاتھ ملانا ضروری رسم تھی۔ ٹیچرز سے بھی تمام طلباء ہاتھ ضرور ملاتے تھے اور آپس میں ہاتھ ملا کر رخسار پر کِس بھی کرتے تھے۔ یونیورسٹی کے تمام آفس زیادہ تر خواتین ہی چلاتی تھیں۔ شہر کے دوسرے دفاتر کا بھی یہی حال تھا۔ شہر میں بہت سے نائٹ کلبس تھے جہاں مختلف ملکوں کی ڈانسرز کمال دکھاتی تھیں۔ شراب نوشی پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بلکہ پورٹ سٹی کے ہونے کی وجہ سے پینے پلانے کی کچھ زیادہ ہی آزادی تھی۔ شام کے بعد کھلے عام شراب پی جاتی تھی۔ مختصراً یہ ایک ایسا جنت نشان شہر تھا جو رفتہ رفتہ انسانوں کو مدفن اور جہنم کا نمونہ بنتا جارہا تھا۔ مستقبل نقش دیوار تھا مگر حال کی مدہوشی میں کوئی کمی نہ تھی۔

زیادہ تر طلباء اس کے ہم عمر ہی تھے لہٰذا ان سب سے ایک طرح کی دوستی سی ہوگئی تھی اور وہ اس سے بے تکلفی سے بات کرتے تھے۔

''کیا ہوا ہے تمہیں، یہ کالے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟ اتنی اداس کیوں ہو؟'' اقبال نے حیران ہو کر گیلری سے گزرتی سلمٰی سے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔

''سر، آپ کے چیمبر میں آؤں گی اس کلاس کے بعد۔'' اس نے اقبال کو بھیگی آنکھوں

سے دیکھتے ہوئے جواب دیا اور تیزی سے گزر گئی۔ اقبال نے اندازہ لگایا کہ اس کے ساتھ کوئی بڑا حادثہ پیش آیا ہے۔ سلام جلیل عبدالحسن کو سب سلمٰی کہتے تھے وہ فائنل ایئر کر رہی تھی اور اقبال کے کلاس کی سب سے ذہین اور حسین لڑکی تھی۔ نہ صرف پڑھائی میں بلکہ مباحثے میں بھی وہ پوری فیکلٹی میں اپنی الگ پہچان رکھتی تھی۔ سنہرے کٹے ہوئے کھلے بال، لمبا قد، بنفشی رنگت، خوبصورت نقش و نگار، مختصر یہ کہ اسے بصرہ کی حور کہا جا سکتا تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد اس نے دروازہ کھول کر اقبال کے چیمبر میں جھانکا۔

''آجاؤ، آرام سے بیٹھو، بتاؤ کہ کیا ہوا ہے تمہیں؟'' اقبال نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

''سر، میرے اکلوتے بڑے بھائی جنگ میں کام آ گئے۔'' اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا اور آہستہ آہستہ رونے لگی۔ کچھ دیر تک اقبال کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

''یہ تو بہت بڑا سانحہ ہے۔'' اس نے صرف اتنا کہا اور خاموش ہو گیا۔

وہ کافی دیر تک سسکیاں لیتی رہی پھر ٹشو نکال کر آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''ساری سر۔''

''لیکن یہ سب کیسے اور کب ہوا؟'' اس نے ساری ہمدردیاں لہجے میں سموتے ہوئے پوچھا۔

''سر، میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم دو بہنوں کے ایک ہی بھائی تھے اور میڈیکل اسٹور چلاتے تھے۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر رونے لگی۔ چند لمحوں کے بعد بتایا ''ابھی ایک مہینہ پہلے انہیں جنگ پر بلا لیا گیا تھا۔''

''ایک دوکاندار کو جنگ پر کیسے بلایا جا سکتا ہے! وہ منع کر سکتے تھے؟'' اقبال نے حیران ہو کر سوال کیا۔

''سر، آپ نہیں جانتے۔ حکومت کے ہر حکم کو بس ماننا ہی ہے۔ میدان جنگ میں تو بچ جانے کا کوئی امکان بھی ہے انکار کے بعد تو بس پھر مرنا ہی ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''اوہ! یہ تو واقعی بہت برا ہے۔ کسی عدالت میں نہیں جا سکتے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''سر، یہ بہت بری حکومت ہے آپ نہیں جانتے۔'' اس نے یہ کہہ کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔شیشے کے دروازے کے باہر کوئی گیلری سے گزر رہا تھا۔

''مجھے جانا چاہیے اگر کسی نے سن لیا تو ہم دونوں کی مصیبت آجائے گی۔'' اس نے گھبرا کر اٹھ کر جاتے ہوئے کہا۔

''نہیں تم بیٹھو۔ یہاں کوئی نہیں سن رہا۔'' اقبال نے سختی سے کہا وہ دوبارہ بیٹھ گئی مگر گھبراہٹ ابھی تک چہرے سے عیاں تھی۔

''سر، میں بتا نہیں سکتی کہ آپ کے پاس مجھے کتنا سکون ملتا ہے۔ یہاں کوئی کسی سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ ہر کوئی مخبری کرتا ہے خود میرے ماں باپ اور بیوہ بھابھی بھی کھل کر اپنے غم کا اظہار نہ کر سکیں کہ حکومت کی نافرمانی نہ سمجھ لیا جائے۔ ہم تو کھل کر رو بھی نہیں سکتے سر۔'' اس نے غمزدہ آنکھوں سے اقبال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'مجھ سے کہو جو کہنا ہے۔'' اقبال نے اسے دلاسہ دیا۔

''اسی لیے میں اتنی دیر سے یہاں ہوں۔اور ہر بات آپ کو بتا دیتی ہوں۔'' اس نے لمبی سانس لی۔

''اچھا یہ کالے کپڑے کس لیے پہنے ہیں۔'' اقبال نے جاننا چاہا۔

''انڈین مسلمز میں نہیں ہوتا سر؟'' یہاں مرنے والے کے گھر کی خواتین چالیس دن تک کالے کپڑے پہنتی ہیں۔'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں ہمارے یہاں یہ رسم نہیں ہے۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اتنی بہت سی لڑکیاں جو کالے کپڑے پہن کر یونیورسٹی آرہی ہیں ان کے گھر میں کوئی نہ کوئی مارا گیا ہے؟'' اقبال نے اندازہ لگایا۔

''ابھی کیا ہے۔اگر یہ جنگ بند نہ ہوئی تو ایک دن تمام لڑکیاں کالے کپڑے پہنے نظر آئیں گی۔سر اب میں چلوں گی۔کل پھر آؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔اگلے دو ہی مہینوں میں اس کی بات سچ ہوگئی جب ایک ایک کر کے تقریباً تمام لڑکیوں نے کالے کپڑوں میں کلاس آنا شروع کر دیا۔خوبصورت ہنستے کھیلتے چہرے غمگین اور اداس ہو کر رہ

گئے۔ پوری یونیورسٹی غم اور اداسی کے ماحول میں ڈوب گئی۔لڑکیاں اپنے بھائیوں اور رشتہ داروں کے مرنے سے اداس رہنے لگیں تو لڑکے اس لیے کہ فائنل ایئر کے بعد دو سال کی لازمی فوجی ٹریننگ میں جانا ہے۔اور چونکہ جنگ کا زمانہ تھا لہٰذا اب صرف چند ماہ کی ٹریننگ کے بعد ہی محاذ پر بھیجا جا رہا تھا۔ نہ صرف فائنل بلکہ سکنڈ ایئر کے لڑکوں کو بھی کسی بھی وقت ٹریننگ کے لیے بلا لئے جانے کا نوٹس دے دیا گیا تھا۔ حالات ان غنچوں کے بن کھلے مرجائے جانے کا سامان کر چکے تھے۔اسٹوڈنٹس کے غم میں وہ برابر کا شریک تھا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ خود بھی ایک اسٹوڈنٹس ہی تھا اور بھی تک وہ مکمل ٹیچر نہیں بن پایا تھا۔ یہاں بھی بہت سے طلباء اپنے دل کی تمام باتیں اس سے کر سکتے تھے۔حالانکہ اس میں خطرہ تھا کہ مخبری نہ ہو جائے کہ وہ طلباء کو بھڑکا رہا ہے۔مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب زیادہ دن یہاں نہیں رہنا ہے۔اس کے کئی ٹیچر دوست جنگ پر بلائے جا چکے تھے اور کئی ٹیچرز فوجی ڈریس میں کلاس لینے آنے لگے تھے۔ پھر ایک دن اس کے چیئر مین نے بھی فوجی ڈریس میں آفس آنا شروع کر دیا۔ان تمام باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ عراق جنگ میں پسپا ہو رہا ہے اور اپنے تمام ہتھیار استعمال کرنے پر آمادہ ہے حتیٰ کہ اساتذہ تک کو محاذ پر بلایا جا رہا ہے۔دنیا تماشہ دیکھ رہی تھی۔ یورپ، امریکہ، روس اور تمام ترقی یافتہ ممالک کی اقتصادیات اب نئی اونچائیاں چھو رہی تھیں۔ان کے سارے ذخیرہ شدہ ہتھیار منہ مانگے داموں پر فروخت ہو رہے تھے۔ادھر اسلامی فوجوں کا جوش تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ یہاں سوشلسٹ حکومت بھی ایران کو تباہ کرنے کے درپے تھی۔ایک پاگل پن تھا کہ دونوں حکومتوں پر سوار تھا۔اتنے میں ایک دن یہ انہدوہناک خبر آئی کہ اسرائیل نے بغداد کے قریب عراق کے اکلوتے ایٹمی ری ایکٹر پر تباہ کن حملہ کیا ہے اور ری ایکٹر مکمل طور پر برباد ہو گیا ہے۔اسرائیلی جنگی جہاز اپنے اڈوں سے اڑے اور تباہی پھیلا کر واپس بھی چلے گئے۔رراڈرز اور فوج کو کچھ بھی پتہ نہ چلا اور دسوں سال کی محنت چند منٹوں میں خاک میں مل گئی۔اس جنگ کا ایک بڑا مقصد امریکہ کو حاصل ہو گیا تھا کہ عرب اب صدیوں تک ایٹمی طاقت بننے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔اس دن اقبال نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ

کرلیا اور ڈین آفس جا پہنچا۔

''کیا ہے یہ؟'' ڈین نے اس کا استعفیٰ ہاتھ میں لے کر پوچھا۔ وہ ملٹری یونیفارم پہنے ایک بڑی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا تھا۔ میز پر کاغذات فائلوں کے علاوہ ایک ریوالور بھی رکھا ہوا تھا۔

''یہ استعفیٰ ہے۔ میں نوکری چھوڑ رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیوں استعفیٰ دینا چاہتے ہیں؟'' ڈین نے چشمہ درست کرتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔ وہ کوئی پچپن سال کا صحتمند شخص تھا۔ کسی زمانے میں پولینڈ سے پی ایچ ڈی کی تھی اور حکمراں جماعت میں بھی اس کے پاس ایک بڑا عہدہ تھا۔ پارٹی میں وہ یونیورسٹی پریسڈنٹ سے بھی زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا۔ اقبال اس پر چلانا چاہتا تھا کہ جہاں ڈین اور چیئر مین تک ملٹری یونیفارم پہنے ہوں جہاں روزانہ بم گر رہے ہوں پورا شہر میدان جنگ بنتا جا رہا ہو، وہاں پڑھائی لکھائی کے کیا معنی ہیں؟ اس سے بہتر ہے کہ یونیورٹی بند کر دی جائے اور صرف جنگ لڑی جائے۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ بس کرسی پر بیٹھتے ہوئے اتنا کہا۔

''سر یہ میری پرسنل پروبلم ہے۔''

''لیکن ہم امتحانات سے پہلے اپنے اسٹاف کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ابھی کورس بھی باقی ہیں۔ امتحانوں کے بعد رزلٹ بھی نکالنا ہے۔'' اس نے قائل کرنے والے انداز میں کہا۔ اقبال نے دل میں جواب دیا کہ رزلٹ تو سر آپ کی پوری قوم کا نکل چکا ہے آپ کو پتہ ہی نہیں۔

''وہ آپ کی پروبلم ہے سر'' اس نے جواب دیا۔

''ہاں یہ ہماری پرابم ہے اسی لیے ہم یہ استعفیٰ منظور نہیں کر سکتے۔'' اس نے اقبال کا فلسفہ واپس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''لیکن ان حالات میں کیسے رہوں گا میں یہاں؟'' اقبال نے پھر اپنی بات کہی۔

''داکٹر اقبال، دھیان سے میری بات سنو۔ تم ایک نوجوان آدمی ہو۔ ابھی زندگی کے حقائق کا تمہیں کچھ پتہ نہیں ہے۔ اگر آج میں یہ استعفیٰ منظور کرلوں تب بھی کاغذی کارروائی پوری ہونے میں تنخواہ اور ٹکٹ کے معاملات طے ہونے میں دو مہینہ لگ جائیں

گے تین مہینہ کے بعد امتحانات تک صرف ایک مہینہ اور تمہیں رکنا ہوگا۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ استعفیٰ واپس لے لو۔ اپنے دوستوں سے پوچھ لو۔ تین مہینہ میں یہاں سے اپنے گھر جا سکتے ہو۔ ہمارا کام بھی پورا ہو جائے گا۔ اس وقت یہ اپنے پاس رکھو۔ دو تین دن اطمینان سے انکوائری کرلو پھر میرے پاس آنا۔'' اس نے اقبال کو استعفیٰ واپس کرتے ہوئے سمجھایا۔ اقبال نے کاغذ واپس لے لیا اور چلا آیا۔ دوستوں سے اور آفس میں معلومات کیں تو پتہ چلا کہ ڈین ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عراق چھوڑنے میں تین مہینے سے کم نہیں لگتے تھے۔

ایران - عراق جنگ کے علاوہ اسرائیل کے حملہ کی وجہ سے عوام میں ٹینشن عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ کسی بھی وقت ایک اور عرب اسرائیل جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ عراق نے اپنی کچھ فوج شمالی بارڈر کی طرف روانہ بھی کر دی تھی۔ سیریا، جارڈن اور مصر نے بھی اپنی فوج کو موبیلائز کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اگر عرب اسرائیل جنگ شروع ہو جاتی تو ایران کو عراق پر فتح حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ خاص طور سے جنوبی عراق پر، جس میں بصرہ، کربلا، کوفہ، نجف کے شیعہ علاقے آتے تھے۔ ایرانی فوج کو یہاں داخل ہونے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں بصرہ میں کام کرنے والے غیر ملکیوں کا بس خدا ہی حافظ تھا لیکن غالباً امریکہ اور روس کی دخل اندازی سے عرب اسرائیل جنگ شروع نہیں ہوئی۔ اسرائیل نے اپنا مقصد چند ہی منٹ کے حملے میں حاصل کر لیا تھا۔ لہٰذا اسے بھی اب جنگ شروع کرنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ بھی پوری دنیا کی طرح دو مسلم ممالک میں جنگ کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک طرف سوشلسٹ عراق تھا اور دوسری طرف خمینی کی اسلامی افواج۔ عرب دنیا، خمینی کے اسلامی انقلاب کو اپنے علاقوں میں داخل ہونے سے بہرصورت روکنا چاہتی تھی۔ لہٰذا پوری عرب دنیا میں ملت عربیہ واحدہ کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ عرب لیگ کے تمام ممالک دل کھول کر صدام حسین کی مدد کر رہے تھے کہ اگر عراق ہار گیا تو کویت یا سعودی عرب خمینی کو نہیں روک سکتے تھے۔ دوسری طرف ایرانی مذہبی لیڈران کمیونسٹ عراق کے خلاف اسلامی جہاد کا نعرہ لگا رہے تھے۔ خمینی کی تقاریر نے ایرانی عوام میں بے پناہ جوش بھر دیا تھا اور وہ

اسلام کے لیے کسی بھی طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔مختلف شہروں میں جلسے کیے جارہے تھے۔جلوس نکالے جارہے تھے اور ہزاروں کی تعداد میں نوجوان جہاد میں شامل ہونے کے لے فوج میں بھرتی ہورہے تھے اور چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد ہی ان کو محاذ جنگ پر بھیج دیا جاتا تھا۔

''اسے حماقت ہی کہیں گے کہ یہ نوجوان،توپوں کے سامنے سینے کھول کر نعرۂ تکبیر کہتے ہوئے چلے آتے ہیں۔''اقبال کے ایک عراقی ٹیچر دوست احمد نے بتانا شروع کیا۔ دومہینہ محاذ پر ڈیوٹی دینے کے بعد وہ چند دنوں کی چھٹی میں گھر لوٹا تھا اور ڈپارٹمنٹ میں اپنے دوستوں سے ملنے چلا آیا تھا۔وہ سب اس وقت اقبال کے چیمبر میں بیٹھے تھے۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔''اقبال نے حیرانی سے جواب دیا۔کوئی اتنا بے رحم نہیں ہوسکتا کہ نوجوان لڑکوں کو ٹرینڈ فوج سے جنگ کرنے بھیج دے؟ جنگ ایک سائنس ہے کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔''

''تمہیں یقین کرنا پڑے گا۔پوری دنیا کے سامنے یہ تماشہ ہورہا ہے۔ایران خود اپنے ٹی وی چینل پر ان نوجوانوں کو سر پہ اللہ اکبر کی پٹیاں باندھے،ہاتھ میں بندوقیں لیے اسلامی نعرے لگاتے ہوئے،بارڈر کی طرف کوچ کرتے ہوئے دکھارہا ہے جنگ کو بھی وہ ایرانی انقلاب کی طرح سمجھ رہے ہیں۔جیسے عوامی طاقت سے انھوں نے شاہ ایران کو ہرادیا،اسی طرح وہ عراق کو ہرا کر اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں''احمد نے تفصیل سے بیان کیا۔

''لیکن یہ دوممالک کے درمیان بھرپور جنگ ہے۔پوری طرح تربیت یافتہ فوج چاہے پبلک اس میں کیا کرسکتی ہے؟''اقبال نے پھر حیرت سے سوال کیا۔

''یہ انہیں کون سمجھائے۔''احمد نے ہاتھ اٹھادیئے۔

''لیکن تم کیوں اتنے پریشان ہو۔تم لوگوں کے لیے تو ان بچوں کا مارنا اور بھی آسان ہے۔''اقبال نے طنز کیا۔

''نہیں دوست۔ہم اتنے بے رحم نہیں ہیں۔ہمارے یونٹ کے کمانڈر کو پچھلے مہینہ ہی

مینٹل ہاسپٹل میں بھرتی کیا گیا اسی وجہ سے۔ ہمارا یونٹ ایرانی بارڈر کے ذرا اندر ایک چھوٹی پہاڑی پر تعینات ہے۔ تم یقین نہیں کر سکتے کہ کس طرح سیکڑوں نوجوان ایک ہاتھ میں رائفل لیے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اور جیبوں میں آیت اللہ خمینی کا جنت میں داخلے کا سفارشی خط لیے، بے خوف وخطر، بغیر یہ احساس کیے ہوئے کہ ہماری توپیں گولے برسا رہی ہیں، جہاد کے نشہ میں چور، بس دوڑتے ہی چلے آتے ہیں۔ میں نے تو بس ایک بار ہی یہ منظر دیکھا لیکن ہمارا کمانڈر کئی بار ان لڑکوں کو چڑیوں کی طرح شوٹ کر چکا تھا۔ لیکن آخری بار اس سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور اپنی پناہ گاہ سے نکل کر اپنی ہی توپوں پر رائفل کو ڈنڈوں کی طرح برسانے لگا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے پکڑ کر باندھا گیا۔ آج کل وہ ایک مہینہ سے دماغی اسپتال میں زیر علاج ہے۔'' احمد نے پرسوز لہجے میں بیان کیا۔

''یا خدا ایسا بھی ممکن ہے اس دنیا میں!'' اقبال نے زور سے آہ بھری۔ کچھ دیر تک سب لوگ خاموش ہو گئے۔ کئی ایک کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''لیکن تم وہاں کیسے رہ لیتے ہو؟'' احمد کے ایک دوست نے پوچھا۔

''میں چونکہ اکیڈمک برانچ سے ہوں لہٰذا پہاڑی سے تقریباً آدھا فرلانگ پیچھے، سپلائی لائن کا انچارج ہوں اور انڈر گراؤنڈ بنکر میں رہتا ہوں۔''

''واپس کب تک جانا ہے۔'' اقبال نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو کہ میرے انکل ہائی کمان کے بہت قریب ہیں۔ میں نے ان سے کہا ہے کہ وہ مجھے کسی سولین ایریا میں شفٹ کرا دیں۔ امید ہے کہ میں یہیں بصرہ ہیڈ کوارٹر میں ہی لگ جاؤں گا۔'' احمد نے پورے اعتماد سے بتایا۔

''اسی لیے تم اتنے سکون میں ہو۔'' اقبال نے طنز کیا۔

''الحمدللہ'' اس نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ پھر گھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔'' اس نے باری باری سب سے ہاتھ ملا کر رسمی کِس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ باقی سب لوگ بھی چیمبر سے اٹھ کر چلے گئے۔

☆

اقبال کی تمام امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑتی جارہی تھیں۔کسی طرح دل کو سمجھا تا تھا، کہ پھر کوئی نہ کوئی حادثہ سامنے آجا تا تھا۔احمد کی بتائی ہوئی باتوں سے تو اس کی ساری امیدیں جو کبھی کبھی سہارا دیتی تھیں، تمام راہیٔ ملک عدم ہو گئیں۔کیا اس نے سوچا تھا اور کیا پایا۔خواب تھا کہ شط العرب کے کنارے کھجوروں کے باغات اور خیابانوں میں دجلہ فرات کی لہروں پر کشتیوں میں انتہائی رومانٹک دن اور راتیں ہونگیں۔خوب بہت سے ڈالر ہوں گے کوئی غم نہ ہوگا نہ پریشانی۔مگر تعبیر تھی کہ لگتا تھا جیسے جان ہی لے کر جائے گی۔کسی بھی دن بموں کی زد میں آجانے کا خوف، حکمراں پارٹی کے شکنجے میں سسکتے سماج میں زندگی کرنے کی پریشانی، بے پایاں تنہائی کا غم۔لگتا تھا جیسے کوئی خنجر سینے کے پار ہے۔ جیسے جگر میں اٹک کر ہی رہ گیا ہے۔پار ہوتا تو شاید اتنی خلش نہ ہوتی۔وہ اس زمانے میں غالب کا مصرع صحیح معنوں کو سمجھ سکا۔مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا۔

وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹتا تھا۔صبح ہوگئی تو شام کرنا مشکل، بمشکل شام آئی تو خوف کہ رات کیسے کٹے گی۔راتوں کو بار بار اٹھنا نیند آئی تو ڈراؤنے خواب جگا دیتے تھے۔کلاس بھی لے لئے، ڈپارٹمنٹ بھی ہو آئے، کینٹین میں بھی کسی کے ساتھ بیٹھ لئے، پتہ چلا کہ ابھی صرف دو بجے ہیں۔ابھی تو تاریخ بدلنے میں دس طویل گھنٹے باقی ہیں۔ہما وغیرہ کی بار بار پڑھی ہوئی کہانیوں کو پڑھنا، کبھی کچھ دیر کرسی پر بیٹھ لئے، چند لمحے لیٹ گئے، کبھی چائے بنا کر پی لی، کبھی خواہ مخواہ یونہی کمرے میں چہل قدمی کر لی۔کچھ دیر یونہی بازار کا چکر لگا آئے۔کوئی انڈین پاکستانی یا بنگلہ دیشی مل گیا تو رسمی سی گفتگو کر لی۔یا اپنی پریشانیاں بیان کر لیں۔پتہ چلا کہ تہذیب تاریخ، مذہب، لٹریچر کسی چیز سے واقفیت نہیں اور نہ انٹرسٹ۔ غالب خسرو کا بس نام سنا ہے۔گاندھی جناح کو جاننے کا دعویٰ ہے۔سرسید علی گڑھ تحریک کا بھی نام سنا ہے۔گفتگو کریں تو کیا کریں۔حس مزاح تک نہیں۔مذاق بھی نہیں کر سکتے منہ لٹکا کر لوٹ آئے۔اتنے کام کر لئے لیکن ابھی تو صرف تین گھنٹے کٹے ہیں۔ابھی سات گھنٹے اور تاریخ بدلنے میں باقی ہیں۔اب کیا کریں۔آنکھیں بند کر کے صوفے پر لیٹ گئے

کہ اب کیا کریں۔ چلو کوئی کیسٹ سنتے ہیں غلام علی، مہدی حسن کی آوازیں پہلے ہی ذہن میں گونجنے لگتیں۔ میوزک جیسے کیسٹ سے پہلے ہی بجنا شروع ہو جاتا۔ اس کے منہ سے رفتہ رفتہ نکلا کہ ذہن نے ہستی کا ساماں تک چھلانگ لگا دی۔ یوں زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے۔ اس نے شاذیہ کو رفتہ رفتہ ساری باتیں تفصیل سے لکھ دیں اور اپنے آنے کا ارادہ بھی ظاہر کر دیا۔ اس کے لیے اس سے زیادہ خوش کی اور کیا بات ہو سکتی تھی۔

3.4 اتاترک فی کربلا

مئی کے آخر میں سوشلسٹ انقلاب کی برسی کے سلسلہ کی تقریبات کا آغاز ہو گیا۔ ان تقاریب کا سلسلہ تین دن تک چلتا رہتا تھا۔ سرکاری دفاتر، یونیورسٹیز وغیرہ سب بند ہو جاتے تھے۔ ہر جگہ صرف پارٹی کے فنکشن اور کلچرک پروگرام ہی ہوتے تھے۔ لہٰذا انور اور دو پاکستانی دوستوں، تنویر اور مدحت نے مل کر کربلا، کوفہ اور نجف جانے کا پروگرام بنا لیا۔ بصرہ سے شمال کی طرف تین سو کلومیٹر فاصلے پر یہ تینوں شہر تقریباً ایک دوسرے سے پچاس ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر بسے ہوئے ہیں۔ یہ تین دن کا سفر تھا لہٰذا ٹیکسی کو مستقل ساتھ رکھا گیا۔ مقامات تاریخی دکھانا، ہوٹل میں ٹھہرانا، واپس لانا ڈرائیور کے ذمہ کیا گیا۔ اس طرح یہ سفر بہت آسان ہو گیا۔ انور کے لیے تو یہ سفر ایک طرح سے حج کرنے کے مترادف تھا کہ اس کو امام حسینؑ حضرت علی اور تمام اہلبیت سے ایک والہانہ عقیدت اور عشق تھا۔ اس کو پتہ بھی نہ تھا کہ یہ عقیدت اور عشق خود ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سب سے پہلے کربلا جانے کا فیصلہ کیا گیا اس کے بعد نجف اشرف پھر کوفہ۔ یہ کاروان بدھ کے دن علی الصبح بصرہ سے کربلا کی طرف روانہ ہوا۔ شہر سے نکلتے ہی ہر طرف سکون اور سناٹا چھا گیا۔ کہیں کہیں آرمی کے ٹرک آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جنگ کا کوئی ماحول تھا اور نہ کسی آبادی کا نام و نشان۔ بس ریتیلے میدان اور کہیں کہیں کھجوروں کے درخت یا کسی گاؤں کے آس پاس اونٹ اور بکریاں چراتے لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے لوگ۔ ریتیلی گرم ہوائیں چلنے کی وجہ سے ٹیکسی کے شیشے چڑھا لئے گئے تھے۔ سڑک بہت

عمدہ بنی ہوئی تھی۔انڈین ٹھیکیداروں کی طرح یہاں کوئی چوری نہیں کرسکتا تھا۔لہٰذا حکومت کا ہر کام بہترین اوراپنے وقت سے پہلے مکمل ہوتا تھا۔یہ لوگ چوری کرنا جھوٹ بولنا یا دھوکہ دینا جیسے جانتے ہی نہ تھے۔جو بات تھی بالکل صاف تھی،داؤ پیچ جو ہم برصغیر کے لوگوں کا خاصہ ہے،ان کو چھوکر بھی نہیں گیا تھا۔صاف دلی صاف گوئی اور دیانتداری ان لوگوں پر ختم تھی۔اقبال کوعربوں سے مل کرسب سے زیادہ خوشگوار حیرت اسی بات پر ہوئی۔

وہ چاروں انتہائی مذہبی عقیدت مندی کے موڈ میں سفر کرر ہے تھے۔انورتو باوضوبھی تھا اورآہستہ آہستہ وردکرتا جارہا تھا۔تقریباً چار پانچ گھنٹے میں تین سوکلومیٹر کا سفرختم ہوا اور اب ٹیکسی کربلا کے شہر میں داخل ہونے جارہی تھی۔اقبال بہت انہماک سے سڑک کے دونوں طرف نہر فرات کوتلاش کرنے کی کوشش کررہا تھا جس کے کنارے وہ حق اور انصاف کا معرکہ ہوا تھالیکن دور دورتک صحرا تھا یا کھجوروں کے باغات۔اب شہر شروع ہونے کے بعد،مکانات بکھرے ہوئے نظرآرہے تھے۔ہرموڑاورچوراہے پرصدام حسین کی تصاویرآویزاں تھیں۔زیادہ تر پرانی طرز کے ایک منزلہ مکانات تھے جہاں مختلف سامان بیچنے کی دوکانیں بھی تھیں اور چائے خانے بھی تھے۔لوگ وہاں بیٹھے ہوئے حقوں کے ساتھ ساتھ قہوہ پی رہے تھے۔زیادہ ترلوگ روایتی عربی لباس پہنے ہوئے تھےاور بہت کم مغربی لباس میں تھے۔عورتیں بھی سر پرچادریں ڈالے پورا جسم عربی عبا میں ڈھکے ہوئے تھیں۔نئی پرانی کاریں اوراونٹ ساتھ ساتھ چلتے دکھائی دے رہے تھے۔ٹیکسی کئی موڑ کاٹکرآبادی سے گزرتی ہوئی بالآخرایک بہت بڑے کمپاؤنڈ کے دروازے پرآکررک گئی۔ڈرائیور نے بتایا کہ یہی ہے وہ میدان کربلا جہاں سپاہ یزیداورامام حسین کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔اقبال نے جلدی سے ٹیکسی سے اتر کر چاروں طرف دیکھا۔یہ ایک کافی چوڑی سڑک تھی جہاں ہرطرح کی بہت سی کاریں دورتک سڑک کے کنارے کنارے کھڑی تھیں۔سیکڑوں خواتین اورمرد کالے کپڑے پہنے ہوئے اس کمپاؤنڈ میں داخل ہورہے تھے۔جس کے اندرامام حسین کے مقربے کا انتہائی بلند عالیشان سنہری بلند گنبد نظر آرہا تھا۔گنبد کا بالائی حصہ سونے کے پتھروں سے سجا ہوا تھا اور نچلے حصہ پر نیلے اورسفید

پتھروں سے قرآنی آیات کندہ تھیں۔

''یہ میدان کربلا ہے؟ وہ میدان جہاں جنگ ہوئی تھی وہ کہاں ہے؟'' اقبال نے حیرت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔

''یہی وہ جگہ ہے جہاں وہ معرکہ حق و باطل ہوا تھا۔'' ڈرائیور نے زور دے کر جواب دیا۔

''اور وہ ندی جس پر سپاہ شام نے قبضہ کر رکھا تھا؟'' اقبال نے پھر پوچھا۔

''وہ ندی اب یہاں نہیں ہے۔ اب یہاں سے کافی دور بہتی ہے۔ آپ کو نہیں پتہ کہ ندیاں راستہ بدلتی ہیں؟'' ڈرائیور نے الٹا سوال کیا۔ اس کے جواب میں اقبال خاموش ہو گیا۔ ٹھیک ہے اس ندی نے ہی کیا پورے زمانے نے راستہ بدل لیا۔ لیکن ایک ہم ہیں کہ انہیں گلیوں میں اب تک بھٹک رہے ہیں۔

بیدلی ہائے تماشہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کو نہ دنیا ہے نہ دیں

صدیاں گزر گئیں کہ وہ منظر ابھی تک آنکھوں میں بسا ہوا ہے۔ ایک لق و دق ریگستانی میدان ہے۔ خاندان رسول کے چشم و چراغ، بوڑھے، نوجوان، عورتیں اور بچے ایک امید ایک آس لیے میدان میں خیمہ زن ہیں اور پانی کی ایک ایک بوند کو ترس رہے ہیں۔ آخر معرکہ گرم ہوتا ہے۔ ایک ایک کر کے آل رسول کا خون غاصب خلیفہ کی افواج اس میدان میں بہا دیتی ہیں۔ قصور ان کا وہی جو ہمیشہ سے طاقت کے نشے میں چور ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق بلند کرنے والی پاک ارواح کرتی چلی آئی ہیں۔ اس منظر میں پوشیدہ ہے حقیقی جمہوری اسلامی عوامی نظام حکومت کی شکست فاش اور شخصی استبدادی نظریہ حکمرانی کی ہمیشہ کے لیے فتح۔ آج تک صدیاں گزریں، عالم اسلام کا عام بے کس مسلمان اسی شکنجے میں کسا ہوا ہے، سسک رہا ہے، تڑپ رہا ہے۔ پانی کا ایک قطرہ تک میسر نہیں۔ رہائی کی کوئی راہ نہیں۔ راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا۔ بظاہر نظام دہر نے کیا کیا نہ کروٹیں بدلیں مگر چودہ سو سال سے زائد گزرے اگر نہ بدلا تو اسلامی نظام حکمرانی نہ بدلا۔ ہزار ہا چھوٹے بڑے مفکرین سلام، حجت الاسلام، قاضی القضاۃ، مفتیان کرام، آیۃ

اللہ کرام، مفسرین گرامی، زمانے نے پیدا کیے اور سپرد خاک کیے۔ کیسے بڑے بڑے نام اور کیسی کیسی عظیم شخصیات دنیائے اسلام میں پیدا ہوئیں کہ بغیر القاب وآداب کے ان کا نام لینا بھی گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا ہے مگر آج تک اسلامی حکومت سازی کا طریقۂ کار بیان نہ کیا جا سکا بلکہ غاصب حکمرانوں کو ہی خلیفہ اور امام کے لقب عظیم سے نواز کر سارا حق اسلامی ادا کر دیا گیا اور حقیقی عوامی حکومت اسلامی کے فلسفہ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ہوا تو صرف یہ کہ کوئی صالح عالم کوئی نیک عبادت گزار اللہ سے ڈرنے والا بندہ پیدا ہو اور حکومت اس کے سپرد کر دی جائے اور اسے ہم حکومت الٰہیہ کہہ سکیں اور دعویٰ کر سکیں کہ اسلامی انقلاب آ گیا۔ برپا ہو گیا، انقلاب اسلامی کہ اب چوروں کے ہاتھ کاٹے جانے لگے، زانی سنگ سار کیے جانے لگے۔ ہم آج تک ایک شخص کی تلاش میں ہیں جسے خلافت وامامتِ اسلامیہ کے منصب عالی پر فائز کر سکیں۔ کبھی امام خمینی یہ اعلان کرتے ہیں کہ اب اسلام آ چکا اور کبھی ضیاء الحق دعویٰ کرتے ہیں کہ اب آیا ہے نظام مصطفیٰ۔ ہمیں ایک شخص چاہیے خواہ وہ کتنا ہی سفید جھوٹ بول رہا ہو مگر بظاہر اللہ رسول کا نام لے قرآنی آیات واحادیث بھی بیان کرتا ہو۔ ہمیں کوئی ادارہ نہیں بنانا ہے کوئی نظام نہیں قائم کرنا ہے۔ آخر پہلے چار خلفاء کیسے منتخب کیے گئے؟ ان سب کو لوگوں نے منتخب کیا تھا۔ چاہے وہ انتخاب چھوٹے پیمانہ پر صرف بااثر لوگوں نے کیا ہو۔ اسی آئیڈیے کو وسیع کیا جا سکتا تھا اور اگر ایسا کیا جاتا تو عوامی جمہوریت جو یورپ میں پیدا ہوئی اسلام میں پہلے آئی ہوتی جو درحقیقت یورپ میں اسلام کو پھیلنے سے روکنے کے لیے وہاں کے دانشوروں نے چرچ اور حکمرانوں کی مرضی کے خلاف عوام کو طاقت دینے کے لیے وضع کی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر پبلک کو یہ حق نہ دیا گیا، کہ وہ اپنی حکومت چن سکیں اور اگر بادشاہ، پادری اور پوپ کی غلامی سے اسے آزاد نہ کیا گیا، تو ایسے مذہب کو جو انسانی برابری کا حقیقی دعویدار تھا، جو انسان کو پادری کے آگے نہیں صرف خدا کے آگے جوابدہ قرار دیتا تھا یورپ میں بھی پھیلنے سے نہیں روکا جا سکتا مگر ایسا نہ ہوا۔ کسی عالم فاضل نے شخصی حکومت پر مہر نہ لگائی اور آج تک لگاتے آ رہے ہیں۔ حکومت کی تلوار اور عالم کا قلم ایک ہو گئے اور صرف وہی زندہ رہے جن کا قلم

حکمران وقت کو خلیفۂ اسلام اور ظل الٰہی کا خطاب دے سکے۔ مگر اپنے حجروں میں بیٹھ کر فلسفۂ انتخاب کو اور اسلامی عوامی طرز حکومت کے خدوخال تو ابھارے جا سکتے تھے۔ یہ بحث تو شروع کی جا سکتی تھی اسلامی جمہوری نظام بھی کوئی چیز ہے اور عام مسلمانوں کی بھی کوئی حیثیت ہے اور شخصی طرز حکومت مخالف اسلام ہے۔ مگر ہوا یہ کہ کمال اتاترک کو کافر قرار دے دیا گیا جس نے تن تنہا، ترکی کو یورپ کا غلام ہونے سے بچالیا اور اسلامی تاریخ میں پہلی بار عوامی جمہوریت کی بنیاد ڈالی۔ اپنی ذاتی حکومت نہیں بنائی۔ اس کے پاس اتنی طاقت تھی چاہتا تو پارلیمنٹ نہ بناتا۔ چاہتا تو علماء اسلام سے خلیفۃ المسلمین کا خطاب لے سکتا تھا۔ عالم اسلام اس کو بھی خلیفہ تسلیم کر لیتا جیسا کہ ہوتا آیا تھا۔ مگر اس نے صحیح اسلامی اسپرٹ کے مطابق حکومت کا انتخاب عوام کے سپرد کر دیا۔ جس کے صلے میں عوام نے اسے ترکوں کے باپ کا خطاب دیا اور ہمیشہ کے لیے اس کے مرنے کے بعد دستور میں لکھ دیا گیا کہ اتاترک قیامت تک جمہوریہ ترکی کے صدر رہیں گے اور آنے والے صدور صرف ان کی نیابت کریں گے۔

''یار! اقبال تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔'' انور نے زور سے اس کا کاندھا ہلایا۔

'تم یہیں ٹھہرے ہو ہمیں اندر جا کر دھیان آیا کہ اقبال کہاں ہے۔'' تنویر نے بھی شکایت کی۔

''دماغ یہاں وہاں بھٹک گیا۔ تھا۔'' اس نے تنویر کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے بتایا۔

''کیا سوچ رہے تھے۔'' اس نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں کربلا میں اتاترک کی یاد آ گئی۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ایں کیا۔'' اتاترک کی یاد کربلا میں؟'' سب حیرت سے چلتے چلتے رک گئے۔

''یہ تو پرانا کافر ہے۔ علی گڑھ میں لوگ اسے مسلمان کہاں سمجھتے ہیں۔'' انور ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''بات تو تشویش کی ہے۔'' مدحت نے بھی متفکر ہو کر بات بڑھاتے ہوئے کہا ''کہیں مدینے جا کر کارل مارکس کی یاد آ گئی تو کیا ہوگا۔''

''اور مکہ میں کنہیا کی۔ پھر تو گئے بھائی ایمان سے۔'' تنویر بھی پیچھے رہنے والا نہ تھا۔
''بس یار تم سب لوگ ٹھیک ہو اور میں ہمیشہ کا غلط۔ اب چلو بھی یہ المیہ تو زندگی کے ساتھ ہے۔'' اقبال نے مدحت کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے زور دیا۔

کہتے ہیں کہ جہاں حضرت حسین شہید ہوئے وہیں اسی مقام پر ان کا مزار ہے۔ ایک بڑے سے سفید پتھر کو جس میں سرخ رنگ کی قدرتی دھاریاں ہیں، اس مقام پر نصب کر دیا گیا ہے۔ سیکڑوں مرد اور عورتیں سیاہ لباس میں ملبوس وہاں موجود تھے۔ کچھ گروپ بنائے ہوئے اپنے اہل خاندان کے ساتھ بیٹھے تھے اور اذکار و تسبیحات وغیرہ میں مشغول تھے۔ کئی منٹ تک یہ لوگ اس مقام پر خاموشی سے فاتحہ میں مشغول رہے۔ اقبال وہیں ایک ستون کا سہارا لے کر فرش پر بیٹھ گیا۔ بالآخر وہ اس مقام کے روبرو تھا جہاں وہ معرکہ پیش آیا جس کے بارے میں وہ بچپن ہی سے سنتا چلا آیا تھا۔ نہ صرف سنتا آیا تھا بلکہ بہت سے مقررین تو نقشہ تک کھینچ کر رکھ دیتے تھے کہ تمام منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو جاتا تھا۔ لیکن یہاں کا منظر بالکل الگ تھا۔ ریت کے میدان کی جگہ ایک عظیم الشان عمارت تعمیر ہو چکی تھی۔ جس کے چاروں طرف ایک بھرپور شہر آباد تھا۔ گلیاں، بازار، چائے خانے اور ہوٹل تھے۔ زندگی پوری طرح رواں دواں تھی۔ وقت نے کوئی بھی اصل نشان باقی نہ چھوڑا تھا سب کچھ نقلی نقلی سا لگتا تھا۔ اتنے اہم تاریخی مقام کو تھوڑا سا بھی اپنی اصلی حالات میں نہیں رہنے دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ خیمہ گاہ کو بھی جہاں یہ قافلہ خیمہ زن ہوا تھا اور تمام رنج والم اور پریشانیاں کھینچیں تھیں، پختہ بنا دیا گیا تھا۔ کنکریٹ اور سیمنٹ سے خیموں کی شکلیں بنائی گئی تھیں جو نہایت نازیبا منظر پیش کر رہی تھیں۔ تاریخی وراثت کو بچا کر رکھنا شاید یہ لوگ جانتے ہی نہ تھے۔

شام ہوتے ہی ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں ایک درمیانی درجے کے ہوٹل میں پہنچا دیا۔ یہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس کی اوپری منزل پر دو کمروں میں یہ لوگ ٹھہر گئے۔ نیچے ڈائننگ ہال میں چکن روسٹ اور روٹی کھائی اور تمام رات تھکن کے مارے سوتے رہے۔ صبح ناشتہ کے بعد اب یہ قافلہ نجف کی طرف جا رہا تھا۔ صحرا کے تمام مناظر ایک سے

لگ رہے تھے۔ دو گھنٹہ کے سفر کے بعد اب یہ لوگ ایک گھنی آبادی کے ایک محلے میں حضرت علی کے روضۂ مبارک کے سامنے کھڑے تھے۔ روضہ کے سامنے والی سڑک خاصی چوڑی تھی اور دور دور تک وہاں بھی زائرین کی کاریں اور ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ سیکڑوں مرد اور سیاہ کپڑوں میں ملبوس خواتین ایک نہایت بلند محراب نما دروازے کے نیچے سے مزار میں داخل ہو رہے تھے۔ بہت سے واپس آ رہے تھے۔ سب کے چہروں پر ایک پرسکون طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ داخلی دروزے پر نیلے اور سفید پتھروں سے قرآنی آیات کی نہایت دلکش نقاشی کی گئی تھی۔ بڑے سے کمپاؤنڈ کے درمیان ایک عظیم الشان بلند گنبد کے نیچے حضرت امام علی عالی مقام کا مزار تھا۔ تمام گنبد سونے پتروں سے جڑا ہوا تھا اور اس پر سورج کی شعائیں پڑنے سے پورا ماحول سونے میں نہایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ گنبد کے نچلے حصہ میں قرآنی آیات کی نقاشی کی گئی تھی جو ایک خوبصورت بارڈر کی شکل میں دیدہ زیب منظر پیش کر رہی تھی۔ کمپاؤنڈ میں ہر طرف دبیز فرش بچھا ہوا تھا جس پر زائرین تسبیحات اور نمازوں میں مشغول تھے، مزار کے اندر بھی ایسا ہی ماحول تھا۔ زائرین کی ایک بھیڑ سی تھی جو قبر کے چاروں طرف مشغول فاتحہ خوانی تھی۔ بہت سے لوگ خاموشی سے فرش پر بیٹھے تھے۔ یہ لوگ بھی دو رکعت نماز پڑھ کر تسبیحات پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔

اقبال سب سے الگ ایک ستون کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ فاتحۂ خیبر کی ذات وصفات کا محاصرہ کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ فاتح کے ساتھ ساتھ مصنف ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول خدا کا ہر دم ساتھی ہونا کہ بچپن سے آخر تک سایۂ نبی میں رہنا، کوئی نثری خیال کوئی تحریر اس کی عظمت کا احاطہ نہیں کر سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اقبال کے قلب پر صاحب قبر کی شوکت کا احساس اترنا شروع ہوا۔ جیسے ہلکی ہلکی پھوار پڑنی شروع ہو کر موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لے۔ کعبۂ مسافران راہ سلوک کے در پر حاضری کا احساس غالب کی منقبت بن کر پورے جسم وجاں پر چھاتا چلا گیا۔

اپنی بے مائیگی اور گنہگاری اور جنس بازارِ معاصی ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ خسرو کی قوالی علی مولیٰ علی علی، مع ساز کے اس کی روح میں اترنے لگی۔

زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

یہ سوال بھی ہمیشہ کی طرح یہاں آ کر بھی تروتازہ رہا کہ آخر ہزار ہا صحابہ کے قتل عام میں جید صحابہ کیونکر شریک ہوسکے کیوں کہ انہیں قرآنی آیات یاد آئیں جن میں کسی بھی مسلمان کے قاتل کو جہنم میں داخل کرنے کی سزا سنائی گئی ہے۔

کافی دیر کے بعد وہ لوگ مزار کے باہر آئے اور اب ٹیکسی میں بیٹھے کوفہ کی طرف سفر کر رہے تھے۔اقبال پورے راستے اگلی سیٹ پر تنہا بیٹھا پیچھے سر ٹکائے آنکھیں بند کیے محو رہا۔نجانے کتنے پہلوؤں سے اس کے ذہن پر امت میں پہلے فتنے کے تمام کرکٹرز اس کے ذہن کو پراگندہ کرتے رہے۔کفر و الحاد و شرک سے صدیوں سے سوکھی زمین آسانی سے سیراب ہونے والی نہ تھی۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

☆

''دیکھئے وہ ہے کوفہ کی جامع مسجد!'' ڈرائیور نے سب کو دائنی طرف دیکھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔اب وہ موڑ کاٹ کر مسجد کے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔خوبصورت قدیم مسجد ایک اونچے سے ٹیلے پر بنی ہوئی تھی۔شہر، مسجد کے پیچھے آباد تھا۔اس حصہ میں بس چند ہی مکانات تھے جہاں کچھ اونٹ اور کاریں کھڑی ہوئی نظر آرہی تھیں۔مسجد کے دروازے کے سامنے ہی صدام حسین کو بڑے سے پورٹریٹ میں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔یہ لوگ کار سے اتر کر مسجد میں داخل ہوگئے۔خاصے بڑے صحن کے آگے مسجد کی نقشیں عمارت تھی۔

''کیا یہی وہ مسجد ہے جہاں حضرت مسلم بن عقیل نے امام حسین کے نام پر کوفہ کے لوگوں سے بیعت لی تھی؟''اقبال نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا، کس نے بیعت لی تھی؟''اس نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں وہ اور بات تھی۔'' اقبال نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا۔

دن کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ ظہر کی نماز کے لیے موذن نے اذان دی۔ یہ لوگ بھی نماز کی تیاری کرنے لگے۔ نماز کے وقت تک کافی مقامی لوگ جمع ہو گئے۔ نوجوان اور بوڑھے زیادہ تھے۔ نماز ختم ہوتے ہی گھنگھرالے بالوں اور سرخ سفید رنگ کا ایک نوجوان عربی چغہ پہنے، اقبال کی طرف گرمجوشی سے بڑھا اور دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''سر یو آر ہیئر؟ ہاؤ پلیزنٹ!''

اقبال نے چند لمحہ اسے غور سے دیکھ کر پہچان لیا وہ فائنل ایئر میں اقبال کا اسٹوڈنٹ حسان محمد علی تھا۔ پہچانتے ہی اقبال نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''ہاؤ کم یو آر ہیئر؟'' اب اقبال نے اس سے پوچھا۔

''سر، میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔ یہیں مسجد کے پیچھے میرا گھر ہے۔ ابھی چھٹیوں میں تین دن سے یہاں ہوں۔'' اس کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ ''اب آپ میرے ساتھ گھر چلیں گے۔''

''ان سے ملو۔ یہ میرے دوست ہیں ڈاکٹر انور یونیورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ یہ ہیں ڈاکٹر تنویر اور ڈاکٹر مدحت یہ لوگ آرٹس فیکلٹی میں اکونومکس اور انگریزی پڑھاتے ہیں۔'' اقبال نے تعارف کرایا، اس نے باری باری انتہائی گرمجوشی اور انکساری سے سب سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں ان کا ڈرائیور بھی قریب آ گیا اور وہ دونوں عربی میں گفتگو کرنے لگے۔ حسان، اس سے ان کے سفر کے بارے میں معلومات کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اقبال سے کہا۔

''سر اب آپ سب لوگ میرے گھر چل رہے ہیں۔ وہیں کھانا کھائیں گے اور پھر شام کو میں آپ کو کوفہ دکھاؤں گا۔ رات میں ٹھہرنے کا انتظام بھی میرے انکل کے ہوٹل میں ہو جائے گا۔ بس اب آپ خود کو اپنے گھر سمجھئے۔''

''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے تم بالکل پریشان نہ ہو۔ یہ ڈرائیور ہمارا گائڈ بھی ہے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''سر یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ ابا بہت ناراض ہوں گے اگر انہیں پتہ چلا۔''

یہ کہہ کر اس نے مدحت اور اقبال کے ہاتھ پکڑ لیے، تنویر اور ڈرائیور کو اشارہ کرتا ہوا مسجد کے باہر چل دیا۔

'تم لوگ پریشان ہو جاؤ گے۔'' اقبال نے پھر چلتے ہوئے کہا۔

''سر جتنے زیادہ مہماں ہوں اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں کوئی بناوٹ یا تکلف بالکل نہیں تھا۔

باہر آ کر سب لوگ کسی طرح ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ حسان، ڈرائیور کو راستہ بتاتا جا رہا تھا۔ پانچ منٹ کے سفر کے بعد ہی ٹیکسی ایک گلی میں داخل ہوگئی اور تقریباً ایک فرلانگ چلنے کے بعد ایک دومنزلہ مکان کے سامنے رک گئی۔ سب لوگ ٹیکسی سے اتر آئے۔

''سر یہ میرا گھر ہے۔'' اس نے اقبال کا اپنا گھر دکھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت بمشکل بیس فٹ چوڑی پختہ گلی میں کھڑے تھے۔ پرانی طرز کی چھوٹی اینٹ کی یہ دومنزلہ عمارت تھی جس کا دروازہ اور سب مکانوں کی طرح سڑک پر ہی کھلا ہوا تھا۔ لکڑی کی بڑی سی چوکھٹ میں ایک بڑا لکڑی کا نقشین دروازہ تھا۔ اوپری منزل میں آگے کو نکلی ہوئی لکڑی کی دیدہ زیب کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں جن کے چھجے بھی نقشیں لکڑی کے ہی تھے۔ ان کھڑکیوں کی باہر نکلی ہوئی جگہ میں ایک آدمی آرام سے بیٹھ سکتا تھا۔ گلی میں بچوں کے کئی گروپ اپنے اپنے کھیل میں مگن تھے۔ کئی مکانوں میں پرچون کی دوکانیں بھی بنی ہوئی تھیں جہاں مقامی لوگ خریداری کر رہے تھے۔ حسان نے دروازہ پر لٹکی ہوئی لوہے کی کنڈی بجائے اندر سے کسی بچے نے دروازہ کھولا۔

''سر آیئے۔ پلیز آپ لوگ تشریف لائیں۔'' حسان نے سب کو اندر آنے کے لیے راستہ بتاتے ہوئے کہا

اقبال نے اندر آ کر دیکھا کہ یہ ایک تقریباً ۲۰ فٹ کی کھلی جگہ تھی، سامنے کی نیچی دیوار میں زنان خانے میں جانے کا چھوٹا دروازہ تھا۔ حسان نے داہنی طرف والے دروازے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ یہ بھی نقشین لکڑی کا خوشنما دوازہ تھا جو ایک بڑے ہال نما، تقریباً ۲۵

فٹ اونچی چھت والے کمرے میں کھلتا تھا۔ جس کی چھت پرانے طرز کی کڑیوں اور تختوں سے بنی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وال ٹو وال گدے دار قالین بچھے ہوئے تھے۔ قالین پر چاروں طرف تقریباً تین فٹ چوڑے فوم کے موٹے موٹے گدے بچھے ہوئے تھے۔ اور تقریباً دو فٹ اونچے فوم کے گدے تکیوں کی طرح دیواروں سے لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹا قیمتی قالین سجاوٹ کے لیے بچھا تھا جس پر شیشہ کا حقہ رکھا تھا اور لمبا رنگین پیچوان اس کے گلے میں پڑا تھا۔ چاروں دیواروں پر قرآنی آیات کشیدہ خوبصورت چھوٹے قالین ٹنگے تھے۔ وہ سب لوگ دروازے کے باہر ننگے فرش پر جوتے اتار کر گدوں پر دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ کمرے کا پورا ماحول انتہائی پرسکون اور آرام دہ تھا۔

''آپ لوگ تشریف رکھیں میں ابھی آیا۔'' یہ کہتے ہوئے حسان ایک چھوٹے دروازے سے اندر چلا گیا۔

''یہاں تو سونے کو دل چاہ رہا ہے۔'' اقبال نے ایک گدے پر تقریباً دراز ہوتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد حسان ایک ٹرے میں گلاس اور جگ لے کر فرش پر بیٹھتے ہوئے، گلاس بھر بھر کر سب کو دیتے ہوے بوا۔ 'سر یہ جوس لیں۔''

''اورینج ہے؟'' اقبال نے ایک سپ لیتے ہوئے پوچھا۔

''سر ہمارا اپنا باغ ہے یہاں سے دس کلومیٹر دور۔ سنتروں اور کھجوروں کا ایک نہر کے کنارے۔'' حسان نے خوش ہو کر بتایا۔ ایک گلاس بھر کر اس نے ڈرائیور کو بھی دیا جو آرام سے پیر پھیلائے سامنے گدے پر، دیوار کے سہارے بیٹھا تھا۔ حسان سب کو جوس دے کر پھر اندر چلا گیا۔

''یار یہ ڈرائیور بھی اندر بیٹھا ہے؟'' انور نے حیرت سے اقبال سے اردو میں کہا۔

''یہی ہے صحیح اسلامی تہذیب۔ ابھی تو دیکھنا کہ یہ ہمارے ہی خوان میں کھانا بھی کھائے گا۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''ہمارے یہاں تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی نوکر یا ملازم برابر بیٹھ بھی جائے۔''

تنویر بھی حیران تھا۔

''اگر ہم بٹھانا بھی چاہیں تو نہیں بیٹھے گا۔ کہے گا کہ ارے آپ بڑے لوگ ہیں۔ میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔''مدحت نے بھی ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یعنی نہ صرف یہ کہ ہم ان کو اپنے برابر نہیں سمجھتے وہ بھی اپنے کو کمتر سمجھتے ہیں۔'' تنویر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''یہ ہندو فلسفہ کا اثر ہے جس میں انسانوں کی تقسیم ان کی پیدائش اور کام کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ برہمن سب سے افضل ہے اس کے بعد چھتری پھر ویش ہیں اور پھر سب سے نیچے شودر ہیں۔ دھرم نے ہی انسانوں کو چھوٹا اور بڑا کر دیا ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق یہ پاپ کا پھیر ہے۔ شودر کو بھگوان نے پہلے جنم میں کیے گئے پاپوں کی وجہ سے شودر پیدا کیا ہے اور اگر اس جنم میں وہ برہمن کی سیوا کرے گا، پُن کے کار یہ کرے گا تو اگلے جنم میں اسے بھی اونچی جات میں پیدا ہونے کا اوسر ملے گا۔''

اقبال نے ہندو فلسفہ بیان کیا۔

''یہ تو انسان کی ایک بہت بڑی تعداد کو ذہنی اور جسمانی غلام بنا دینے کی شاندار ترکیب ہے۔''مدحت نے خیال ظاہر کیا۔

''اس ڈرائیور کو دیکھو۔ ذرا بھی اسے احساس ہے کہ یہ کوئی غیر فطری عمل ہے اس کا۔ حسان نے اسے اندر بلانے میں یا جوس دیتے وقت کسی بھی ہچکچاہٹ کا اظہار کیا؟'' اقبال نے انور سے پوچھا۔

''بالکل بھی نہیں۔ ذرا بھی نہیں۔ میں اسی بات پر تو حیران ہو رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس لیے کہ ہم بھارتیہ مسلمان ہندو تہذیب کو اپنا چکے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اونچے اور نیچے لوگ ہیں۔ شیخ، پٹھا، انصاری، سید اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم نے بھی منو کے مطابق مسلمانوں کی تفریق کر دی ہے۔'' اقبال نے افسوس کے ساتھ کہا۔

''اس طرح تو ہماری سوسائٹی کبھی بھی اسلامی سوسائٹی نہیں ہو سکتی؟''مدحت نے اقبال

سے سوال کیا۔

''بالکل سامنے کی بات ہے۔''

''یہ تو نہایت افسوس کا مقام ہے۔'' تنویر نے مایوس ہو کر کہا۔

''ابھی کیا ہے۔ابھی تو آگے آگے دیکھنا۔ سیاسی طاقت کس طرح اسلام کو بھی ہندو آدرشوں میں ڈھال دے گی۔ کس طرح ہمارے یہاں بھی دیوی دیوتا پیدا ہونے شروع ہو جائیں گے۔ بہت سے مسلمان آج بھی اجمیر کو مسلمانوں کو تیرتھ استھان کہتے ہیں۔ ہر شہر، گاؤں اور قصبات میں مزارات کیا ہیں؟ اگر گہرائی سے غور کیا جائے تو زیارت کے کیا معنی ہیں اور زائرین کیا کرنے ان مزارات پر جاتے ہیں۔ جیسے ہندو تیرتھ استھانوں پر جاتے ہیں، مزارات مسلمانوں کے تیرتھ استھان بن چکے ہیں۔ مرادیں وہاں سے پوری ہوتی ہیں۔ نوکریاں وہاں بانٹی جاتی ہیں اولادیں پیر صاحب عطا کرتے ہیں۔ ہر وہ کام جو ہندو اپنے دیوی دیوتاؤں سے کرانے کی تمنا میں ان کی پوجا کرتے ہیں۔ وہ ساری مرادیں مسلمان بھی اپنے پیروں فقیروں اور مزارات سے پوری کرانے کے لیے ایک طرح سے ان کی پوجا ہی کرتا ہے۔ بس اتنا فرق باقی ہے کہ اگر پوچھا جائے تو جواب ملتا ہے کہ یہ خود نہیں بلکہ اللہ سے سفارش کرتے ہیں نعوذ باللہ جیسے اللہ نے کمیشن ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں اور نہ پوچھا جائے تو بس پھر پیر ہی پیر اور مزارات ہی سب کچھ ہیں۔ اسلام نے بندے اور اللہ کا براہ راست رشتہ قائم کیا۔ کوئی پادری یا پنڈت، مولوی یا صوفی درمیان میں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ سے فرمایا کہ یہ نہ سمجھنا کہ میری بیٹی ہو تو مغفرت ہو جائے گی۔ ہر انسان کا حساب اس کے اپنے اعمال پر ہوگا یہ ہے اسلام کا اصلی پیغام۔'' اتنا کہہ کر اقبال خاموش ہو گیا۔

''مگر ہمارے علماء تو یہ کہتے ہیں کہ اصلی اسلام تو صرف انڈیا میں ہے۔ میں نے جانے کتنے مولویوں سے یہ بات سنی ہے۔'' انور نے بتایا۔

''اگر وہ یہ نہ کہیں گے تو انہیں صدقہ، فطرہ اور چرم قربانی کون دے گا؟'' تنویر نے ہنستے ہوئے کہا ''اور یہی حضرت عمر دراز ہو کر پیر بن جائیں گے۔ سفید داڑھی اور سرخ سرخ

آنکھوں سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائیں گے تعویذ بیچیں گے، پلاؤ اورمرغ کھائیں گے۔انڈیااور پاکستان دونوں ہی ہندوتہذیب کے زیراثر ہیں۔''

اتنے میں حسان پھرایک ٹرے لے کراندر سے آگیا اس بار ایک بڑی پلیٹ میں مختلف اقسام کی کھجوریں اورچائے کی پیالیاں تھیں۔اس نے سب کو چائے دیتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ دودھ کی چائے پیتے ہیں۔خود بنا کرلایا ہوں چھوٹی بہن اورامی کی توسمجھ میں ہی نہیں آیا۔''

''مزہ آگیا! کیا عمدہ چائے بنائی ہے۔''مدحت نے ایک گھونٹ لے کرتعریف کی۔

''ابا آپ لوگوں سے ملنے آنے والے ہیں۔''حسان نے بتایا۔

''ہم بھی ان کے منتظر ہیں۔''اقبال نے سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔سب لوگ مودب ہوکر بیٹھ گئے۔اتنے میں سائڈ گیٹ کھلا اورتقریباً ۶۵ سال کے سفید ریش بزرگ سفید عربی لمبا چغا پہنے سر پرعربی عمامہ باندھے،ایک ہاتھ میں تسبیح اور ایک میں چھڑی لیے کمرے میں داخل ہوئے۔سب نے کھڑے ہوکرسلام کیا۔انھوں نے باری باری سب سے مسکرا کر ہاتھ ملایااورکندھے پرایک بارکس کیا۔

''مرحبا،مرحبا۔آپ لوگ تشریف رکھیں۔''

حسان بتاچکا تھا کہ انھوں نے کافی سال پہلے بغداد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا تھا اوراب خاندانی کھیتی وباغات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔وہ بہت صاف انگریزی میں گفتگو کررہے تھے۔

''آپ حسان کے استاد ہیں اس نے بتایا کہ آپ سب ہندی مسلمان ہیں۔الحمدللہ۔''

''نہیں ہم دو پاکستانی ہیں۔''تنویر نے جلدی سے وضاحت کی۔

''اچھااچھا بہت خوب!''انھوں نے ہنستے ہوئے کہا۔''دو ہندی اوردو پاکستانی۔''

''مسجد میں حسان سے ملاقات ہوگئی۔ہم یہاں تاریخی مقامات دیکھنے آئے تھے۔'' اقبال نے سفر کا مقصد بیان کیا۔

''کربلا اورنجف اشرف تو ہوآئے اب کوفہ دیکھنے اوراس کے بارے میں جاننے

کا اشتیاق یہاں بھی لے آیا۔'' تنویر نے ان سے مخاطب ہو کر عرض کیا۔

''کوفے والوں کو تو سب لا یوفی کہتے ہیں۔کوفی لا یوفی۔'' انھوں نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

''ایسا کیوں ہے آخر، اس کی وجہ کیا ہے؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''یہ ایک لمبی داستان ہے۔'' انھوں نے گہری سانس لی۔

''ہم سننا چاہتے ہیں۔ ہاں انڈیا پاکستان میں بھی یہی کہا جاتا ہے۔''

مدحت نے اشتیاق ظاہر کیا۔

''بیٹا حسان! ان لوگوں کے لیے کچھ لاؤ۔'' انھوں نے حسان سے کہا۔

''جی ابا ابھی لایا۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا اور ایک بڑے سے خوان میں کئی طرح کے پھل سیب، سنترے، انگور، کیلے وغیرہ لاکر باری باری سب کو پیش کیے۔ سب نے کچھ نہ کچھ اٹھالیا۔ درمیان میں خوان رکھ کر حسان بھی اپنے ابا کے برابر بیٹھ گیا۔

''جی، ہم سب مشتاق ہیں۔'' تنویر نے بھی درخواست کی۔

''مختصراً بیان کروں گا۔عربوں کے دو معزز خاندانوں کی آپسی لڑائی اس تمام فساد کی بنیاد ہے۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان ایک زمانے سے خانۂ کعبہ کی تولیت کو لے کر اختلافات چلے آرہے تھے۔ محمد ﷺ کی بعثت کے بعد اسلام کے پیغام کو روکنے میں سب سے زیادہ بنو امیہ اور ان کے لیڈر ابوسفیان نے روڑے اٹکائے۔لیکن چونکہ پیغام آسمانی تھا اور حقانیت اس کی بنیاد۔ لہٰذا بہت دنوں تک وہ لڑ نہیں سکے اور آخر ان سب کو بھی اسلام قبول کرنا پڑا۔ اس طرح پورے حجاز میں توحید کا جھنڈا بلند ہو گیا۔ آنحضرت کے وصال کے بعد خلافت کا قضیہ پیدا ہو گیا۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح سلجھالیا گیا اور ابوبکر، عمر اور عثمان کے بعد حضرت علی کی خلافت پر بنو امیہ کے بااثر لوگ راضی نہ ہوئے۔ وہ دور آپسی جھگڑوں میں گزر گیا۔خلافت بنو امیہ کے پاس پہنچ گئی اور امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو خلیفہ نامزد کر دیا۔ یہ لوگ انتہائی دنیادار تھے اور سیاسی طاقت اپنے ہی خاندان میں رکھنا چاہتے تھے۔لیکن عام مسلمان اس پر راضی نہ تھے اور حضرت حسین ابن علی کو خلیفہ دیکھنا

چاہتے تھے۔حسین ابن علی اوران کے ساتھی عبادت گزار اوراللہ کے خوف سے لرزنے والے بزرگ تھے۔دنیاداری اتنی نہیں کرسکتے تھے جتنا کہ ان کے مخالفین اس فن کے ماہر تھے۔کوفہ حضرت امام علی کا دارالخلافہ رہا تھا۔.....''

''معاف کیجئے گا میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔حضرت امام علی بحیثیت خلیفہ یہاں کہاں رہتے تھے کوئی نشان باقی ہے اس جگہ کا۔'' اقبال نے اشتیاق سے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''پورے عراق میں شاید وہی مکان ابھی تک اسی حالت میں موجود ہے جامع مسجد سے ذرا آگے۔حسان آپ لوگوں کوصبح دکھائے گا۔''انھوں نے حسان کودیکھتے ہوئے کہا۔

''کل صبح وہاں چلیں گے۔'' حسان نے فوراًحامی بھری۔

''کل ہی ٹھیک رہے گا۔اب شام ہونے والی ہے۔''اقبال نے رائے دی۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔کہ امام علی چونکہ یہاں بحیثیت خلیفہ قیام پذیر تھے لہٰذا یہاں کے عوام کے خاندان رسالت سے ذاتی مراسم ہوگئے تھے۔یہاں کے لوگوں نے امام حسین کومدینہ سے بلانے کے لیے ایک مہم چلائی اوراسی جامع مسجد میں حضرت مسلم کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے امام حسین کی خلافت پر بیعت کی مگر جب تک امام حسین مدینہ سے یہاں آتے حکومت وقت نے عوام پرظلم وستم کا سلسلہ شروع کردیا۔گھر اجاڑ دیے گئے۔کتنوں کوقید خانوں میں بند کردیا گیا۔فوج ان کی تھی سارا حکمرانی کا نظام ان کے ہاتھ میں تھا، نہتے لوگ کچھ بھی نہ کرسکے اور جب امام عالی مقام میدان کربلا تک تشریف لائے تو فوج نے انہیں گھیر لیا۔ جب تک عوام کو پتہ چلتا حضرت حسین شہید کئے جاچکے تھے۔''اتنا کہتے ہی ان کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو بہنے لگے۔''غم حسین سے آج تک سینہ شق ہے۔قیامت تک یہ صدمہ لہورلاتا رہے گا۔'' یہ کہہ کروہ خاموش ہوگئے۔ان کے آنسو بہانے سے سب ہی کی آنکھیں نم ہوگئیں اورکافی دیرتک سب خاموش بیٹھے رہے۔ پھروہ حسان کاہاتھ پکڑکراٹھ گئے۔

''بیٹاحسان!میں چلتا ہوں۔دیکھنامہمانوں کوکوئی تکلیف نہ ہو۔''

یہ سنتے ہی وہ سب لوگ اٹھ گئے اور باری باری انھوں نے سب کے سروں پر ہاتھ پھیرا، دعا دی اور اندر گھر میں چلے گئے۔

''اب کھانا کھایا جائے۔'' یہ کہہ کر حسان بھی گھر کے اندر گیا اور کچھ دیر بعد ہی کندھے پر تولیہ ایک ہاتھ میں گرم پانی کا پرانے طرز کا لوٹا اور دوسرے ہاتھ میں سلفچی لئے آ گیا اور باری باری وہیں اس نے مع ڈرائیور سب کے ہاتھ دھلوائے، تولیہ پیش کی اور پھر اندر گیا۔ اس بار وہ ٹرے میں گرم ٹماٹو سوپ کے پیالے لے کر آیا۔ سب کو ایک ایک پیالہ پکڑایا۔ پھر فرش پر دسترخوان بچھا کر اس پر بڑے سے خوان میں فرائڈ چاول، چاولوں پر پانچ ہاف مرغ فرائڈ، گائے کا بھونا گوشت، پیالوں میں شوربہ، روٹیاں، ایک گول ٹرے میں سلاد اور پیپسی کی بوتلیں لا کر سجا دیں۔

''تفضّل! سر آیئے۔ پلیز، تشریف لائیں۔'' اس نے باری باری سب سے دسترخوان پر آنے کی دعوت کی۔

''آیئے صاحبان۔'' اقبال نے بھی دوستوں سے کہا۔

ان پانچوں نے خوان میں اپنی اپنی طرف سے مرغ اور گوشت چاولوں کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔ ایک طرف ڈرائیور بھی بیٹھا تھا اور اتفاق سے اس کے برابر میں ہی انور صاحب بھی تھے۔

''کہیئے، کیسا لگ رہا ہے؟'' اقبال نے انور سے مسکرا کر پوچھا۔

''انڈیا میں ہوتے تو باہر ہی، بچ جانے کے بعد کچھ کھانا بچتا بجھوا دیا جاتا۔'' انور نے جواب دیا۔

''کیوں! ہضم نہیں ہو رہا اس کا بیٹھنا؟'' تنویر نے ہنستے ہوئے چٹکی لی۔

''نہیں سارے مسلمان آپس میں بھائی ہیں۔'' انور نے آخر جواب دیا۔

''دل سے نہیں کہہ رہے ہو۔'' تنویر نے کہا۔

''ایسا نہ ہو کہ یہ اردو سمجھتا ہو۔'' مدحت نے خدشہ ظاہر کیا۔

''حضرت بلال حبشی اور رسول اللہ کے رشتہ کے بارے میں غور کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ

اسلام میں انسانی برابری کا تصور کتنا واضح اور مستحکم ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ایک سیاہ فام تھے بلکہ غلام بھی۔ ایسے شخص کا کیا سماجی مرتبہ ہوسکتا تھا اسلام سے پہلے؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''فی زمانہ تو اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ غلام کی تو کوئی مزدوری بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ساری محنت پر آقا کا حق تھا۔ جو کچھ بھی کھانا یا کپڑا اس کو ملتا تھا وہ مہربانی کے دائرے میں شمار ہوتا تھا۔'' مدحت نے بتایا۔

''سر، باتیں ذرا کم اور کھانے پر زیادہ دھیان دیں۔'' حسان نے جو وہیں مستعد کھڑا تھا، مسکرا کر اقبال سے کہا۔

''اتنا کھانا لا کر رکھ دیا ہے تم نے۔ ہم لوگ تو چار دن میں اتنا کھاتے۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''نہیں سر یہ تو کچھ بھی نہیں ہے اور پیپسی تو یونہی رکھی ہے۔'' اس نے اقبال کے گلاس میں ڈرنک انڈیلتے ہوئے کہا۔ پھر باری باری اس نے سب کے گلاسوں میں پیپسی انڈیلی۔

''اپنا ہی گھر سمجھ کر کھائیں۔'' اس نے ڈرائیور سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جزاک اللہ'' اس نے خوش ہوکر جواب دیا۔

کھانا کھا کر سب نے وہیں اٹیچڈ باتھ روم میں ہاتھ دھوئے اور پھر اپنی اپنی جگہ آ کر آرام سے تقریباً لیٹ سے گئے۔ دسترخوان اٹھانے کے تھوڑی دیر بعد حسان ایک بڑی سی پلیٹ میں مختلف اقسام کی کھجوریں اور پھل لے آیا اور سب کو پیش کیں۔

''یار یہاں کھجوروں کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟'' اقبال ایک کھجور کھاتے ہوئے انور سے پوچھا۔

''ہمارے یہاں آم کی اتنی قسمیں نہیں ہوتی ہیں، جتنی یہاں کھجوروں کی ہوتی ہیں۔'' انور نے بتایا۔

''میرے خیال سے اب کسی ہوٹل میں چلا جائے نیند آرہی ہے۔'' تنویر نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''مالِ غنیمت سمجھ کر کھایا ہے۔'' مدحت نے تنویر کو چھیڑا۔

''بہت لذیذ تھا نا؟'' اس نے بات کوٹالتے ہوئے پوچھا۔

''حسان! ایسا ہے کہ اب ہم لوگ ہوٹل چلتے ہیں۔ تھکے ہوئے ہیں سب لوگ۔' اقبال نے اٹھتے ہوئے حسان سے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ سب لوگ اس کے انکل کے ہوٹل میں پہنچ گئے جہاں دوسری منزل پر دو کمرے مل گئے۔ انور اور ڈرائیور کو ایک کمرے میں کر دیا گیا اور حسان صبح آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر چلا گیا۔

☆

''یہ ہے وہ گھر جہاں حضرت علیؓ بحثیت خلیفہ قیام پذیر تھے؟'' اقبال نے حیرت سے مکان کو دیکھتے ہوئے حسان سے پوچھا۔

وہ لوگ دوسرے دن صبح دس بجے کے قریب جامع مسجد کوفہ سے تقریباً دو فرلانگ دور ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ اقبال نے چھوٹی اینٹوں کی تقریباً سات فٹ اونچی باؤنڈری کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ مشکل سے تمام رقبہ سو گز رہا ہوگا۔ لکڑی کے چھوٹے سے دروازے کے برابر ایک بورڈ پر عربی زبان میں اس مکان کی مختصر تاریخ لکھی تھی۔

''یہ گھر بالکل اپنی قدیم صورت میں محفوظ کیا گیا ہے۔'' حسان نے ان لوگوں کو گھر کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں حکومت کی طرف سے ایک دربان بھی مقرر تھا جس نے سب کو جوتے باہر ہی اتروادیے۔ سب ننگے پیر گھر کے اندر داخل ہوگئے۔ چھوٹا سا صحن اور بمشکل چار کمرے تھے جن کی چھتیں آٹھ یا نو فٹ سے زیادہ اونچی نہ تھیں۔ دربان نے بتایا کہ یہ حضرت حسن وحسین کے پڑھنے کا کمرہ تھا۔ ایک بیڈ روم تھا ایک کمرے میں پانی کا کنواں تھا۔ بلکہ کنویں کو ہی ڈھانپ کر کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ تو یہ تھا حضرت حیدر کرار فاتح خیبر کا وہ گھر جس میں رہ کر انھوں نے خلیفۂ اسلام کے فرائض انجام دیے تھے۔ سب لوگ انتہائی جزباتی ہوگئے اور صحن میں فرش پر بیٹھ گئے۔ ہر طرف حضرت علی، فاطمہ، حسن وحسین کے چلنے پھرنے کی آہٹیں سی آرہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ بچے ابھی کسی کمرے سے نکل کر ان سے باتیں کرنے لگیں گے۔ اقبال کی روح

کو عجب انبساط کی کیفیت نے شرابور کر رکھا تھا۔ ایسی کیفیت تو کربلا میں ہوئی اور نہ مزار علی پر نجف میں۔ یہ کیسا روحانی معجزہ تھا اس مکان میں۔ یہاں زندگی تھی اصل اسلامی زندگی کہ خلیفہ ہو کر بھی دنیا کو کیا سمجھا حضرت امام نے؟ یہ کیسا بادشاہ وقت تھا کہ جس کی زمینی بادشاہت کی سرحدیں مصر سے ایران تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے دنیا کو اتنا حقیر اس کے سامان راحت کو اتنا ذلیل اور شان و شوکت کو صرف کھیل تماشا سمجھا! ایک فقیر شاعر جو پینشن مانگنے دردر کی ٹھوکریں کھاتا پھرا ہوا، یہ کہہ سکتا تھا۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

لیکن ایک ایسا شخص جس کی ٹھوکر میں بادشاہوں کے تاج ہوں، جس کے ذرا سے اشارے پر حکومتیں سرنگوں ہو جائیں۔ قیصر و کسریٰ کے خزانے جس نے اپنے ہاتھ سے تقسیم کیے ہوں کہ جن کے درباروں اور محلوں کی شان و شوکت ایسی تھی کہ دیکھنے والا ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا تھا۔ ایسا بادشاہ ایسے بے نام و نشان مکان میں رہتا تھا؟ تاریخ پڑھنے اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یہ صرف گھر نہ تھا بلکہ یہاں کے ذرے ذرے پر تاریخ رقم تھی جو اپنا حال خود بیان کر رہی تھی کہ کس طرح بے سروسامانی کے عالم میں خاتم الانبیاء کی قیادت میں حضرات صحابہ، انسانوں کو پیغام توحید پہنچانے نکلے اور جب صرف چند ہی سالوں میں سارے زمانے کی دولتیں ان کے قدموں تلے آ گئیں، تب بھی ان کا دل دنیا میں نہ لگا۔ اس وقت بھی انہیں صرف پیغام ہی عزیز رہا۔ دولت دنیا کو تمام مسلمانوں کی ملکیت سمجھا اور بیت المال سے صرف اپنے گزارے کے لائق سب سے کم حصہ لیا۔

''مگر پھر اسلام کو کیا ہو گیا!'' اقبال کے منہ سے زور سے نکلا اور سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نے کہا ''اس گھر کو دیکھئے اور ذرا صدام حسین کے محلوں کو دیکھئے وہ تو خیر اسلام کا نام نہیں لیتا، مگر ذرا خادمین حرمین شریفین کے محلات کو دیکھئے۔ چالیس سے زائد مسلم ممالک کے شاہی محلات کو دیکھیں، بنوامیہ کے محلات کی تاریخ پڑھیں،

امیر معاویہ اور یزید کے محلات پر نظر ڈالیں۔ خلافت سے ملوکیت کا سفر دراصل اسلام کی شکست کا سفر ہے جس کے سردار امیر معاویہ ہیں۔ بنوامیہ کے لالچ اور علمائے اسلام کی لاعلمی نے کاروان اسلام کو بے سروسامان کر دیا۔'' اقبال یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ ''اب چلتے ہیں باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔''

سب لوگ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اٹھ گئے۔ باہر آ کر جوتے پہنے اور ٹیکسی میں سوار ہونے سے پہلے حسان کو الوداع کہا۔

''اچھا بھئی حسان! اب ہم لوگ بصرہ چلتے ہیں۔'' اقبال نے اس کے دونوں ۃاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔

''نہیں سر! دوپہر کا کھانا کھا کر جایئے گا۔ میں گھر کہہ کر آیا تھا۔'' اس نے زور دے کر کہا۔

''ہوٹل میں تمہارے انکل نے اتنا زیادہ ناشتہ کرادیا اور کرایہ بھی نہیں لیا۔ اب بالکل گنجائش نہیں ہے۔ بس شام کو بصرہ پہنچ کر ہی کھائیں گے۔'' اس نے حسان کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''سر یہ کوئی بات نہیں ہوئی۔'' اس نے پھر زور دیا۔

''نہیں، اب ہم لوگ چلیں گے۔ تمہارا گھر تو سامنے ہی ہے، چلے جاؤ گے؟'' اقبال نے اس سے پوچھا۔

''ہاں بس مسجد کے پیچھے ہے۔'' اس نے کہا۔ باقی سب لوگ بھی اس سے گلے مل کر رخصت ہوئے۔

''بہت بہت شکریہ حسان، بصرہ میں ملنا۔'' انور نے اس کا ہاتھ تھام کر ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ اب ان کی ٹیکسی بصرہ کی طرف جا رہی تھی۔ انور آگے سیٹ پر تھا اور پیچھے اقبال کے ساتھ مدحت اور تنویر بیٹھے تھے۔

''محلات کا ذکر کر رہے تھے آپ؟'' تنویر نے پوچھا۔

''حضرت عمر کا وہ واقعہ تو یاد ہی ہوگا جب ایک عام آدمی نے خطبہ کے دوران سوال کر دیا تھا کہ آپ کا کرتا اتنا لمبا کیوں ہے۔ سب کے حصہ سے زیادہ آپ کو مال غنیمت

کیسے مل گیا؟'' اور وہ حیرت انگیز نظارہ کہ بیت المقدس کی فتح کے بعد جب حضرت عمر شہر میں داخل ہوئے تو اونٹ پر سواری کرنے کی باری غلام کی تھی۔ اور خلیفۂ وقت اونٹ کی نکیل پکڑ کر پیدل چل رہا تھا۔ ہمارا مولوی ملا گلا پھاڑ پھاڑ کر دنیا کو للکارتا ہے کہ تاریخ ایسی مثال پیش کر کے دکھائے۔ یہ برابری یہ ایمانداری کا قلندرانہ انداز، کیا تاریخ کوئی ایسی مثال پیش کر سکتی ہے؟ میں پوچھتا ہوں کہ دوسری قوموں کو چھوڑ یئے، کیا خود ملت اسلامیہ ایسی کوئی دوسری مثال پیش کر سکتی ہے؟ صرف چند ہی سالوں کے بعد اموی وعباسی خلفاء نے نہ صرف سارے مال غنیمت کو اپنا ذاتی مال سمجھا بلکہ خود خلافت کو بھی خاندانی میراث بنادیا اور آج تک یہی ہورہا ہے۔ عام مسلمان کی کسمپرسی کا عالم ان کی حکومتوں میں دیکھئے۔ ساری تیل کی دولت ان کی اور ان کے خاندان کی ہے۔ بلکہ سارے مسلمان بھی ان کے غلام در غلام ہیں۔ ۱۴۰۰ سو سال سے زائد ہو گئے کہ برابری تو چھوڑ یئے عام مسلمانوں کو سانس تک لینے کے لیے ان ظالم حکمرانوں کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے محلات دیکھئے۔ ان کی عیاشیوں کا ہم لوگ تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی علماء کا من پسند اسلام ہے؟ تمام عالم اسلام میں یہی ہو رہا ہے۔ خود سعودی عرب میں کیا ہورہا ہے۔ پاکستان سے لے کر الجیریا تک چلے جایئے کسی اسلامی ملک میں دیکھ لیجئے، جس نے تلوار کے زور پر حکومت حاصل کر لی بس وہ مالک بن گیا۔''

''مگر اب کیا ہوسکتا ہے؟'' تنویر نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں ہوسکتا؟'' مدحت نے بھی مایوس لہجے میں سوال کیا۔

''واقعی کچھ نہیں ہوسکتا۔ سیاسی طور سے چالاک اور تلوار کے دھنی لوگ تمام سیاسی اور اقتصادی طاقت پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ پھر ان سے زیادہ چالاک کوئی پیدا ہوتا ہے اور پرانے حکمراں کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھتا ہے۔ یہ تو کر رہا ہے ہمارا سیاست داں طبقہ اور ہمارا دوسرا علماء اسلام کا طبقہ، صرف وضو اور نماز اور روزے کے احکامات پر ریسرچ کرتا رہا ہے۔ سنت واجبات اور فرائض پر نئے نئے انداز سے روشنی ڈالتا ہے۔ سیکڑوں تفاسیر قرآن میں ایک اور نئی تفسیر کا اضافہ کر دیتا ہے۔ بس ایک پرانے مشکل لفظ کی جگہ نئے

آسان لفظ کا استعمال کر دیا اور ہوگئی تفسیر اور پیدا ہوگیا ایک اور مفسر قرآن۔ رہا اسلامی سیاسی نظریات کا سوال تو بس وہ تو ایک ہی آئیڈیل ہے خلافت راشدہ۔ اس کے لیے تو ایک ہی شرط ہے کہ خود رسول اللہ کی ذاتی نگرانی میں تربیت یافتہ کوئی پیدا ہو اور حکومت کرے۔ لیکن یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کے علاوہ عثمان اور علی کو، ان ہی لوگوں نے شہید کیا جو رسول اللہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے اور صحابی کے رتبے پر فائز تھے۔'' اقبال کے خاموش ہونے سے پہلے ہی انور اگلی سیٹ سے بول پڑا۔

''اچھا، اس لیے تم نے مجھے آگے بٹھایا ہے تاکہ الٹی سیدھی بکواس کر سکو۔ یہ کون سی ہسٹری بیان کر رہے ہو۔ علماء اور صحابہ کے خلاف زبان درازی کرو گے تو اسلام سے خارج ہو جاؤ گے۔ دوزخ میں ڈالے جاؤ گے۔ کچھ اللہ اور آخرت کا خوف نہیں ہے تمہیں۔ پورے کافر ہو کر مرو گے، ہر وقت کچھ نہ کچھ بکواس کرتے رہتے ہو۔ کچھ پڑھا لکھا ہے عربی آتی ہے؟ قرآن سمجھ سکتے ہو؟ بتیس علوم آنے چاہئیں قرآن سمجھنے کے لیے۔ تمام زندگی علماء عربی پڑھتے ہیں احادیث کا علم حاصل کرتے ہیں، تب جا کر کوئی مفسر پیدا ہوتا ہے۔ قرآن ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ارے بھئی تم سائنس کے آدمی ہو اپنا سبجیکٹ جانتے ہو۔ میں نے ریاضی پڑھی ہے وہ جانتا ہوں کوئی انجینئر ہے وہ انجینئرنگ کے بارے میں بتائے گا۔ کوئی سرجن ہے وہ سرجری کے بارے میں بتائے گا۔ انھوں نے اسلام پڑھا ہے وہی اسلام کے بارے میں بتائیں گے سامنے کی بات ہے۔ مگر یہ اپنے مضمون کی بات کبھی نہیں کرے گا ہر وقت اسلام اور تاریخ کی بات کرتا ہے۔ علماء تو نائب رسول ہیں ان کی توہین، توہین رسول کے درجے میں آتی ہے۔ وہ نہ ہوتے تو اسلام کب کا ختم ہو چکا ہوتا۔ علماء کی یہ عزت نہیں کرتے، صوفیاء کو یہ نہیں مانتے، پھر یہ کیسے مسلمان ہیں؟'' انور کو شدید غصہ آ گیا تھا اور اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

''گویا علماء کی عزت کرنا اور صوفیاء کو ماننا مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے؟'' تنویر نے بھی غصہ میں آ کر سوال کیا۔

''ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ توحید، رسالت، صحائف آسمانی، قیامت اور ملائکہ پر جو

ایمان لے آیا وہ مسلمان ہو گیا۔بس' مدحت نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

''اور میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جس نے ان میں سے کسی اور چیز کا اضافہ کیا گویا اس نے اسلام میں اضافہ کیا۔پھر اس کا اسلام رسول اللہ کا اسلام نہیں رہا، کچھ اور ہو گیا۔'' تنویر نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔''اور رہا قرآن تو خود اللہ فرمارہا ہے کہ ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے سہل زبان میں قرآن اتارا۔ نہ صرف مسلمانوں کی یا علماء کی بلکہ تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن اتارا گیا۔ ہندو پنڈتوں کی طرح جیسے انھوں نے ویدوں کو پڑھنا بلکہ سننا بھی حرام کر رکھا ہے علماء بھی عام انسانوں کے لیے قرآن پڑھنا حرام قرار دینے والے ہیں۔''

''کوئی بھی آدمی جسے دنیا کی کوئی بھی بڑی زبان آتی ہو قرآن سمجھ سکتا ہے۔اس لیے کہ ان تمام زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔جیسے یہ کار بنادی گئی تو اب کوئی بھی آدمی اس کو سمجھ سکتا ہے چلا سکتا ہے۔سرجری واقعی صرف سرجن ہی جانتا ہے اور انجینئر نگ انجینئر ،مگر اسلام سب کا مذہب ہے ہم سب کی زندگی ہے۔اس کے بارے میں جاننا اور باتیں کرنا ضروری ہے۔اسلام کے نام پر کوئی ہمیں بے وقوف بنالے یہ نہیں ہوسکتا۔'' مدحت نے انور کا کاندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

''اچھا انور یہ بتاؤ کہ حضرت ابوبکر کے علاوہ تینوں خلفاء شہید کئے گئے۔اگر کوئی قتل ہوتا ہے تو کوئی قاتل ضرور ہوتا ہے اور کوئی سازش کرنے والا بھی ضرور ہوتا ہے۔ان تینوں جلیل القدر صحابہ کو جنھوں نے شہید کیا وہ مسلمان ہی تھے۔تو ان کا ذکر نہ کیا جائے۔آپ ہر وقت اس سوسائٹی کے خدائی سوسائٹی ہونے کی بات کریں۔آئیڈیل اسلامی سماج ہونے کی بات کریں اور ہم یہ سوال نہ کریں کیوں نہ کریں؟ کیا ایسا کرنا قرآن میں ممنوع ہے؟ جنگ جمل اور جنگ صفین میں کئی ہزار صحابہ شہید ہوئے۔مرنے والے اور مارنے والے دونوں صحابی تھے۔تو یہ ذکر نہ کیا جائے؟'' تنویر نے سوال کیا۔

''اسلام صرف رسول اللہ کی ذات کی گارنٹی لیتا ہے اور قرآن کی حقانیت کا دعویدار ہے۔بس اس کے بعد بات ختم۔کوئی اور کتاب اور کوئی صحابی، عالم، فاضل،صوفی یا کسی اور

کا عمل بغیر دلیل صحیح نہیں ہے اور نہ اسلام اس کا ذمہ دار ہے۔'' آخر اقبال نے بھی بولنے کی ہمت کی۔

''اور علماء کا تو یہ حال ہے کہ کسی نے زور سے آمین کہہ دیا تو وہ اسلام سے خارج، کسی کی داڑھی چھوٹی رہ گئی تو وہ اسلام سے خارج، کسی کا پائجامہ ذرا سا نیچا ہو گیا تو وہ اسلام سے خارج۔ ہمارے ایک دوست کہنے لگے کہ مسلمان ہونے کے لیے تین بھائی ہونا ضروری ہیں اور صرف بیچ کا بھائی مسلمان ہوسکتا ہے۔'' تنویر نے اب مزاح پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔

''وہ کیوں؟'' اقبال نے بھی مزا لیتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ صرف وہی بڑے بھائی کا کرتا اور چھوٹے بھائی کا پائجامہ پہن سکتا ہے۔'' تنویر نے جواب دیا۔ انور کے علاوہ سب ہنسنے لگے۔

''یعنی مسلمان ہونے کے لیے بڑے بھائی کا کرتا اور چھوٹے بھائی کا پائجامہ پہننا شرعی ضرورت ہے۔ بڑے بھائی کے پاس بڑا کرتا نہیں ہوسکتا اور چھوٹا بھائی چھوٹا پائجامہ کہاں سے لائے گا۔ لہٰذا صرف منجھلا ہی مسلمان ہوسکتا ہے۔'' مدحت نے تفصیل بیان کی۔ تینوں دیر تک ہنستے رہے۔

''اچھا سلوا نہیں سکتا؟'' اس طرح تینوں بھائی مسلمان ہوسکتے ہیں۔'' اقبال نے ترکیب نکالی۔

''چلو شکر ہے کہ تینوں ہی مسلمان ہو گئے۔'' تنویر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک لطیفہ مجھے بھی یاد آیا۔ ایک خان صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں نماز پڑھتے ہیں وہ کہنے لگے کہ بس اللہ معاف کرے۔ انھوں نے پوچھا روزے وغیرہ، کہنے لگے پیاس برداشت نہیں ہوتی۔ پوچھا حج زکوٰۃ وغیرہ، کہنے لگے کہ خوئے اتنا مال نہیں ہے۔ پوچھا کہ مزار وغیرہ پر جاتے ہیں۔ بس اس پر انہیں زور کا غصہ آ گیا۔ گالی بک کر کہا کہ کیا بالکل ہی کافر سمجھا ہے۔'' مدحت نے مزے لے کر سنایا۔ اب انور نے بالکل خاموش ہو کر آنکھیں بند کرلیں وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں لہٰذا خاموشی

ہی بہتر ہے۔

''مگر یہ اتاترک کو جو آپ نے کربلا کی سیر کرائی ہے، میری بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر کہیں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ اتاترک اور حضرت امام کو آپ نے روبرو کرادیا ہے تو خیر نہیں ہے۔'' تنویر نے تشویشناک لہجے میں اقبال سے پوچھا۔

''خیر نہیں ہے؟ پھر تو اسلام سے ہمیشہ کے لیے خارج ہی سمجھو۔ اتاترک کی کیا امیج ہے؟ اسلام دشمن، خلافت کو ختم کرنے والا، عربی زبان اور مدارس کو بند کرنے والا، ترکوں کو اسلام سے دور کرنے والا۔ اور ایک یہ ہیں کہ بھائی نے شہید کربلا نواسۂ رسول سے ہی اس کی ملاقات کرادی۔'' مدحت نے مزے لے کر بیان کیا۔

''صرف سیاسی امور میں ایک خیال آیا تھا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ بہت سے مسلمان، سماجی شعائر کو بھی اسلام سمجھتے ہیں۔ جیسے عربی زبان لباس، داڑھی، ٹوپی وغیرہ۔ ان کے نزدیک تو صرف عربی میں ہی قرآن پڑھایا جاسکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے مرنے کے بعد آج تک بھی وہاں کے عوام اسے اتاترک ہی مانتے ہیں۔ اس کی وجہ سیاسی ہے۔ اگر وہ اپنی جان ہتھیلی پر نہ رکھتا تو خلیفۂ عبدالحمید کو انگریز انقرہ کی سڑکوں پر ہتھکڑی لگا کر گھماتے۔ جیسے بہادر شاہ ظفر کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ اتحادی فوجیں پوری ترک قوم کو اپنے بوٹوں تلے روند دیتیں اور نہ جانے کب تک وہ غلامی کی زندگی بسر کرتے۔ عرب تو اس وقت تک غلام ہو ہی چکے تھے۔ ترکوں کی مدد کس نے کی؟ خلیفہ نے انگریزوں کے حکم پر اتاترک کی گرفتاری کے لیے فوج تک بھیج دی تھی۔ اتحادی اس کے دشمن، خلیفہ اس کا دشمن، اس نے تو صرف اپنی بہادری، سمجھداری اور سب سے بڑی بات یہ کہ خلوص کی طاقت پر نہتے عوام کو ساتھ لے کر تمام دشمنوں کو ہرایا۔ فرسودہ خلافت کو ختم کر کے عوامی جمہوریت قائم کردی۔ خلافت خلافت چلاتا ہے آج تک مولوی۔ کوئی پوچھے کہ خلافت راشدہ تھی چار خلفاء تک۔ اس کے بعد کیا تھی؟ صرف اور صرف بے لگام بادشاہت۔ عبدالحمید کیسے خلیفہ ہوگیا؟ ہاں اگر اسلام بادشاہت کا ہی حامی ہے تو ٹھیک ہے۔'' اقبال نے تفصیل بیان کی۔

''تو گویا آپ خلافت کے ہی خلاف ہیں؟'' مدحت نے پوچھا۔

''جو چیز نہ کبھی تھی اور نہ ہوسکتی ہے اس کے خلاف ہونے کے کیا معنی ہیں؟'' اقبال نے سختی سے جواب دیا۔

''نہ تھی کیا مطلب؟'' مدحت نے پھر پوچھا۔

''نہ کہلاؤ یار چار خلفاء راشدین میں سے تین کو کتنی دشواریوں پیش آئیں کہ خود مسلم مخالفین نے ان کو شہید ہی کرادیا اور یہ زمانہ بھی بس ۲۸ سال کا ہے۔قوموں کی سیاسی زندگی میں یہ زمانہ صفر سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے۔ان سب باتوں کے علاوہ کیا قیامت میں اللہ ہم سے یہ سوال کرے گا کہ خلفاء راشدین کے بارے میں کیا خیال ہے اور خلافت کیوں نہیں قائم کی؟ ہمارا آئیڈل اتنا مشکوک کیسے ہوسکتا ہے۔؟''

''پھر آپ کیا سمجھتے ہیں صحیح اسلامی سیاسی نظام درحقیقت کیا ہے؟'' تنویر نے سوال کیا۔

''یہیں تو اتاترک کا ذکر آ گیا۔امام حسین کو شہید کرنے والا بھی خلیفہ ہی کہلایا۔ بادشاہت تو بالفطرت ظالم اور غاصب ہوتی ہے اگر کوئی نیک آدمی بادشاہ بن جائے تو یہ اس کی ذاتی شرافت ہے۔لیکن بادشاہت کا مطلب ہے کہ عوام کی ساری دولت،عزت، آبرو،سب اس کی ذات ملکیت ہے۔میرے خیال میں جس طرح پہلے چار خلفاء کو خواص نے منتخب کیا،اسی آئیڈیے کو ڈولپ کیا جانا چاہیے تھا۔جس کا پہلا تجربہ اتاترک نے ترکی میں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ عوامی جمہوریت جو فرانس میں پیدا ہوئی وہی درحقیقت اسلامی طرزِ حکومت ہے۔''

''تو پھر یہ حکومت الٰہیہ، نظام مصطفیٰ اور اسلامی انقلاب یہ سب کیا ہیں؟'' مدحت نے پوچھا۔

''بھئی آپ کی پارلیمنٹ منتخب ہوگئی۔عوام نے اپنے نمائندے چن لیے۔اب جو وہ چاہیں اسے نام دے لیں۔حکومت الٰہیہ کہہ لیں،نظام مصطفیٰ کہہ لیں،چاہے جیسے قوانین بنائیں،شریعت نافذ کریں،جو چاہیں کریں،بنیادی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے بجائے ایک مجلس،جو عوام کے ذریعہ جو چنی گئی ہو حکومت کرے۔اسے خلافت کی بجائے مجلس

خلافت کا نام دے دیں، اگر خلافت لفظ سے اتنا ہی لگاؤ ہے۔ پارلیمنٹری طرز حکومت ہی میرے خیال میں صحیح اسلامی نظام ہوگا۔ دنیا دیکھے گی کہ بہت جلد پوری اسلامی دنیا کو بھی اسی طرز حکومت کو اپنانا پڑے گا۔''اقبال نے یہ کہہ کر اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔''یہ انقلاب آ کر رہے گا۔کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔''

''اب ختم کرو یار۔سر میں درد ہونے لگا۔''انور نے پیچھے مڑ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''اب تھوڑی دیر سولیا جائے۔میرے بھی سر میں درد ہونے لگا۔''تنویر نے بھی آنکھیں بند کر کے سیٹ پر آرام سے لیٹتے ہوئے کہا۔

''بس اب باتیں ختم تھوڑی دیر آرام کر لیں۔''مدحت نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔

O

(۴) آتشِ برف و چنار

4.1 جاں نذر دینی بھول گیا

بصرہ یونیورسٹی سے استعفیٰ دینے کے چند مہینہ بعد ہی اقبال کو قدرت نے ایک اور موقع فراہم کیا۔ اب اس کا سلیکشن یونیوسٹی آف کشمیر سری نگر میں بحیثیت لیکچرار ہو گیا۔ وہ اپنے سبجیکٹ کا پہلا ہی ٹیچر تھا یونیورسٹی میں۔ ایک طرح سے ایک نئے ڈپارٹمنٹ کی بنیاد ڈالنی تھی ایک چیلنجنگ جاب اس کے سامنے تھا۔ جہاں کوئی اس کا مخالف نہیں ہو سکتا تھا اور ترقی کرنے کے پورے مواقع تھے۔ اس نئی شاندار شروعات پر وہ اور شاذیہ دونوں بے انتہا خوش تھے۔ ایک سال کی جدائی کے بعد دنیا کی بہشت میں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع ملا تھا۔ جہاں کے حسین تصور سے ہی دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ محبت اور رومانس کی وادیاں، جن کا ثانی تمام روئے زمین پر کوئی نہیں اور ایک انتہائی خوبرو، دلکش پرفریب اداؤں اور محبت بھرے دل والا ہمسفر وہمراہی۔ وہ اپنے آپ کو انتہائی خوش بخت سمجھ رہا تھا۔

فی الحال وہ جوائن کرنے اور رہنے وغیرہ کا انتظام کرنے کے لیے تنہا ہی آیا تھا۔ شہر سے کوئی سات کلومیٹر دور یونیورسٹی کیمپس بنایا گیا تھا۔ تقریباً چار اسکوائر کلومیٹر کے رقبہ میں کیمپس بسا ہوا تھا جو تین اطراف سے دنیا کی مشہور ترین جھیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ دو اطراف میں ڈل جھیل دور دور تک پھیلی ہوئی تھی اور تیسری طرف نگین جھیل کا جھلمل کرا ہوا شفاف پانی لہریں مار رہا تھا۔ ان کے پیچھے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑوں کا سلسلہ قائم تھا جن کی اونچی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی تھیں۔ تمام علاقہ خوبصورت چنار اور دوسرے سیکڑوں اقسام کے پیڑوں سے سرسبز وشاداب تھا۔ چاروں طرف بڑے بڑے

خوبصورت باغات اور لانس کا سلسلہ تھا۔ان کے پیچھے حسین جھیلیں اور جھیلوں کے پیچھے پہاڑوں کا سلسلہ اور انہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر رومانٹک مغل شہنشاہوں، شاہجہاں اور جانگیر کے بنائے ہوئے مشہور زمانہ شالیمار اور نشاط باغات تھے جن کا حسن بوڑھوں کو بھی مدہوش کر دیتا تھا۔ یہاں کے پھولوں میں عجیب دلکشی اور رنگ میں عجب گہرائی تھی اور خوشبو تھی کہ دور تک پورے علاقے کو مہکاتی رہتی تھی۔ یہاں کی پر کیف ہوائیں بھی شرابی کی طرح چلتی تھیں۔

اقبال کو کیمپس کے اندر ہی چنار کے درختوں کے درمیان نسیم باغ میں ایک دو کمروں کا آراستہ گھر الاٹ ہوگیا۔ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھولتے ہی سامنے ڈل جھیل پر تیرتے ہوئے شکارے نظر آتے تھے۔اور جھیل کے اس پار نشاط باغ کے اونچے اونچے درخت بھی۔جھیل میں سیکڑوں ہاؤس بوٹس تھیں۔ بڑی بڑی کشتیوں کے اوپر لکڑی کے خوبصورت رہائشی کمروں میں قالین اور بڑے بڑے نقشیں بیڈز، کھڑکیوں پر ریشمی پردے، گرم پانی کے حمام، ڈائننگ اور ڈرائنگ رومز مختصر یہ کہ ہاؤس بوٹس میں اعلیٰ پیمانے کے رہائشی انتظامات تھے۔شکارے میں بھی ایک چھوٹی کشتی پر دو آدمیوں کے لیٹنے کے لیے خوبصورت گدے دار دررازصوفہ کے اوپر رنگین کپڑوں سے آراستہ شیڈ۔صوفہ کی اونچی گدی کے پیچھے کشتی بان اپنے چپو لیے بیٹھتا تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔سیکڑوں کی تعداد میں یہ شکارے ہنی مون منانے والے جوڑوں کو لیے گھنٹوں ڈل جھیل کے پرسکون پانی پر آہستہ آہستہ چپوؤں کی آوازوں کے درمیان تیرتے رہتے تھے جیسے جھیل میں راج ہنس تیرے رہے ہوں۔کہا جاتا ہے کہ پورے چاند کی روشنی میں ڈل جھیل میں شکارے کے بیڈ پر کسی حسین ساتھی کے ساتھ آہستہ آہستہ تیرتے ہوئے ہچکولے کھانے سے زیادہ رومانٹک کوئی دوسرا منظر نہیں ہوسکتا۔ یہ مارچ کی شروعات تھی موسم بہار اپنے عروج پر تھا۔باغات میں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھولوں کی رنگت اور نکھار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ یہاں گردوغبار کا نام ونشان تک نہ تھا۔اقبال یہ بھول ہی گیا تھا کہ دھول کسے کہتے ہیں اور غبار کیا ہوتا ہے۔جی چاہتا ہے تھا کہ ساری ہوا سینے میں بھر لیں۔تمام ہوٹلز اور موٹر بوٹس

ٹورسٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ تمام دنیا سے لوگ یہاں آ گئے ہیں۔ ہر ملک اور رنگ و نسل کے خوبصورت مرد اور عورتوں سے پورا ماحول جگمگا رہا تھا۔ تشدد اور گولہ بارود کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ کشمیر ابھی جنت نشان ہی تھا۔ چنار میں آگ لگنے میں ابھی وقت باقی تھا۔ ایران عراق جنگ کے محاذ، وہاں کے سیاسی نظام اور یہاں کشمیر کے ماحول میں دوزخ اور جنت کا فرق تھا۔ بصرہ میں تو ہر وقت صرف اپنے کو بچا کر ہندوستان لوٹ جانے کی فکر تھی۔ تمام وقت اسی فکر میں گزرتا تھا۔ ذہن تھا کہ جیسے کسی تنور میں ڈال دیا گیا ہو مگر یہاں جسم و جاں ایک نئے انداز سے انگڑائی لے رہے تھے، جیسے روح پھولوں کے مہکتے باغ میں رومانس کے جھولے میں جھول رہی ہو۔ بس کمی تھی تو صرف ایک کہ شاذیہ وہاں نہیں تھی۔ اس کے دل و دماغ پر رومانس جادو بن کر چھا رہا تھا۔ اس نے کمرے کی ہر دیوار پر شاذیہ کی تصویریں لگا رکھی تھیں۔ چاروں طرف بس اسی کا مسکراتا چہرہ نظر آتا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، پھولوں کے مکھڑوں میں، ڈل جھیل کے تیرتے شکاروں پر، نگین جھیل کے پرسکون پانی میں، چناروں کے درختوں پر، بس ہر جگہ صرف اور صرف شاذیہ ہی اس کو نظر آتی تھی۔ وہاں بارود کی آگ نے تو یہاں ہجر کی آگ نے اسے جلا رکھا تھا۔ کسی نہ کسی آگ میں جلتے ہی رہنا شاید اس کا مقدر تھا۔ ایک مہینہ کے بعد تین دن کی چھٹیاں آئیں اور اس نے ڈین سے پانچ دن کی چھٹی کسی طرح منوالی، حالانکہ وہ ابھی کسی بھی چھٹی کا حقدار نہ تھا۔

☆

یہ ایک خواب آگیں جادو بھرا سفر تھا۔ وہ شاذیہ کے ہمراہ جموں سرینگر روڈ پر ایک منی بس میں سفر کر رہا تھا۔ تقریباً چار سو کلومیٹر کا یہ لمبا سفر، جس میں بیس گھنٹے سے بھی زیادہ لگتے تھے غالباً دنیا کا سب سے زیادہ ایڈوینچرس اور رومانٹک سفر ہے۔ جس میں حیرت انگیز حسین وادیاں کلکل کرتی ندیاں، خوبصورت آبشار، بے پناہ دراؤنی گھاٹیاں، گھنے جنگلات، ہرے بھرے درخت برف سے ڈھکے پہاڑ، تمام راستے مسافر کو آنکھیں بند نہیں کرنے دیتے۔ کبھی پہاڑ کے چاروں طرف گھومتی ہوئی بس اوپر ہی اوپر چڑھتی چلی جاتی ہے کھڑکی

سے جھانک کر دیکھ لیجئے کہ وہاں پہاڑ کی اونچی چوٹی پر ہمیں جانا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ وہاں تک پہنچنے کا راستہ کیا ہوگا۔ اور اگر کبھی کھائی کی طرف نظر چلی گئی تو کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ خدایا اگر کسی وجہ سے بس نیچے گر گئی کہ صرف چند فٹ گاڑی کا پہیہ خندق کی طرف مڑا اور ہزاروں فٹ نیچے پہنچ کر کسی کے بچنے کا تو سوال ہی نہیں، شاید کسی بھی ترکیب سے لاشیں تک حاصل نہیں کی جاسکیں۔ ایسے میں دوسری طرف سے آتے ہوئے ٹریفک کو راستہ بھی دینا ہوتا ہے۔ جو حد درجہ خوفناک منظر ہوتا ہے۔ چوٹی پر پہنچ کر اب اترائی کا سفر شروع ہوتا ہے جو اتنا ہی خطرناک اور ایڈوینچرس ہے کہ گھنٹوں اسی پہاڑ پر نیچے کی طرف چکراتے ہوئے اترتے چلے جارہے ہیں اور دوسرے پہاڑ کی بیس تک پہنچ گئے اب اس پہاڑ پر چڑھائی کا سفر شروع ہوا۔

''یہ تم مجھے کہاں لے جارہے ہو۔ میں مرجاؤں گی۔ یہ خدایہ سفر ہے کہ قیامت۔'' شاذیہ نے دونوں ہاتھوں سے اقبال کا شانہ پکڑ کر کہا۔

''بس تم لڑکیوں کا یہی قصہ ہے۔ وہ دیکھو نیچے وادی میں کتنی حسین ندی بہہ رہی ہے کیسی جھلمل کر رہی ہے۔ مگر تم سے زیادہ نہیں۔'' اس نے شاذیہ کی گردن میں ہاتھ ڈالکر اپنی طرف جھکاتے ہوئے کہا۔ وہ کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا اور شاذیہ اس کے برابر دوسری سیٹ پر تھی۔ منی بس میں کل بیس بائیس مسافر تھے کئی یورپین جوڑے بھی سفر کر رہے تھے۔ تمام لوگ پل پل بدلتے ہوئے میں مناظر کا لطف لے رہے تھے۔ مگر کچھ تو آنکھیں کھولتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔ پہاڑی راستوں کا سفر ہر ایک کے لیے آسان نہیں ہوتا۔ بیس سال کی شاذیہ بھی انہیں لوگوں میں سے تھی۔ مگر اقبال کے کہنے سے آنکھیں کھول کر ڈرتے ہوئے کبھی کبھی کھڑکی سے بھی جھانک لیتی تھی۔ تمام راستے وہ معصوم بچے کی طرح اقبال سے چپکی بیٹھی رہی۔ بس ذرا موڑ آیا اور اس کی سسکاری نکلی۔ اقبال کے ساتھ کشمیر وادی میں جاکر رہنے کی خوشی ایک طویل سفر کا رومانس اور چہرے پر خوف کی پرچھائیاں، اس کی بے مثال حسین چہرے پر عجب طرح کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔

''ہوائی جہاز سے نہیں آسکتے تھے؟ دہلی سے صرف ایک گھنٹے کا سفر ہے۔'' اس نے

مصنوعی غصہ سے اقبال کی کمر پر ہاتھ مارا۔

''اب تم کہہ سکتی ہو کہ تم دنیا کے حسین ترین راستے کی مسافر رہی ہو۔ کتنے لوگ ہیں جو اس راستے سے گزرے ہیں۔ جہاز سے کیا ہوتا۔ یہ سین یہ وادیاں یہ آبشار اور یہ خوبصورت جنگلات کہاں دیکھنے کو ملتے۔'' اقبال نے اس کا سر اپنے کاندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''میرا تو کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔ ایسا سفر الٰہی توبہ۔ اب میں کبھی اس راستے سے نہیں آؤں گی۔ اس نے اقبال کی کمر کو زور سے پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ غلط بات ہے۔ اگر تم ایسا سوچو گی تو بالکل مزہ نہیں آئے گا۔ قدرت کا حسن دیکھو۔ دیکھو کہ خدا نے دنیا کو کیسا سجایا ہے۔ حالانکہ تمہیں آئینہ دیکھنے سے ہی کہاں فرصت ہے۔'' اقبال نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''اور آپ میرے علاوہ سب کچھ دیکھئے۔ پہلے سال کے لیے عراق چلے گئے بصرہ، بغداد، کربلا، کوفہ اور نہ جانے کہاں کہاں۔ اور اب یہ منظر دیکھ رہے ہیں ہم پاس بیٹھے ہیں انہیں پتہ بھی نہیں۔'' اس نے ناراض ہو کر شکایتی نظروں سے اقبال کو دیکھا۔

''ارے پیارا بچہ تو ناراض ہو گیا! کون ہے جو اس تمام کائنات میں تم سے زیادہ حسین اور خوبرو ہے۔ یہ مناظر، وادیاں، جھرنے سب تمہاری ذرا سی مسکراہٹ پر قربان۔ میری تمام ہستی تمہاری آنکھوں کا صرف ایک آنسو ہے۔ بغداد کی گلیوں سے لے کر کشمیر کی وادی تک میرے دل نے ہر جگہ صرف تمہیں ہی آواز دی ہے، صرف تمہیں۔ لو اب تمہارے چہرے کے علاوہ میں کوئی اور منظر نہیں دیکھوں گا۔ سری نگر تک تمام راستے آنکھیں بند رکھوں گا۔'' اقبال نے دونوں ہاتھوں میں اس کا شہرہ لے کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''اب راستے پر آیا میرا اجنبی۔'' شاذیہ نے دونوں بانہیں اقبال کے گلے میں ڈالتے ہوئے اس کے منہ پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا، اجنبی؟ وہ کیسے؟'' اقبال نے فوراً آنکھیں کھول کر سوال کیا۔

''اجنبی نہیں تو کیا کیا۔ نہ جانے کیا کیا کتابیں پڑھتے رہتے ہیں،سوائے ہمارے۔''
اس نے ایک ناز سے شکایتی انداز میں کہا۔

'کتابیں تو سب بکواس ہیں۔کوئی مصنف،کوئی شاعر میرے دل کی حالت اور تمہارے حسن کو بیان نہیں کرسکتا۔کسی زبان میں وہ سکت نہیں کہ تمہاری ایک معصوم نظر،نظر کی مسکراہٹ یا شکایت یا اقرار یا شرارت کو بیان کر سکے۔کیسا جادو ہے تمہارے وجود میں کہ میں تو بس دیوانہ ہوکر رہ گیا ہوں۔ مجھے ان مناظر کا کتابوں کا، بغداد، بصرہ کا طعنہ نہ دو کہ دل کی بستی میں صرف اورصرف تمہارا بسیرا ہے۔یقین کرو۔'' اقبال نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''آج میں تمہاری کتابوں کی قائل ہوگئی۔خوب پڑھا کرو۔''اس نے زور سے ہنستے ہوئے کہا۔اس کی ہنسی سے جل ترنگ سا بج اٹھا۔

''اچھا تو میں یہ کتابوں میں لکھا ہوا بیان کرر ہا ہوں؟''اقبال نے شکایتاً سوال کیا۔

'اورنہیں تو کیا میرے اجنبی۔ یہ لفاظی تم نے کہاں سے سیکھی؟'' شاذیہ کے چہرے پر شریر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی۔

''جسے پیار ہوتا ہے اسے خود بخود لفاظی آجاتی ہے۔خیر سرینگر چل کر میں تمہیں خنجر خرید کر پیش کروں گا۔اجنبی اورلفاظی کا علاج بس اسی طرح ممکن ہے۔''اقبال نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے تو وہ خنجر چاہیے جو سلیم نے بہار کے سینے میں اتارنا چاہا تھا اورسینہ یہ حاضر ہے۔''شاذیہ پوری طرح شرارت کے موڈ میں تھی۔

''مگرتم بہارنہیں، بلکہ تم تو انارکلی ہو۔میرا انارکلی۔''

''نہیں پرنس مجھے انارکلی نہ کہو کہ وہ اپنے سلیم سے جدا کردی گئی تھی۔''شاذیہ نے اداس لہجہ میں اس کا ہاتھ تھام کر جواب دیا۔

''ملن اورجوائی سب خدائی فیصلے ہیں کوئی انسان کچھ نہیں کرسکتا۔''اقبال نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''جدائی کیساتھ ،خدائی فیصلے کا ذکر نہ کرو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' شاذیہ کی آنکھیں نم ہوگئیں اور اس نے اقبال کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

''اچھا اب سو جاؤ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔'' اقبال نے اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ شاذیہ نے اس کے دوسرے کاندھے کو بھی ہاتھ سے پکڑ لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

اقبال اس وقت دنیا کے خوش نصیبوں میں اپنے آپ کو شمار کر رہا تھا۔ سفید شلوار سوٹ اور دوپٹے اور ہلکے میک اپ میں شاذیہ بالکل اپسرا لگ رہی تھی۔ اقبال کو بے پناہ اس پر پیار آرہا تھا۔ نیند کی وجہ سے اس کے چہرے کی معصومیت پر اور بھی نکھار آ گیا تھا حسین راستوں میں من پسند ہمسفر اور سری نگر میں ڈل جھیل کے کنارے انتظار کرتا ہوا خوبصورت باغ، باغ میں چھوٹا سا گھر، سامنے ڈل جھیل کے نظارے اور یونیورسٹی میں ٹیچنگ جاب اور کیا چاہیے تھا اسے؟ زندگی نے اسے سب کچھ دے دیا گیا۔ ٹیچنگ اسے سب سے زیادہ مرغوب تھی۔ ایک گھنٹہ کے بھرپور لیکچر کے دوران نوجوان طلباء کی آوازیں ''سر سب سمجھ میں آرہا ہے۔'' اسے مدہوش سا کر دیتی تھیں۔ اس کے طلباء اس کو بہت چاہتے تھے اور تقریباً دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ اسے بصرہ یونیورسٹی کا آخری لیکچر یاد آیا۔ شروع مئی کا کوئی دن تھا۔ اس دن گرمی بہت زیادہ تھی ایک گھنٹہ کے لیکچر کے بعد اس نے اعلان کیا:

''ویل ڈیئر اسٹوڈنٹس! بصرہ یونیورسٹی میں یہ میرا آخری لیکچر تھا، میں انڈیا واپس جا رہا ہوں۔''

''نو سر! کیوں؟ ہم سب آپ کو بہت چاہتے ہیں۔'' ایک لڑکی نے اچانک کھڑے ہو کر کہا۔ پھر تمام طلباء نے اس کو گھیر لیا۔ وہ اپنی کرسی پر بیٹھا ان کے سوالات کے جوابات دیتا رہا۔ طلباء کے اظہار اپنائیت اور خلوص نے اسے بھی جذباتی کر دیا۔ اگلے کئی دن ان کے مختلف گروپس کے ساتھ فوٹوگرافی میں گزرے۔ انھوں نے ایک الوداعی پارٹی بھی دی۔ شط العرب میں بوٹنگ اور پکنک کرنے بھی ایک دن سب گئے۔ پکنک کے دوسرے دن جب اقبال ڈپارٹمنٹ آیا تو سلمیٰ گیلری میں کھڑی تھی۔ انتہائی ذہین اور شارپ لڑکی

تھی۔اپنی بہت سی ذاتی باتیں بھی وہ اس سے کر لیتی تھی۔

''کیا آپ واقعی جارہے ہیں؟''اس نے بغیر اجازت لیے اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل، بس اگلے ہفتے ہی کویت ہوکر جارہا ہوں۔یہاں سے کویت صرف سوکلومیٹر دور ہی تو ہے۔بس سے وہاں جائیں گے اور وہاں سے دہلی۔ یہاں تو جنگ بڑھتی ہی جارہی ہے۔''اقبال کے کرسی پر بیٹھتے ہی وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''لیکن ہم کہاں جائیں سر۔''کم ازکم آپ سے میں ہر بات کہہ لیتی تھی اور میرا دل ہلکا ہوجاتا تھا۔ یہاں تو کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔یہ جنگ تو لگتا ہے ہم سب کوختم ہی کر کےختم ہوگی۔''یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''ایسا نہ کہو۔بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا اور امید ہے کہ یہاں جمہوریت بھی ایک دن آجائے گی۔''اقبال نے اسے دلاسہ دینا چاہا۔

''سر آپ مجھے نادان سمجھ رہے ہیں۔عرب دنیا میں جمہوریت؟ قیامت تک ایسا نہیں ہوسکتا۔ہم سب ظالم حکمرانوں کے ظلم کا شکار ہونے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔شروع سے ہی ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔''اس نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن تم ایک اچھی اسٹوڈنٹ ہو تمہارا فائنل ہوجائے گا۔کسی ترقی یافتہ ملک میں ریسرچ کے لیے چلی جاؤ۔اسکالرشپ تمہاری حکومت دے دے گی۔کیا پریشانی ہے؟''

اقبال نے پھر اسے راستہ دکھانا چاہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب آسان نہیں تھا مگر وہ امید اور حوصلے کے ساتھ جینے کی صلاح کے علاوہ اسے اور کیا دے سکتا تھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہمارے سماج کو نہیں جانتے سر۔ یہاں لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے ہر کام میں۔چاہے ان کے نمبر ہم سے کم ہی کیوں نہ ہوں۔بس میں یہیں کسی آفس یا بینک میں کلرک ہوجاؤں گی اور میرے ماں باپ کسی لڑکے سے میری شادی کردیں گے۔''اس نے اقبال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

''اور کیا چاہیے تمہیں؟'' قسمت سے کون لڑسکتا ہے۔''اقبال نے اس سے نظریں

بچاتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں چاہیے، کچھ بھی نہیں سر! میں آپ سے کچھ بھی نہیں چاہتی۔ میں جانتی تھی کہ وہ تمام نظریات، جمہوریت، آزادی، برابری اور نہ جانے کیا کیا، جو خواب آپ پورے سال میرے دماغ میں ڈالتے رہے ان کی کچھ حقیقت نہیں ہے سوائے کاغذی نظریات کے۔ آخر آپ نے بھی کاتب تقدیر کا سہارا لے ہی لیا۔ قسمت سے کون لڑسکتا ہے۔ یہی کہا نا آپ نے! اور یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ انسان اپنی قسمت خود بناتا ہے۔ جایئے اپنی قسمت بنایئے، میں اب آپ سے کبھی نہیں ملوں گی۔ خدا حافظ۔'' اچانک اس نے ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھ کر کہا اور بغیر پیچھے دیکھے دروازہ کھول کر چلی گئی۔ اقبال اس کے جذباتی انداز پر حیران رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی لڑکی کے سینہ میں اٹھتے ہوئے طوفانی جذبات کی زد میں آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر میز پر سے اس کا چھوڑا ہوا خوشبودار ٹشو پیپر اٹھا کر جیب میں رکھا اور اپنے کاغذات سمیٹنے لگا۔ اسے لگا کہ جیسے عراق کی ساری کمائی انہیں چند آنسوؤں میں سمٹ آئی ہے وہ شاید صرف اسی بھیگے ہوئے کاغذ کی جستجو میں ریگستانوں کی سیر کرنے نکلا تھا۔

☆

اونچے اونچے گھنے چناروں کے نسیم باغ کے درمیان، چھوٹے سے خوبصورت آراستہ گھر کو دیکھ کر شاذیہ خوشی سے جھوم اٹھی۔

''اوہ میرے پرنس، تم نے میری پورے سال کی جدائی کا غم دور کردیا۔'' اس نے اقبال کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اسے چوم لیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ تم مدہوش ہو جاؤ گی۔ اقبال نے اس کی کمر تھپتھپائی۔

''جیسا سنا تھا تصویروں اور فلموں میں جیسا دیکھا تھا، اس سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے یہ ہمارا کشمیر۔'' شاذیہ نے صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

''ہمارا کشمیر! یہ ہمارا کب سے ہو گیا۔'' اقبال نے مسکرا کر پوچھا۔

''بس ابھی سے، جب سے ہم یہاں آئے۔ جب سے تم نے مجھے چھوٹا سا یہ پیارا گھر

دیا۔'' شاذیہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھا کر اس کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔
''اسے ہمارا کشمیر مت کہو۔ پنڈت نہرو اور کشمیری دونوں ناراض ہو جائیں گے۔''
اقبال نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔
''کیا مطلب؟'' شاذیہ نے حیران ہوتے ہوئے سر اٹھا کر پوچھا۔
''پنڈت جی اس لیے کہ بڑی مشکل سے ایڈونا کے ذریعہ انھوں نے اسے اپنے قبضے میں کیا تھا اور کشمیری اس لیے کہ وہ ہم سب کو غاصب ہندوستانی سمجھتے ہیں۔''
اقبال نے جواب دیا۔
''سارا موڈ غارت کر دیا تم نے۔ اسی لیے میں تمہیں اجنبی کہتی ہوں۔'' شاذیہ کی آنکھیں چھلک آئیں اور وہ اندر کمرے میں جا کر بستر پر تکیہ میں سر چھپا کر لیٹ گئی۔
''ارے میرا لاڈلا بیٹا تو ناراض ہو گیا۔'' اقبال نے اس کے پیچھے آتے ہوئے کہا اور اس کے برابر آ کر لیٹ گیا۔
''میں نہیں بات کروں گی تم سے۔'' اس نے ناراضگی سے دوسری طرف کروٹ لے لی۔
''دیکھو بھوکوں سے ناراض ہونا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ دس گھنٹے سے کچھ نہیں کھایا۔'' اقبال نے اداس لہجے میں اس کو یاد دلایا۔
''اچھا تو کتنے زور کی بھوک لگی ہے میرے بچے کو؟'' شاذیہ نے ایک دم پلٹ کر پوچھا۔
''یہ ہوئی نا بات۔ میں جانتا ہوں کہ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔
''ایسا ہی ہے میرا دل۔ میری ساری خوشیاں اور غم، بس صرف تمہارے ہاتھ میں ہیں۔ چاہے ہنسا دو چاہے رلا دو۔'' شاذیہ نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔
''اور میرا دماغ بھٹکتا رہتا ہے نہ جانے کہاں کہاں۔'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اس کی کمر تھپتھپائی۔
''دماغ کو بھٹکانا چھوڑو اجنبی۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔'' شاذیہ نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کھانا کسے کھانا ہے۔ وہ تو تمہیں منانے کا ایک بہانہ تھا۔'' اقبال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اچھا بدمعاش!'' شاذیہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''عشق اول در دل معشوق پیدا میشود'' اقبال نے یہ کہہ کر اس کی طرف کروٹ بدل لی۔ پھر یہ عالم ہوا کہ قبول حضرت غالب:

میں اور حز وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

☆

نیا ڈپارٹمنٹ شروع ہونے میں ابھی وقت تھا۔ لیکن دوسرے ڈپارٹمنٹ میں اقبال کو اپیلائڈ قسم کا ایک کورس پڑھنے کو دے دیا گیا۔ ہفتہ میں صرف تین لیکچرز ہوتے تھے۔ باقی سارا وقت چھٹی کا تھا۔ ریسرچ کی بھی سہولت نہیں تھی۔ لہٰذا راوی نے صرف چین لکھ دیا تھا دونوں کی قسمت میں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر کچھ دیر لیٹے اور تین بجے ہی وہ دونوں تھرماس میں چائے، آملیٹ اور سینڈوچ وغیرہ لے کر نکل جاتے تھے۔ کیمپس کے چاروں طرف جہاں بھی نکل جائیں ہر جگہ پکنک منانے کے خوبصورت باغات اور وادیاں بکھری پڑی تھیں۔ گھر کے سامنے نسیم باغ سے نیچے اترتے ہی سڑک کے پار ڈل جھیل کا پانی لہریں مار رہا ہوتا۔ جھیل اور سڑک کے درمیان ایک خوبصورت طویل لان تھا جسے بہت سے مالی مل کر جنت نشان بنائے رکھتے تھے۔ مختلف قسم کے گلاب کے جا بجا لہلہاتے تختے، اتنے بڑے خوش رنگ اور خوشبودار گلاب، کہیں میدانی علاقوں میں نہیں پائے جاتے۔ ٹورسٹوں سے یہ لان بھرے رہتے تھے، جا بجا ٹولیاں بنائے لوگ ہنی مون منانے آنے والے نوجوان جوڑے اور ان کا انتظار کرتے اپنے شکارے سجائے ہوئے کشتی بان، جھیل کے کنارے کشمیری گیت گاتے ہوئے مقامی لوگوں کی ٹولیاں۔ دور پہاڑی کی چوٹیوں پر جمی برف پر پڑتی ہوئی سورج کی شعائیں۔ پہاڑوں کی ڈھلانوں پر گھنے پیڑوں کا سلسلہ، عطر بیز ہوائیں اور ان گنت قسم کے پرندوں کے غول کے غول۔ کبھی جھیل کے اس کنارے کبھی

اس کنارے خوش فعلیاں کرتے ہوئے۔ایک کشمیری کشتی بان روز ان لوگوں کا انتظار کرتا تھا اور جھیل کے درمیان کشتی روک کر جل ترنگ کے ساز پر کوئی لوک گیت گا کر سناتا تھا۔ ہجر و وصال کا درد بھرا گیت تھا۔کچھ دیر یونہی لان میں چہل قدمی کے بعد وہ اس کے شکارے میں جھیل کا ایک چکر لگاتے تھے۔جھیل پر ہر وقت ایک نیا منظر ہوتا تھا۔درجۂ حرارت کی معمولی تبدیلی سے ہی پوری فضا بدلی بدلی نظر آتی تھی۔اگر سیکڑوں بار بھی ڈل میں بوٹنگ کیجئے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے ڈل دیکھ لی۔کہ لمحہ لمحہ اس کا مزاج، رنگ اور لطف بدلتا ہے۔بادلوں کے آنے جانے اوران کے رنگ روپ سے، جھیل ہر بار ایک نئے انداز سے آپ کا انتظار کرتی ہے جیسے کوئی خوشنما خوبرو دوشیزہ، ہر لباس میں، ہر طرز و ادا میں، ایک نئے روپ میں شئے دیگر بن کر سامنے آتی ہے۔شاذیہ کے مختلف لباسوں اور ہیئر اسٹائل اور موڈ کی طرح، ہر بار ایک نئی جھیل سے ملاقات ہوتی تھی۔ پورے چاند، آدھے چانداور بادلوں کے درمیان چھپتے نکلتے چاند میں، چھوٹے اور بڑے چاند کی راتوں میں، دور سے لہروں پر آتی ہوئی کشمیری میوزک اور ساز کی مہکار میں، شاذیہ کے ساتھ شکارے کے بیڈ پر لیٹے ہوئے، جھیل کا تصور ایسا ہے کہ جیسے جاگتی آنکھوں کا خواب۔ درحقیقت حسین ترین خواب بھی ایسے نہیں ہوتے۔کبھی کبھی سر جھٹک کر سوچنا پڑتا تھا کہ ہم جاگ رہے ہیں یا سو رہے ہیں۔جھیل کے بیچ میں ایک ٹاپو پر چنار کے چار قدیم درخت ہیں وہاں بیٹھ کر چاروں طرف کا نظارہ کسی اور ہی رنگ میں نظر آتا ہے۔جھیل کے دوسری پار پہاڑی کی ڈھلانوں پر مغل بادشاہوں کے بنائے ہوئے نشاط اور شالیمار باغ ہیں۔ پہاڑی کی چوٹی سے شفاف جھرنے کا جھلمل کرتا پانی خوشنما حوضوں اور نقشیں سیڑھیوں سے اترتا ہوا، اوپر سے نیچے کی طرف اترتا ہے، اور پھر پورا جھرنا بنکر ڈل میں گر جاتا ہے۔ بابجا حوضوں میں مختلف قسم کے فوارے پانی کو ہوا میں بکھیرتے ہیں۔دونوں طرف چوڑے خوبصورت لان اوران میں استادہ منتخب حسین درخت اور پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ پکنک مناتے لوگ، حسینوں کے پیچھے دوڑتے، شوخیاں کرتے نوجوان اورآہستہ آہستہ چلتی عطر بیز ہوائیں، دیکھے بغیر یقین نہیں آسکتا کہ کوئی منظر اتنا دلنشیں اور اتنا شوخ اور اتنا خوش

رنگ ہوسکتا ہے۔ وہ دونوں گھنٹوں ان باغات میں مگن گھومتے رہتے تھے۔ شام کو سورج غروب کے وقت ڈل جھیل کے درمیان شکارے کو روک کر پل پل بدلتے رنگوں کو دیکھتے۔ مغرب میں پہاڑ کی اونچی برف سے ڈھکی چوٹی پر، جب ڈوبتے سورج کی شعائیں قوس قزوح بن کر آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں سے ٹکراتیں تو ہزار ہا خوشنما رنگ پورے ماحول پر جھیل کے پانی میں، شاذیہ کے حسین چہرے پر اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اتر آتے تھے۔ گھڑی گھڑی بدلتے سورج کے ہر زاویے سے لامتناہی رنگوں کا سلسلہ پل میں کچھ ہوتا تو پل میں کچھ۔ کسی شاعر کا تخیل، کسی نثر نگار کے الفاظ بھی ان مناظر کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ اندھیرا چھا جانے پر ہی وہ جھیل سے باہر آتے تھے اور دس منٹ کی چڑھائی کے بعد اپنے گھونسلے میں پہنچ کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سو جاتے تھے۔ چند ہی مہینوں میں انھوں نے پوری وادیٔ کشمیر کے ہر قابل ذکر مقام کی سیر کر لی اور سیکڑوں مناظر کو کیمرے میں قید کر لیا۔ اقبال کو فوٹوگرافی کا شوق تھا تو شاذیہ کو فوٹو کھنچوانے کا۔ فوٹوجینک چہرے والی اس لڑکی کا مختلف زاویوں اور ملبوسات میں تصویریں کھنچوانے سے دل ہی نہیں بھرتا تھا۔

4.2 فریبِ ہستی

یہ ایک سرد رات تھی، تیز برفیلی ہواؤ کے ساتھ ساتھ بارش بھی ہو رہی تھی۔ اقبال، شاذیہ اور اپنی دو سال کی بچی، روشی کے ساتھ اپنے گھر میں سویا ہوا تھا۔ شاذیہ ہر رات دودھ گرم کر کے فلاسک میں بھر کر بستر کے پاس ٹیبل پر رکھ کر سوتی تھی۔ اس شام وہ جلد ہی سو گئے تھے اور شاذیہ کام نہیں کر پائی تھی۔

''اقبال! میں جل رہی ہوں۔ مجھے بچاؤ۔''

شاذیہ کی چیخیں سن کر اقبال جاگ گیا چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پھر دوڑتا ہوا سامنے کچن میں پہنچا تو شاذیہ کی ٹانگیں شعلوں میں لپٹی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے بجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ دوڑ کر واپس آیا اور کمبل میں لپیٹ کر اس کو اندر کمرے میں قالین پر لٹا دیا۔ چیخ پکار کی آوازیں سن کر روشی اٹھ کر بیٹھ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

''ممی ممی ممی!'' بس وہ شاذیہ کو بے پناہ آوازیں دیے جارہی تھی۔ ادھر شاذیہ اپنے درد میں چیخ رہی تھی۔ اقبال دیوانوں کی طرح کبھی اس کے پاس تو کبھی اس کے پاس دوڑ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ پھر وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر بارش اور تیز ہوا سے گزرتا ہوا سامنے پروفیسر صدیقی کے مکان پر بجائے گھنٹی بجانے کے زورزور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

''کیا ہوا اقبال؟'' تم کیوں رورہے ہو، یہ سب کیا ہے؟'' پروفیسر صدیقی نے دروازہ کھول کر اقبال کو اس حالت میں دیکھ کر حیرانی سے پوچھا۔

''پلیز جلدی چلیے، شاذیہ کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہے۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''کیا، کپڑوں میں آگ؟ تم چلو ہم لوگ ابھی آئے۔'' انھوں نے اقبال سے کہہ کر دروازہ بند کرلیا۔ چند ہی منٹ میں وہ وہاں آگئے۔ مسز صدیقی آتے ہی شاذیہ کا سر اپنی ٹانگ پر رکھ کر دلاسہ دینے لگیں۔

''کیا ہوا؟ گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ہم لوگ ہیں۔ تم پریشان نہ ہو۔''

پروفیسر صدیقی نے جلدی سے ایک اور پڑوسی، پرفیسر اور مسز تھومس کو بھی وہاں بلالیا۔ مسز تھومس نے آتے ہی روشی کو گود میں لے لیا اور اس کو چپ کرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ شاذیہ کا سر اپنی گود میں رکھے پروفیسر صدیقی کی کار میں شہر کے اسپتال کی طرف جارہے تھے۔ تمام راستے وہ درد اور جلن سے کراہتی رہی۔ مسز صدیقی بھی آگے کی سیٹ پر بیٹھی تھیں تقریباً آدھے گھنٹے میں وہ لوگ ایمرجنسی وارڈ میں پہنچ گئے اور شاذیہ کو بھرتی کرلیا گیا۔ ڈاکٹرز نے کچھ انجکشن دیئے جس سے اس کو تھوڑی ہی دیر میں نیند آگئی۔ اقبال سکتے کے عالم میں اس کے بیڈ کے برابر اسٹول پر بیٹھا، رفتہ رفتہ اس کے سوجتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر اور مسز صدیقی تقریباً آدھا گھنٹہ وہاں رکنے کے بعد صبح آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

اس شام وہ ضرورت سے کچھ زیادہ خوش تھے۔ شالیمار باغ میں بچے کے ساتھ بہت دیر تک کھیلتے رہے تھے۔ اور مختلف زاویوں سے اس کی تصویریں کھینچیں تھیں۔ روشی نے

چند ماہ پہلے ہی چلنا سیکھا تھا لیکن ابھی تک چلنے میں وہ گر جاتی تھی ۔شاذیہ اس کی دیوانی تھی ہر لمحہ اس کا چہرہ دیکھتی رہتی تھی ۔اسی کے کام میں مگن اور اس کی باتیں ہر دم اس ی زبان پر رہتی تھیں ۔شام سے ہی بادل گھرنے شروع ہو گئے تھے سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں ۔اس لیے وہ جلد ہی گھر لوٹ آئے تھے اور اب اقبال انتہائی شاک کے عالم میں اپنی زندگی کے حسین ترین خواب کی بھیانک رنگ بدلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔شاذیہ کی چیخیں اور دردناک آہیں اس کے وجود میں شعلہ بن کر دوڑ رہی تھیں ۔ابھی کچھ گھنٹے پہلے تک وہ اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا۔صرف ایک رات کے فرق نے اس کی جنت میں آگ لگا دی تھی اور خوبصورت دن بھیانک رات میں تبدیل ہو گیا تھا۔اس کی دنیا کا عزیز ترین وجود ہسپتال کے جنرل وارڈ میں موت اور زندگی کی کشمکش سے دوچار، اکثر وقت نشہ آور دواؤں کے زیر اثر، ڈاکٹر اور نرسوں اور طلباء کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا اور دوسری طرف اس کی پیاری ننھی بیٹی، پڑوسیوں کے گھر میں ہر وقت ممی ممی پکارتی، روتی اور تڑپتی رہتی تھی۔ اسے کون سمجھا سکتا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔کہ نہ ممی ہیں اور نہ پاپا اور یہ کون ہیں کہ جن کے پاس وہ رو رہی ہے ۔اس معصوم کے درد کو کون سمجھ سکتا تھا۔کئی دن بعد اقبال جب شاذیہ کو نرسوں کی زیر نگرانی چھوڑ کر روشی کو دیکھنے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ ننگے پاؤں اپنے گھر کے دروازے پر بالکل تنہا کھڑی ہوئی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی اور رو رو کر پکار رہی تھی ۔

''ممی! ممی! دروازہ کھولو!''

وہ دور سے دوڑتا ہوا آیا اور تیزی سے بچی کو گود میں اٹھا کر سینے سے چپکا لیا۔

''اوروہ نو مائی گوڈ! میری بچی نہ روؤ پلیز مت روو۔'' وہ اس کے تمام چہرے پر دیوانہ وار پیار کر رہا تھا۔خود بھی اس کی آنکھوں سے بے پناہ آنسو رواں تھے۔پھر وہ وہیں گھر کی سیڑھیوں پر اس کو گود میں لیے بیٹھ گیا۔بچی خاموش ہو گئی اور دونوں دیر تک وہیں بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔پھر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ اس نے پورے باغ میں بچی کو گھمایا، چھوٹی چھوٹی باتیں کرتا رہا کبھی کوئی پھول کی پتی توڑ کر دی کبھی کوئی پرندہ دکھایا بادل دکھائے، پہاڑ

دکھائے، پھولوں کی کیاری کے پاس بٹھا کراس کی معصوم باتیں سنیں۔ اپنے آنسو چھپا کر اس کو بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔لیکن وہ ہر منٹ بعد وہی سوال کررہی تھی۔

''ممی پاس جانا ہے۔''

''ہاں بیٹا۔ وہ تمہارے لیے فراک لینے گئی ہیں۔جلد ہی آجائیں گی۔''

کافی دیر تک وہ بچی کو بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ بار بار خیال آتا کہ اب اسپتال جانا چاہیے پھر بچی کی تنہائی کا خیال آتا تھا۔ پھر وہ ایک چکر اور باغ کا لگالیتا تھا۔ اسی طرح وقت آگے بڑھتا رہا اور وہ کشمکش میں مبتلا بچی کو گود میں لئے گھومتا رہا۔ اتنے میں مسز تھومس اپنے گھر سے نکل کر آئیں۔ شاید اب انہیں روشی کے نہ ہونے کا خیال آیا ہوگا۔ ادھر ادھر دیکھا پھر اقبال بھی دیکھ لیا اور اشارے سے اسے اپنی طرف بلایا۔

''تم کب آئے؟ میں کام میں لگ گئی بچی کا دھیان ہی نہ رہا۔ شاذیہ کیسی ہے؟''

''افاقہ ہورہا ہے۔''

''ابھی جنرل وارڈ میں ہی ہے؟''

''نہیں وائس چانسلر وغیرہ کی سفارش سے شیر کشمیر اسپتال میں شفٹ کردیا گیا ہے اور الگ سے کمرہ بھی مل گیا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ سنا ہے کہ بہت شاندار ہوٹل ہے بالکل فائیو اسٹار ہوٹل کی طرح۔ بیٹا تم بچی کی فکر نہ کرنا۔''

''فکر کے علاوہ اب اور کام ہی کیا ہے۔'' اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

''نہیں، ہم لوگ ہیں۔''

''ایسی مجبوری میں، آپ ہی لوگ کام آرہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''نہیں مجبوری کیسی۔ یہ ہمارا فرض ہے۔ گاڈ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

''یہ لیجئے۔'' اس نے روشی کو ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''پاپاپا!'' وہ مچل گئی اور اس کی ٹانگوں میں لپٹ گئی۔ اقبال نے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''رو و نہیں بیٹا۔ میں تھوڑی دیر میں آؤں گا۔'' اس نے اپنا سر اس کے سینے سے لگا کر آنسو چھپاتے ہوئے کہا۔

''نہیں پاپا! مجھے بھی ممی کے پاس جانا ہے۔'' اقبال کے اٹھتے ہی وہ پھر اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر سسکنے لگی۔ کافی دیر کے بعد مسز تھوس اور پڑوس کے بچوں کے بہلانے پر وہ رکنے پر ہلکی سے رضامند ہوگئی اور اقبال نے ان کے حوالے کر کے واپس اسپتال کی راہ لی۔

زندگی ایک طوفان زدہ بھیانک کالی رات بن گئی تھی۔ اسے کسی لمحے قرار نہ تھا۔ اسپیشل وارڈ کے کمرے کے ایک کونے میں وہ کبھی چٹائی پر لیٹ جاتا تھا، کبھی شاذیہ کے بستر کے چاروں طرف چکر لگاتا رہتا تھا، جو اکثر اوقات سونے والی دواؤں کے زیر اثر اونگھتی یا سوتی رہتی تھی۔ گلوکوز کی ڈرپ ہر وقت آہستہ آہستہ چلتی رہتی تھی۔ وہی اس کی زندگی اور غذا کا ذریعہ تھی۔ اس کے ہاتھوں اور ٹانگوں پر چالیس فیصد برن کے زخم تھے۔ جو ڈاکٹروں کے حساب سے خطرے سے باہر کی سچویشن تھی۔ لیکن ابھی دس دن تک کسی دوسری طرح کے انفیکشن کے چانسیس کافی زیادہ تھے۔ جو برن کے مریضوں کے لیے زیادہ خطرے کا سبب بن جاتے ہیں۔ ڈرپ کے ہی ذریعے دوسری اینٹی بائٹک دوائیں دی جارہی تھیں۔ اس کے تمام دن اسپتال سے گھر اور گھر سے ڈسپنسری کے چکر لگاتے ہوئے گزرتے تھے۔ تمام راتیں شاذیہ کے ساتھ کراہتے ہوئے گزرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ دواؤں کے اثر سے آزاد ہو کر اس سے کچھ باتیں بھی کرتی تھی۔ پچھلے بیس دن میں اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ بس ایک ہی خیال کے گرد گھومتا رہتا تھا کہ کس طرح شاذیہ اچھی ہوگی۔ اس ایک خیال کے علاوہ اب دیگر کوئی شے اس کے لیے وجود نہیں رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ اب روشی کا خیال بھی کم ہی آتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ بس کے ذریعہ فوراً گھر کی طرف بھاگتا تھا۔ کچھ دیر اسکو بہلا کر پھر اسپتال کی طرف دوڑ لگاتا تھا۔

بیس دن گزر جانے کے بعد ڈاکٹرز کی ٹیم نے شاذیہ اور اس کے کیس شیٹ کا معائنہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب وہ خطرے سے باہر ہے اور اگلے دس دنوں میں اسے اسپتال سے چھٹی مل سکتی ہے۔ اس دوران شاذیہ کی امی دو بڑے بھائی، اور اقبال کے ماں باپ بھی سرینگر

آ گئے تھے۔ان سب کے آنے سے اقبال پر کام کا بوجھ کچھ کم ہوگیا تھا۔خطرے سے باہر ہونے کی خبر سن کر سب انتہائی خوش ہوگئے۔اب شاذیہ کو نیند کی دوائیاں دینی بھی بند کردی گئی تھیں۔وہ زیادہ تر ہوش میں رہتی تھی اور سب گھر والوں سے باتیں کرتی رہتی تھی۔

یہ اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا پچیسواں دن تھا۔شاذیہ کی حالت روز بروز اچھی ہوتی جارہی تھی۔دوسرے دن بقرعید تھی۔اسپتال کے زیادہ تر ڈاکٹرز اور نرسیں چھٹی پر جاچکی تھیں۔بہت سے مریض اوران کے تیماردار بھی عید کی خوشی میں دودن کے لیے جو جاسکتے تھے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔اس رات اقبال کے ساتھ شاذیہ کے بڑے بھائی کو اسپتال میں رہنا تھا۔رات کے تقریباً بارہ بجے تھے کہ شاذیہ نے پیٹ میں تیز درد ہونے کی شکایت کی۔اقبال فوراً ڈاکٹر کی تلاش میں ڈیوٹی رومز کی طرف چل پڑا۔کہیں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔بڑی مشکل سے پتہ چلا کہ فلاں کمرے میں ڈاکٹر آن ڈیوٹی آرام کررہا ہے۔یہ ایک نوجوان لڑکا تھا جو انٹرن شپ کے بعد پہلے سائنمنٹ پر یہاں آیا تھا۔اقبال نے اس سے جا کر شکایت کی۔وہ جلدی سے شاذیہ کے کمرے میں آیا اور بغیر کیس شیٹ دیکھے،اس نے جلد میں ایک انجکشن لگادیا۔انجکشن کی سوئی ابھی شاذیہ کی جلد سے باہر بھی نہیں آئی تھی کہ وہ سوگئی۔اقبال کو بہت حیرت ہوئی اوراس نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ ایسا کیا دے دیا اس نے کہ فوراً ہی شاذیہ کو نیند آ گئی۔اس نے بتایا کہ مارفین دیا ہے۔

''کیوں دیا تم نے مارفین؟تمھیں پتہ نہیں کہ تمام نشہ آور دوائیں پچھلے سات دن سے بند ہیں۔یہ دیکھیں کیس شیٹ''،اقبال نے کیس شیٹ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

''پلیز،میں اپنا کام جانتا ہوں آپ غصہ نہ ہوں۔''

''تم نے اپنے آرام کے لیے اس کو سلادیا تاکہ رات میں تمھیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔؟''اقبال نے پھر غصہ سے کہا۔

''نہیں آپ الزام نہ لگائیں۔میں ڈاکٹر ہوں،آپ نہیں۔''یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

اقبال نے بھی سوچا کہ ڈاکٹر شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔دواؤں اور علاج کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔وہ چٹائی پر لیٹ گیا تھوڑی ہی دیر میں اسے بھی نیند آ گئی۔

رات میں کئی بار جاگنا ہوتا تھا لہٰذا وہ مستقل نہیں سوسکتا تھا۔ اس لیے اس کی آنکھ کھل گئی،اس نے گھڑی میں دیکھا کہ تین بجے تھے۔اسے حیرت ہوئی کہ شاذیہ نے آج کچھ بھی نہیں مانگا۔ورنہ وہ رات میں کئی مرتبہ جوس یا پانی مانگتی تھی کہ اب ڈرپس بھی ہٹادی گئی تھیں۔وہ کھڑا ہوگیا اور شاذیہ کے پاس آکر دیکھا۔اس کی سانس رک رک کرآ رہی تھی۔ اس نے شاذیہ کو پکارنے کی کوشش کی۔کئی بار اس کو ہلایا اور آوازیں دیں۔لیکن اس کی سانسیں بدستور رک رک کرآتی رہیں۔اقبال نے شاذیہ کے بھائی کو اٹھایا اور دوڑ کر اسی ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔ڈاکٹر بھی اپنا سامان لے کر دوڑتا ہوا آیا۔اب سانسیں اور زیادہ گہری اور دیر دیر سے آرہی تھیں۔ڈاکٹر نے ایک انجکشن بھی دیا لیکن بے سود۔

''شاذیہ شاذیہ۔پلیز آنکھیں کھولو۔''اقبال اس کو پکارتا رہا،جھنجھوڑتا رہا لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔تھوڑی دیر میں اسکی سانسیں ایک دم رک گئیں۔وہ اس دارفانی سے کوچ کر چکی تھی۔ اقبال پر سکتہ طاری ہوگیا۔وہ ایک ٹک اس کے مردہ چہرے کو دیکھتا رہ گیا۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔اب وہ موت کو دیکھ سکتا تھا،اس کو محسوس کرسکتا تھا اسے چھوسکتا تھا۔اس سے باتیں کرسکتا تھا۔اب تک زندگی،زندگی سے مل کر نئی زندگی پیدا کرتی تھی۔لیکن اب زندگی اور موت کے اتصال سے ایک نئے قسم کا انسان پیدا ہوا۔موت اس کی زندگی کا اہم ترین حصہ بن گئی۔اس کی اپنی زندگی کے آخری دن تک کی ہمسفر اور ساتھی۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

○

(۵)نشاط کارِہوس

5.1 تاج وتختِ علی گڑھ

دونوں ہی خاندانوں کے اہم لوگ وہاں موجود تھے اس لیے فیصلہ ہوا کہ کشمیر میں ہی تدفین کی جائے۔دوسرے ہی دن یونیورسٹی قبرستان میں دفن کے بعد جموں کے لیے رختِ سفر باندھ لیا گیا۔سرینگر سے جموں وہاں سے مراداآباد اور پھر سنبھل کا سفر کیسے کٹا کتنے دنوں میں کٹا، بچی کو کس نے سنبھالا، اقبال کو کچھ احساس نہیں تھا۔جیسے بے جان میت کو لوگ کاندھوں پر گھر سے قبرستان لے جاتے ہیں بس اتنا فرق تھا کہ یہ لاش خود اپنے پیروں پر کھڑی تھی اور قبرستان سے گھر جارہی تھی۔کئی مہینہ تک وہ اپنے گھر مردانے حصہ کے ایک ہال نما کمرے میں پڑا رہا۔صبح سے وہیں پڑے پڑے شام ہو جاتی،تعزیت کرنے والے آتے رہتے اور اپنی سی کہہ کر چلے جاتے۔شام کو رشتہ دار،بچپن کے دوست احباب آجاتے اور دیر گئے رات تک بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔زندگی اور دنیا کی بے ثباتی کے ہزار ہر قصے سنائے جاتے۔خاندان میں ہونے والے سانحات کا ذکر ہوتا۔نئے پرانے قصے بیان کیے جاتے۔خواتین اپنے اپنے غم بیان کر کے آنسو بہانے لگتیں۔کسی کو اپنے بچے کا صدمہ تھا تو کسی کو ماں باپ یا بھائی کا۔دوسرے خاندانوں میں ہونے والی ٹریجڈیز بھی بیان کی جاتیں۔خاندان کے مولوی حضرات مذہبی پیرایے میں مقصد زندگی بیان کرتے کہ دنیا جائے امتحان ہے۔رسول اور صحابہ کی زندگیوں میں ہونے والے سانحات کا ذکر کرتے۔قیامت کا بیان ہوتا۔آنے والی زندگی کی تیاری کا ذکر کیا جاتا۔موت کا وقت اور جگہ کے مقرر ہونے کا مختلف پیرایوں میں بیان ہوتا۔کہا جاتا کہ جس جگہ انسان کی

موت لکھی ہوتی ہے وہ کسی نہ کسی بہانے سے وہیں پہنچ جاتا ہے۔ موت سے کس کو رستگاری ہے آج ہم کل تمہاری باری ہے۔ تسبیحات بتائی جاتیں کہ خاموشی سے ذکر الٰہی کرتے رہو۔ بتایا جاتا کہ شرع شریف میں موت کے غم کو تین دن سے زیادہ منانا حرام ہے۔ حکم الٰہی میں کسے کلام ہے۔ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں کہ موت کا غم منائے۔ انہیں پتہ نہ تھا کہ یہاں کسی کا موت کا غم نہیں تھا۔ غم تو اپنے زندہ رہ جانے کا تھا کہ تینوں ہی کیوں نہ ختم ہو گئے۔ کسی کا قضا کا صدمہ نہ تھا بلکہ غم حیات کا خنجر تھا کہ سینے کے پار تھا۔ خاندان کی خواتین، ماں اور بہنیں چھوٹی سی بچی کے مستقبل کی باتیں کرتیں۔ خود اس کی عمر کا ذکر ہوتا کہ پہاڑ سی زندگی آگے پڑی ہے۔ قرآن اور نوافل پڑھ پڑھ کر مرحومہ کو بخشتیں اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر پھونکا جاتا۔ بچی کو گود میں لا بٹھاتیں کہ مرحومہ کی نشانی تمہارے پاس ہے۔ اب اس فرض کو پورا کرنے کے لیے زندگی دوبارہ شروع کرنی ہی پڑے گی۔ بچی بھی اپنے پاپا کو بھیگی آنکھیں دیکھ کر رونے لگتی۔

''لو یہ دوسرا خط ہے پروفیسر شاہ منظور عالم کا۔'' والد صاحب نے کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا خط اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس نامعقول کو سمجھاؤ کہ ان کو جواب تو دے۔ کتنے شریف انسان ہیں۔ ہر وقت ہماری مدد کے لیے تیار رہتے تھے۔''

وہ اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے دوست سے مخاطب ہوئے۔ اس نے لفافہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا کہ پانچ مہینہ گزر جانے کے بعد بھی ہم نے آپ کی سروس ختم نہیں کی ہے۔ آپ چاہیں تو فوراً آ جائیں۔ پہلے والے خط کا جواب نہ دینے کی بھی شکایت کی گئی۔ اس نے اسی دن چھوٹے بھائی انلینڈ لیٹر منگوا کر نوکری سے استعفیٰ روانہ کر دیا۔ والدین اور دوستوں کو پتہ چلا تو سب لوگ بہت ناراض ہوئے کہ نوکری آسانی سے نہیں ملتی۔ مگر اب وہ دوبارہ اس ہمسفر کے بغیر کشمیر جانے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وادیوں، پہاڑوں، نسیم باغ اور جھیلوں کے نام سے ہی اسے وحشت ہونے لگی تھی۔ صرف نام سے ہی دم گھٹنے لگا تھا۔ زندگی ہی جب ان وادیوں میں مٹ گئی تو یہ نوکری وہاں کیسے باقی رہ سکتی تھی۔ کئی مہینے گھر میں پڑے پڑے یا جانی پہچانی گلیوں محلوں میں گھومتے گھومتے گزر گئے۔ رفتہ رفتہ والدین

اور دوستوں کے سمجھانے سے پھر علی گڑھ کا رخ کیا۔ایک زمانے کے بعد پھر وہی گرم لو اور دھول میں پرائیوٹ بس سے علی گڑھ کا سفر درپیش تھا۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

یہ سحر نہ جانے کتنی صدیوں اور طویل راتوں کے بعد آئے گی۔تمام راستے دھول بھری گرم ہوا کے تھپیڑے کھاتے ہوئے وہ یہ سوچتا رہا۔کاتب تقدیر نے جموں سے سرینگر تک کا ایک وہ سفر بھی اس کی قسمت میں لکھا تھا۔اس سفر میں جنت و دوزخ کا واضح تصور اس کے ذہن پر نقش ہو گیا۔

کئی دوست تعلیم پوری کر کے نوکری کے انتظار میں وہیں قیام پذیر تھے۔کچھ ابھی تک ہوسٹل میں ہی رہ رہے تھے۔اس نے اولڈ بوائز لاج میں ڈیرا ڈال دیا پھر سے پرانے دوست جمع ہونے شروع ہوئے۔کئی ان میں سے یونیورسٹی میں ہی ملازم ہو گئے تھے۔کچھ ریسرچ ہی کر رہے تھے۔ایک تھے کہ بارہ سال سے ایم بی بی ایس ہی کر رہے تھے۔کچھ دہلی شفٹ ہو گئے تھے اور سیاست میں قسمت آزمائی کر رہے تھے۔

رفتہ رفتہ اندازہ ہوا کہ اب یہ وہ علی گڑھ نہیں تھا کہ جہاں طلباء اپنے آپ کو ''میں اپنے چمن کا بلبل ہوں۔'' کہہ سکتے تھے۔اب یہ ایک مذہبی بیوروکریٹ کے آہنی شکنجے میں کسا ہوا علی گڑھ تھا۔اب یہ صرف ایک پنج وقتہ نمازی وائس چانسلر کا بلاشرکت غیرے علی گڑھ تھا۔طلبا اور اسٹوڈنٹس یونین کو دشمن مان لیا گیا تھا۔اب طلباء دہلی جا کر وزیراعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے گھر کے آگے دھرنا لگانا تو دور کنار خود وائس چانسلر لاج کے آگے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔یہ حال ہر ایسوسی ایشن اور تمام دوسری ملازمین انجمنوں کا تھا۔ہر جگہ وائس چانسلر نے گروپس بنوا دیے تھے۔گروپس تو ہمیشہ ہی ہوتے تھے اور ہر انتخابی انجمن میں ہوتے تھے۔لیکن اب شیخ الجامعہ بذات خود ایک گروپ کی کھلے عام سرپرستی فرماتے تھے۔لہٰذا آپسی رنجشیں اپنے عروج پر تھی۔بہانہ وہی ہمیشہ کا کہ دوسرے لوگ شرپسند عناصر ہیں۔بلکہ جناب سید والی گہر نے واضح الفاظ میں تہذیب و

شائستگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے مخالفین کو غنڈوں کے خطاب سے سرفراز کر دیا تھا۔ یہ خطاب وہ صرف طلباء ہی کو نہیں بلکہ بہت سے نامی گرامی پروفیسروں کو بھی عنایت کر چکے تھے۔ جن کے علم کا زمانہ قائل تھا اور ہزار ہا طلبہ جن کی نگرانی میں تعلیم مکمل کر کے دنیا میں علی گڑھ کا نام روشن کر رہے تھے۔ خطا ان کی صرف یہ تھی کہ وہ جمہوریت کے قائل تھے اور وائس چانسلر سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ یہ طلبا اور اساتذہ ایک بھیانک جرم کر چکے تھے جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا پڑ رہا تھا اور وہ جرم یہ تھا کہ انھوں نے ملک میں جمہوریت ختم کر کے ایمرجنسی نافذ کر دینے والی سخت گیر وزیر اعظم کے گھر کے سامنے دھرنا لگا کر پی اے سی ختم کر دینے کا مطالبہ کرنے کی ہمت کی تھی۔ اندرا جی کے چیف سکریٹری پی سی الیگزنڈر کے ذریعے، جو حضور اعلیٰ کے سرپرست تھے یونیورسٹی کے اندر سیاسی مخالفین کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کیمپس میں حکومت بذریعہ وائس چانسلر اپنا گھناؤنا کھیل کھیل رہی تھی۔ لہٰذا نہ صرف یہ کہ یونین میں تالا لگا دیا گیا تھا بلکہ اسی پی اے سی کو، جس کا مسلم مخالف ہونا اور فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام کرنا، اخبارات سے ثابت ہو چکا تھا، جس کو ختم کر دینے کا مسلمان مطالبہ کرتے رہے تھے، کیمپس کے اندر لائبریری کے سامنے، وی سی لاج کے باہر، فیض گیٹ اور سلیمان ہال کے سامنے، میڈیکل کالج کے میدان میں، پورے پانچ سال تعینات رکھا گیا۔ حکومت وقت ان کی ہر سختی کی تائید کرتی تھی۔ نیشلسٹ علماء وقت مولانا محمد علی میاں ندوی وغیرہ کھلے عام ان کے ساتھ تھے کہ موصوف ان کو لوٹے میں پانی لے کر وضو کراتے تھے۔ کئی لوگ اس پانی کے گرنے سے پہلے ہی اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مل لیتے تھے۔ پانچ سال کی عمر سے پنج وقتہ نمازی ہونا اپنی کسی تقریر میں بتانا نہیں بھولتے تھے یہاں تک کہ طلباء کے والدین کو لکھے خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ تماشا یہ کہ ملک کے بڑے بڑے کمیونسٹ اور لیفٹسٹ رائٹرز وغیرہ بھی کھلے عام ان کے ساتھ تھے۔ کیمپس کے کمیونسٹ اور ہمہ وقت شیروانی اور اٹنگے پائجامے پہنے والے تبلیغی دونوں ایک جان اور دو قالب ہو گئے تھے اور ہر کام میں باہم شریک تھے۔ یہ حیرت انگیز نظارہ بھی چشم فلک نے علی گڑھ میں دیکھا کہ یونیورسٹی کی مذہبی

جماعتوں کے قائدین، یونیورسٹی میں کمیونسٹوں اور ملحدوں کے سرپرست اعلیٰ مشہور مارکسٹ تاریخ داں کے دروازے پر لائن لگائے حاضری کا انتظار کرتے رہتے تھے۔

مسلمانوں کی بدنصیبی یہ بھی تھی کہ تقریباً بیس سال کی بے مثال جدوجہد اور قربانیوں کے بعد جب ان کو یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی، تو موصوف ہی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔۱۹۸۲ء ایکٹ کے تحت جب یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل ہوئی، تو موصوف نے سب سے پہلے یہ قضیہ کھڑا کیا کہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال نہیں ہوا ہے۔ بلکہ تاریخی کردار بحال ہوا ہے۔ یونیورسٹی کے کمیونسٹ بھی بہ بانگ دہل یہ کہتے تھے۔ موصوف یہ بھی فرماتے تھے کہ یونیورسٹی کورٹ اعلیٰ اختیاری ادارہ نہیں ہے۔ لہٰذا ہر کورٹ کی میٹنگ میں یونیورسٹی ملازمین، وائس چانسلر کی ذاتی سرپرستی میں لیڈران ملت سے، جنھوں نے بے مثال قربانیاں دے کر اقلیتی کردار بحال کرایا تھا ہر مسئلہ پر اختلاف کرتے تھے۔ جبکہ سید والی گہر اس تمام عرصے میں حکومت کے مختلف عہدوں پر سرکاری ملازمت کے تمام عیش اٹھاتے رہے اور اپنی ملازمت کے دور میں کسی ایک مسلمان کا بھی تقرر کر کے نہیں دیا۔ بہانہ وہی کہ قابلیت نہیں ہے اور مسلمان کمپیٹ نہیں کر پاتا۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کے رزرویشن کے بھی موصوف ہمیشہ مخالف رہے کہ یہ بیساکھی ہمیں نہیں چاہیے جبکہ خود انٹرنل پروموشن کی بیساکھی سے آئی اے ایس نامزد ہوئے تھے۔ اگر کوئی بے نمازی وائس چانسلر اس طرح کا رویہ یونیورسٹی ایکٹ کے بارے میں اختیار کرتا تو قوم اس کی کھال کھینچ لیتی۔ یونیورسٹی ایکٹ میں دیے گئے ایمرجنسی اختیار دفع (۳)۱۹ کا انھوں نے بے شمار بار اپنے حامیوں کو فائدہ اور مخالفین کو نقصان پہنانے کے لیے استعمال کیا۔ نہ صرف یونیورسٹی کورٹ بلکہ ایکزیکٹو کونسل بھی جناب کی ذاتی انجمن ہو کر رہ گئی تھی۔ یونیورسٹی میں مسلم طلباء کے رزرویشن کی بات تو جب آتی جب وائس چانسلر اس کو اقلیتی ادارہ مانتا لہٰذا یہ سوال کبھی ان کے دور میں اٹھا ہی نہیں۔ جبکہ پارلیمنٹ میں صاف طور سے کہا گیا تھا اور ایکٹ میں بھی لکھا گیا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے اپنی تعلیمی و ثقافتی ضرورت کے لیے بنائی ہے۔ یونیورسٹی تقرریوں میں موصوف عقل کل بن کر

بیٹھتے تھے۔تمام ایکسپرٹس ایک طرف اور موصوف کا سسرالی رشتہ دار ہونا ایک طرف۔ یا اگر کوچۂ جاناں سے کوئی سفارشی خط آ گیا تو تمام قاعدے قوانین بالائے طاق جبکہ ان کے اپنے خاندان کا کوئی شخص ان سے کام کے لیے ملنے نہیں آ تا تھا۔ دوسری نا قابل رد سفارش لکھنؤ کے ندوی حضرت کی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی کے اندران کے حمایتیوں کے لیے بھی کوئی قانون نہیں تھا۔ان کے پرموشن کے لیے صرف وفاداری کی سند کافی تھی۔نئی تقرریوں میں بھی وفاداروں اور جانثاروں کے سفارشی خطوط اکثر ناممکن کو ممکن کر دکھاتے تھے۔ یونیورسٹی کی زیادہ تر اسامیاں ان کی ذاتی ملکیت بن کر رہ گئی تھیں۔

حالات اتنے دگرگوں تھے کہ یونیورسٹی کی پوری تاریخ میں پہلی بار وائس چانسلر کی موجودگی میں، وی سی لاج سے صرف سومیٹر دور پی اے سی کی گولی سے ایک طالب علم آفتاب شہید ہوا۔نام نہاد باپ نے نوجوان بیٹے کو اس لیے گولی مروادی کہ وہ پوری یونیورسٹی کو خراب کر رہا تھا۔چھوٹے شر پسند کو بڑے نے آخر مرواہی دیا۔ بے شمار طلباء پہلے ہی فار لائف رسٹیکیٹ کیے جا چکے تھے۔ان کے داخلے فارم ریجیکٹ کر دیے گئے تھے، پچاسوں ملازمین کی ملازمتیں ٹرمینیٹ کی جا چکی تھی۔سیکڑوں مقدمات یونیورسٹی اپنے ملازمین سے لڑ رہی تھی حتیٰ کہ چپراسیوں تک سے مقدمے بازی چل رہی تھی۔

موصوف کے پی وی سی اور کنٹرولر دونوں ہی کھلے عام بدعنوان تھے۔انکے زمانے میں یونیورسٹی انتظامیہ میں کرپشن کی بنیاد پڑ۔اندراجی کے بل بوتے پر پورے پانچ سال یونیورسٹی پر سوار رہے کہ خیر اور شر دوہی طاقتیں دنیا میں ہیں اور دونوں ان کے ساتھ تھیں اور وہ ایک مشن کو تکمیل کرنے علی گڑھ کی سرزمین پر نازل ہوئے تھے۔ان سے پہلے یونیورسٹی میں امتحان ہوتے تھے نہ پڑھائی۔ادارہ ذات گرامی سے بہت چھوٹا تھا بہت ہی چھوٹا۔علی گڑھ سے جانے کے بعد مسلمانوں کے چندے سے ایک رسالہ بھی نکالا جس کا نام رکھا ''ون نیشن''، یعنی کانگریسی نیشنل ازم ہی دراصل واحد سیاسی قومی نظریہ ہے۔

پورے پانچ سال بعد جس دن سیدوالی گہر علی گڑھ سے گئے تو تاریخ میں پہلی اور شاید آخری بار ایسا چراغاں ہوا ایسا چراغاں ہوا کہ یونیورسٹی کا کوئی طاق کوئی محراب، کوئی در

وازہ کوئی پیڑ ایسا نہ تھا کہ چراغوں سے جگمگا نہ رہا ہو۔تمام رات یونیورسٹی کی سڑکوں پر طلباء جشن مناتے رہے۔لیکن موافقین جن کو پروموشنز اور بڑے بڑے عہدے حضور والا نے بشرط وفاداری عنایت کیے تھے، اردو لکھنا جانتے تھے اور خود بھی قلم سے خودستائی کر لیتے تھے لہٰذا موصوف کی تعریف میں بہت سے مضامین اور ایک کتاب بھی لکھی گئی۔اسی نماز روزے کے توسط سے دہلی جا کر جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی عظیم الشان بے مثال وارثت کے واحد حاکم اعلیٰ بن بیٹھے۔کار، بنگلہ،موٹی تنخواہ اور جامعہ کے ملازمین پر حکمرانی۔اور کیا چاہے ایک زاہد شب بیدار کو اس غلیظ دنیا سے؟

مگر ان تمام بڑے نقصانات سے بھی زیادہ سب سے دیر پا نقصان یہ ہونے کا اندیشہ بھی قائم ہو گیا کہ موصوف کی ذات وصفات،کام کرنے کا ڈکٹیٹرانہ انداز ریاست علی گڑھ پر ان کی حکمرانی، بے پایاں اختیارات اور اس پر غرور رہنمائی، کاروان تعلیم کا راہنما، یہ تمام تمغات جو انھوں نے خود ہی اپنے سینے پر سجا لئے تھے، جانے کتنے مصاحبین حکومت کرپٹ آئی اے ایس مسلم آفیسران کے دلوں میں حصول تاج وتخت کی خواہش جگا گئے ہوں۔رہے بیچارے پروفیسران، تو نہ اپنی زندگی میں کبھی انھوں نے وزارت کی چمک دیکھی نہ حکمران وقت کے عالیشان بنگلوں میں ان کی رسائی رہی۔صرف ایک چھوٹے سے گھر اور بچوں کی تعلیم کے علاوہ کوئی دوسری تمنا نہ کی۔بچوں کی تعلیم اور ریسرچ میں سر کھپانے والے ان لوگوں کا سیاسی لیڈران کے دروں پر سجدہ ریز رہنے والوں سے کیا مقابلہ!

5.2 پیچ وتابِ ہوس

''مبارک ہو اقبال، آخر تم پھر لیکچرر ہو گئے۔قسمت ہو تو ایسی۔جہاں چاہا وہاں نوکری کر لی۔'' ڈاکٹر سلیم نے مبارکباد دیتے ہوئے گلے لگ کر کہا۔وہ اکونومکس میں حال ہی میں ریڈر ہوئے تھے۔انھوں نے اقبال کے ساتھ ہی پی ایچ ڈی کی تھی۔

''خدا کا شکر ہے۔'' اقبال نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔

''کیا پرمانٹ ہو گئے؟''ضمیر نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں یار۔ ایک سال کی پوسٹ ہے۔ ایک صاحب چھٹی پر سعودیہ گئے ہیں، بس انہیں کی جگہ رکھ لیا گیا ہے۔'' اس نے مایوسی سے جواب دیا۔

''اس میں مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ بغیر کسی گروپ میں شریک ہوئے اسٹاف میں آ گئے یہ کیا کم بڑی بات ہے۔ پیر رکھنے کی تو جگہ ملی'' سلیم نے ہمت دلائی۔

''ہاں یہ تو ہے مگر چند ہی امیدوار تھے اور انٹرویو میرا اتفاق سے بہت اچھا ہو گیا۔ بس اوپر والے کی نظر سیدھی تھی۔''

''اچھا چائے شائے کچھ مٹھائی وغیرہ بھی منگائی ہے کہ نہیں۔'' سلیم نے مطالبہ کیا۔

''بس ابھی منگاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اقبال کمرے کے باہر برآمدے میں سے ہی بیئرر کو آواز دی۔ وہ دوڑا دوڑا آیا۔ مٹھائی لانے کے لیے اسے پیسے دیئے اور چائے بنانے کو کہا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ اس کے پرانے گروپ کے دوست کلیم، شمیر، امیر، بصیر وغیرہ سب ہال کے گیٹ سے اندر داخل ہو کر اس کی طرف چلے آ رہے ہیں۔ وہ اس وقت سلیمان ہال کے اندر جے کشن ہوسٹل کے وارڈن روم میں رہ رہا تھا۔ ابھی دو دن پہلے ہی اسے پروفیسر سالم قدوائی صاحب نے اپنے ساتھ وارڈن بنایا تھا اور رہنے کو جگہ دی تھی۔ انہیں ایک ریزیڈنشیل وارڈن کی ضرورت تھی۔ سب لوگوں نے قریب آ کر باری باری گلے مل کر مبارکباد دی۔

''یار رہنے کی جگہ تو اچھی ہے۔'' بصیر نے برآمدے میں نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

''سامنے کیا خوبصورت لان ہے۔ اونچے اونچے پیڑ، گلابوں کی کیاریاں اوپر سے خدمت کے لیے پورا اسٹاف۔ بھائی تو پھر راجہ ہو گیا۔'' اسی طرح یہ لوگ اس کا دل بہلاتے رہتے تھے۔

''نظر نہ لگاؤ۔ اب علی گڑھ سے نہ جانا۔ بس یہ طے رہا۔ کیوں؟'' کلیم نے سختی سے اقبال کو سمجھایا۔

''میں نے اس دن بھی کہا تھا جب یہ عراق جا رہا تھا کہ نہ جاؤ۔'' سلیم نے یاد دلایا۔

''ٹھیک ہے۔ شاید یہیں کا دانہ پانی لکھا ہے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''ٹھیک نہیں۔بس یہی ٹھیک ہے اور یہ ہال تو شاید ڈیوٹی سوسائٹی نے بنا کر دیا تھا یونیورسٹی کو؟'' کلیم نے امیر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں اولڈ بوائز نے ہی چندہ جمع کر کے بنایا تھا۔تمام کمروں پر چندہ دینے والوں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔دیکھیں ہمارے وارڈن صاحب کو کتنے بنوا کر دیا ہے۔''امیر دروازے کے اوپر لگی تختی پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔سب لوگ تختی کی طرف دیکھنے لگے۔

''یار دینے والوں نے کتنے پیار سے روپیہ دیا ہوگا ایک یہ ہمارے وارڈن صاحب ہیں کہ تختیاں تک صاف نہیں کرواسکتے۔''امیر نے پڑھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''یہ سارے وارڈن پرووسٹ بالکل بیکار ہیں۔اپنی وراثت تک بچا کر نہیں رکھ سکتے۔'' کلیم کو واقعی غصہ آ گیا اور اس نے اقبال سے کہا ''ابھی صاف کراؤ اس تختی کو۔مابدولت اب تب ہی کمرے میں جائیں گے،جب یہ معلوم ہو کہ یہ کمرہ کس نے بنوایا ہے۔''

''اس بیچارے پر کیوں غصہ اتار رہے ہو۔ابھی یہاں آئے دو ہی دن تو ہوئے ہیں۔'' شمیر نے مداخلت کرنی چاہی۔

''کام کرنے والوں کے لیے ایک گھنٹہ بھی بہت ہوتا ہے۔بلاؤ نا کسی کو۔'' کلیم نے پھر غصے میں اقبال کو مخاطب کیا۔

''اچھا بلاتا ہوں بابا۔'' یہ کہہ کر اقبال نے لان میں کام کرتے مالی کو آواز دے کر بلایا اور اس سے تختی صاف کرنے کو کہا۔وہ فوراً ہی کمرے سے میز نکال کر اس پر چڑھ گیا اور گیلے کپڑے سے پتھر کی تختی کو صاف کر دیا۔سرخ پتھر پر چندہ دینے والے کا نام لکھا ہوا تھا۔''

''بیرسٹرایٹ لا۔محمد علی جناح،بمبئی'' کلیم نے زور سے پڑھا۔سب غور سے تختی کو دیکھنے لگے۔

''کیا بات ہے بھئی!مجھے لگ رہا ہے کہ نئی تاریخ بننے والی ہے۔''بصیر نے ہنستے ہوئے اقبال کا ہاتھ پکڑ لیا۔شورسن کر اندر بیٹھے ہوئے ضمیر وغیرہ بھی باہر آ گئے۔

''کیا خوب اتفاق ہے۔ کربلا سے سیدھے جناح صاحب کے کمرے میں۔'' ضمیر نے بھی مزا لیتے ہوئے کہا۔

''شہادت سے امارت کی طرف۔'' سلیم نے رائے دی۔

''امارت نہیں جناب، امامت کی طرف۔'' بصیر نے تصحیح کی۔

'یار کچھ ہونا چاہیے، جناح صاحب کے کمرے سے۔'' ضمیر نے امید ظاہر کی۔

''قائداعظم کہئے جناب۔'' شمیر نے تصحیح کی۔

''ہاں بھئی ہمارے تو وہ آج بھی قائد ہیں۔'' کلیم نے بھی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سب لوگ باتیں کرتے ہوئے کمرے میں آ گئے۔ اتنے میں بیئر رمٹھائی اور چائے لے آیا۔

''مبارک ہو اقبال۔'' ضمیر نے مٹھائی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی بہت بہت مبارک ہو۔' باقی سب لوگوں نے بھی مٹھائی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھالیا۔

''بار بار استعفیٰ دے کر آدمی سروس میں آ جائے بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اب کچھ بھی ہو جائے یہاں سے کہیں نہیں جانا بغیر پرمانٹ ہوئے۔'' سلیم نے پھر زور دے کر کہا۔

''چاہے پرمانٹ ہونے میں دسوں سال ہی کیوں نہ لگ جائیں۔'' کلیم نے چائے پیتے ہوئے شرط لگائی۔

''اب تو بس پڑ گئے یہاں۔ یہیں منٹوای میں ہی دفن ہونا ہے۔'' اقبال نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''مگر یارو میری سمجھ میں آج تک ایک بات نہیں آئی کہ ایک داڑھی منڈا بے نمازی، اردو سے بالکل ناواقف اور کلچرڈ ریس میں انگریز قائداعظم کیسے بن گیا۔'' شمیر نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اوپر سے یہ بھی مشہور کر دیا گیا تھا کہ شراب پیتے ہیں اور سور کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔'' امیر نے تعجب سے کہا۔

''پھر مشکل یہ بھی تھی کہ بڑے نامی گرامی اٹنگے پائجامے والے علماء کرام، سب کے سب ان کے دشمن اور کانگریس میں شریک تھے۔ جیسے مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا آزاد وغیرہ جو ثقیل اردو کے ساتھ قرآنی آیات اور احادیث کا استعمال کیے بغیر تقریر ہی نہیں کرتے تھے۔ اور ادھر یہ عالم کہ بغیر داڑھی، شاندار سوٹ اور بوٹ میں انگریزی بولتا ہوا ایک شخص۔ ایک جملہ بھی وہ اردو میں نہیں بول سکتے تھے۔'' کلیم نے اپنی معلومات پیش کیں۔

''یہ کوئی بڑے آدمی نہ تھے۔ کانگریسی ایجنٹ تھے۔ کانگریس نے بیساکھی لگا کر ان کا قد اونچا کر دیا تھا۔ مصنوعی قیادت کب تک چلتی۔'' اقبال نے بولنا شروع کیا۔ ''دوسری طرف ہمارے مولوی حضرات تھے جو صرف لمبی داڑھیوں اور شرعی پائجاموں سے مسلمانوں کو بہلانا چاہتے تھے اور ایک حریف جماعت کو مسلمانوں کا دوست ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ لوگ کسی کو آسانی سے نہیں مان لیتے۔ جناح صاحب کی تقریباً چالیس سالہ سیاسی زندگی لوگوں کے سامنے تھی۔ وہ ۱۹۰۱ء سے سیاست میں تھے۔ ۱۹۴۰ء میں جب انھوں نے قرارداد پاکستان پیش کی تو ان کی تمام زندگی کی ایمانداری اور قوم کے لیے خدمات، مسلمانوں کے سامنے تھیں۔ ایک انگریز صحافی نے لکھا ہے کہ وہ انگریزی میں عوامی تقریر کر رہے تھے۔ ایک رکشہ والا ان کے ہر جملہ پر تالیاں بجاتا تھا۔ صحافی اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں مگر مجھے اتنا یقین ہے کہ جو کہہ رہے ہیں صحیح کہہ رہے ہیں۔''

''کیا یقین تھا!'' ضمیر حیران تھا۔

''خدا جسے عزت دے۔'' امین نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''مجھے یاد آیا کہ ایک بار صرف ایک جملہ اردو میں حافظ ابراہیم کے خلاف الیکشن لڑاتے ہوئے کہا تھا جو آج تک مراد آباد کے لوگوں کو یاد ہے۔ انگریزی لہجے میں کہا تھا، 'حافظ ابرا اک اچھا آدمی ہے اسے روٹی دو پیسہ دو ووٹ مت دو، ووٹ اسلام کا

انامت ہے مسلم لیگ کو دو۔ باقی ایک گھنٹہ کی تقریر فراٹے دار انگریزی میں۔'' شمیر نے یاد کرتے ہوئے ایکٹنگ کے ساتھ بتایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' امیر نے پوچھا۔

''ہوتا کیا؟ حافظ ابرا کی ضمانت ضبط ہوگئی۔'' شمیر نے بتایا۔ اس پر زوردار قہقہہ پڑا۔

''اور ایک یہ ہمارے مقرر اعظم کلیم خاں ہیں پچھلے اسمبلی کے الیکشن میں فراٹے دار تقاریر کر کے ڈائیلاگ سنا سنا کے لوگوں کو بے حال و بے خود کر دیا۔ ہر جملے پر دیر تک تالیاں بجتی تھیں۔ مگر نتیجہ یہ کہ ہمارے سابق صدر صاحب کی ضمانت ضبط ہوگئی۔'' امیر نے کلیم کو چڑاتے ہوئے ہنس کر بتایا۔

''اور تم بھی تو اپنے مجلسی زبان و انداز میں لوگوں کو کبھی رلاتے تھے کبھی ہنساتے تھے۔ یہ بھی تو بتاؤ۔'' کلیم نے غصہ میں آکر امیر سے کہا۔

''ہاں ہاں میں بھی اسی ٹوٹی کشتی میں سوار تھا۔ نیا کوڈ و بنا تھا سو ڈوب گئی۔'' امیر نے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکرا کر اعتراف کیا۔

''یہ کب کی بات ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''پچھلے سال یو پی اسمبلی الیکشن میں۔ تم کشمیر میں تھے اس وقت ہمارے سابق صدر صاحب بلند شہر سے اسمبلی کا ٹکٹ لے آئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم سب لوگ جٹ گئے ان کو جتانے میں۔ گھر کا لاکھوں روپیہ خرچ کر کے ضمانت ضبط کرالی۔'' امیر نے تفصیل بیان کی۔

''ایک وہ علی گڑھ والے تھے۔ لیاقت علی خاں، چودھری خلیق الزماں، راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ کہ ایک بے نمازی، بے داڑھی والے انگریز کو قائد اعظم بنا دیا اور ایک الگ ملک بنا کر دم لیا اور ایک ہم ہیں کہ آزادی کے بعد سوائے خوشامد اور خودغرضی کے کوئی کام نہیں۔ آزاد ہندوستان میں کسی علی گڑھ والے کو مسلمانوں نے لیڈر تسلیم نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں شاہ بانو کیس میں اکثریت کی حمایت کرنے والے، فیک بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنانے والے، ہر پارٹی کے در پر سجدہ کرنے والے علیگ ہیں۔ عام مسلمان جن کی عزت کرتا ہے ان میں ایک بھی علیگ نہیں ہے جیسے ڈاکٹر فریدی مرحوم، بنات والا، سلیمان سیٹھ، سلطان

صلاح الدین اویسی وغیرہ۔ کتنے افسوس کا مقام ہے۔'' شمیر نے مایوسی کے ساتھ کہا۔

''یاں یہ تو حقیقت ہے۔ سب دیکھ ہی رہے ہیں کہ بابری مسجد کے نام پر کتنی گھٹیا سیاست ہمارے علیگ بھائی کر رہے ہیں کہ بس کسی طرح ہم مشہور ہو جائیں۔'' ضمیر نے تائید کی۔

''وہ بڑے لوگ تھے۔ بڑے مقاصد تھے۔ وہ زمانہ جدا تھا۔ ملک آزاد ہو رہا تھا۔ مسلمان بھی چاہتے تھے کہ انہیں کچھ مل جائے۔ کانگریس دعویٰ کر رہی تھی کہ ہم ہیں تو سب کے نگہبان۔ مسلم لیگ کہتی تھی کہ آپ کیسے ہمارے نگہبان ہو سکتے ہیں؟ ہم اپنی نگہبانی خود کریں گے۔ علی گڑھ کا ایک مثبت رول تھا۔ آج کیا ہے کہ خوشامد کرو کسی نہ کسی پارٹی سے ٹکٹ لے لو اور ایم ایل اے یا ایم پی بن جاؤ۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہم نے موجودہ سیاسی نظام کو جوں کا توں تسلیم کر لیا ہے اور اپنی روزی روٹی کی تلاش میں لگ گئے ہیں۔ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہمارے ایجنڈے میں ہی نہیں ہے۔ جبکہ علی گڑھ کی بنیاد ہی یہ ہے کہ یہی اہمیت ہے۔ اسی لیے تمام عمر سرسید پریشانی اٹھاتے رہے۔ ان کی تمام دوستیاں اور لڑائیاں صرف اس مقصد کے لیے تھیں اور ہماری دوستیاں لڑائیاں صرف اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ہیں۔ کبھی نہرو، بہوگنا، چرن سنگھ، ملائم سنگھ لالو یادو اور کبھی مایاوتی۔ ہم ان سب کے دروں پر سجدہ ریز ہیں۔ بس یہی ہمارا ماڈل ہے۔ علی گڑھ اب صرف سیاسی دلال پیدا کر رہا ہے۔'' سلیم نے افسوس کے ساتھ بیان کیا۔

''مگر افسوس یہ ہے کہ ملتا پھر بھی کچھ نہیں۔ کتنے لوگ ان چالیس سالوں میں علی گڑھ سے قومی سطح پر پہنچے؟ کتنے ایم ایل اے یا ایم پی بنے؟ مشکل سے تین یا چار نام ہیں مگر پوری علیگ برادری نہ جانے کس خوش فہمی میں دلالی کیے جا رہی ہے۔ ہر سیاسی پارٹی میں ایک یا دو مسلمان دکھانے کے لیے چاہئیں، وہاں پہلے ہی نو ویکنسی کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ پھر بھی ہمارا لالچ، سیاسی دلالی سے فرصت نہیں لینے دیتا۔'' اقبال نے سلیم کی تائید میں بات بڑھائی۔

''کتنی نسلیں گزر گئیں اسی سجدہ ریزی میں مگر اسمبلی یا پارلیمنٹ میں پہنچنا تو دور کی بات

ہے ایک ٹکٹ تک نصیب نہیں ہوا۔ کہئے تو نام گناؤں آپ سب جانتے ہیں۔'' شمیر نے بھی اپنا تجربہ بیان کیا۔

''نہ جانے کتنے لوگ کہتے ہیں کہ ہم خاندانی کانگریسی ہیں، ہم خاندانی لوہیائی ہیں اور اب خاندانی دلتیائی ہونا بھی قابل فخر سمجھا جارہا ہے۔ پورے کیمپس کا سروے کر لیجئے۔ کچھ کمیونسٹ ہیں۔ کچھ کانگریسی ہیں کچھ اینٹی کانگریسی ہیں اور کچھ اب دلت حمایتی ہیں۔ باقی مولوی حضرات ہیں کہ زمین کے نیچے اور آسمان کے اوپر کی باتیں کرتے ہیں۔ کہاں ہے سرسید کا مشن؟ سب کچھ ختم ہو گیا۔ علی گڑھ کا مقصد ہی ختم کر دیا ہم لوگوں نے۔ سیاسی موقع پرست پیدا کرنے کا مرکز۔ طلباء کو جوش آتا ہے مسلمانوں کے کسی قتل عام پر یا علی گڑھ کے اقلیتی کردار پر حملہ کے وقت، وہ بھی صرف اس وقت تک جب تک اسٹوڈنٹ ہیں۔ یونیورسٹی سے نکل کر وہی اسٹوڈنٹ بس اپنی ذات اور خاندان تک محدود ہو جاتا ہے۔'' کلیم بھی یونیورسٹی کے اندرونی حالات پر گہری نظر رکھتا تھا۔

''انصاف کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے دلالی نہیں کی اور مسلم سیاست کو فروغ دینے میں اپنی زندگی خراب کر لی۔'' امیر نے دوسرا پہلو پیش کیا۔

''ایسی مثالیں بھی ہیں مگر صرف چند۔ جانتے ہیں سیاسی موقع پرستی کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ ملک آزاد ہوا اور بٹ بھی گیا۔ علی گڑھ اب جن لوگوں کے ہاتھ میں آیا وہ شروع سے ہی کانگریسی تھے جیسے ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ۔ یوپی مسلم لیگ کے صدر اور علی گڑھ کے وائس چانسلر نواب محمد اسمٰعیل خاں کو ہٹا کر انہیں وی سی بنایا گیا۔ ذاکر حسین خلافت تحریک میں محمد علی جوہر کے ساتھ تھے جو اسلام اور خلافت کے نام پر مسلم نیشنل ازم کو مٹا کر کانگریسی نیشنل ازم قائم کرنے کی گاندھی کی در پردہ چال تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے ڈاکٹر سر ضیاء الدین کا ان کی کوششوں سے علی گڑھ بچ گیا۔ خیر وہ ایک لمبی داستان ہے پھر کبھی سہی۔ لیکن ناکام مسلم نیشنلسٹ لیڈران کو بہت عمدہ موقع ہاتھ آیا کہ اب کانگریس کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ مسلم ریاستیں تباہ کر دی گئی تھیں۔ مسلم لیگ تو رہ ہی نہیں سکتی تھی جو لیڈران بچے انہیں جیلوں میں ڈال دیا گیا ان کی تمام پراپرٹیز ضبط کر لی گئیں۔ یہاں تک حکم تھا کہ اگر کسی پر

شک بھی ہے کہ پاکستان جا سکتا ہے اس کا مکان زمین سب ضبط کر لی جاتی تھی۔اب وہ بیچارہ عدالتوں کے چکر لگا تا رہے۔ بہرحال جس مقصد کے لیے کانگریس قائم ہوئی تھی پورا ہو کر رہا اور وہ اپنے اصلی رنگ میں مسلمانوں کے سامنے آ گئی۔اب علی گڑھ کو صرف نیشنلسٹ بن کر ہی رہنا تھا۔عمارتیں رہیں تعلیم بھی ہوتی رہی لیکن نیا سبق یہ تھا کہ ہندوستان میں سیاسی عرضی نویس اور درخواست گزار بن کر ہی رہنا ہے۔ جہاں پناہ کی مرضی ہوئی اور انہیں خوش کر لیا تو ضرور پیٹ بھر کر روٹی مل جائے گی۔اب اسی راستے پر علی گڑھ چل رہا ہے۔''اقبال نے مایوس لہجے میں تفصیل بیان کی۔

''لیکن اگر مسلم لیگ پاکستان نہ بنواتی تو یہ سب نہ ہوتا؟''ضمیر نے سوال کیا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگر مسلم لیگ رہتی تو مسلمان برباد نہ ہوتا۔یعنی کانگریس کو تو برباد کرنا ہی تھا اور اس کو اپنے عزائم سے روکنے کے لیے مسلم لیگ کا ہونا ضروری تھا۔ ورنہ مسلمان عزت سے نہیں رہ سکتا تھا۔اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ کانگریس کا سیکولر اور نیشنلسٹ چہرہ شروع سے صرف ایک دھوکا تھا فریب تھا۔پاکستان بھی تو کانگریس نے ہی بنوایا۔مطالبہ مسلم لیگ نے ضرور کیا لیکن ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان تینوں پارٹیوں نے مان لیا تھا پاکستان کا مطالبہ ختم ہو گیا تھا لیکن اس معاہدہ کو کانگریس نے توڑا۔اب مسلم لیگ کے پاس صرف دو ہی راستے تھے کہ کانگریس کی تمام شرائط بغیر اُف کیے ہوئے مان لے اور اپنا سیاسی وجود ختم کر کے کانگریسی نیشنل ازم کو تسلیم کر لے یا پھر جو بھی مل سکتا تھا لے لے۔دوسرا راستہ چننے پر کانگریس نے مسلم لیگ کو مجبور کر دیا۔''کلیم نے منطقی انداز میں وضاحت کی۔

''آزادی کے بعد یونیورسٹی کے مشہور اساتذہ بھی اسی راستے پر لگ گئے اور کیمپس میں مسلم نیشنل ازم کو برا نام دے کر قتل کر دیا گیا اور کانگریسی نیشنل ازم علی گڑھ کی اساس قرار دیا گیا۔لہٰذا اب ہمارے ہاتھ میں سیاسی بھیک کا کٹورا ہے اور ہر سیاسی در پر ہمارے لوگ صدا لگاتے نظر آتے ہیں۔اچھی آواز لگانے والوں کو اندر بلا بھی لیا جاتا ہے۔''

''جیسے کہ آرب محمد خاں؟''ضمیر نے پوچھا۔

''ایک آر ب محمد خاں، اس نے تو خیر پیسے بھی کما لئے۔ نہ جانے کتنے ایسے ہیں کہ ابھی سنگ در ہی گھس رہے ہیں۔ پیشانی گھس کے کچی سڑک ہوگئی بال سفید ہو گئے، بڑھاپے نے آلیا مگر سر اٹھانے کا نام نہیں لے رہے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''ابھی ہمارے ایک دوست کسی طرح ایک سال کے لیے راجیہ سبھا کے ممبر بن گئے تھے۔چشم دید گواہوں نے بیان کیا کہ ایک منسٹر کی کار سے کئی بار سیکورٹی والوں نے انہیں باہر دھکا دیا مگر آخر کار ہماری بھنڈی اس میں گھس کر ہی رہی۔'' امیر نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

''کچھ چالاک لوگوں نے گھر بیٹھ کر بابری مسجد ایکشن کمیٹی بنالی اور بغیر کسی انتخاب کے پوری قوم کے نمائندے بن گئے۔قوم نے بھی کہا کہ چلو انہیں کو کرنے دو۔ مجھے تو بالکل امید نہیں کہ یہ بابری مسجد بچانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔نہایت خودغرض اور موقع پرست لوگ ہیں۔ مسجد شہید ہی کرا کے دم لیں گے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہزار ہا مسلمان مسجد کے نام پر شہید ہو جائیں گے اور یہ لوگ عیش کرتے نظر آئیں گے۔خدا کرے ایسا نہ ہو مگر مجھے تو پورا شک ہے ان لوگوں پر۔ کیونکہ ان میں کا ہر آدمی کسی نہ کسی سیاسی پارٹی یا لیڈر سے بندھا ہوا ہے۔ جہاں سے اس کی روزی روٹی چلتی ہے۔'' کلیم نے مایوسی سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''ہم لوگوں کو کچھ کرنا چاہیے۔''ضمیر نے مشورہ دیا۔

''کیسے کریں۔ ہمارے پاس کوئی پلیٹ فارم بھی نہیں ہے۔اسٹوڈنٹس یونین ہوتی تو ان سے کہا جاتا کہ وہ کوئی میٹنگ بلائیں۔قوم کے تمام لیڈران کا کنونشن کریں اور کھل کر گفتگو ہو سکے۔ایسے حالات میں جب ہندو فاشزم ملک میں بڑھتا ہی جارہا ہے۔رام مندر تحریک عروج پکڑتی جارہی ہے۔صحیح معنوں میں کوئی قومی سطح کی کمیٹی ہوتی جو بابری مسجد کو بچانے کی کوشش کرتی۔مگر یہاں حالات یہ ہیں کہ یونین بند پڑی ہے اسٹاف ایسوسی ایشن میں آپسی اختلافات عروج پر ہیں۔دہلی میں بیٹھے ہوئے علیگ اب بھی علی گڑھ کی اندرونی سیاست میں کھل کر حصہ لے رہے ہیں۔قومی سطح پر کوئی فورم ایسا ہے نہیں

کہ وہ یہ کام کرے۔ پرسنل لاء بورڈ والوں نے اس معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا ہے کہ اس کا گھر ہے وہ جانے۔ اور پھر جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ کوئی مسلم جماعت ہے نہیں۔ مسلم لیگ ہے بھی تو وہ بغیر تنظیم کے اس لڑائی کو بے سود سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں اس مسئلے کو اٹھاتے ہی رہتے ہیں اس سے زیادہ وہ کریں گے تو مسلمان ہی ان کے دشمن ہو جائیں گے کہ یہ پھر اپنی سیاسی دکان چمکانے نکل آئے۔ رہے شاہی امام تو انہیں صرف جامع مسجد کی پراپرٹی کی فکر رہتی ہے اور سید شہاب الدین صاحب تو جنتا پارٹی کے لیڈر ہیں اپنی پارٹی کی مرضی کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ پچھلے دنوں انھوں نے ۲۶ رجنوری کے بائیکاٹ کی کال دی اور واپس بھی لے لی'' سلیم نے موجودہ ملکی سیاست کا پورا تجزیہ کر دیا۔

''بائیکاٹ وہ بھی ۲۶ رجنوری کا؟ اس سے زیادہ احمقانہ کیا بات ہو سکتی ہے۔ یعنی جمہوریت کا بائیکاٹ کر کے آپ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کوئی تنظیم یا پارٹی آپ کے پاس نہیں۔ کوئی مطالبہ بھی نہیں ہے۔ بس یہ کہ بابری مسجد کی حفاظت کی جائے۔ حکومت کہہ دیتی ہے کہ ہم نے پولیس فورس لگا دی ہے۔ کسی کو قریب بھی نہیں آنے دیا جائے گا۔ بس بات ختم۔'' اقبال نے لیڈران قوم کی عقلمندی کا رونا رویا۔

''دیکھنا کہ یہ ساری ایکشن کمیٹیاں اور یہ احمقانہ سیاست ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام کرا کر ہی رہے گی۔ اگر سڑکوں پر ہی پوری قوم کو اتارنا ہے تو تنظیم بنا کر اتارو۔ ایک سیاسی جماعت بناؤ۔ اس کے تحت پارلیمنٹ اور اسمبلی میں اپنی آواز اٹھاؤ۔ حکومت میں حصہ ملے گا تبھی آپ کی بات سنی جائے گی۔ ورنہ تو عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ دیوانی مقدمات طے ہوتے ہوتے پچاسوں سال لگ جاتے ہیں۔ آپ بھی بس مقدمات لڑاتے رہیے۔ مگر گھٹیا سیاست کے ذریعہ سستی شہرت ہر ایک کو چاہیے۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کو جذباتی بنانا سب سے آسان ہے۔ وہی ہو رہا ہے۔ ان کی ایک سیاسی جماعت ہے۔ جس کے پیچھے ایک ۷۵ سال پرانی ایک نظریاتی تنظیم ہے۔ پورے منظّم طریقے سے ہندو عوام کو مجتمع کیا جا رہا ہے۔ ملک کو ہندو راشٹر بنانے کا پروگرام ہے۔ مگر وہ بھی بیوقوف ہیں ہندو راشٹر تو ہے ہی۔ نام دینے سے بدنامی ہی ہو گی فرق کچھ پڑنا نہیں ہے۔'' امیر نے بھی

اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے سیاسی تجزیوں کا مقابلہ ہورہا ہے۔سر میں درد ہوگیا سنتے سنتے۔ایک ہمارے وارڈن صاحب ہیں کہ چائے بھی نہیں منگوارہے۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے شکایت کی۔

''ہاں باتوں میں بھول ہی گئے کہ کھانے کا وقت ہوگیا۔'' کلیم نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''کھانا منگوایا جائے ہوٹل سے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''نہیں یار بس چائے اور نمک پارے منگواؤ۔اس کے بعد ہم لوگ چلتے ہیں۔اب روز یہیں بیٹھا جایا کرے گا۔'' امیر نے سب کی طرف سے کہا۔اقبال نے بیئرر کو آواز دے کر چائے وغیرہ کا آرڈر دیا۔تھوڑی دیر بعد محفل برخاست ہوگئی اور سب لوگ اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے۔

5.3 پنڈت مہا بکّو چھیڑا

''یہ دیکھئے۔کل آپ لوگ میری بات نہیں مان رہے تھے۔یہ خطبات آزاد ہے۔اور یہ ہے کلکتہ خلافت کانفرنس ۱۹۱۹ء میں اتحاد اسلامی کے موضوع پر دیا ہوا حضرت کا خطبہ جس میں انھوں نے صاف کہا ہے کہ مسلم یونیورسٹی قائم کرنا شیطانی فعل ہے۔'' فضل حق نے کتاب کھول کر سب کو دکھاتے ہوئے کہا اور اقبال کے ہاتھ میں کتاب دے دی۔

فضل حق کلیم کے سینئر دوست تھے جنھوں نے کئی سال پہلے علی گڑھ سے پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا اور دہلی کے کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔دو دن پہلے وہ علی گڑھ کسی کام سے آئے ہوئے تھے اور رات میں شمشاد مارکیٹ میں ٹہل رہے تھے کہ کلیم کو ان لوگوں کے پاس ڈھابے پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور ملنے چلے آئے۔کلیم نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور سب سے تعارف کرایا تو سب اٹھ گئے اور باری باری ہاتھ ملایا۔پھر دیر تک وہیں چائے کی محفل چلتی رہی۔دنیا جہاں کی باتیں اور مباحث ہوتے رہے کہ اسی دوران مولانا آزاد کا ذکر آ گیا تو انھوں نے کہا۔

''آپ کو پتہ نہیں ہے کہ وہ ایم اےاو کالج اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کے کتنے بڑے مخالف تھے۔''

''بڑا مرتبہ تھا ان کا۔ بہت بڑے عالم تھے۔ ہندوستان کا وزیر تعلیم ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔'' اقبال نے ان کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے مولانا کے بارے میں عام رائے کا اظہار کیا۔ حالانکہ وہ اب انہیں سیاسی رہنما نہیں مانتا تھا لیکن ایک عالم اور تعلیمی رہنما کے طور پر اب بھی ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ علی گڑھ آنے سے پہلے ان کی سیاسی رہنمائی کا بھی وہ بہت قائل تھا کہ اس کا اپنا خاندانی پس منظر نہ صرف کانگریسی بلکہ جمعیۃ العلمائی تھا۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں پوری یوپی میں مسلم لیگ صرف ایک سنبھل کی سیٹ ہاری تھی اور وہ اس کی دادی کے بڑے بھائی مولانا اسمٰعیل صاحب نے ہرائی تھی۔ وہ جمعیۃ العلماء ہند یوپی کے سکریٹری تھے اور کئی کتابوں کے مصنف بھی۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ اور ایک انتہائی خوش بیان مقرر تھے۔ مولانا آزاد سے ان کے ذاتی مراسم تھے اور وہ الیکشن میں ایک مرتبہ ان کے گھر بھی آئے تھے۔ نہ صرف اقبال، بلکہ اس کے دوستوں میں کوئی بھی یہ سننے کے لیے تیار نہ تھا کہ مولانا آزاد، سرسید کی تعلیمی تحریک کے مخالف بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کے عظیم عالم ہونے میں بھی کسی کو شک نہ تھا۔ حالانکہ اب وہ سب ان کی سیاسی رہنمائی کو رہزنی خیال کرتے تھے۔

اقبال کی بات سن کر فضل حق صاحب رسانیت سے بولے۔

''آپ لوگ ان کے بارے میں، معاف کیجئے گا، سنی سنائی باتیں کر رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' شمیر نے ناراض ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سنیے! میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ نہ صرف یہ کہ مولانا بہت بڑے عالم نہیں تھے بلکہ ایک طرح سے غور کیا جائے تو وہ ہم جیسے مسلمان بھی نہیں تھے۔ ان کا وحدت ادیان کا نظریہ قرآن سے مستعار نہیں بلکہ اس کے متضاد ہے۔ قرآن تو تمام پرانے مذاہب کی منسوخی کا اعلان کرتا ہے اور صرف شریعت محمدیہ کو ہی آخری پیغام بتاتا ہے۔ وحدت ادیان کا مطلب ہے کہ تمام مذاہب آج کی حالت میں بھی بنیادی طور سے درست ہیں اور واحد

منزل مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ یہ نظریہ گیتا کا ہے اور ہندو مذہب کا ایک بنیادی جز۔ اس زمانے میں جب مولانا کی تفسیر شائع ہو کر آئی اور وہ بھی بعض لوگوں کے نزدیک کسی مصری عالم کی نقل تھی، علماء وقت نے شدید اعتراضات کیے۔ غلام رسول مہر کی کتاب میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ بنیادی اعتراض یہی تھا کہ جب تمام مذاہب کی ایک ہی تعلیم ہے اور صرف راستے جدا جدا لیکن منزل ایک ہے پھر شریعت محمدیہ کی کہاں گنجائش باقی رہی۔ یہ صحیح ہے کہ تمام انبیاء کی قرآن کے مطابق ایک ہی تعلیم تھی۔ لیکن اس میں تحریف کر دی گئی اسی وجہ سے اسلام آیا۔ دوسرا بنیادی عقیدہ مولانا کا مغفرت کے بارے میں یہ تھا کہ ہر انسان جو بھی نیک کام کرتا ہے اس کی مغفرت ہوگی۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسے اعتقادات کا آدمی مسلمان کہلائے گا۔ آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ ان کا کیا مذہب تھا۔ لہٰذا گاندھی جی نے گجراتی سبھا سے ان کی تفسیر شائع کرائی اور بہت تعریف کی۔ یہ واحد تفسیر ہے جو کسی غیر مسلم ادارے نے شائع کی ہے۔''

''پلیز سنئے!'' کلیم نے انہیں ٹوکتے ہوئے کہا۔'' دیکھئے ہم لوگ مذہب کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ آپ تو نہایت سنگین الزامات لگا رہے ہیں۔ سیاست کی بات الگ ہے لیکن ایک اتنے مشہور عالم فاضل پر اتنی بڑی تہمت!''

''آپ شہرت کی بات کر رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ لارینس آف عربیا یہودی ثابت ہونے سے پہلے ایک عظیم عالم کی حیثیت سے کتنا مشہور تھا؟ شہرت تو سیاسی وجوہ سے ہو ہی جاتی ہے۔ خیر مذہب کو جانے دیجئے۔ آپ لوگوں میں سے کسی کو اللہ نے توفیق دی تو یہ ریسرچ بھی کوئی نہ کوئی کرے گا۔ مسلمانوں کے کام ذرا دیر سے ہوتے ہیں۔ ورنہ اس موضوع پر اب تک بہت سی تحقیقات سامنے آ جانی چاہیے تھیں۔ اب صرف تعلیم کو لے لیجئے۔ میں آپ لوگوں کو زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ یہ سن کر بھی آپ لوگ برداشت نہیں کریں گے کہ مولانا آزاد مسلم یونیورسٹی کے قیام کے سخت خلاف تھے بلکہ اس زمانے میں جب یونیورسٹی کے قیام کی تحریک پورے ملک میں چلائی جا رہی تھی مولانا اس کو کھلے عام شیطانی فعل کہتے تھے اور جی جان سے مخالفت کر رہے تھے کہ یونیورسٹی نہ بنے۔'' ان کے

ختم کرنے سے پہلے ہی ضمیر غصے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''دیکھئے، آپ ہم سب کے سینئر ہیں۔اس لیے آپ کی اتنی عزت کرر ہے ہیں۔لیکن اب یہ بہت ہوگئی۔کون مان لے گا اس بکواس کو؟ اتنے سال ہمیں علی گڑھ میں ہوگئے، کسی کے منہ سے ایسی بات نہیں سنی۔خوب نئی نئی باتیں بتارہے ہیں آپ۔کمال ہوگیا۔'' اقبال نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھادیا۔

''خاموش رہو۔سمجھدار آدمی کسی بھی نئی بات کو یوں رد نہیں کرتا۔''

''اگر یہ بات ہے تو پھر میں جارہا ہوں۔اچھا بھئی کلیم بہت بہت شکریہ چائے کا۔'' فضل حق نے یہ کہہ کر اٹھنا چاہا۔

''نہیں نہیں ایسا کیسے ہوجائے گا۔یہ ضمیر تو جذباتی آدمی ہے۔چلو ضمیر سوری کہو۔'' امیر نے اس سے سختی سے کہا۔

''سوری تو میں ہزار بار کہہ دوں گا یہ ہمارے سینئر ہیں۔مگر یار حد ہوتی ہے۔'' ضمیر نے فوراً ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

''حد تو واقعی ہوتی ہے۔ایسے سنگین الزامات تو ہم نے کہیں نہ سنے نہ پڑھے۔کتنے ہی بڑے بڑے لوگوں کی تقاریر سنیں، کتنے ہی یونیورسٹی کے نامی گرامی پروفیسران کے خطبے سنے اور کتنے ہی مضامین پڑھ ڈالے مگر ہر جگہ صرف اور صرف تعریف سنی کہ وہ یکتائے روزگار، عالم بے مثل اور عظیم قائد تھے۔دنیا کی تمام خوبیاں چاہے وہ ادبی ہوں، ثقافتی ہوں، تہذیبی ہوں یا مذہبی ہوں، سب ان میں موجود تھیں۔ایسا آدمی نہ پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا۔یہاں تک کہ بہت سے لوگ انھیں امامت کے درجے پر پہنچانا چاہتے تھے اور امام الہند کہتے تھے۔چلئے سیاست کو چھوڑیئے، وہ تو ہم لوگ بھی ان کے مخالف ہیں۔لیکن مذہب اور تعلیم کے ضمن میں جو باتیں آپ بتارہے ہیں بالکل یقین کے قابل نہیں۔'' اقبال نے بھی حیرانی سے فضل حق صاحب کو بتایا۔

''چلئے پھر ایسا ہے کہ میں دہلی جانا ایک دن کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔حالانکہ صبح ہی مجھے واپس جانا تھا۔لیکن اب پرسوں جاؤں گا اور کل اسی وقت اسی جگہ مولانا کی تقاریر

کا مجموعۂ خطبات آزاد لے کر آؤں گا۔ یہیں ایجوکیشنل بک ہاؤس میں مل جائے گا اور کل شام کو یہاں ملاقات ہوگی۔ اچھا خدا حافظ شب بخیر۔''

''یار یہ تو بالکل کیس لگ رہے ہیں مجھے۔'' ضمیر نے ان کے جاتے ہی کہا۔

''نہیں ایسا مت کہو۔ ہوسکتا ہے کہ ان کی بات ٹھیک ہی ہو۔'' اقبال نے اسے ٹوکا۔

''کوئی خاندانی مخالف ہوں گے لہٰذا بے پر کی اڑا رہے ہیں۔'' امیر نے بھی اپنے دل کی بات کہی۔

''کتاب خریدنے گئے ہیں۔ دیکھو ادھر ہی جا رہے ہیں ایجوکیشنل بک ہاؤس کی طرف۔ مجھے تو بالکل ہی سنکی لگ رہے ہیں۔ اس وقت تو وہ کہاں کھلا ہوگا۔ رات کے دس بجے ہیں۔'' ضمیر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سب کو دکھایا۔

''سنئے! ہم لوگ بھی تو علی گڑھ آنے سے پہلے مولانا کو سیاسی لیڈر تسلیم کرتے تھے لیکن ملک کے حالات اور اکثریتی حکومت کی اقلیت دشمن پالیسیوں نے ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا اور ثابت ہوا کہ بغیر تحفظات، مسلم اقلیت ہندوستان میں زندہ نہیں رہ سکتی تھی اور نہ آج رہ سکتی ہے۔ جو بات ہمیشہ سے مسلم لیگ کہتی آ رہی تھی لہٰذا ثابت ہوا کہ مولانا آزاد، کانگریس کے پیدا کردہ لیڈر تھے اور بقول جناح صاحب کانگریس کے شو بوائے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ فضل حق صاحب کی بات مذہب اور تعلیم میں بھی درست ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے پاس کیا ثبوت ہے کہ مولانا مسلم یونیورسٹی قیام کے مخالف تھے۔'' اقبال نے تفصیل سے اپنے خیالات بیان کیے۔

''ارے رہنے دو اقبال! ساری دنیا غلط ہوگئی۔ سارے پروفیسر قلم کار تاریخ داں سب غلط ہیں۔ اور یہ بے وقوف قسم کا آدمی جس کی کوئی حیثیت نہیں، کوئی پہچان نہیں، یہ ٹھیک ہوسکتا ہے؟'' شمیر کو غصہ آ گیا۔

''ابھی پچھلے مہینہ تو مولانا آزاد پر سیمینار ہوا تھا۔ کتنے محققین نے پیپرز پڑھے۔ کیسی کیسی تعریفیں ہوئیں۔ ہمارے پروفیسر نظامی صاحب نے صدارتی تقریر میں کیا کیا نہ تعریف کی۔ ایک یہ دہلی کے کسی اسکول میں پڑھانے والا ٹھیک ہے، باقی سب غلط

ہیں۔؟''ضمیر نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

''اسکول میں نہیں کالج میں لکچرر ہیں۔قلم کار کیا ہوتے ہیں؟ ایک آدھ ہی کوئی سچ بولتا ہے ورنہ تو سب حکومت وقت کی ڈفلی بجانے والے ہوتے ہیں۔'' اب کلیم بھی اپنے دوست کی مستقل برائی سن سن کر غصہ میں آ گیا۔

''دیکھو ضمیر! سیاسی طاقت بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔وہی آزاد جن کو ریلوے اسٹیشن پر لڑکے جوتوں کا ہار پہنا کر آئے تھے۔اسٹوڈنٹس یونین میں آزادی کے بعد ان کو استقبالیہ دے رہے تھے اور ہماری سینٹرل لائبریری کا نام بھی ان کے نام پر رکھا گیا۔ملک بٹ گیا۔اب ہندوستان میں صرف وہی سانس لے سکتا تھا جو آزاد کا حامی اور جناح کا مخالف ہو۔اسی کے مضامین چھپ سکتے تھے جو ان کی تعریف کرے۔اسی کو نوکری مل سکتی تھی جو اپنی تحقیق میں یہ ثابت کرے کہ آزاد ہی دراصل مسلمانوں کے صحیح رہنما تھے۔ان بیچارے ٹیچرز پر فیسرز کی کیا حیثیت؟ ذرا ٹرمینیٹ ہو جائیں تو روٹی تک نہ ملے۔سیمینار کرانے کے لیے حکومت لاکھوں روپیہ دیتی ہے،اس لیے کہ آزد کی خامیاں تلاش کی جائیں؟ جی نہیں اکثریت کی سیاسی ضرورت ہے کہ آزاد ہمارے ہیرو بنے رہیں اور یہ سب نامی گرامی پروفیسر اسی لیے بنے کہ حکومت کی ڈگڈگی بجاتے رہیں۔''اقبال نے تفصیل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ان احمق فضل صاحب کی کیا کیا سنو گے؟ وہ تو مولانا کو مسلمان بھی ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔کہہ رہے تھے کہ ان کی نامکمل تفسیر بھی کسی مصری عالم کی نقل ہے اور یہ بھی کہ مولانا وحدت ادیان کے قائل تھے جو اسلام مخالف نظریہ ہے اور اس کی وجہ سے شریعت محمدیہ کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔یار وہ تو اتنے بڑے عالم کو اسلام ہی سے خارج کر رہا ہے۔سیاست کی بات الگ ہے لیکن یہ احمق تو اسلام کا ٹھیکیدار بھی بن گیا۔مولانا محمود الحسن، حسین احمد مدنی،مولانا علی میاں وغیرہ سارے بڑے بڑے عالم مولانا آزاد کے قائل ہیں اور یہ الو ان کو اسلام سے ہی خارج کر رہا ہے۔''ضمیر کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''کیا اسلام پڑھا ہے اس نے؟ عربی تک تو آتی نہ ہوگی۔اتنے جید نامی گرامی علماء

ایک طرف اور یہ معمولی سا آدمی جو شاید تمام زندگی دلی کی سڑکوں پر ایڑیاں رگڑتا رہے، اسلام کے بارے میں بھی بکواس کر رہا ہے۔ یار حد ہوتی ہے کوئی۔ مولانا آزاد اس کی نظر میں مسلمان ہی نہ تھے لارینس آف عربیا کی مثال دے رہا تھا۔'' شمیر بھی بہت غصے میں تھا فضل حق صاحب کی بات پر۔

''وحدت ادیان کے وہ قائل تھے۔ یہ تو ان کے سارے حامی بھی بہ بانگ دہل کہتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وحدت ادیان کا قائل مسلمان کیوں نہیں ہوسکتا۔ بھئی قرآن کا ترجمہ تو میں نے بھی کئی بار پڑھا ہے۔ لیکن وحدت ادیان کا یہ مطلب تو بالکل نہیں ہے کہ آج کی شکل میں تمام مذاہب ایک ہیں۔ ہاں قرآن یہ ضرور کہتا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں پیغمبر بھیجے۔ جن کا ایک ہی پیغام تھا کہ خدا واحد لاشریک ہے۔ لیکن چونکہ لوگ خود نبیوں کی ہی عبادت کرنے لگے اور شرک پھیلنے لگا تو ہم نے پھر نبی بھیجے۔ لیکن اب آخری پیغمبر محمدؐ کا پیغام ہی قیامت تک کے لیے آسمانی پیغام ہے۔ جب یہودیت اور عیسائیت کو بھی قرآن رد کر رہا ہے تو ہندومت کی کیا حیثیت رہ گئی۔ غالباً آزاد، ہندوازم کی حمایت میں ہی وحدت ادیان کا تصور لائے تھے۔ عیسائیوں کے تو وہ بہت مخالف تھے۔ لہٰذا مجھے فضل صاحب کی باتوں سے یقین سا ہو رہا ہے کہ آزاد نے ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے وحد ادیان کا نظریہ گڑھا ہو۔ اور اگر ایسا ہے تو نتیجہ ظاہر ہے۔'' اقبال نے فضل حق کی حمایت میں دلیل دی۔

''لیجئے ایک اور مفسر قرآن پیدا ہوگیا۔ ہمیں پتہ ہی نہ تھا کہ یہ حضرت بھی تفسیر لکھنے جا رہے ہیں۔ بس خاموش رہو؟ قرآن کوئی ایسی ویسی کتاب ہے کہ ہر ایک کی سمجھ میں آجائے۔'' شمیر نے اقبال کا مذاق اڑاتے ہوئے سب کو مخاطب کیا۔

''تو قرآن کیسی کتاب ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے کیا چاہیے؟'' اقبال نے شمیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''بتیس علوم کا عالم ہو، سند یافتہ ہو، عربی لغت اور زبان سے واقف ہو۔ تب قرآن کو ہاتھ لگانا چاہیے۔'' شمیر نے فی الفور جواب دیا۔

''اوراگرکوئی اپنی زبان یاانگریزی میں ترجمہ پڑھ لےتب؟'' اور وہ بتیس علوم کون سے ہیں؟''

''ترجمے سے کیاہوتاہے۔اصل ثواب توعربی میں پڑھنے میں ہے۔''

''ثواب کی بات کہاں سے آ گئی؟بات تو سمجھنے کی ہورہی ہے۔اگرکوئی ترجمہ پڑھ لےتب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا؟کیا یہ نیوکلیرفزکس ٹائپ کی کوئی کتاب ہے؟''

''نہیں آئے گا۔ہمارے علماءیہی کہتے ہیں۔''اب شمیر نے تھوڑاجھجھکتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہاری اورتمہارے علما کی ایسی تیسی۔مگرقرآن تو یہ دعویٰ کررہاہے کہ ہم نے تمام انسانوں کی ہدایت کے لیےآسان زبان میں اتاراہےصرف عربوں اورعالموں کے لیے نہیں۔قرآن کا دعویٰ نعوذ باللہ غلط ہوگیا اور یہ ملے صحیح ہوگئے؟'' اقبال کوبھی اب غصہ آ گیا۔

''اگرعربی زبان جاننا ضروری ہےقرآن سمجھنے کے لیےتو پھرسارے انسانوں کو ہدایت کیسے ہوگی؟''اب کلیم نےبھی اقبال کی حمایت میں اپنی رائے دی۔''صاف بات ہے کہ ترجمے کےذریعے ہی لوگ پیغام سمجھ سکتے ہیں۔ایک شخص جاپانی،چینی،یاافریقی ہے وہ صرف ترجمے کےذریعے ہی پیغام الٰہی سمجھ سکتاہےدوسراکوئی طریقہ ہی نہیں ہے۔''

''بات میں بات نکالے جارہے ہو۔اللہ سےڈرواورسوچ سمجھ کربولو۔''ضمیرنےشمیر کوسپورٹ کرتے ہوئےکلیم سے کہا۔

''ایسا ہے کہ کل سے آپ بھی مودودی یا تھانوی یاعبداللہ یوسف علی کا ترجمہ پڑھنا شروع کیجیے۔میرادعویٰ ہےاور یہ قرآن کااعجاز ہے کہ انسان کے دل میں اترتا چلا جاتا ہے کہ حق ہے۔سچ ہمیشہ انسان کےضمیرپرروشن ہوجاتاہے۔اسلام کے بنیادی پیغام کے بارے میں قرآن ہرصفحہ پر بالکل واضح ہے جیسے سورج نکل رہاہے۔رہی تاریخی معاملات کی بات تو وہاں تفسیر کی ضرورت پڑسکتی ہےاوروہ واقعات بھی بطورعبرت بیان کیے گئے ہیں تاریخ پڑھانی مقصودنہیں ہے۔ہرانسان کے لیےقرآن اتنا سہل ہے کہ بیان سے

باہر۔ بنیادی پیغام قرآنی توحید ہے، خالص توحید۔ اسی لیے پیغمبر دنیا میں بھیجے گئے۔ پرانی امتوں کی مشرکانہ حرکتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جب شرک زیادہ بڑھ جاتا تھا تو اللہ تعالیٰ پھر پیغمبر مبعوث فرماتا تھا۔ جو پرانی شریعتوں کو منسوخ کر کے پھر سے توحید کا پیغام دیتے تھے۔ اسی طرح آخری پیغمبر محمدؐ کی آمد کے بعد تمام پرانی شریعتیں منسوخ ہوگئیں اور قرآن کے مطابق اب صرف ایک ہی صحیح سچا راستہ ہے اور وہ ہے اسلام۔ اگر کوئی شخص وحدت ادیان کا آج کی صورت میں قائل ہے تو وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر نامی گرامی علمائے ہند نے سیاسی وجوہات، اپنی لاپرواہی یا مصلحت کے پیش نظر اس نظریے کے قائل آدمی کو کافر قرار نہیں دیا تو اللہ کی بارگاہ میں یہ لوگ جوابدہ ہوں گے۔'' اقبال نے بھی جوش میں آکر لمبی تقریر کر ڈالی۔

''یار اب چلو یہاں سے۔ یہ بھی مخالفین سرسید کی طرح کفر کا فتویٰ دینے والے ہیں۔'' شمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''جاتے کہاں ہو پوری بات سنو؟ ایک سرسید ہی کیا علامہ اقبال حتیٰ کہ شاہ ولی اللہ پر بھی کفر کے فتوے عائد کیے گئے لیکن وحدت ادیان کے قائل کو کیوں چھوڑ دیا گیا؟ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایسی کیا بات تھی غلامِ ہنود میں؟ وہ یہ تھی کہ نامی گرامی علماء نیشنلسٹ تھے۔ اس لیے اتنی سنگین بات کو چھپالیا گیا۔ حالانکہ وہ سب کھل کر لکھتے ہیں کہ آزاد نظریۂ وحدت ادیان کے قائل تھے۔ میں نے بہت جگہ پڑھا ہے۔ لیکن اب غور سے پڑھا جائے گا۔ میں تو فضل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ میری آنکھیں کھول دیں۔'' اقبال نے شمیر کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''مجھے پتہ ہے کہ اب تم اسی میں لگ جاؤ گے تم بھی فضل حق کی طرح سنکی ہو۔ کچھ اپنے سبجیکٹ پر بھی ریسرچ کرو، وہی کام آئے گی۔'' سلیم نے اقبال کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

'بس دنیا جہان کی باتیں کرتا ہے بھائی۔ اپنے سبجیکٹ کا کوئی ذکر نہیں۔'' شمیر نے بھی سلیم کی حمایت کی۔

''اس میں بھی بہت کچھ کر رکھا ہے یونہی بار بار نوکری نہیں ملتی۔ یہاں سبجیکٹ کی بات کون سمجھے گا؟ گردش وقت نے اگر فرصت دی تو اور بھی ریسرچ کریں گے۔'' اقبال نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''ایک ایک چائے اور ہو جائے۔ دماغ خراب کر کے دکھ دیا اس فضل حق نے۔'' یہ کہہ کر شمیر نے چائے کا آرڈر دیا۔

کافی رات گئے تک یہ لوگ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ گھوم پھر کر ہر بار فضل حق کا ذکر آتا رہا۔

اتنے میں ٹیڑھا زیدی بھی وہاں آ گیا۔ وہی پرانی اکڑی ہوئی چال، آنکھوں میں شرارت اور ایکٹنگ کا موڈ لیے۔ مزاحیہ انداز میں آ کر سلام کیا۔

''مابدولت کے لیے کرسی نہیں رکھی گئی؟'' اس نے کولہوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''مابدولت کے بچے! وہاں سے کرسی اٹھا کر لا اور آرام سے بیٹھ۔'' سلیم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ کیا۔

''ہماری یہ انسلٹ! کلیم تم یہ سب برداشت کر رہے ہو۔ جاؤ ہمارے لیے کرسی لے کر آؤ۔'' اس نے کلیم کو مخاطب کرتے ہوئے حکم جاری کیا۔

''میدان جنگ میں تو مابدولت گھٹنوں کھڑے رہتے تھے۔ کیا آج گھٹنوں میں درد ہو رہا ہے؟'' کلیم نے بھی ہنستے ہوئے وار کیا۔ سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

''اور ایران سے یہاں تک پیدل چل کر آئے تھے۔'' شمیر نے بھی پیوند لگایا۔

چاروں طرف زور کا قہقہہ پڑا۔

''آج دال نہیں گلنے والی ہے۔ اقبال ذرا سی جگہ دو۔'' اس نے اپنی ہات تسلیم کرتے ہوئے اقبال کی کرسی پر ہی جگہ بنائی اور بیٹھ گیا۔

''اتنی آسانی سے ہار گیا میرا شیر۔'' اقبال نے مسکرا کر اس کی کمر تھپتھپا کر پوچھا۔

''سبھی خلاف ہو گئے آج۔ شمیر نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔' اس نے نارمل ہوتے

ہوئے جواب دیا۔

''یہ لوگ مذاق نہیں سمجھتے۔ ہے نا؟''ضمیر نے زیدی کو چھیڑا۔

''کلیم میرے لیے کرسی اٹھا کر لاتا؟ اب یہ تو نہیں سمجھتا مذاق'' زیدی نے ضمیر کی چال سمجھ کر جواب دیا۔ سب لوگ پھر ہنسنے لگے۔

''اب یہ ضمیر بھی ہمیں پھنسانے لگے۔ تب تو ہم رہ لئے علی گڑھ میں۔''اس نے لوگوں کی ہنسی رکتے ہی پھر کہا۔

''کیوں، ضمیر کیوں نہیں پھنسا سکتا؟ کیا اس کے پاس عقل نہیں ہے۔''اب شمیر نے ضمیر کو پھنسانے کے لیے جال پھینکا۔

''یہی تو افسوس ہے۔''کلیم نے آہستہ سے کہا۔

''کلیم اب بھی ضمیر کے خلاف رہتا ہے؟''اقبال نے زیدی سے پوچھا۔

''کلیم تو ہمیشہ کا میرا مخالف ہے۔''ضمیر کو غصہ آنا شروع ہو گیا۔

''میں کیوں مخالف ہونے لگا۔ اقبال تم بھی اب لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔'' کلیم نے احتجاج کیا۔

''نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔ بس کچھ پرانے واقعات یاد آ گئے۔''اقبال نے جواب دیا۔

''یہاں تو ہم سب ابھی پرانے ہی دور میں چل رہے ہیں۔ نیا زمانہ تو آیا ہی نہیں۔ وہی علی گڑھ کی سڑکیں، کینٹین، ڈھابے اور بے کار کے مباحث۔ تمہاری علاوہ سب یہیں کے یہیں رہ گئے۔''امین نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اور یہ بیچارہ بھی کہاں کہاں سے ہو کر پھر یہیں آ گرا۔''کلیم نے مایوسی سے کہا۔

''اماں اچھا ہی ہوا کہ ہم سب لوگ یہیں تھے ورنہ اتنے بڑے صدمے کے بعد اس کا سنبھلنا مشکل ہوتا۔''زیدی نے ماحول میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔

''ماننا پڑتا ہے قسمت واقعی لکھی ہوتی ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے؟''سلیم نے ٹھنڈی سانس لی۔

''میں نہیں مانتا قسمت کو۔ انسان اپنی کوشش سے سب کچھ بدل سکتا ہے۔''زیدی نے

پھر زندگی پیدا کرنی چاہی۔

''قسمت کو چھوڑو۔زیدی سنو،تمہارے آنے سے پہلے کلیم کا ایک کیس دوست دہلی سے آیا تھا۔ابھی یہاں سے گئے ہیں تم ہوتے تو مزا آجاتا۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے اس کو بتایا۔

''یار کیس مت کہو۔میرے بہت پرانے دوست ہیں۔دراصل میرے بڑے بھائی کے کلاس فیلو تھے جو دبئی چلے گئے۔اسی وجہ سے مجھے دوست کم چھوٹا بھائی زیادہ مانتے ہیں۔''کلیم نے تفصیل سے بتایا۔

''کچھ بھی ہو مگر ضمیر انہیں کیس کیوں کہہ رہا ہے؟'' کافی سینئر آدمی ہوں گے؟''زیدی نے کئی سوال کر ڈالے۔

''یار عجیب آدمی ہیں۔لگتا ہے کہ پڑھا لکھا تو ہے انھوں نے مگر عجیب باتیں کر رہے تھے۔کہہ رہے تھے کہ مولانا آزاد مسلمان ہی نہیں تھے اور مسلم یونیورسٹی کے قیام کے مخالف تھے۔ہے نا کیس ہونے والی بات؟''ضمیر نے ان کا مذاق اڑانے کے انداز میں بتایا۔

''ایسا کہہ رہے تھے؟ ہے تو بہت پرانی بات،مگر مجھے اپنے دادا کی باتیں یاد آ گئیں۔''زیدی ایک دم سیریس ہو گیا۔

''ابے یہ دادا بیچ میں کہاں سے کود پڑے؟''کلیم کو غصہ آ گیا۔

''اماں یار دادا نہ ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔''زیدی نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔

''بشرطیکہ وہی دادا ہوں جو درحقیقت تھے۔''امین نے اپنے خاص اسٹائل میں شرارت بھری مسکراہٹ سے وار کیا۔سب لوگ ہنسنے لگے۔

''پٹنا چاہ رہے ہو کیا؟''زیدی نے امین کے دھول جمایا۔

''خیر یہ بتاؤ کہ دادا کی یاد کیوں آ گئی؟''اقبال نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہمارے دادا بھی ایک بڑے عالم تھے۔قرآن و حدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔کانگریس کے مخالفین میں سے تھے قصبہ کے لیول پر سیاست بھی کرتے تھے۔''زیدی نے

کہنا شروع کیا۔

''تھے کیا مطلب؟''ضمیر نے بیچ میں ٹوکا۔

''آزادی کے اگلے ہی سال ان کا انتقال ہو گیا۔''اس نے بتایا۔

''یعنی آزادی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے۔''امین نے پھر شرارت کی۔

''یہ واقعی پٹ جائے گا آج مجھ سے۔کلیم سمجھاؤ اسے۔''زیدی نے کلیم کو مخاطب کیا۔

''اچھا اب کچھ نہیں کہوں گا، کان پکڑتا ہوں۔''امین نے زیدی کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''دیکھ رہے ہو اس سالے کو۔ میرا کان پکڑ کر توبہ کر رہا ہے۔''زیدی نے کھڑے ہو کر سب سے شکایت کی۔

''اچھا یہاں آؤ۔تم یہاں بیٹھو۔''کلیم نے اپنی کرسی چھوڑ کر زیدی کو دے دی اور خود امین کے برابر بیٹھ گیا۔

''ہاں تو دادا کی کیا بات تھی؟''ضمیر نے پھر زیدی کو یاد دلایا۔

''ہاں کیا بات ہو رہی تھی؟ امین نے سب کچھ بھلا دیا۔''زیدی نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کہ مولانا آزاد مسلمان نہیں تھے اور یونیورسٹی کے قیام کے مخالف تھے۔''کلیم نے یاد دہانی کرائی۔

''ہاں یاد آ گیا۔ہم نے اپنے والد صاحب سے سنا کہ اس زمانے میں جب مولانا آزاد کی ہندو نواز پالیسیاں اور مسلم لیگ کی مخالفت بڑھتی گئی تو ان کے نام کا بھی لوگوں نے ہندی کرن کر دیا تھا۔ پنڈت مہا بکّو چھٹیرا۔''

''کیا پنڈت مہا بکّو چھٹیرا؟''سب نے ایک ساتھ حیران ہو کر دہرایا۔

''مطلب صاف ہے۔ پنڈت بمعنی مولانا، مہا بکو یعنی ابوالکلام، اور چھٹیرا مطلب آزاد۔''اقبال کی وضاحت پر ہر طرف زور کا قہقہہ پڑا۔

''ہو نہ ہو یہ کسی علی گڑھ والے نے ہی نام دیا ہوگا۔مزہ آ گیا۔''کلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دادا نے کیا خوب نکالی۔کیا وہ بھی تمہاری طرح اولڈ بوائے تھے؟'' امین نے پھر زیدی کو چھیڑا۔اس نے سنی ان سنی کر کے ٹال دیا۔

''کسی نے بھی دیا ہومگر کمال کا نام ہے۔پوری شخصیت کا نچوڑ۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔بس ہندی کا نام بیان کر دو۔'' کلیم ابھی تک ہنس رہا تھا۔

''یہ زیدی بھی تو چھٹیرا ہی ہے۔ہر جگہ چھٹا پھرتا ہے۔''امین نے زیدی کو چھیڑا۔

''اور تم سالے مہا بکو ہو کہ ہر جلسے میں تقریر کرنے پہنچ جاتے ہو۔کوئی موضوع ہو مسجد سے میخانے تک ہر جگہ بکواس جاری رہتی ہے۔''اس نے کرارا جواب دیا۔

''اور یہ اقبال پنڈت ہے آج کل ہر وقت قرآن اسلام کی باتیں کرتا ہے۔''ضمیر نے بھی اپنی عقل استعمال کی۔

''تو تم تینوں مل کر پنڈت مہا بکو چھٹیرا ہو گئے۔کیا خوب!'' کلیم نے ہنستے ہوئے جوڑا۔

اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا کہ دور دور بیٹھے ہوئے لوگ بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔ہنستے ہنستے سب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔کئی منٹ کے بعد ان کو ہوش آیا لیکن یاد آتے ہی پھر ہنسی چھوٹ جاتی تھی۔

''اللہ رحم کرے تم لوگوں پر۔خانخواہ پوری یونیورسٹی میں بدنام نہیں ہو۔'' سلیم نے کہا جو مہینے میں ایک آدھ بار ہی ادھر کا رخ کرتا تھا۔

''ہمارا تو کچھ نہیں ہے۔کسی دن چلے جائیں گے۔مگر ان کو دیکھو وارڈن ہیں۔کسی دن نکالے جائیں گے۔ ہر وقت شرّی گروپ میں بیٹھے رہتے ہیں اور وہ بھی ڈھابے پر۔''زیدی نے ہنستے ہوئے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔

''چھ مہینوں میں دو بار وائس چانسلر کے یہاں بلائے جا چکے ہیں صفائی دینے کے لیے بس جلد ہی نکالے جانے والے ہیں۔''شمیر نے اطلاع دی۔

''وہ تو وائس چانسلر شریف آدمی ہیں ورنہ عارضی ملازم کو تو بس ایک خط روانہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ کسی بھی دن آجائے گا۔'' کلیم نے بھی ہنستے ہوئے بات بڑھائی۔

''بس کرو یار۔ آخری چائے پیتے ہیں۔'' شمیر نے چائے کا آرڈر دیا۔

اسی طرح کی نوک جھونک میں کافی وقت گزر گیا اور تقریباً دو بجے رات وہ ڈھابے سے اٹھ کر اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

❍

(٦)فریب خلافتِ اسلامیہ

6.1 تحریکِ فریب

رات کے تقریباً گیارہ بجے تھے۔اس وقت وہ سب شمشاد مارکیٹ میں ڈھابے پر بیٹھے ہوئے تھے اور فضل حق صاحب کی دی ہوئی خطبات آزاد پڑھ رہے تھے۔

''ہاں بھئی اقبال سناؤ، کیا کہا ہے آزاد نے اس خطبے میں؟'' سلیم نے اقبال سے کہا جو کتاب کے اوراق الٹنے میں مصروف تھا۔

''ہاں پڑھیے ۔١٩١٩ کا اتحاد اسلامی کے موضوع پر خطبہ۔'' فضل حق نے کل کی بات یاد کرتے ہوئے کہا۔انھوں نے اپنا سفر ایک دن ملتوی کر دیا تھا اور ایجوکیشنل بک ہاؤس سے کتاب خرید کر لائے تھے جو اس وقت اقبال کے ہاتھ میں تھی۔

''سنیے صاحبان! خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یہ خطبہ دیا گیا۔'' اقبال نے پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ فضل حق نے اسے روک دیا۔

''پہلے میں اس کی بیک گراؤنڈ تھوڑی سی بیان کر دوں ۔اس کے بعد یہ پڑھا جائے تو آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔''

''ہاں یہ ضروری ہے مگر مختصر بیان کیجئے گا۔'' اقبال نے کتاب بند کر دی۔

''خلافت تحریک، میں سمجھتا ہوں کہ اعلیٰ ترین حماقت تحریک تھی۔'' انھوں نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ امین نے انہیں روک دیا۔

''اب یہ تو نیا مسئلہ شروع ہو گیا۔ ہندوستانی مسلمان جس تحریک کو اتنی اہمیت دیتے ہیں۔اتنا زیادہ جس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ شاید ہی کسی تحریک میں اتنا جوش وخروش

دکھایا ہو۔علی برادران جس کے لیڈر رہوں، اسے ہی آپ حماقت تحریک کہہ رہے ہیں۔ یہ تو بالکل نئی بات ہے۔آپ دہلی سے ہمارا دل دکھانے آئے ہیں۔ یہ کیا قصہ ہے۔سارے مسلمان ایک طرف اور آپ ایک طرف۔''

''نہیں آپ بیان کریں! نئی بات سننے میں کوئی حرج نہیں ہے۔بہت سی باتیں پروپیگنڈہ بھی ہوتی ہیں جو جان بوجھ کر عوام کی نفسیات کا حصہ بنائی جاتی ہیں۔'' اقبال نے امین کی زوردار مخالفت کی۔

''یہی تو مسئلہ ہے ہمارا۔ ہم کوئی نئی بات نہ سننا چاہتے ہیں اور نہ سمجھنا۔اسی لیے مسلمان دنیا بھر میں پٹ رہا ہے۔جو ہمیں بتادیا گیا۔آسمانی پیغام سمجھ کر اندھوں کی طرح اس راستے پر چل پڑتے ہیں۔'' کلیم نے بھی اقبال کی تائید کی۔

''کل یہ مولانا آزاد کے خلاف بول رہے تھے۔انہیں یہ مسلمان تک نہیں مانتے۔آج یہ علی برادران کے خلاف بھی بولنے لگے۔وہ بھی ہمارے اولڈ بوائے تھے۔اتنے بڑے قائدین قوم کو بھی یہ نہیں مانتے؟'' ضمیر کو سخت غصہ آ گیا اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

''دیکھئے سرسید، جناح، علی برادران، آزاد، گاندھی، نہرو، شبلی، حسین احمد مدنی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب انسان ہی تو تھے یا پیغمبر تھے؟ ان سے اختلاف کرنا کوئی گناہ تو ہے نہیں۔ سب غلطیاں کر سکتے ہیں۔ہم کیوں نہ نئے سرے سے ان کو پڑھیں اور انصاف کے ساتھ اپنی تحقیق خود کریں۔ہوسکتا ہے کہ ہمارا مستقبل اسی راستے سے تابندہ ہو۔'' فضل حق نے رسانیت سے اپنی بات رکھی۔

''میں بالکل اتفاق کرتا ہوں آپ سے۔رسولؐ کے علاوہ ہر بڑے سے بڑے عالم فاضل قائد کے قول یا فعل کو ہمیں پرکھنے کا پورا پورا حق ہے۔ان کی کتابیں کوئی قرآن نہیں ہیں اور نہ وہ نبی کے درجہ پر فائز ہیں کہ ان کے اعمال پر اللہ کی سند ہو۔اگر کوئی ان کو غلطیوں سے پاک سمجھتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ درجہ تو صرف پیغمبروں کا ہے اور ایسا سمجھنا اسلام کے مطابق بالکل غلط ہے۔ صرف غلطیوں کی ہی بات نہیں ہے۔بہت سے بڑے لوگوں نے تو پیسہ یا حسد یا حکومت کے لالچ میں نہ جانے کتنے جھوٹ سچ کر دیئے اور کتنے

سچ جھوٹ بنا دیے۔'' اقبال نے فضل حق کو سپورٹ کرتے ہوئے کہا۔

'' مجھے لگتا ہے کہ آپ نے طے کر رکھا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی ٹوپی اچھالنی ہے۔ ہر ایک کو ذلیل کر دینا ہے۔ آپ کے نزدیک کوئی نیک نام بھی ہے۔ یا صرف آپ ہی پیدا ہوئے ہیں۔ اپنی حیثیت پر بھی نظر کی ہے کبھی آپ نے۔'' اب شمیر نے فضل حق پر براہ راست حملہ کر دیا۔

'' مجھے اپنی حیثیت بالکل پتہ ہے۔ نہ میں کسی کی عزت اچھالنا چاہتا ہوں۔ میری یہ اوقات نہیں۔ لیکن مجھے اپنی تحقیق کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ایک عام مسلمان کی حیثیت سے مجھے صرف سچائی جاننے میں دلچسپی ہے اور وہ میں جان کر رہوں گا چاہے کسی بھی عالم فاضل یا قائد کی حیثیت مجروح ہو۔ جو کچھ میں نے برسوں پڑھنے کے بعد سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ نئے دور میں غدر کے بعد سرسید، وقار الملک، محسن الملک، آغا خاں، سر ضیاء الدین، محمد علی جناح، لیاقت علی خاں وغیرہ یہ سب سچے اور صحیح راہ پر تھے باقی دوسری پارٹی مخالفین سرسید علما، شبلی، آزاد، علی برادران، حسین احمد مدنی وغیرہ سب غلط راہ پر تھے اور انہیں مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سیاسی مقاصد کے مدنظر برادران وطن کی حمایت میں یا حسد کی بنا پر جان بوجھ کر حقائق سے نظریں بند کیے ہوئے تھے اور قوم کو گمراہ کر رہے تھے۔'' اب فضل حق بھی جوش میں آ گئے تھے اور ان کا منہ بھی سرخ ہو گیا تھا۔

'' آپ نے تو اتنا وسیع کر دیا اس مباحثے کو کہ یہ کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو کچھ آپ نے کہا ہے میں بھی اس کی حقیقت جان کر رہوں گا چاہے کتنے ہی سال کیوں نہ لگ جائیں۔'' اقبال نے ان کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ کیا۔

'' یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اسلام اور رسول اللہؐ کا نام نامی یہ دوسرا گروپ ہی استعمال کر رہا تھا۔ کہ غلط بات صرف سادہ زبان میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ سرسید کی طرح نہیں کہ دل سے کہی اور دل میں اتری۔ یہاں تو قرآنی آیات اور احادیث رسول کا حوالہ دینا ضروری تھا کہ مسلمان ان کی غلط بیانیوں کو عین اسلام سمجھیں۔ لیکن اوپر اللہ بھی ہے اور

زمانہ شاہد ہے کہ عزت کسے ملی اور رسوائی کس کے حصہ میں آئی۔کس کا چراغ آج بھی روشن ہے کس کا دھواں ہوگیا۔کس کے مزار پر انسان نہیں صرف غلیظ جانور جاتے ہیں اور کس کے مزار پر ہر وقت قرآن خوانی ہوتی ہے۔'' وہ اب انتہائی جذباتی ہو گئے تھے اور ان کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔لہٰذا رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگے۔

''یہ کس کے مزار کا ذکر ہے؟'' شمیر نے ان سے پوچھا۔

''جامع مسجد شاہجہانی کے سامنے جو مزار ہے! میں نے آج تک وہاں کسی کو فاتحہ پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔شاذونادر ہی کوئی پڑھتا ہے۔ہزارہا مسلمان روز جامع مسجد میں نماز پڑھتا ہے لیکن کوئی ادھر دیکھتا بھی نہیں۔ابھی دو سال پہلے جب تک اس کی باؤنڈری بنا کر دروازہ نہیں لگا دیا گیا، جواری جوا کھیلتے اور شرابی شراب پیتے رہتے تھے اور کتے بیٹھے رہتے تھے۔یہ ایک روحانی معاملہ ہے۔مجھے یقین ہے کہ اللہ معاف کرے میں اگر غلط ہوں، یہ موصوف کی وحدت ادیان کے ماننے اور شرع محمدیہ ؐ کے ناسخ ہونے کی وجہ سے ہے۔آپ چاہ کر بھی وہاں فاتحہ نہیں پڑھ سکتے۔کچھ نہ کچھ معاملہ پڑ جائے گا اور آپ وہاں جانا بھول جائیں گے۔دوسری طرف پچھلے چالیس سال سے مسلسل قرآن خوانی ہو رہی ہے قائداعظم کے مزار پر۔دیکھنا ہو جسے عبرت کا تماشہ دیکھے۔نظر چاہیے دیکھنے کے لیے۔دونوں اپنے اپنے ملک میں مدفون ہیں جس نے جو چاہا وہی پالیا۔'' وہ کہتے رہے اور سب ہمہ تن گوش رہے۔

''آپ کی ہر ہر بات میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔میری زندگی کو آپ نے آج نیا رخ دیا ہے۔آج سے یہی تحقیق میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔میں لکھوں گا ضرور لکھوں گا لیکن ریسرچ کے بعد مگر آپ نے کیوں نہیں لکھا اور شائع کرایا؟'' اقبال نے ان سے سوال کیا۔

''ڈر لگتا ہے۔مسلمانوں سے ہی ڈر لگتا ہے۔پیسہ بھی نہیں ہے۔کوئی پبلشر چھاپے گا نہیں۔چندہ کوئی دے گا نہیں۔میں کس کس کی خوشامد کروں گا۔ہاں اگر اللہ نے کبھی دیا تو اپنی جیب سے ہی کچھ بچا کر شائع کرنے کی کوشش کروں گا۔لیکن پورا زمانہ میرا دشمن ہو جائے گا۔اتنی ہمت مجھ میں نہیں ہے کہ اپنے بیگانے سب دشمن ہو جائیں اور میں زندہ

رہ لوں۔نوکری بھی کرنی ہے۔دو بچوں کا ساتھ ہے۔'' انھوں نے انتہائی اداس ہوکر جواب دیا۔اب رفتہ رفتہ سب کواندازہ ہوتا جارہا تھا کہ یہ لوگ کسی عام آدمی سے مخاطب نہیں تھے۔لہٰذا ضمیر،شمیراورامین سب خاموش ہوکران کوسن رہے تھے۔اقبال،سلیم اورکلیم تو پہلے سے ہی ان کے حامی ہوگئے تھے۔اب پوراماحول انتہائی سنجیدہ اور خوشگوار سا ہوگیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے سچائی سب پر بالکل عیاں ہوگئی ہے۔

''میں کسی سے ووٹ یا پیسہ تونہیں مانگ رہا۔میرا نقصان ہی ہے فائدہ کیا ہوسکتا ہے؟ کوئی بتائے۔میرا تومحفلوں میں بیٹھنا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ہرمحفل میں مسلمان سیاست اورتاریخ کی بات ضرورکرتا ہے جناح کوضرورگالیاں دیتا ہے آزاد کی ضرورتعریف کرتا ہے۔گاندھی کومہاتما مانتا ہےاورسرسید کوکانگریسی قوم پرست۔میں تو کہیں کا نہ رہا۔ہرجگہ لوگ مجھ سےلڑپڑتے ہیں سامنے ہی برا بھلا کہنے لگتے ہیں۔ابھی کی مثال لے لیجئے۔ضمیر اورامین نے کیا کیانہیں کہا۔'' ان کے اداس لہجے نے سب پر بے پناہ اثر کیا۔خاص طور سے ضمیر نے فوراً ہی معافی مانگتے ہوئے کہا۔

''میں آپ سے اپنی ہر بات کی معافی چاہتا ہوں۔لیکن ہم بھی کیا کریں جو بزرگوں نے پڑھادیا یقین کرلیااوراسی پراڑے ہوئے ہیں۔''

''اورہم بھی وہی کہہ رہے ہیں جوہم نے سنا۔میں بھی ضمیر کی طرح آپ سے معافی چاہتاہوں۔''امین نے بھی ضمیر کی تقلید کی۔

''آسانی سے آپ سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔لیکن جس دلسوزی اوربغیر لالچ کے یہ سب باتیں آپ نے معلوم کیں اور یہاں بیان کی ہیں ہم سب ان پرغور کریں گے۔یہ بالکل ایک نیا نظریہ ہےایک نئی روشنی ہے جوہمیں آپ سے ملی ہے۔لیکن اب ہم سب خود حقیقت معلوم کرکے رہیں گے۔یہ ہماراوعدہ ہے۔اوراگر یہ صحیح نکلاتو ہم اپنے پیسے سے اس کوشائع بھی کرائیں گے۔''شمیر بھی ان کی دلسوزی سے متاثر ہوکران کی حمایت میں آگیا۔

'میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ آپ میرے اوپر یقین نہ کریں لیکن اوروں پر بھی نہ کریں۔خودتحقیق کریں اورنتیجہ نکالیں۔''

''مگران ساری باتوں کے درمیان، کتاب پھر ایک طرف رہ گئی اور جو پڑھا جانا تھا وہ سب لوگ بھول ہی گئے۔''ضمیر نے اقبال کے ہاتھ سے کتاب لے کر یاد دلایا۔

''پڑھا جائے گا۔لیکن پہلے ایک چائے ہو جائے۔'' یہ کہہ کر شمیر نے بیئرر کو آواز دی اور چائے کا آرڈر دیا کچھ دیر بعد چائے آ گئی۔کلیم نے اپنی سگریٹ سلگا لی اور ایک سلیم کو بھی پیش کی۔فضل حق صاحب کو بھی دینی چاہی انھوں نے بتایا کہ وہ اسموکنگ نہیں کرتے۔اتنے میں ٹیڑھا زیدی بھی وہاں آ گیا اور ماحول کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے بالکل خاموشی سے سلام کر کے بیٹھ گیا۔

''خیریت یہ آج اتنی سنجیدگی کیوں ہے۔'' اس نے اقبال سے پوچھا اور فضل حق کی طرف اشارہ کیا۔

''فضل صاحب! ان سے ملئے یہ ہمارے بہت پرانے دوست ہیں، بلال زیدی صاحب۔''اقبال نے تعارف کرایا۔

''خادم کو ٹیڑھا زیدی کہتے ہیں۔'' بلال نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''ٹیڑھا زیدی!''

''دوستوں کی مہربانی ہے۔ہم نے بھی اپنے آپ کو یہی کہنا شروع کر دیا اور کیا کرتے۔اس سے پہلے یہ کہ ہماری چڑ بنتی، ہم نے کہا کہ لو ہم بھی آج سے ٹیڑھے ہوئے جاتے ہیں۔''اس نے ایک کندھا جھکا کر سنجیدگی سے کہا۔سب لوگ ہنسنے لگے۔

''یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا۔علی گڑھ کی ٹریڈیشن خوب نبھائی۔''فضل صاحب نے تعریف کی۔

''یہ لوگ ہنستے رہیں، بس ہمیں اور کیا چاہیے۔''اس نے فراخدلی دکھائی۔

''اور بھی چاہے۔غزالہ کا پھر کیا ہوگا؟''ضمیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اے تم بھی خوب ہو۔راز کی بات سر بازار کہہ دی۔'' اس نے مصنوعی ناراضگی دکھائی۔

''تمہارا راز بھی کوئی راز ہے۔پورا علی گڑھ جانتا ہے۔ہر گلی چوراہے پر تو پکارتے

پھرتے ہو۔'' کلیم نے یاد دلایا۔

''دل صاف ہوتو کیا برائی ہے۔''اس نے جواب دیا۔

''یہ صرف دل کی نہیں بلکہ دماغ کے بھی صاف ہونے کی دلیل ہے۔''امین نے فوراً ہی وار کیا۔

''بھائی تو مجھے معاف کر۔ بار تو جیتا۔ ہر وقت جملے چپکا تا رہتا ہے۔کوئی حد ہوتی ہے۔''زیدی نے ہاتھ جوڑ کرامین سے کہا۔

''اب اتنا بھی دماغ صاف نہیں ہے جتنا امین بتا رہا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہے۔''شمیر نے مزا لیتے ہوئے بات بڑھائی۔

''ہاں ہے۔ضرور ہے، بھوسا ہے اور کیا ہے۔''امین پھر شرارتی انداز میں مسکرایا۔

''میں جارہا ہوں۔ میں نہیں بیٹھ سکتا۔ سب ایک طرف ہوجاتے ہیں۔''اس نے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا۔

''ارے نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' کلیم نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

''فضل صاحب! آپ سینئر ہیں دیکھئے یہ کوئی انصاف ہے۔''

''نہیں میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔'' انھوں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔

''تب ٹھیک ہے۔اب کوئی ڈر نہیں۔''

''پھر نہ جانے کیا کیا باتیں شروع ہوگئیں۔ بھئی وہ کتاب کب پڑھی جائے گی؟''شمیر نے یاد دلایا۔

''ہاں بھئی اقبال پڑھا! دیکھیں کہ کیا کہا تھا ہمارے مولانا نے۔'' ضمیر نے بھی یاددلایا۔

''لیجئے سنئے ،فرمایا۔''

''میرے عقیدے میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا عمل السحر ہے...... جس دن یونیورسٹی بن جائے گی اس دن ''**الیوم اکملت دینکم**......'' کی وحی اسٹریچی ہال کی

چھت پر نازل ہوگی۔''

6.2 برادرانِ یوسف

''یہ تو قعی حد ہوگئی۔ یونیورسٹی کے قیام کے عمل کو شیطانی قرار دے دیا گیا اور قرآن کی آیت بھی پیش کر دی اور ہزاروں مسلمان بیٹھے ہوئے سنتے رہے مع ہمارے احمق برادران کے۔ انگریزوں کی دشمنی اور خودساختہ خلافت کی حمایت میں کہا جا رہا تھا کہ یونیورسٹی کا فنڈ بھی لڑائی میں دے دیا جائے۔ یہ تو حیرت کی بات ہے اور اس پر ہمارے دینی علماء اس کو امام الہند بنا دینا چاہتے تھے۔'' کلیم کو سخت غصہ آ گیا یہ اقتباس سن کر۔ باقی تمام لوگ بھی دنگ رہ گئے خاص طور سے اس بات پر کہ کھلے عام مسلمانوں کے جلسے میں یہ بات کہی گئی اور علی برادران کی موجودگی میں یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی گئی۔

''ہمارے عظیم اولڈ بوائز برادران علی بھی اس جلسے میں موجود تھے۔ انھوں نے کہا کیا اس پر؟'' ضمیر نے طنز کرتے ہوئے پوچھا۔ اب ضمیر بھی فضل حق سے متفق ہو چلا تھا۔

''کیا کہا اس پر؟ آزاد اگر ایک قرآن کی آیت پیش کر رہا تھا تو یہ دس پیش کرتے تھے۔ ان کی کہانی تو پاپا میاں شیخ عبداللہ کی سوانح عمری میں پڑھیے۔ آپ کو ان کی حقیقت پتہ چل جائے گی۔ اتنا میں جانتا ہوں کہ سر ضیاء الدین اگر اس وقت کالج کے پرنسپل نہ ہوتے تو ان لوگوں نے کالج کو نام نہاد خلافت کے نام پر کانگریس کے سپرد کر دینے کا پورا پلان بنا لیا تھا۔ جناب! یونیورسٹی بننا تو دور کی بات ہے کالج بھی کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ آرکیالوجی کے لوگ بیان کرتے کہ یہاں کبھی کوئی کالج ہوا کرتا تھا۔'' فضل حق نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''آپ تو حیرت انگیز کہانی سنا رہے ہیں۔ نہ کبھی ایسا سنا نہ پڑھا۔ لیکن اس تقریر کو پڑھنے کے بعد اب ہمیں آپ کی ہر بات پر پورا یقین ہے۔ ان برادران کے بارے میں بھی ریسرچ کرنی پڑے گی کہ آخر یہ چاہتے کیا تھے۔ ایسے حالات تھے کہ کالج ہی ختم ہو جاتا؟'' امین نے حیرانی سے پوچھا۔

''جی بیشک اس سے بھی زیادہ خراب حالات تھے۔''

''مگر یہ تو ہمارے ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ ہر تقریر میں ان دونوں کا نام لیا جاتا ہے۔ سر ضیاءالدین کا نام تو کوئی بھولے سے بھی نہیں لیتا؟'' شمیر نے حیرت سے سوال کیا۔

''وجہ اس کی وہی ہے جو آزاد کے ہیرو بنا دیے جانے کی ہے۔ ذاکر حسین بھی بحیثیت طالب علم اس حماقت تحریک میں شریک تھے۔ ملک میں کانگریس کی حکومت آ گئی۔ لہٰذا جن لوگوں سے کانگریس کو فائدہ ہوا اور مسلمانوں میں نیشنل ازم مضبوط ہوا سب ہمارے ہیرو بنا دیے گئے۔ انہیں میں یہ برادران بھی شامل ہیں۔''

''آپ اتنی بہت سی باتیں ایک ساتھ بیان کر رہے ہیں کہ ہم لوگ بس پاگل ہی ہو جائیں۔ آخر ہمیں بے وقوف بنانے کی پوری تحریک ہمارے دانشوروں اور ہمارے ہی نامی گرامی اساتذہ اور ٹیچرز نے چلائی۔ چلئے سچ نہ بتایئے مگر جھوٹ اور فریب کو تو سچ مت بنایئے۔ حقیقت کے بارے میں کبھی کہیں ایک لفظ تو لکھئے یا بولئے کچھ اشارہ تو کیجئے۔ آج میں سمجھا کہ دنیا میں کمیونسٹ انقلاب کیوں آیا۔ مزدوروں اور طلباء نے ہتھیار کیوں اٹھائے۔ کیوں تہذیبوں کو ملیامیٹ کر دیا گیا، چرچ کا جھوٹ جب ساری حدود کراس کر گیا، تو عوام نے چرچ کو اپنی زندگی سے ہی نکال پھینکا۔ اب پوری عیسائی دنیا چرچ کو بس ایک کھلونا سمجھتی ہے۔ ہم کیا سمجھیں اپنے دانشوروں کو، ٹیچرز کو، رائٹرز کو؟ اتنا بڑا فریب اتنا بڑا دھوکا! اتنے زمانے سے ہمارے طلباء سے جھوٹ بولا جا رہا ہے۔ کسی ایک رائٹر یا ٹیچر یا تاریخ داں کو یہ توفیق نہ ہوئی کبھی ایک بار ایک جملہ تو سچ بولتا۔ کہتا کہ علی برادران کالج ختم کر سکتے تھے۔ آزاد، یونیورسٹی کے قیام کے مخالف تھے۔ صرف اتنا ہی کہتا۔ اس کے برخلاف ہمارے ولین کو ہمارا ہیرو بنا دیا گیا اور ہماری پوری قوم کو اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ ایسے تمام لوگوں کے خلاف تو پرتشدد تحریک چلائی جانی چاہیے۔''

ضمیر کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ابھی صرف ایک دن پہلے وہ فضل حق کی تمام باتوں کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن ثبوت سامنے آتے ہی اب سب سے زیادہ ہی ان کا حامی تھا۔

''مگر یہ کتاب تو ہر جگہ ملتی ہے۔ اس تقریر کو نہ جانے کتنے لوگوں نے پڑھا ہوگا۔ کیا

تمام پڑھنے والے احمق ہی ہیں کہ صاف الفاظ کے معنی بھی نہیں سمجھ پاتے۔''

''یہ تو انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ دنیائے اسلام کی سب سے بڑی، اولین تعلیمی تحریک کی مخالفت اتنے غلیظ الفاظ میں کی جائے اور لوگ خاموش رہیں؟'' اقبال نے بھی حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''یہ نہ ہوتا تو مسلمان ہر جگہ کیوں پٹتا۔ ذلیل وخوار ہوتا۔ اگر میری دنیا میں کوئی عزت نہیں کرتا تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ ہر آدمی صرف اپنی ذات میں محدود ہے۔ میری نوکری، میرا گھر، میرے بچے اور میں۔ یہ ہے آج کے مسلمان کی پوری دنیا۔ اگر سرسید زندگی میں ایک لمحے کے لیے بھی اتنے چالاک واسمارٹ ہوجاتے جتنے ہم ہیں تو میرا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے گھروں میں شولنگ کی پوجا کر رہا ہوتا۔ اسپین سے زیادہ بری ہماری حالت ہوتی یہاں۔ بزور طاقت یا تو نکال دیا جاتا یا ہندو بنالیا جاتا۔ ہم لوگ تو ابھی یہ بھی نہیں جانتے کہ سرسید تحریک نہ ہوتی تو ہمارا کیا ہوتا؟'' فضل حق نے ایک نئے انداز سے سرسید کی اہمیت واضح کی۔

''اسپین کے حالات یہاں سے بھی برے تھے؟'' کلیم نے پوچھا۔

''وہاں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ کسی اسپینی کا مسلمان سے جھگڑا ہوجاتا تھا تو وہ کہتا تھا کہ تو یہیں کھڑا رہ، میں گھر سے تلوار لے کر آتا ہوں اور تیرا قتل کروں گا۔ اس کی یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ اس لیے کہ اگر بھاگ گیا تو پورے خاندان کی تباہی لازمی تھی، لہٰذا خاموشی سے وہیں کھڑا رہتا تھا۔ پورا اسپین مسلمانوں سے خالی ہوگیا۔ ساری مساجد، بڑے بڑے مدارس اور خانقاہیں یوں ہی خالی پڑی رہ گئیں۔ بڑے بڑے علماء اور صوفی سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔ اگر سرسید احمد نے وقت کو نہ پہچانا ہوتا اور بروقت مداوانہ کیا ہوتا تو اسپین سے بھی براحال یہاں ہمارا ہوتا۔ پورے چالیس سال وہ شخص ہمارے لیے لڑتا رہا علماء سے، انگریزوں سے اور برادران وطن سے اور سب سے مدد بھی لی جو ساتھ آتا گیا دوست ہوتا گیا۔ پھر تمام عمر انہیں کا ہوکر رہا۔'' فضل حق نے وضاحت کی۔

''اور خلافت جیسی بے فائدہ خیالی چیز کے لیے، چھٹیرا یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت

کر رہا تھا؟''شمیر نے تعجب سے پوچھا۔

''خلافت کا تو تصور ہی بے حقیقت ہے۔صرف ایک خیالی پلاؤ۔لیکن آزادتو اس نام نہاد خلافت کے لیے بھی نہیں لڑ رہا تھا۔وہ تو مسلمانوں کے جذبات سے کھیل رہا تھا خلافت کا نام لے کر۔گاندھی اورآزاد کے لیے یہ خلافت تحریک نہ تھی۔''

''کیا مطلب؟''سب نے حیران ہوکر پوچھا۔

''یہ کیابات ہوئی؟تو پھر خلافت تحریک کیاتھی ان کے لیے؟''ضمیر نے بھی سوال کیا۔

''ان کے لیے یہ تحریک فریب و دغا تھی۔یہ لوگ خلافت کا نام لے کر،مسلمانوں کو بیوقوف بنا کر کانگریسی نیشنل ازم کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ملک کی تحریک آزادی میں جذباتی مسلمانوں کوایندھن بنادینا چاہتے تھے۔گاندھی نے ساؤتھ افریقہ میں جان لیا تھا کہ مسلمان کتنی بے وقوف چیز ہے۔ان کے وہاں بھی اکثر جاں نثار مسلمان ہی تھے۔اس تقریر میں آگے پڑھیے تیسرے صفحہ پر میں نے نشان لگادیا ہے۔سب کو سنایئے۔'' انھوں نے اقبال سے کہااور ورق تلاش کرنے میں مدد کی۔

''فرمایا کہ،آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے یہ ایک مقصد ہے جوفتح چاہتا ہےعمل چاہتا ہے۔''اقبال نے زور سے پڑھ کر سنایا۔

''یہ کیابات ہوئی؟تو پھراس کا نام خلافت کانفرنس کیوں رکھا آزادی کانفرنس ہونا چاہیے تھا۔''شمیر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم سے یہ بات واضح الفاظ میں کہی گئی؟چھیڑا یہ کہہ رہا تھااورمسلمان سن رہے تھے؟''ضمیر نے حیرت سے پوچھا۔

''گاندھی کا مقصدتو پوری طرح واضح تھا۔''کلیم نے خودکلامی کی۔

''یارمیرا تو دماغ خراب ہوا جارہا ہے یہ سن سن کر۔اوپر سے حق صاحب کے تبصرے اورتفصیل۔یہ سب کیا ہے؟'' کیا ہم اب تک بیوقوفوں کی جنت میں رہ رہے تھے؟''شمیر نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''یہ زمانہ تلوار کا نہیں ہے۔خیالات،نظریات اورقلم کا زمانہ ہے۔ہندوفلسفے میں زمانہ

قدیم سے ہی بھید کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سام، دام، کام، ڈنڈ، بھید، چانکیہ نیتی کے بنیادی جز ہیں۔ مہان پرش بھید پر عمل کر رہا تھا۔ آزاد ان کا راز داں اور ساتھی تھا کہ قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کو مدہوش کر دیتا تھا۔'' فضل حق نے بتایا۔

''چلئے چھیڑا تو اس میں گاندھی کا ساتھی تھا۔ لیکن ان برادران حماقت کے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟ کیا یہ لوگ بھی اس بھید سے واقف تھے اور سازش میں شریک تھے؟'' امین نے سوال کیا۔

''میرا خال ہے کہ محمد علی انتہائی جذباتی انسان تھے۔ مولانا کا خطاب اور ان کو دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا خلافت کے نام پر ہر حد سے گزر جانے کے لیے ایک مہرا گاندھی کو مل گیا تھا۔ جو ان کی خوش نصیبی سے علی گڑھ کا اولڈ بوائے بھی تھا۔ وہ اس زمانے کی کرکٹ ٹیم کے کپتان بھی تھے جب ملک میں ایک آدھ ہی ٹیم ہوا کرتی تھی۔ انگریزی بہت اچھی لکھتے تھے۔ ان کے اخبار کامریڈ کی زبان کے انگریز بھی قدر دان تھے۔ بڑے بھائی شوکت علی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ اور محمد علی کے ساتھ تھا کہ وہ عبدالباری فرنگی محلی کے مرید بھی تھے۔ لہٰذا ان کا سلسلہ ان علماء سے پیری مریدی کا قائم تھا جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے دشمن تھے۔ گاندھی نے ۱۹۱۶ء میں انڈیا آنے کے بعد ان ہی لوگوں کو اپنا مہرہ بنایا اور ان کو مساجد و مدارس سے باہر نکال کر مسلمانوں میں ناقابل یقین اشتعال پیدا کر دیا۔''

6.3 غازیٔ گفتار افغانی

''خلافت کے حوالے سے سید جمال الدین افغانی کے بارے میں بتایئے کہ وہ کیا چیز تھے؟'' کلیم نے ان سے سوال کیا۔

''بہت اونچی چیز تھے وہ بھی۔ خلافت کا نام تو آج بھی مولوی دنیا بھر میں لیتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی سیاسی نظام کے معنی بس ایک لفظ تک محدود ہیں۔ خلافت، ایک جادوئی لفظ بنا ہوا ہے۔ جبکہ خلافت راشدہ صرف ۲۸ سالوں میں خود صحابہ نے ختم کر دی۔ خلفاء کو

قتل کرنے والے ان کے ساتھی ہی تھے اور ایک صحابی حضرت معاویہ نے خلافت کو باقاعدہ ختم کر کے اپنے بیٹے یزید کو بادشاہ بنادیا اور اس نے حضرت حسینؓ کو شہید کر دیا۔اس کے بعد جس کی تلوار میں دم تھا خلیفہ بنتا چلا گیا۔درحقیقت قرآن میں کہیں بھی خلافت یاامامت کی طرف اشارہ تک نہیں ہے......۔''

''کیا کہا آپ نے۔قرآن نے خلافت یاامامت کا کوئی ذکر نہیں ہے؟''اچانک سب سکتے میں آ گئے۔

''میں نے کہا کہ صرف ذکر ہی نہیں بلکہ اشارہ تک نہیں ہے پورے قرآن میں۔'' فضل حق نے دعویٰ کیا۔

''کمال ہے۔تو پھر یہ دنیا بھر کا مولوی کیوں راگ الاپتا ہے۔خلافت قائم کرو۔ خلافت قائم کرو۔''

''یہی تو امت اسلامیہ کی بدنصیبی ہے۔اسلامی سیاسی نظام کیا ہوگا اس کا ذکر تک نہیں۔بس چند مسائل جو ہر انسان کے زندگی سے متعلق ہیں، جیسے وراثت،نکاح،طلاق اور چند بڑے بڑے گناہوں کی سزائیں بیان کر دی گئی ہیں۔حکومت کیسے بنے گی کیا شکل ہوگی اس کی؟ قرآن میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے۔یہ قوم کی سمجھ بوجھ اور دانشمندی کا امتحان ہے۔علماء اسلام اس امتحان میں پوری طرح ناکام رہے۔حکمرانی کا کوئی فلسفہ ایجاد کرنے کی بجائے انھوں نے خلافت لفظ کو پکڑلیا اور پوری دنیا میں ایک اودھم مچادیا۔ ہرتاناشاہ اور ظالم بادشاہ کو خلیفہ کالقب عنایت کر کے اہل اسلام پر ظلم وستم کا بازار گرم کرادیا۔تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گزرا کہ مسلمان ان بادشاہوں کی تلوار کے سائے تلے ان کے رحم وکرم پر غلامی کی زندگی گزار رہا ہے۔''

''ذرا رکیے! یہ تو تمہید ہی اتنی لمبی ہوگئی۔ذرا چائے ہوجائے۔اس کے بعد ہوگی باقی گفتگو۔'' شمیر نے ان کو روکتے ہوئے کہا اور بیرّر کو آواز دے کر چائے کا آرڈر دے دیا۔چند ہی لمحوں میں چائے آ گئی۔

''ایسا ہے کہ میں چل رہا ہوں رات کے بارہ تو بج چکے ہیں۔آپ حضرات صبح تک

اس مسئلے کو حل کر ہی لیں گے۔ میں کل اقبال سے پوچھ لوں گا کہ کیا طے ہوا اور کیا کرنا ہے۔'' زیدی نے طنز کرتے ہوئے کہا اور اٹھ کر جانے لگا۔

''جو بھی طے ہوگا تمہارے سامنے ہی ہوگا۔'' امین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

''جن معاملات میں ہمارا کوئی دخل نہیں ہے ہر وقت انہیں پر بات ہوتی رہتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی؟'' زیدی کو تاریخی یا فلسفیانہ گفتگو بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔

''اور جن معاملات میں تمہارا دخل ہے ان میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔'' کلیم نے بات بڑھائی۔

''ان معاملات میں دلچسپی کے لیے اسمارٹنس چاہیے، انداز بیان چاہیے اور کچھ شاعری بھی۔ جو تمہارے پاس نہیں ہے۔'' زیدی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کلیم کو چڑایا۔

''اچھا اسمارٹ! ایسا ہے کہ اب تک کہ چائے کا بل ادا کر دو اور جاؤ۔'' شمیر نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

''تمہارے فلسفے سے چھٹکارے کے لیے یہ قیمت تو کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ اٹھ کر کاؤنٹر کی طرف جانے لگا۔

''نہیں اب تک کی نہیں صبح تک کی چائے کا!'' کلیم نے ٹکڑا لگایا۔

''لوٹ لو مجھے۔ اسی لیے دوست بنے ہو؟'' زیدی نے جواب دیا۔ سب لوگ ہنسنے لگے۔ اس نے بل ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

''ہاں آپ جمال الدین افغانی کے بارے میں بتا رہے تھے۔'' اقبال نے پھر وہیں سے گفتگو کو چھیڑا۔

''ہاں تو یہ حضرت اکثر پیرس میں رہتے تھے اور وہیں سے ایک عربی رسالہ نکالتے تھے۔ آدمی بہت ذہین اور تیز تھے۔ بڑے بڑے امراء اور بادشاہوں کی صحبت میں رہتے تھے۔ ترکی خلافت کے بہت بڑے حامی اور ان ہی کے پیسہ پر دنیا بھر میں خلافت کا بگل بجاتے پھرتے تھے۔ یہ سرسید کے آخری زمانے کی بات ہے۔ تقریباً سات سو سال ترکوں کے پاس اسلامی خلافت رہی۔ لیکن انیسویں صدی کے آتے آتے ان کی پکڑ کمزور ہوتی

چلی گئی۔ فاضل علماء، روزہ، زکوٰۃ اور نماز وغیرہ کے مسائل سے آگے بڑھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔اور یورپ میں سائنٹفک اور صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ سیاسی جمہوری انقلاب بھی آچکا تھا۔ لہٰذا اس کا نتیجہ جو نکلنا تھا نکلا۔ یورپ اور ایشیا کے اکثر خلیفہ کے علاقے دوسروں کے قبضے میں آتے چلے گئے۔جس کا جہاں داؤ لگتا تھا وہی علاقہ ہڑپ کر لیتا تھا۔ حالت یہ ہوگئی کہ یورپین ترکی کے تمام علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ عرب، ترکوں کی ہر شکست پر خوش ہوتے تھے۔ایسے میں ترکوں کی حمایت کے لیے دنیائے اسلام میں مقررین اور علماء کی ضرورت تھی جو مسلمانوں میں اسلامی جوش پیدا کریں۔ سید جمال الدین ان سب کے سالار تھے۔مسلمانوں کے زوال کی اصل وجوہ پر غور کرنا ان کے بس کا نہیں تھا۔ یہ لوگ تو بس شور مچا سکتے تھے۔ اسلام کے نام پر مسلمانوں کو جوش دلا سکتے تھے۔ دوسری قوموں سے دشمنی کرا سکتے تھے۔لہٰذا یہی ہوا۔ بجائے اس کے کہ یہ علماء بنیادی مسائل پر غور کرتے،مسلمانوں کے زوال کی فلسفیانہ اسباب تلاش کرتے۔بس ایک شور مچانے کے لیے پوری دنیا میں گھوتے پھرتے تھے۔سرسید، دنیائے اسلام کے پہلے عالم ہیں جنھوں نے بہت گہرائی اور سنجیدگی سے مسلمانوں کے زوال کی وجوہ تلاش کیں اور ان کا سدباب تلاش کرنے نکلے۔وہ احمقوں کی طرح ٹینکوں کے مقابلے میں تلوار لے کر نہیں کودے۔ یہ گفتار کا غازی اسی زمانے میں ہندوستان آیا اور نظام حیدرآباد کا مہمان ہوا۔ مجھے نہیں پتہ کہ سرسید سے ملاقات ہوئی یا نہیں۔سرسید نے ہندوستان میں خلافت کی حمایت میں تحریک چلانے کی مخالفت کی۔ان کی دلیل تھی کہ جب ہم اپنی حکومت ہندوستان میں نہیں بچا سکے تو ہزاروں میل دور ہو رہی ترکوں اور اتحادیوں کی جنگوں میں ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہندی مسلمان سو سال تک لڑنے کے بعد پوری طرح برباد ہو چکا تھا اور دوسر دلیل یہ تھی کہ جنگوں میں مسلسل ہارنے کی کوئی بنیادی وجہ ہوگی اور وجہ وہی تھی علمی جمود اور فلسفیانہ بے شعوری۔ جو پچھلے سیکڑوں سال سے اسلامی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔لہٰذا یہ غازیٔ گفتار بے انتہا ناراض ہوگیا۔اس وقت سرسید کی حمایت کے بغیر پورے ہندوستان میں کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔تمام مسلمان اس وقت تک سرسید کی قیامت میں

آ چکے تھے۔لہٰذا اپنے رسالے میں سرسید کے خلاف عربی زبان میں ایک نہایت بے ہودہ اور غلیظ آرٹکل لکھا۔ یہاں تک لکھا کہ یہ شخص یہودیوں کا ایجنٹ ہے اور اسلام چھوڑ چکا ہے۔ مذہبی عالم کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب مخالفت کرتا ہے تو اسے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔بس بے پناہ لفاظی اور قرآنی آیات اور احادیث کا استعمال کرنے میں سارے ریکارڈ توڑ دیتا ہے۔آج تک عرب دنیا میں سرسید کا تعارف اسی مضمون کے حوالے سے ہے جو جناب عالی مقام غازیٔ گفتار سید جمال الدین افغانی نے سپرد دروغ کیا اور کذب فتیح کو عام کیا۔آج بھی ہمارے دینی علماء کے لیے سرسید کے کفر پر ایک ناقابل تردید سند کی حیثیت رکھتا ہے۔''

''یار ایسے تمام علماء کے ساتھ تو وہی ہونا چاہیے جو اتاترک نے کیا تھا۔'' کلیم کو تفصیل جانتے ہی غصہ آ گیا۔

''اتاترک نے کیا کیا تھا؟'' ضمیر نے فوراً ہی پوچھا۔

''اس نے تو عجیب وغریب کام کیا تھا۔ان علماء کا کام ہی تمام کر دیا تھا۔ جب یہ لوگ کسی دلیل سے باز نہیں آئے تو اس نے علماء کو دعوت دی کہ سمندری جہاز میں ایک مہینہ پکنک رہے گی اور تمام مسائل پر بحث ومناظرہ بھی ہوگا۔سارے نامی گرامی علماء خوشی خوشی جہاز میں سوار ہو گئے۔بس پھر کیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟'' ضمیر کو جاننے کی جلدی تھی۔

''ہوتا کیا، جیسے ہی جہاز بیچ سمندر میں پہنچا تو اس کو ڈبو دیا گیا۔خس کم جہان پاک۔'' کلیم نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

''اماں یار یہ تو ظلم ہے۔ایسا بھی کیا انتقام۔'' شمیر نے افسوس ظاہر کیا۔

''اتاترک تو ایسا ہی تھا۔اس کے شروع کے زیادہ تر دوست اور ساتھی ملک میں برطانوی طرز کی جمہوریت چاہتے تھے کہ خلیفہ باقاعدہ دستوری بادشاہ ہو جائے۔اتاترک کا کہنا تھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو اسلام کے نام پر خلیفہ پھر مطلق العنان بادشاہ بن جائے گا۔ کوئی روک نہیں سکے گا۔اور ہزار ہا قوم پرست ترکوں کی جانی قربانیاں جو انھوں نے ترکی

کو بچانے کے لیے جنگوں میں دی ہیں، رائیگاں چلی جائیں گی۔ خلیفہ انگریزوں کا حامی اور قوم پرست ترکوں کا مخالف ہونے کے باوجود پھر سے حکمراں بن جائے گا۔ اتاترک کے دوست اس مسئلہ پر اس کے دشمن ہوگئے اور اس کو قتل کرانے کی سازش میں پکڑے گئے۔ عدالت نے پھانسی کی سزائیں دیں۔ آخری دستخط صدر جمہوریہ کے ہونے تھے۔ عوام کا خیال تھا کہ بچپن کے دوستوں کا معاملہ ہے جو ہر محاذ پر ساتھ لڑے ہیں معافی مل جائے گی۔ قریبی لوگوں نے دباؤ بھی ڈالا۔ لیکن وہاں ایک ہی جواب تھا ترکی پہلے دوستی بعد میں۔ سرعام پھانسی دے دی گئی۔''

''رویا تو ضرور ہوگا وہ تنہائی میں؟'' شمیر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''پتہ نہیں کہ رویا یا نہیں لیکن جن لوگوں کو اپنے مقصد سے عشق ہوتا ہے وہ کسی رکاوٹ کی پرواہ نہیں کرتے۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''مگر انہیں جیل میں ڈال دیتا، عمر قید کر دیتا۔ یہ تو بہت ظلم ہے۔ وہ تو ہر لڑائی میں شریک رہے تھے۔'' ضمیر نے افسوس ظاہر کیا۔

''یہ معاملات عشق تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ ایک دوسرا واقعہ سنو جو اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ جس زمانے میں اتاترک اپنی افواج بنا کر مختلف محاذوں پر فتح کے جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ یاد رہے کہ خلیفہ، انگریزوں کی حمایت میں اتاترک کا مخالف تھا۔ ایسے بہادر جوان مرد اور خوبصورت آدمی پر ہزاروں حسینائیں فدا تھیں۔ پیرس کی تعلیم یافتہ ایک خودسر شوخ حسینہ امیر کبیر باپ کی اکلوتی بیٹی، ثمینہ کو بھی اترترک سے عشق ہوگیا۔ وہ ایک محاذ پر گولیوں کے سائے میں اپنے سنہری بال کھولے ہوئے اتاترک سے ملنے پہنچ گئی۔ ملاقات کی اور اپنے یک طرفہ عشق کا اظہار کیا۔ مابدولت خوش ہوئے اور مسکرائے۔''

''ایسے بیان کر رہا ہے جیسے یہ بھی وہاں موجود تھا۔ اور مسکرائے۔'' شمیر نے ہنس کر کہا۔

''ٹیڑھا زیدی ہوتا تو کہتا کہ جنگ گئی بھاڑ میں۔ ثمینہ کا ہاتھ پکڑتا اور پیرس کی سیر کر رہا ہوتا۔'' ضمیر نے بھی مزا لیتے ہوئے اندازہ لگایا۔ ہر طرف ایک قہقہہ لگایا۔

''ایک ٹیڑھے زیدی کی کیا بات ہے ہم سب ہی لوگ محاذ چھوڑ کر بھاگ آتے۔'' کلیم

نے ضمیر کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''لیکن میں نہیں آتا۔'' امین نے شریر مسکراہٹ کے درمیان کہا۔

''بہت بہادر ہو؟'' کلیم نے اسے گھورا۔

''جنگ کرنا بند۔ محاذ پر ہی نکاح ہوتا۔ سہاگ رات ہوگی۔ ہرجانہ لے کر دشمن سے صلح کرتا اور پھر پیرس جاتا۔ قوم گئی بھاڑ میں۔'' امین کی اسکیم پر زوردار قہقہہ پڑا۔

''لیکن نتیجہ تو وہی ہوا کہ بھاگ آئے۔'' کلیم نے یاد دلایا۔

''بھاگتے ضرور۔ مگر پورے انتظام کے ساتھ۔ ٹیڑھے زیدی کی طرح نہیں۔ پھر یہ بھی تو معلوم کرتا کہ اس کے باپ کے پاس کتنا پیسہ ہے۔ پیرس میں رہنے کا خرچہ وہ دے گا کہ نہیں۔'' امین کی شریر مسکراہٹ اور گہری ہوگئی۔

''لیکن میں ہوتا تو یہ تمام باتیں نکاح سے پہلے ہی معلوم کرواتا۔ لڑکی سے کہتا کہ اپنے باپ سے پوچھو کہ پیرس میں مکان خرید کر دے گا یا نہیں۔'' اب ضمیر نے اپنی حکمت عملی بیان کی۔

''تم ماشاء اللہ ہم سب میں تیز ہو۔'' اقبال نے ہنس کر ضمیر کی کمر تھپتھپائی سب نے ایک قہقہہ لگایا۔

''ہم سب میں سب سے زیادہ یہی ترقی کرے گا دیکھ لینا۔'' کلیم نے دعوٰی کیا۔

''ترقی کرنے کے لیے ہر اخلاقی پابندی سے گزر جاؤں گا۔ کیا چاہیے ترقی کے لیے؟ خوشامد، چاپلوسی، جھوٹ، فریب اور خودغرضی۔ یہ سب ہے میرے پاس۔'' ضمیر نے فخر سے سینہ ٹھوکا۔

''اچھا اب مذاق بند۔ ہاں تو کلیم پھر کیا ہوا؟'' اقبال نے سب کو خاموش کراتے ہوئے پوچھا۔

''بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے یہاں۔ خیر تو وہ لڑکی اتاترک سے ملی ہمارے لڑکے کو بھی اس کی بہادری اور حسن دیکھ کر اس سے محبت ہوگئی۔'' کلیم نے کہنا شروع کیا۔

''ہمارا لڑکا کیا؟ شمیر نے ٹوکا۔

''اب آپ سے یہ امید نہیں تھی کہ انداز بیان کے معنی بتانے پڑیں گے؟'' کلیم نے حیران ہوکر شمیر کو ڈانٹا۔

''ارے ساری یار، میں ابھی تک ضمیر کی خالص خودغرضی میں الجھا ہوا تھا۔'' شمیر نے سر جھٹک کر جواب دیا۔

''بہرحال جب جنگیں بند ہوگئیں، اتاترک کی مکمل فتح ہوگئی تو اس نے ثمینہ سے شادی کرلی۔ الیکشن ہوئے اتاترک صدر بن گئے۔ اس کی بیوی یورپ میں پڑھی لکھی لڑکی تھی اس نے بھی سیاست میں حصہ لینا شروع کردیا۔ بلکہ اتاترک نے ہی ثمینہ کو معاملات نسواں کا انچارج بنادیا۔ اب ثمینہ ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی۔ اس کی رائے بھی اتاترک کے دوستوں سے ملتی تھی کہ ملک میں برطانوی طرز کی جمہوریت ہو اور خلیفہ کو دستوری بادشاہ بنادیا جائے۔ دونوں میں اختلاف بڑھتا چلا گیا۔ چند ہی دنوں میں اتاترک نے اسے طلاق دے دی اور پھر کبھی شادی نہیں کی۔ لوگوں نے وجہ پوچھی تو یہی جواب دیا کہ ''یہ دوسری داستان عشق ہے۔''

''طلاق دیدی'' ضمیر نے حیران ہوکر دہرایا۔

''جی بیوی کو طلاق اور دوستوں کو پھانسی، خلیفہ کو ملک بدر، مدارس کے نصاب میں تبدیلی جدید نظام تعلیم کا اجراء، ترکی کا رسم الخط تبدیل، لباس یورپین اور معاشرت جدید ترکوں کا سچا عاشق تھا۔'' کلیم نے یہ کہہ کر ٹھنڈی سانس بھر کر شعر پڑھا۔

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

''ہندوستان پہلے ہی اس سیلاب بلا کی زد میں تھا۔ یہ عشق ہی تھا جس نے سیدزادے کو کروڑوں کی جائداد پر ٹھوکر مارنے پر مجبور کردیا۔ یہ عشق ہی تھا جس نے خاندان کی تباہی سے صرف نظر کرکے مسلمانوں کی بربادی کا نظارہ کرایا۔ یہ عشق ہی کی طاقت تھی جس کی بدولت وہ تمام علمائے اسلام سے تن تنہا لڑ گیا اور کامران آیا۔ یہ سید کا عشق ہی تھا جس کی بدولت گرم لو کے تھپیڑوں میں اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھنے وائسرائے ہند، بادشاہ وقت

شملہ سے علی گڑھ آیا۔ یہ عشق ہی تھا جس کی بدولت آخری زمانے میں اس نے کانگریسی نیشنل ازم کی دھجیاں اڑا دیں اور دنیائے اسلام کو نیوکلیر پاور سے روشناس کرا دیا۔

ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے

یہ کہتے کہتے فضل حق اتنے جذباتی ہو گئے کہ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انھوں نے رومال سے اپنا چہرہ چھپالیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ کافی دیر تک سب لوگ چپ رہے۔ شمیر نے بیئرر کو آواز دے کر چائے کا آرڈر دیا۔ رات کے تقریباً دو بج چکے تھے۔ پورے شمشاد مارکیٹ میں سناٹا تھا۔ صرف یہی پانچ لوگ پیڑ کے سائے میں بیٹھے تھے۔ ڈھابے کا مالک ان کے اٹھنے کے انتظار میں انگیٹھی سلگائے بیٹھا تھا مگر یہ سب لوگ دم بخود بیٹھے تھے اور کوئی اٹھنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

6.4 ضیاءِ علی گڑھ

''مگر افسوس یہ ہے کہ سید کے عشق کو اس کے جلائے ہوئے چراغ نہ سمجھ سکے۔ اور اسی گھر کو آگ لگانے نکل پڑے جہاں ان کی پرورش ہوئی تھی۔'' فضل حق نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مراد علی برادران سے ہے؟'' امین نے سوال کیا۔

''جی بیشک یہی نادان لوگ تھے کہ اگر سر ضیاء الدین مرحوم نہ ہوتے تو علی گڑھ کالج ان لوگوں نے ختم ہی کر دیا ہوتا۔''

''مگر ذرا تفصیل سے بتائیں۔ یہ حیرت انگیز بات ہم پہلی بار سن رہے ہیں۔'' کلیم تجسس سے پوچھا۔

''۱۹۱۶ء میں گاندھی کے ہندوستان آنے کے بعد تین سال کے اندر خلافت تحریک کا ہنگامہ کھڑا ہوا۔ مولانا آزاد، علمائے دیوبند اور چند علماء لکھنؤ وغیرہ گاندھی کے وفادار تھے۔ ترکی پر تقریباً پچھلے سو سالوں سے کوئی نہ کوئی ملک حملہ کرتا رہتا تھا اور کچھ نہ کچھ علاقہ

ہتھیالیتا تھا۔اس وقت دنیائے اسلام ترکی خلیفہ کوتقریباً خلفائے راشدین کی طرح مانتی تھی اوراس کی حفاظت بقائے اسلام کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ ہرمسلم بادشاہ کی یہ کوشش رہتی تھی کہ کسی طرح خلیفہ سے سندمل جائے۔اس سند سے حکومت کو وقار حاصل ہوجاتا تھا۔مملکتِ برطانیہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی۔ یہاں تک کہ ان کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔لہٰذا جب انگریزوں اوراتحادی فوجوں نے ترکی پر قبضہ کرنا چاہا ہندوستان میں ایک ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔مطالبہ غاصب انگریزوں سے ہی تھا کہ خلافت کا تحفظ کیا جائے۔اس وقت محمد علی جوہراپنی خطابت اورصحافت کی وجہ سے ملک کے مشہور لیڈران میں شمار ہوتے تھے۔کالج کے بورڈ آف ٹرسٹیز میں بھی دونوں بھائی تھے۔مسلم لیگ پر بھی اس زمانہ میں ان لوگوں کا دبدبہ تھا۔خلافت کانفرنس قائم ہوئی۔انگریزی زبان سے واقفیت اورعلی گڑھ سے تعلق کی بناپر یہی لوگ اس تحریک کے قائد بن گئے۔۱۹۱۹ء میں کلکتہ کی خلافت کانفرنس میں تحریک ترک موالات پاس ہوئی جس کا مطلب یہ تھا کہ انگریزی مصنوعات،انگریزی تعلیم اور انگریزوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔کلکتہ میں یہ تحریک پاس ہوئی اور وہاں سے یہ قافلہ چلا۔کلکتہ میں یونیورسٹی تھی، پٹنہ میں کئی کالج تھے الہ آباد اور بنارس میں یونیورسٹیز تھیں مگر یہ لوگ کہیں نہیں رکے۔سیدھے علی گڑھ آکر ڈیرا ڈال دیا۔کالج کیمپس کواس تحریک کے چلانے کی تجربہ گاہ بنایا گیا۔مشہوراولڈ بوائز ہونے کی وجہ سےاسلامی خلافت کے نام پراکثر طلباء ان کے ساتھ ہوگئے۔ان لوگوں نے جلسے کرنے شروع کیے۔قرآنی آیات اوراحادیث رسول سے یہ ثابت کیا کہ انگریزی تعلیم اور انگریزوں کا بائیکاٹ شرعی مطالبہ ہے۔ترکی میں ہزاروں مسلمان خلافت کی حفاظت کے لیے شہید ہورہے ہیں۔پھر کیا تھا طلباء میں جوش بڑھتا چلا گیا۔انگریز پروفیسروں کا بائیکاٹ شروع ہوا۔ انگریزی لباس جلائے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اسٹریچی ہال میں جلسہ کرکے ان بھائیوں نے بورڈ آف ٹرسٹیز سے یہ مطالبہ کرڈالا کہ فلاں تاریخ تک کالج کوخلافت کانفرنس کے حوالے کردیا جائے۔اس کے بعد جوکچھ ہوگا ہم ذمہ دارنہ ہوں گے۔یعنی یہ کہ بہ زورطاقت کالج پر قبضہ

کرلیں گے۔اسی کے ساتھ ساتھ پورے شمالی ہند میں بے پناہ جذبات بھڑکا دیے گئے تھے۔ان لوگوں کے طوفانی دوروں میں قرآن وحدیث کے حوالوں سے یہ ثابت کیا جا چکا تھا کہ اسلامی خلافت کو بچانا ہی واحد فریضہ ہے اس وقت مسلمانان عالم کا۔ یہ لوگ اپنی بوڑھی اماں تک کوشہر شہر لیے پھرتے تھے اور یہ مشہور لائن بچے بچے کی زبان پر تھی کہ ''بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلاف پہ دیدو'' حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ ''بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹھا خلافت پہ لے لو۔''اس زمانے میں تقریباً ساٹھ لاکھ روپیہ خلافت کانفرنس کے چندے میں جمع ہوا تھا جو شوکت علی کے پاس تھا۔مختصر یہ کہ بے پناہ دولت اور عوامی سپورٹ ان لوگوں کے ساتھ تھی۔سمجھدار لوگ حیران تھے۔اس طوفان بلاخیز میں کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔لیکن طلباء کو سمجھا بھی رہے تھے کہ تعلیم کا کیا ہوگا۔طلباء کے دباؤ میں ان لوگوں کو ایک نئی نیشنلسٹ یونیورسٹی قائم کرنے کا اعلان کرنا پڑا اور جامع مسجد کے اندر مولوی محمود الحسن کے ذریعہ اس کا افتتاح کرایا گیا۔''

''یونیورسٹی جامع مسجد کے اندر؟''شمیر نے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

''جی اسی جامع مسجد میں!''

''یونیورسٹی کے لیے تو پہلے زمین لی جاتی۔پھر وہاں افتتاح کرایا جاتا۔مسجد کے اندر افتتاح کا کیا مطلب ہوا؟''

''جی اس کا مطلب صاف اور واضح تھا کہ ہمیں صرف بیوقوف بنانا ہے اور آپ سب لوگ احمق ہیں۔''امین نے جواب دیا۔

''ہندوستان کی خلافت تحریک پر ترکی سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔اس کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے۔اس میں لکھا ہے کہ اس دن جامع مسجد کے صحن میں شہر کے بہت سے معزز ہندو حضرات مع جوتوں کے موجود تھے۔ایک سیمینار میں میں نے یہ پیپر پڑھا تو کئی دانشوروں نے میری حمایت کی کہ ایسا ہوا تھا۔سرضیاء الدین پر ایک سمینار ہوا تھا فیکلٹی آف آرٹس میں۔اس میں یہ پیپر پڑھا تھا۔''اقبال بھی درمیان میں بول پڑا۔

''مسجد کے اندر مع جوتوں کے شہر کے ہندو حضرات! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''ضمیر نے

حیرانی سے سوال کیا۔

''مسلمان اتنا بے غیرت نہیں ہوسکتا؟''شمیر نے بھی کہا۔

''ماحول بنانے کی بات ہوتی ہے۔اس زمانے میں پورے ملک میں یہی ماحول بنا دیا تھا ان لوگوں نے۔کیا دہلی جامع مسجد کے ممبر سے سوامی شردھانند کی تقریر نہیں کرائی گئی؟ جس نے بعد میں رنگیلا رسول کتاب لکھی۔یونیورسٹی مسجد میں کچھ لوگ مع جوتوں کے موجود تھے تو اس زمانے میں یہ کوئی عجیب بات نہ تھی۔مسلمان بالکل دیوانہ بنا دیا گیا تھا۔''

''ہاں اس تقریر کا تو بہت ذکر ہے اور یہ بھی کہ بعد کو کسی افغانی نے شردھانند کے گولی ماردی تھی۔''کلیم نے یاد کرتے ہوئے بتایا۔

''ان بھائیوں کی کہانی پاپا میاں نے بھی اپنی بائیوگرافی میں لکھی ہے۔پوری بدمعاشی پر اتر آئے تھے یہ لوگ۔شوکت علی نے تو پاپا میاں کو بھری میٹنگ میں چانٹا بھی مار دیا تھا۔''

''کیا پاپا میاں،تعلیم نسواں کے بانی کو چانٹا مارا اس شوکت علی نے؟''ضمیر کو ایک دم غصہ آ گیا۔

''جی وہ بھی بورڈ آف ٹرسٹیز کی میٹنگ میں۔''

''ان کی کیا کیا سنو گے۔ایک فرانسس روبنسن ہیں آکسفورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر۔ انھوں نے خلافت تحریک پر تحقیق کی ہے۔ان کی ایک بہت بڑی کتاب اس موضوع پر ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ خلافت کے پیسے پر یہ لوگ پورے چھ مہینہ یورپ میں شاہزادوں کی طرح رہے۔آپ کی لائبریری میں دونوں کتابیں موجود ہیں۔خود ہی پڑھ لیں نا آپ لوگ؟''فضل حق نے زور دیا۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دونوں ہی بھائی بڑے اور چھوٹے فراڈ کر رہے تھے ملت کے ساتھ؟''شمیر نے سوال کیا۔

''ظاہری بات ہے یہی مطلب ہوا۔''اقبال نے جواب دیا۔

''ساٹھ ساٹھ لاکھ اس زمانے کی (۱۹۲۰ء کے آس پاس) تو بہت بڑی رقم ہوئی۔ اگر سو گنا بھی بڑھائیں تو ساٹھ کروڑ روپیہ ہو گیا آج کا۔اتنے روپیہ کا کیا کیا ان

لوگوں نے؟''ضمیر کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

''بمبئی میں ایک خلافت ہاؤس بنایا۔ جو آج بھی موجود ہے اور باقی روپیوں کے بارے میں شوکت علی نے بیان دیا کہ ہم نے شپ کمپنی میں لگا دیے تھے اور وہ جہاز سمندر میں غرق ہو گئے۔''

''بہتر ہوتا کہ یہ دونوں بھی اس جہاز پر سوار ہوتے۔''کلیم نے آرزو کی۔

''یہ تو خیالی جہاز تھا۔ سفید جھوٹ۔ اگر صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی یہ پیسہ ترکی فوج کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ تجارت میں کیوں لگا دیا؟''فضل حق نے سوال قائم کیا۔

''محمد علی کی اماں بتائیں گی۔''امین بولا۔

''بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ لے لو۔ ٹھیک ہی کہا آپ نے۔''اقبال نے تائید کی۔

''مگر محمد علی کا ایک بیان کافی مشہور ہے۔ جس میں انھوں نے کہا کہ میرے نزدیک ایک فاسق اور فاجر مسلمان بھی گاندھی سے بہتر ہے کہ صاحب ایمان ہے۔''کلیم نے فضل حق سے پوچھا۔

''ہاں ایسا بیان ہے۔ لیکن جب گاندھی کا پورا کام ان لوگوں نے کر دیا اور یہ دونوں بھائی سیاست میں کسی کام کے نہ رہے کہ نہ گھر کے نہ گھاٹ کے۔ خود مسلمان مسلم لیگ چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہو گئے تھے۔ اب تک یہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ہم واقعی لیڈر ہیں۔ مگر جب گاندھی نے ان کی حیثیت بتا دی تو یہ بہت تلملائے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا سوائے اس کے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ بس یہی مطلب ہے اس بیان کا۔''فضل حق نے آگے بتانا شروع کیا۔''ایک زمانے میں تو کانکورڈ کانگریس کے صدارتی خطبے میں گاندھی کو عیسیٰ مسیح سے ملا دیا تھا کہ دونوں انسانوں کی مسیحائی کرتے تھے۔ محمد علی کے اس خطبے کو پڑھیے۔ خود شردھانند بھی ایسی تقریر نہیں کر سکتا تھا۔ واقعی یہ لوگ انتہائی خود غرض تھے۔''

''بات بہت آگے پہنچ گئی۔ یہ بتائیے کہ کالج کیسے بچا؟''امین نے سوال کیا۔

''ہاں وہ بات تو رہ ہی گئی۔ جب حالات زیادہ خراب ہو گئے اور طلباء سے یہ تجویز پاس

کرالی گئی کہ غالباً ۳۰/اکتوبر۱۹۲۰ء تک کالج کا انتظام خلافت کانفرنس کے سپرد کر دیا جائے، تو سرضیاء الدین بھی سڑکوں پر نکل آئے۔ پہلے انھوں نے بورڈ آف ٹرسٹیز کی میٹنگ کی اور واضح اکثریت سے اس رزولوشن کومسترد کرایا۔ پھر وہ گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جو اس زمانے میں شہر کے مشہور گاندھیائی خواجہ عبدالحمید کے یہاں ڈیرا ڈالے ہوئے تھے۔ ان سے درخواست کی کہ ہمارے کالج کو چلنے دیا جائے۔ سارے طلباء واسٹاف کے لوگ تو پہلے ہی چندہ دے رہے ہیں۔ پیسہ ہم سب دیتے ہی رہیں گے لیکن تعلیم کے بائیکاٹ کی کال واپس لے لی جائے۔ پتہ ہے کہ گاندھی نے کیا جواب دیا؟''

''میٹھی گولی میں زہر دیا ہوگا۔'' کلیم نے اندازہ لگایا۔

''بالکل ایسا ہی کیا۔ گاندھی نے ضیاءالدین صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور لان میں ٹہلتے ہوئے کہا کہ میرے بھائی آپ کالج کیمپس خالی کر دیں۔ ہم یہاں کانگریس کا دفتر بنائیں گے۔''

''کیا کانگریس کا دفتر؟'' ضمیر حیران رہ گیا۔

''جی کانگریس کے دفاتر۔''

''اور خلافت کانفرنس کہاں گئی؟'' ضمیر نے پھر پوچھا۔

''یار تم بھی بےوقوف ہو۔ اسی دن کے لیے تو خلافت کانفرنس بنائی گئی تھی۔ اب اصل مقصد کے پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا اور بھید سے پردہ اٹھ رہا تھا۔''

''اور کیا کہا گاندھی نے؟'' شمیر نے بھی سوال کیا۔

''بہت پریم پوروک سرجھاکر میٹھے سور میں، ضیاءالدین کے کانوں میں رس گھولتے ہوئے کہا کہ جیسے ہی کیمپس میں کانگریس کا دفتر بنا۔ دیکھنا کہ ملک پانچ سال میں ہی آزاد ہو جائے گا۔ آزادی کے بعد پہلا کام حکومت یہ کرے گی کہ کالج سے سوگنا بڑی یونیورسٹی آپ کو بنا کر دے گی۔ یہ ہمارا وعدہ ہے آپ سے۔''

''سرضیاءالدین کو بھی وہ کوئی چغد لیڈر سمجھ رہا تھا۔'' امین کو غصہ آ گیا۔

''جی! سرضیاءالدین کو بھی وہ برادران زر سمجھ رہا تھا۔ انھوں نے گاندھی سے کہا کہ میں

اب آپ کی پوری بات سمجھ گیا اور چلے آئے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''بس ہونا کیا تھا۔ وہ یوپی اسمبلی میں مسلم لیگ کے لیڈر تھے۔ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ سڑکوں پر آ گئے۔ لڑکوں کی میٹنگس کیں۔ گاندھی اور محمد علی کا اصل مقصد بیان کیا۔ چند ہی ہفتوں میں پانسا پلٹ گیا کئی طلباء کو نکال دیا گیا۔ باقی تمام طلباء ان کے ساتھ آ گئے۔ اب محمد علی کو دیکھنے کا وقت آیا اور بورڈ آف ٹرسٹیز سے علی برادران کو علی گڑھ بدر کرنے کی تحریک پاس کرائی اور ضلع مجسٹریٹ کے پاس خود لے کر گئے۔ دوسرے ہی دن پولیس نے ان کا سامان اولڈ بوائز لاج سے باہر پھینک دیا۔ دونوں بھائی سر چھپا کر علی گڑھ سے بھاگے۔ پھر کبھی تا زندگی وہ کیمپس میں آنے کی ہمت نہ کر سکے۔''

''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے۔'' امین نے مصرعہ پڑھا۔

''شروع شروع میں جب اپیل کی جاتی تھی تو یہ کہتے تھے کہ ہم اللہ کے حکم سے یہاں آئے ہیں اور جب اللہ کا حکم آئے گا چلے جائیں گے۔'' فضل حق نے بتایا۔

''اور ہوا یہ کہ سر ضیاء الدین کے حکم سے ہی چلے گئے۔'' امین نے ہنستے ہوئے فوراً ہی کہا۔

''اللہ و رسول اللہ کا نام نامی استعمال کرنے والے بدنیت لوگ۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ تاریخ میں ایسے لوگ زیادہ تر فراڈ ہی ثابت ہوئے ہیں۔'' اقبال نے خیال ظاہر کیا۔

''اس پر ایک لطیفہ نما بات یاد آ گئی۔ یہ تو یاد نہیں آیا کہ کہاں پڑھا ہے مگر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے کہیں لکھا ہے کہ یہ دونوں اللہ اور رسولؐ کا نام اتنی بار اور اس طرح استعمال کرتے تھے کہ جیسے ابھی ابھی ان کے ساتھ چائے پی کر آئے ہیں۔''

''کیا بات ہے! بہت خوب!'' چاروں طرف زوردار قہقہہ پڑا۔

''اللہ میاں کے ساتھ چائے! خوب کہی مزا آ گیا'' سب لوگ یاد کر کے دیر تک ہنستے رہے۔

6.4 شبلی نامہ

''اچھاسراسیر مالٹامحمودالحسن کی یونیورسٹی کا کیا ہوا؟''اقبال نے ماحول کو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

''نیشنل یونیورسٹی تو ڈرامہ تھی۔محمدعلی یا گاندھی کواس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔لیکن علی گڑھ کے کچھ مخلص لوگ تھے انھوں نے لال ڈگی کے پاس پھوس والے بنگلہ میں اس کا بورڈ لگادیا تھا۔''

''کوئی پڑھائی وغیرہ؟''ضمیر نے پوچھا۔

''اے یار مذاق مت کرو۔نیشنل یونیورسٹی تو علی گڑھ کوختم کرنے کی سازش تھی جونا کام ہوئی لہٰذا کافی زمانے تک صرف بورڈ لگا رہا مگر بعد میں حکیم اجمل خاں جن کا دہلی میں بہت بڑا مطب تھااور ایک طبیہ کالج بھی چلاتے تھے۔جامعہ ملیہ کے بورڈ کوعلی گڑھ سے دہلی لے گئے اور اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔گاندھی اورمحمدعلی وغیرہ کو یاد دلاتے رہے کہ اس بورڈ کا کیا کیا جائے۔حکیم صاحب کوئی چھوٹے موٹے آدمی نہ تھے۔دہلی کے ایک بہت بڑے خاندانی آدمی تھے۔ان کی آواز میں دم تھا۔لہٰذا مدرسہ قائم ہوگیا۔پھراور زمانہ گزراحکیم اجمل خاں وغیرہ نے اوکھلا کے نزدیک کچھ زمین کا انتظام کیا۔اور بالآخر وہ ادارہ تھا قائم ہوا۔ملک آزاد ہوالیکن بہت زمانے تک صرف ایک ایم اے فائن آرٹ میں تھا۔جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ نہرواورآزاد کے ذوق جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کا ذریعہ تھالیکن اب جامعہ ماشاءاللہ بہت ترقی پر ہےاور علی گڑھ کےلوگ اسے چلا رہے ہیں۔''

''یہ ذوق جمال والی کیا بات کہی آپ نے؟''ضمیر نے حیران ہوکرانہیں ٹوکا۔

''آرٹ کےتمام شاہکار ذہنی تسکین ہی کےتو کام آتے ہیں لہٰذا جوپینٹنگس وغیرہ وہاں بنائی جاتی تھیں پہلے آزادکوپیش کی جاتی تھی۔''فضل حق نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''دیکھئے آپ کچھ چھپا رہے ہیں صاف صاف بتایئے؟''ضمیر نے انہیں کریدا۔

''بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔آزاد اور نہرو کی دوستی شام کی چائے سے شروع ہوتی تھی۔''

''یعنی وہ لوگ بھی ہماری طرح کاڑھا چائے پیتے تھے اور صرف باتیں کرتے تھے؟'' ضمیر نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

''تم یہ چاہتے ہو کہ میں چائے کی جگہ شراب کہہ دوں؟''، فضل حق نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

''اگر ایسا ہے تو بتایئے۔حرج ہی کیا ہے۔نہرو کے لیے کیا کیا نہ لکھا لوگوں نے۔'' کلیم نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''اس زمانے میں کوئی راز راز نہیں ہے۔صاف بیان کرنے کا زمانہ ہے۔''اقبال نے بھی زور لگایا۔

''اب میں کوئی خوشونت سنگھ تو ہوں نہیں کہ ہر بات کھول کر بیان کر دوں۔مجھ سے نہ کہلواؤ کہ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔یہ الگ بات ہے کہ آزاد خود ہی شراب پینے کا اعتراف کر لیں۔''فضل حق کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''کیا کہا آپ نے؟ آزاد نے شراب پینے کا اعتراف کیا ہے۔امام الہند شراب بھی پیتے تھے؟''کلیم نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''اعتراف کا تو پتہ بھی نہیں چلتا اگر وہ خط عبدالماجد دریابادی کے ہاتھ نہ لگتا اور وہ اس کو شائع نہ کر دیتے۔''فضل حق اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

''بھئی اب تو آپ زچ کرنے لگے صاف بتائیں پوری بات۔'' شمیر نے ناراض ہو کر پوچھا۔

''ہوا یہ کہ سید سلیمان ندوی، آزاد کے الہلال میں کام کرتے تھے شبلی کی وجہ سے۔اب آپ لوگ وعدہ کریں کہ شبلی اور آزاد کے تعلقات کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ پھر میں آگے بولوں گا۔'' فضل حق نے مسکرا کر باری باری سب کی طرف دیکھا۔مگر اس جملے سے اور ہلچل مچ گئی۔

''یہ کیا بات ہوئی؟ ہم تو ضرور پوچھیں گے۔'' سب ایک ساتھ بول پڑے۔

'رات کے تین بج گئے۔اب چلا جائے۔''فضل حق نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ گئے۔

''ابھی تو سورج نکلنے میں تین گھنٹے باقی ہیں جناب۔صبح کا ناشتہ کر کے چلیں گے۔'' امین نے مسکراتے ہوئے فیصلہ سنایا۔

''ارے بیٹھئے صاحب۔ نہ آپ کو ایسے سننے والے ملیں گے اور نہ ہمیں ایسا سنانے والا۔ایسی صحبتیں کسے نصیب ہیں۔ہمیں خوشی ہے کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ یہ باقی رات تو اب یہیں کٹے گی۔'' کلیم نے ان کا ہاتھ پکڑ کر درخواست کی۔

''بیٹھئے حضور، میں ذرا رضا کو اٹھاتا ہوں کہ گرم گرم چائے پلائے۔''ضمیر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''سنئے آپ کو ایک شعر سناتا ہوں۔اگر آپ اس پر بھی نہ بیٹھے تو ہم سب بھی اٹھ جائیں گے۔''اقبال نے یہ کہہ کر شعر پڑھا۔

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشاء

غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

''بھئی بہت خوب! واہ واہ کیا شعر سنایا ہے۔'' چاروں طرف ایک شور سا مچ گیا۔

''اب تو بیٹھنا ہی پڑے گا۔'' یہ کہتے ہوئے فضل حق بھی بیٹھ گئے۔

''فضل صاحب کے اٹھنے پر ایک شعر یاد آ گیا۔ظالم نے کیا کہا ہے۔

میں نے کہا کہ بزم یار چاہیے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

''بس تم ہی غیر ہو یہاں باقی تو سب اپنے ہیں۔غلط فہمی یہ تھی کہ سب غیر ہیں صرف میں ہی ان کا اپنا ہوں۔'' کلیم نے ہنستے ہوئے بیان کیا۔

''کیا گزری ہوگی مرزا پہ جب اٹھایا گیا ہوگا۔''ضمیر نے گریہ کیا۔

''کس اعتماد سے فرمائش کی تھی اور کیا ہوا۔واہ رے قسمت۔''اقبال نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''مرزا کیسے اٹھے ہوں گے۔'' کلیم نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے۔'' امین نے فوراً ہی مصرع پڑھا۔

''مگر وہ دوسرے دن ہی پہنچ گئے ہوں گے کہ میر کی طرح ناتواں تو تھے نہیں کہ عشق کا بھاری پتھر نہ اٹھا سکیں۔'' اقبال نے عرض کیا۔

عشق میر ایک بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اٹھتا ہے

''ناتوانی پر غالب کا کیا خوبصورت شعر ہے۔'' امین کو بھی شاعری سوجھی۔

ادھر یہ ناتوانی ہے ادھر وہ بدگمانی ہے
نہ بولا جائے ہے مجھ سے نہ پوچھا جائے ہے ان سے

''بولے جانے کی بھی خوب کہی۔ یہاں تو ہاتھ اٹھا کر گدائی بھی نہیں کر سکتے۔'' کلیم نے پرسوز لہجے میں اشعار پڑھے۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر
بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے

''واہ واہ کیا اشعار پڑھے ہیں۔ میر کا انداز بھی نرالا ہے۔ کیا سوز ہے پورا وجود ہی جیسے غرق اندوہ ہو کر رہ گیا ہو۔'' اقبال نے آہ بھری۔

''یہاں تو لگ رہا ہے کہ مشاعرہ شروع ہو گیا۔'' شمیر نے واپس اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''موقع سے فائدہ اٹھا کر میں بھی ایک شعر عرض کرتا ہوں۔ کہا ہے۔

آب رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آب رواں بنایا

''کیا خوب شعر ہے۔'' فضل حق نے تعریف کی۔

''کیا ظریفانہ انداز ہے۔'' اقبال نے کہا۔

''ایسا شعر تو میں بھی کہہ دوں گا۔'' کلیم بولا۔

''آپ تو معاف ہی فرمائیں۔ چائے کا کیا ہوا؟'' ضمیر نے شمیر سے پوچھا۔

''بڑی مشکل سے اٹھا ہے رضا۔ بس ہم لوگوں کی محبت میں بیٹھا رہتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ کہہ رہا تھا کہ بھٹی ٹھنڈی ہوگئی۔ میں نے کہا کہ لکڑی جلا کر ہی بناؤ۔ سوکھی لکڑیاں جمع کرے گا تو چائے بنائے گا۔'' شمیر نے بتایا۔

''جب تک چائے آتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں۔'' امین نے اشعار پڑھے۔

رخسار گل کے اوپر زلف سیاہ بنائی
زلف سیاہ کے نیچے رخسار گل بنایا
کھانے کے بعد پانی تو نے پلایا مجھ کو
پانی سے پہلے کھانا تو نے کھلایا مجھ کو

''بھئی واہ واہ مزا آ گیا۔'' سب نے ایک ساتھ کہا۔

''اس میں کیا ہے؟ ایسی شاعری تو ہر آدمی کر لے گا۔'' ضمیر بولا۔

''روز ہی آپ لوگ یہاں صبح کر دیتے ہیں؟'' فضل حق نے ماحول بدلنے کے لیے پوچھا۔

''نہیں۔ دو ڈھائی تو روز ہی بجتے ہیں۔ صبح تو بس آج ہی آئے گی۔'' شمیر نے بتایا۔

''اس کا ڈھابہ بھی تو ہم لوگوں کی وجہ سے کتنا چلتا ہے۔ پہلے یہاں کوئی بھی نہیں آتا تھا۔'' ضمیر بھی بولا۔

تھوڑی دیر میں ہی رضا چائے بنا کر لے آیا۔

''ہاں فضل صاحب اب بتایئے آپ؟'' اقبال نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا بتائیں؟''

''وہی بات جو آپ بتانا نہیں چاہ رہے تھے۔''

''کون سی بات؟''

''آزاد کی شراب اور ان کے شبلی سے تعلقات کے بارے میں۔''

''ہاں آزاد شراب پیتے تھے سبھی جانتے ہیں۔شام کے بعد وہ کسی سے مل بھی نہیں سکتے تھے۔آخر تک ان کا یہ معمول رہا۔لیکن ان کا اعتراف بھی بہت مزے کی چیز ہے۔سید سلیمان ندوی ایک شریف عالم تھے۔ان کو شبلی نے آزاد کے الہلال میں کام کرنے کے لیے کلکتہ بھیج دیا۔وہ آزاد کو نیک آدمی سمجھتے تھے۔انھوں نے خطوط میں لکھا بھی ہے کہ مجھے کیسی غلط فہمی تھی آزاد کے بارے میں۔جب دیکھا کہ آزاد دفتر میں بھی شراب پیتے ہیں تو ان سے برداشت نہ ہوا اور کلکتہ چھوڑ کر چلے آئے۔پورا الہلال ان ہی کے دم پر چلتا تھا۔آزاد کو بہت پریشانی ہوئی۔لہٰذا انہیں خط لکھ کر منانے کی کوشش میں اعتراف کرنا پڑا کہ میں شراب پیتا ہوں لیکن آئندہ کے لیے وعدہ کرتا ہوں۔یہ خط عبدالماجد دریابادی کے ہاتھ لگ گیا اور انھوں نے شائع بھی کر دیا۔''

''تو حضرت امام الہند شرابی تھے اور مسلمان جناح کو شرابی سمجھتا ہے۔'' ضمیر نے تاسف سے کہا۔

''ہر آدمی کا فعل ہے اللہ جانے۔ہم درمیان میں نہیں آتے۔'' کلیم نے اپنی رائے دی۔

''بالکل آتے ہیں۔جب کسی کے بارے میں مشہور کیا جائے کہ وہ عالم اسلام اور مفسر قرآن ہے اور ہر وقت وہ قرآن وحدیث بیان کرے تو ہم بیچ میں آتے ہیں۔اس لیے کہ ہمیں فریب دیا جا رہا ہے۔دھوکا دیا جا رہا ہے سارے مسلمانوں کو۔'' امین نے سختی سے کلیم کی بات کاٹی۔

''فریب تو دیا گیا۔'' اقبال نے امین کی تائید کی۔

''خیر یہ تو ہوئی آزاد کی شراب کی بات اب ذرا شبلی سے ان کے تعلقات پر روشنی ڈالیے۔'' کلیم نے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔

''انجمن ترقی اردو ہند نے ۱۹۸۷ء میں سید شہاب الدین دسنوی کی کتاب بعنوان ''شبلی'' شائع کی ہے جس میں انھوں نے شبلی پر جہاں جہاں تنقیدیں ہوئی ہیں سب کو جمع کر دیا ہے اور ان کی حمایت میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔شبلی کے معاشقے اور

دوسری عادتوں کی صفائی دی ہے۔ بس خدا کسی کو ایسا حامی نہ دے۔ تفصیل جاننے کے لیے آپ کو وہ چارج شیٹ دیکھنی پڑے گی جو ندوہ کی انتظامیہ کمیٹ نے شبلی کو دی تھی اوران پر انکوائری بٹھائی گئی تھی۔ یہ تمام رپوٹز ندوہ کی لائبریری میں موجود ہیں۔ ہوا کہ یہ شبلی کی ملاقات آزاد سے امرتسر ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں ہوئی۔ آزاد اس وقت ۱۸ یا ۱۹ سال کے خوبرو جوان تھے۔ شبلی ندوہ کے ناظم تھے۔ آزاد کو لکھنؤ لے آئے اور ان کی تہذیب و تربیت میں ذاتی دلچسپی لینے لگے۔ الندوہ کا ایڈیٹر بھی اتنی کم عمری میں بنادیا۔ ساتھ رکھنے کا کوئی جواز تو چاہیے تھا۔ بہت سی غبن وغیرہ کی شکایتیں شبلی کے خلاف پہلے سے ہی تھیں۔ اب فعل قبیح کی وجہ سے اور ہوا ملی نتیجہ یہ ہوا کہ انکوائی ہوئی اور ان کوندوہ چھوڑنا پڑا۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔''

''یہ تو بڑی حیرت انگیز بات بتارہے ہیں آپ، اس کا کوئی ثبوت؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''ثبوت تو نہ جانے کتنے ہیں۔ میں خود شبلی کا خط سناتا ہوں جو انھوں نے آزاد کو اس کمیشن کے بارے میں لکھا۔ ''فرد جرم بہت بڑی ہے خورد برد کا الزام بھی ہے...... ہاں انہیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔''

''یعنی یہ تو ثابت ہوا ہے کہ ایسے مکروہ الزامات عائد ہوئے اور انکوائری کرائی گئی۔'' امین نے سب کو مخاطب کیا۔

''ظاہری بات ہے کہ مگر یہ خط کہاں چھپا ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''دسنوی صاحب کی کتاب میں صفحہ ۹۹ پر۔'' فضل حق نے بتایا۔

''انھوں نے اور کچھ کمنٹ کیا ہے اس معاملے پر؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''دسنوی صاحب شبلی کے حامی ہیں۔ وہ بھی اگلے ہی صفحے پر لکھنے پر مجبور ہوئے، ''۱۹۱۰ء کا زمانہ وہ تھا جب کہ ابوالکلام خود اپنے بیان کے مطابق رندی اور ہوسنا کی کے دور سے گزر رہے تھے اس کے باوجود اپنے تبحر علمی کی وجہ سے وہ شبلی کو عزیز تھے۔ علمائے کرام شرعی لحاظ سے اس پر معترض ہوئے کہ شبلی ندوۃ العلماء کے سربراہ ہوتے ہوئے ایک رند بدمست کے قریب کیسے ہوسکتے تھے۔ یہی وہ محبت ہے جس کا الزام ان پر لگایا گیا ہے۔''

''میرا تو سر چکرا رہا ہے۔آخر اتنا بڑا فریب ہوا ہمارے ساتھ۔''ضمیر نے سر پکڑ لیا۔
''کیا شبلی کو علی گڑھ سے بھی نکالا گیا تھا؟''
''اس سلسلے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں ہیں۔لیکن یہاں بھی لوگ ان کے رویے کی وجہ سے ناراض رہتے تھے۔غالبًا ان سے استعفٰی دینے کے لیے کہا گیا تھا۔نہ دیتے تو اگلی کارروائی ہوتی بہرحال میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔اس سلسلے میں تحقیق کرنی پڑے گی۔''
''ان کو نوکری کس نے دی تھی؟''کلیم نے پوچھا۔
''سرسید نے ہی ان کو ملازم رکھا تھا عربی پڑھانے کے لیے۔کسی کا تعارفی خط اور ایک عربی قصیدہ لکھ کر لائے تھے سرسید کی تعریف میں۔ان کو ضرورت تھی عربی کے استاد کی۔سرسید نے امتحان لیا اور نوکر رکھ لیا۔بلکہ اس کے بعد اپنی لائبریری بھی ان کے لیے کھول دی۔پروفیسر آرنلڈ سے دوستی کرائی۔اب ذرا غور کریں کہ ایک مدرسے کے فارغ میں وہ روشنی کہاں سے آئی کہ الفاروق لکھتا۔سرسید ہی کی سرپرستی میں وہ ایک عام مولوی سے عالم بنے۔سیرۃ النبی لکھی۔لیکن اپنے محسن کے انتقال کے بعد نہ صرف سرسید بلکہ کالج کے بھی دشمن ہو گئے۔سرسید کے خلاف مضامین لکھے۔الہلال علی گڑھ کو ختم کرانے کے لیے نکلوایا۔وہ پہلے عالم تھے جس نے سرسید کی سیاسی پالیسی کو زبردست مخالفت کی اور کانگریسی نیشنلزم کی حمایت کی۔مولانا آزاد جیسے علی گڑھ دشمن کی الہلال والبلاغ نکالنے میں مدد کی بلکہ اس کو پیدا کیا۔آپ خود دیکھیں یہ گھٹیا رسائل آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ کس حد تک دشمنی یہ لوگ علی گڑھ کالج سے کر رہے تھے مگر اس زمانے میں حامئین سرسید کی کمی نہ تھی۔بابائے اردو مولوی عبدالحق اور دوسرے بڑے بڑے ادیبوں نے شبلی کی مخالفت میں مضامین اور کتابیں لکھیں اور ان کی حیثیت ختم کر دی۔لیکن آزاد کی حقیقت بتانے والا کوئی پیدا نہ ہوا۔ان کی بس سیاسی مخالفت کی گئی اور ۱۹۴۷ء تک آزاد کی کوئی حیثیت مسلم سماج میں نہ بننے دی مگر آزادی کے بعد وہ ہمارا ہیرو بنا دیا گیا۔''
''یہ تو بہت حیرت انگیز داستان ہے۔الہلال اور البلاغ تو دیکھنے پڑیں گے۔ یہاں لائبریری میں موجود ہیں۔''اقبال نے سوچتے ہوئے کہا۔

''مگر آپ دیکھ کر برداشت نہ کر سکیں گے۔''فضل حق نے وارننگ دی۔

''کیوں؟ایسا کیا ہے؟''

''دونوں اخبار کل ملا کر صرف تین سال نکلے۔میں نہیں سمجھتا کہ اس زمانے کا کوئی گھٹیا ترین اخبار بھی ایسا ہوگا۔بس فرق صرف یہ ہے کہ قرآن وحدیث کا بے پناہ استعمال کیا گیا ہے۔ہر بات قرآن اور اسوہ نبی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے۔حالانکہ آزاد اپنے اعتراف کے مطابق اس زمانے میں مسلمان بھی نہیں تھے۔''

''کیا مطلب؟''

''ان کا زمانہ الحاد تو بہت مشہور ہے۔سبھی جانتے ہیں وہ کئی سال تک ملحد رہے اسی زمانے میں اخبار نکالا۔''

''خدا رسول پر یقین نہیں تھا تو پھر ان کا حوالہ کیوں دے رہا تھا؟''

''یقین نہیں تھا۔اس لیے حوالہ دینا اور بھی آسان تھا اس لیے کہ اب کوئی ڈر تو تھا نہیں۔بس اہل اسلام کو قوم پرستی کے اندھیروں میں ڈبونا تھا۔کوئی بھی آیت کہیں بھی استعمال کی جا سکتی تھی۔مثلاً مشرکین مکہ کے لیے جو آیات نازل ہوئیں وہ اکثر سرسید اور ان کے ساتھیوں کے لیے استعمال کردیں۔''

''کیا؟'سب کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا۔

''آپ خود دیکھ لیں،کوئی بھی دیکھ لے یہاں لائبریری میں ساری فائلیں موجود ہیں۔''

''کتنی حیرت کی بات ہے۔''امین تعجب سے بولا۔

''اور میرا دعویٰ ہے کہ ملک نہ بٹتا اگر سرسید نے شبلی کو نوکری اور محمد علی کو داخلہ نہ دیا ہوتا۔بلکہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو برابری کا حصہ ملتا۔پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں کی کمزوری کا اعتراف تھا۔مسلم سیاسی اتحاد اتنا کمزور کر دیا تھا ان لوگوں نے کہ اگر لیاقت علی خاں،جناح کو لندن سے واپس نہ لاتے اور مسلم لیگ ان کو قائد نہ مانتی تو صوبۂ سرحد تک کانگریس کی عملداری ہوتی اور تمام مسلمان دلالی کر رہے ہوتے جیسا کہ آج میں کر رہے ہیں۔''

''یہ خیال تو تفصیل طلب ہے۔ذرا وضاحت سے بیان کریں۔کہ سرسید اگر شبلی اور محمد

علی کو نوکری اور داخلہ نہ دیتے تو پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو برابری کا حصہ ملتا۔''

اقبال نے تفصیل جاننا چاہی۔

''یہ تو کمال کی تھیوری ہے۔'' کلیم نے حیرانی سے کہا۔

''ہر آدھے گھنٹہ میں آپ ایک نئی تھیسس پیش کر رہے ہیں۔ یہ بھی عجیب تھیوری ہے کہ سرسید شبلی کو نوکری اور محمد علی کو داخلہ نہ دیتے تو ملک تقسیم نہ ہوتا اور اگر ایسا ہوتا تو لاکھوں ہندو اور مسلمان جو فسادات میں مارے گئے نہ مارے جاتے۔ دہلی مشرقی پنجاب، یوپی، بہار ،مغربی بنگال میں مسلمانوں کا قتل عام نہ ہوتا۔ حیدرآباد کی ریاست نہ جاتی۔ کشمیر کا مسئلہ نہ پیدا ہوتا۔ جنگیں نہ ہوتیں۔ اردو نہ ختم ہوتی۔ پوری دنیا ہی بدلی ہوئی ہوتی۔ کیا صرف دو آدمیوں کی بدولت اتنا سب کچھ ہو گیا؟'' شمیر نے حیران ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''دو آدمی؟ صرف ایک انسان کی بدولت الگ ملک نہ بن گیا؟ اور ایک مہاتما کی بدولت پورا ہندوستان متحد نہ ہو گیا؟ اگر گاندھی نہ ہوتے تو کیا ہندوستان ہوتا؟ اگر جناح نہ ہوتے تو کیا پاکستان ہوتا؟'' فضل حق نے سوال نما جواب دیا۔

''کیا ایک انسان کے بدولت پوری دنیا دو بلاکس میں نہ بٹ گئی۔ کیا روس میں انقلاب آتا چین میں انقلاب آتا؟ دنیا کے ہر ملک میں کمیونسٹ تحریک صرف ایک ہی انسان کی بدولت تو پیدا ہوئی۔ کارل مارکس اگر اپنی تھیوری نہ لکھتا تو کیا دنیا ایسی ہی ہوتی جیسی ہے؟ میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو، ابلیس سے پہلے اسداللہ بھی کہہ گئے۔'' اقبال نے اشعار پڑھے۔

اثر آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں
صورت رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
نگہ گرم سے ایک آگ ٹپکتی ہے اسد
ہے چراغاں خس وخاشاک گلستاں مجھ کو

''یہ ہر جگہ مرزا کو کیوں لے آتے ہو تم۔'' ضمیر نے اقبال پر مصنوعی غصہ سے دکھایا۔

''کلیم یہ بات غلط ہے! یہ تو خیال کرو کہ کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔'' کلیم نے ضمیر

پر وار کیا۔

''تم تو جیسے بہت عقلمند ہو۔اگر اقبال معنی نہ بتائے تو مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے بتاؤ؟''ضمیر بھی کم نہ تھا پلٹ وار کرنے میں۔

''فرق ہے۔اچھا بتاؤ نگۂ گرم سے آگ ٹپکنے کا کیا مطلب ہوا؟'' کلیم نے پھر وار کیا۔

''ارے ابھی اقبال نے معنی کہاں بتائے ہی، جو بتاؤں۔''ضمیر کے جواب پر سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

''یہ ہوتی ہے صاف گوئی۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے ضمیر کی کمر تھپتھپائی۔

''اب تم بھی اعتراف کر ہی لو۔''امین نے کلیم کو مشورہ دیا۔

''ہاں ہاں کرلو۔ یہاں سب اپنے ہی تو بیٹھے ہیں اور فضل صاحب دہلی جا کر کسی کو تھوڑی بتائیں گے۔'' شمیر نے کلیم کو مشورہ دیا۔اب کلیم پوری طرح پھنس چکا تھا۔اس کے علاوہ سب نے قہقہہ لگایا۔

''مارکس اور مرزا کو خوب ملایا آپ نے۔'' فضل حق نے بات بدلتے ہوئے اقبال سے کہا۔

''ابلیس او رمرزا کو بھی۔ کہتے ہیں کہ ابلیس سے پہلے اسداللہ کہہ گئے۔'' امین نے شرارتی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ ابلیس نام کا بھی شاعر کوئی تھا؟''ضمیر نے معصومیت سے پوچھا۔

''ان کی سنیے! کلیم ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔''امین نے کلیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابے گدھے! یہ اقبال کی ایک نظم مکالمۂ ابلیس و جبریل کا ایک مصرعہ ہے۔جس میں شیطان جبرئیل کو چیلنج کرر ہا ہے کہ دنیا کی ساری رونق مجھ سے ہی ہے۔''شمیر نے ضمیر کو بتایا۔

''اور اگر یقین نہ آئے تو خود اللہ سے پوچھ لے کہ قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے پھر ایک مصرعہ پڑھا۔

''گویا شیطان کی بھی خاص اہمیت ہے۔''کلیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ بلکہ صرف ان حضرت کی ہی اہمیت ہے کہ اگر یہ نہ ہوتے تو خیر وشر کی ساری کشمکش ہی کہاں ہوتی۔'' امین نے شرارتی انداز میں کہا۔

''خیر میں تو بالکل دم نہیں ہے۔ ایک دم بور آئیڈیا ہے۔ بس بیٹھے بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہو۔ ایک شر ہی ہے جو شراب سے لے کر ایٹم بم تک اور پینٹی سے لے کر بلو فلم تک بنواتا ہے۔ ابلیس سے پہلے کیا تھا۔ فرشتے تھے، جو ہر دم ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔ میں تو وہاں نہیں رہ سکتا تھا۔'' کلیم نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اور خود اللہ میاں کا بھی جی کہاں لگا بغیر شیطان کو پیدا کیے۔'' امین نے پھر شرارت کی۔ ''حالانکہ فرشتوں نے کافی احتجاج کیا تھا کہ آدم کی کیا ضرورت ہے ہم ہیں تو تیری عبادت کرنے کے لیے۔''

''پھر اللہ میاں نے مقابلے کا امتحان رکھا۔ فرشتے فیل ہو گئے اور انسان جیت گیا۔ اسے علم دیا گیا تھا اور اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا تھا اس کے اندر کہ وہ نائب اللہ بن گیا اور تحقیق و تخلیق کرنے لگا۔'' اقبال نے فلسفہ بیان کیا۔

''تو ہم لوگ اللہ کے نائب ہیں زمین پر اور یہ ضمیر بھی؟'' کلیم نے پھر ضمیر پر وار کیا۔

''صرف ضمیر ہی نہیں پشیند رکمار بھی۔'' امین نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ہر طرف ہنسی پھیل گئی۔

''تم سالے چھوٹے نائب ہو اور میں تم سے بڑا؟'' ضمیر کو غصہ آ گیا اور کلیم پر پل پڑا۔

''یہ کلیم ہر وقت شر پھیلاتا ہے۔'' اقبال نے احتجاج کیا۔

''جی آپ ہی کے فلسفے کے مطابق فرض آدم ادا کر رہا ہوں۔ آداب۔'' کلیم نے اقبال کو طنزاً سر جھکا کر آداب کیا۔

''تو کیا شیطان کے چھوٹے بھائی ہو؟'' اقبال کے بجائے امین نے کلیم سے پوچھا۔ کلیم نے ڈک کرنا مناسب سمجھا۔

''فرض آدم نہیں، بلکہ خصلت آدم سے مجبور ہیں ہم لوگ، کہ انسان میں خیر وشر دونوں قوتیں اللہ نے رکھی ہی۔ جس نے خصلت شر کو دبا لیا وہی جنت میں جائے گا اور شرک ہے

سب سے بڑا شر۔'' اقبال نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''اور شرک کی حمایت اس سے بھی بڑا شر ہے جو شبلی آزاد وغیرہ نے کی۔'' امین نے خود کلامی کی۔

''میں نے تو کلیم کو دبا رکھا ہے۔ لہٰذا میں نے جنتی ہو گیا۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے دعویٰ کیا۔

''یعنی کلیم خصلت شر ہے۔ یہ تو بہت زیادتی ہے۔'' امین نے کلیم کو چڑھانا چاہا۔

''کہنے دو۔ میں کچھ کہتا ہوں تو غصہ کرنے لگتا ہے۔'' کلیم نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میں تو کل سے اٹنگا پائجامہ پہننا شروع کر دوں گا کہ خصلت شر کو دبانے کا بہت ہی آزمودہ نسخہ ہے۔ صدیوں سے علماء اس کو آزماتے آ رہے ہیں۔'' امین نے شرارتی لہجے میں کہا۔

''قوت دافع شر بڑھانے کے لیے اسے اور اونچا کرو۔'' اقبال نے مشورہ دیا۔

''اٹنگا کیوں! گھٹنے سے اوپر تک پہننا۔'' کلیم نے رائے دی۔

''اور اگر بالکل ہی نہ پہنو تو اور بھی اچھا ہے۔'' شمیر نے مصرع جڑا۔ ہر طرف ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

''کل سے ہم سب بغیر پائجامے کے یہاں بیٹھا کریں گے؟'' کلیم نے ہنسی کے درمیان کہا۔ ہنستے ہنستے سب لوگ لوٹ پوٹ ہو گئے۔

''بھئی اب کوئی کچھ نہ کہے پلیز۔'' امین نے پیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔ سب لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

''تم لوگوں کا بھی جواب نہیں۔ بات کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہو۔'' کچھ دیر کے بعد فضل حق نے ڈانٹا۔

''بس یونہی دن رات گزر رہے ہیں۔ بات میں سے بات نکلتی چلی آتی ہے۔'' شمیر نے جواب دیا۔

''لیجئے صاحب چار بج گئے دو گھنٹے بعد سورج نکل آئے گا۔اب چلا جائے۔'' فضل نے گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھنا چاہا۔

''ایسے کیسے چلے جائیں گے۔ابھی وہ شبلی اور جوہر والی بات پوری کہاں ہوئی۔'' اقبال نے یاد دلایا۔

''ابھی تو آپ کو یہ بتانا ہے کہ سرسید نے شبلی کو نوکری اور جوہر کو داخلہ نہ دیا ہوتا تو کیسے ملک کا بٹوارہ نہ ہوتا۔'' کلیم نے بھی یاد دہانی کرائی۔

''لیکن آپ لوگ وعدہ کریں کہ اب شبلی سے اٹنگے پائجامے تک ٹائپ کی کوئی بات نہیں ہوگی۔''

''اقبال نے شروع کی تھی۔خیراب صرف آپ بیان کریں گے۔کوئی کچھ نہ بولے!'' کلیم نے سب کو تنبیہ کی۔

''ہاں صاحب اب کوئی نہیں بولے گا۔'' شمیر نے سب کی طرف سے وعدہ کیا۔

''تو سنئے۔یہ تو سب کو پتہ ہی ہے کہ آخر زمانے میں سرسید نے کانگریسی نیشنل ازم کی زبردست مخالفت کی تھی؟'' فضل صاحب نے بات شروع کی۔

''یعنی یہ کہ سرسید قوم پرست نہیں تھے؟'' امین نے سوال کیا۔

''جی''

''بلکہ ہمیں تو اس کا بالکل الٹا پتہ ہے۔ہمیں تو صرف یہ بتایا گیا ہے کہ جب کانگریس بنی تو سرسید نے مسلمانوں کو سیاست میں جانے سے روکا۔وہ بھی اس لیے کہ پہلے مسلمان پڑھ لیں اور غدر کی طرح دوسری مصیبت ان پر نہ پڑ جائے۔'' امین نے تفصیل بیان کی۔

''اور پڑھنے کے بعد کانگریس میں چلے جائیں۔'' اقبال نے بات بڑھائی۔

''ہمیشہ یہی بتایا گیا کہ پہلا گریجویٹ ہندو تھا۔سر راس مسعود کی فاتحہ راجہ جے کشن کی گود میں ہوئی تھی۔اور ہندو مسلمان خوبصورت دلہن کی دو آنکھیں ہیں وغیرہ وغیرہ۔''

''یہ سب تاثر غلط ہے آپ لوگوں کا۔سرسید کانگریسی نیشنل ازم کے زبردست مخالف تھے اس کے برخلاف وہ مسلم نیشنل ازم کے بانی تھے۔'' فضل حق نے بتایا۔

''لیجئے صاحب ایک نئی تھیوری آ گئی۔آپ تو بس ہم لوگوں کو دیوانہ بنا کر چھوڑیں گے۔''کلیم نے محبت بھری شکایت کی۔

''سنیے!میں ابھی ثابت کیے دیتا ہوں۔''فضل حق نے بات شروع ہی کی تھی کہ مساجد سے فجر کی اذان کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں۔سب لوگ خاموش ہوگئے۔

''اب اٹھا جائے۔''اقبال نے اٹھتے ہوئے کہااور سب لوگ اٹھ گئے۔

''اب کیا پروگرام ہے؟''کلیم نے سوال کیا۔

''ایسا کرتے ہیں کہ آج دوپہر سب لوگ ساتھ کھانا کھائیں گے۔باقی باتیں وہیں ہوں گی۔بیئرر سے گوشت بھنواتے ہیں اور بازار سے نان منگوائیں گے۔تین بجے کے بعد جوآیا وہ اپنی سزا خود بھگتے گا۔''اقبال نے تجویز پیش کی۔

''کیا بات ہے!مزا آجائے گا۔میں تو اب کہیں جاؤں گا ہی نہیں۔اقبال کے کمرے میں صوفے پرسوؤں گا۔''امین نے اپنا فیصلہ سنایا۔

''ایسا ہے فضل صاحب آپ بھی اب کہیں نہ جائیں اور آج اقبال کے کمرے میں ہی رہیں۔''کلیم نے تجویز رکھی۔

''مگر مجھے تو دہلی جانا ہے۔''انھوں نے احتجاج کیا۔

''نہیں!اب آپ دہلی پتہ نہیں کب جائیں گے۔مہمان آتا ہے اپنی مرضی سے لیکن جاتا ہے میزبان کی مرضی سے۔''امین نے ہنس کر کہا۔

''آج سے آپ میرے مہمان ہیں اور میرے ہی ساتھ رہیں گے۔''اقبال نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''اتنی بہت سی باتیں ابھی آپ سے معلوم کرنی ہیں''کلیم نے بھی حق جتایا۔

''تب دوستو!ٹھیک ہے۔امین اور فضل صاحب میرے ساتھ رہیں گے۔باقی سب لوگ تین بجے تک میرے کمرے آجائیں۔خدا حافظ۔''اقبال نے فیصلہ سنا دیا سب لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔اقبال،فضل حق اور امین کے ساتھ جے کشن ہاؤس میں اپنے وارڈن روم آ گیا۔

☆

''ڈاکٹر صاحب تمام رات ڈھابے پر ہی رہے کیا؟'' بابو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں کچھ ہوا کیا؟'' اقبال نے اس سے پوچھا۔ وہ ایک سینئر بیئرر کے ریٹائر ہونے پر اپنے والد کی جگہ کام کر رہا تھا۔

''رات ہم لوگ بھی گیارہ بجے گئے تھے۔ پرووسٹ صاحب نے راؤنڈ لیا تھا سارے وارڈن ساتھ تھے۔ بس آپ ہی نہیں تھے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''تمہارے ڈاکٹر صاحب چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے نہیں پیدا ہوئے ہیں پرووسٹ صاحب سے کہہ دینا تھا۔'' امین نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

''پرووسٹ صاحب کو بھی پتہ ہے کہہ رہے تھے کہ کہیں بیٹھے ہوں گے ڈھابے پر۔''

''مگر یہ راؤنڈ کیوں ہوا اچانک؟'' اقبال نے اس سے پوچھا۔

''صاحب، وہی اڈوانی کی رتھ یاترا کا کوئی چکر ہے۔ سنا ہے کہ ان کا رتھ کل علی گڑھ آ رہا ہے۔ اس لیے لڑکوں کو سمجھانے کے لیے ہر حال میں راؤنڈ لیا گیا ہے۔ وارڈنز کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ چوبیس گھنٹے تمام وارڈن حضرات کو موجود رہنے کا حکم ہے۔''

''تمہارے صاحب کو چھوڑ کر؟'' امین نے ہنس کر پوچھا۔

''ہمارے صاحب تو بڑے بڑے کاموں کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔'' اس نے بھی مزا لیتے ہوئے کہا۔

''ابے کیا مار کھائے گا؟'' اقبال نے مصنوعی غصے سے اسے ڈانٹا۔

سب لوگ ہنسنے لگے۔

''صاحب! چائے لاؤں۔'' بابو نے پوچھا۔

''نہیں۔ ایسا ہے کہ ہم لوگوں کو بارہ بجے اٹھا دینا۔ تبھی ناشتہ کرا دینا۔ ابے بھاگا کہاں جا رہا ہے۔ بات سن۔ یہ پیسے لو نوشے قصائی کی دکان سے چھوٹے کی چاروں بونگ بنوا لانا۔ صرف بونگ ہی لانا اور کچھ نہیں۔ ابھی ایک گھنٹے میں چلے جانا اور انیس خانساماں

سے کہنا کہ صرف اصلی مصالحے پڑیں گے۔ گوشت کو اچھی طرح بھونے۔ پانی بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ پانچ آدمیوں کے لیے نان بھی چاہئیں۔ کچھ سلاد۔ دس بارہ کالے جام بھی موجی کے یہاں سے لے آنا۔ تین بجے یہیں کھانا آجانا چاہیے۔ سمجھ میں آ گیا؟''

''جی سمجھ گیا۔ بونگ کا بھنا ہوا گوشت، پانچ آدمیوں کے لیے گرم نان، سلاد اور کالے جام۔ یہ سب تین بجے اور بارہ بجے ناشتہ۔''

''ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔ ہمیں کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔''

''مگر یاد آیا صاحب، ساڑھے بارہ بجے تو وارڈن صاحبان کی میٹنگ ہے پرووسٹ صاحب کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے۔ ناشتے کے بعد پرووسٹ آفس چلا جاؤں گا۔''

''اچھا صاحب میں جا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر بابو چلا گیا۔

''پورا جسم تھکن سے چور ہو رہا ہے۔'' امین نے صوفے پر تکیہ لگا کر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''فضل صاحب، آپ یہاں بستر پر سو جایئے۔'' اقبال نے اپنے لیے فرش پر دری اور چادر بچھا لی چند ہی منٹوں میں سب کو نیند نے آ لیا۔

○

(۷) نیک معصوم طلباء

7.1 فکرِ بہشت

''کیا لاجواب قورمہ بنا ہے۔''

''بھئی مزہ آ گیا۔'' امین نے مزا لیتے ہوئے کہا۔

دن کے ساڑھے تین بجے تھے۔ یہ لوگ اقبال کے بڑے سے وارڈن روم میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''صاحب، میں نے تو نوشے سے کہہ دیا کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب کے مہمان آ رہے ہیں۔صرف بونگ کا گوشت نکالے۔ وہ صرف دو بونگیں دے رہا تھا میں لڑ گیا اس سے، پھر چاروں نکلوائیں۔ گراہک کئی اور بھی کھڑے تھے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ پھر انیس باورچی کے ساتھ ساتھ میں نے گوشت بھنوایا۔ ہاتھ درد کرنے لگے صاحب بھونتے بھونتے۔'' بابو نے اپنے لچھے دار لہجے میں بیان کیا۔

''ہاں یہ سب تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔ صاحب سے بڑا انعام لینا۔'' کلیم نے اسے چڑھایا۔

''انعام ونعام کیا صاحب۔ آپ نے پسند کر لیا۔ ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے۔''

''بابو، دیکھو فضل صاحب کی پلیٹ خالی ہو گئی۔'' اقبال نے اشارہ کیا۔

''صاحب آپ تکلف نہ کریں۔'' اس نے ان کی پلیٹ بھرتے ہوئے کہا۔

''لگتا ہے کہ اڈوانی کا رتھ بغیر فساد کے علی گڑھ سے گزر گیا۔'' شمیر نے اندازہ لگایا۔

''پرووسٹ صاحب میٹنگ میں بتا رہے تھے کہ شہر میں امن ہے اور رتھ بارہ بجے تک

یہاں سے گزر گیا۔مگر بہت خطرناک تقاریر ہوئیں۔''اقبال نے بتایا۔
''سنا ہے کہ ساڑھے تین سو مساجد پر دعویٰ کر رہی ہے بی جے پی۔بابری مسجد کے علاوہ۔''ضمیر نے کہا۔
''بابر کی اولاد کو ملک سے نکالنے کا بھی نعرہ لگایا جا رہا ہے۔''امین نے بتایا۔
''لگتا ہے کہ ہندو راشٹر بنا کر ہی دم لیں گے یہ لوگ۔''ضمیر نے خدشہ ظاہر کیا۔
''یہ کیا ہندو راشٹر بنائیں گے۔کانگریس پہلے ہی بنا چکی ہے۔یہ تو بس سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگا رہے ہیں اقتدار کے لالچ میں۔''فضل حق نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
''کیا مطلب؟ ہمارا دیش سیکولر ہے۔یہ ہندو راشٹر کیسے ہو گیا؟''ضمیر نے حیرانی سے پوچھا۔
''سیکولرزم تو ہمارے کانسٹی ٹیوشن کا حصہ ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ کانگریس ہندو راشٹر بنا چکی ہے؟''شمیر نے بھی ضمیر کی تائید میں سوال کیا۔
''بی جے پی تو صرف جھنڈا بدلنا چاہتی ہے۔راشٹر پتی بھون پر بھگوا جھنڈا لگ جائے۔ہندو راشٹر بنانے کے لیے اور کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔باقی کام سیکولر لیڈر کر چکے ہیں۔اچھا بتائیے کہ ملک کی فوج میں مسلمان ہیں؟''فضل حق نے ضمیر سے سوال کیا۔
''نہیں ہیں۔''
''نوکریوں میں مسلمان ہیں؟''
''صرف ایک فیصد ہیں۔''
''انڈسٹری اور تعلیم میں مسلمان کتنے ہیں؟''
''ایک فیصد سے بھی کم۔''
''پولیس اور پی اے سی مسلمانوں کو فسادات میں مرواتی ہے۔انہیں کو گرفتار بھی کیا جاتا ہے۔انہیں پر میسا اور ٹاڈا جیسے قوانین لگائے جاتے ہیں؟''
''یہ تو پوری دنیا جانتی ہے۔''
''پولیٹیکل پاور میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔ وہ تو صرف ہندو پارٹیوں کے ایجنٹ ہیں۔''

''کوئی سیکولر پارٹی مسلمانوں کو کچھ بھی دینا چاہتی ہے؟''

''کچھ نہیں۔ ہمیں تو صرف سیکولرزم کے نام پر انہیں ووٹ دینا ہے۔''

''ملک میں کس کی حکومت رہی ہے آج تک؟''

''کانگریس یا دوسری سیکولر جماعتوں کی۔''

''اردو کا جنازہ کس نے نکالا؟ عربی فارسی کا تو ذکر ہی نہیں۔''

''کانگریس نے۔''

''زمینداری کیوں ختم کی گئی؟''

''کہ مسلمانوں کی مالی حیثیت کم ہو جائے۔''

''اچھا پھر ہندو راشٹر اور کسے کہیں گے؟''

''یہ تو بالکل ثابت کر دیا آپ نے کہ یہ ہندو راشٹر ہے۔ بس لیبل بدلنے کی کمی ہے۔'' ضمیر نے آخر اعتراف کیا۔

''مسلمان کو نماز روزے کی اجازت ہے جو کوئی بھی حکومت خواہ آر ایس ایس ہی کیوں نہ ہو ختم ہیں کر سکتی۔ بقول شاعر:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ یہ نہیں ہے ہندو راشٹر

لہٰذا یہ بی جے پی والے صرف مسلمانوں کو جگا رہے ہیں۔ انہیں اپنی حیثیت یاد دلا رہے ہیں۔ انہیں بتا دینا چاہتے ہیں کہ کسی دھوکے میں نہ رہیں۔ یہ ہندو راشٹر ہے۔ پورا اسٹرکچر کانگریس نے کھڑا کر دیا ہے بس اعلان باقی ہے۔ پارلیمنٹ پر پوسٹر لگانا ہے بس۔''

''باتیں کھانے کے بعد بھی ہو سکتی ہیں۔'' اقبال نے سب کو ٹوکا۔

''کھانا تو کھا ہی رہے ہیں۔'' امین نے ہنس کر کہا۔

''اگر انھوں نے بابری مسجد شہید کر دی تو دیکھنا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی نئی زندگی کی شروعات ہوگی۔'' فضل حق نے پیش گوئی کی۔

''اس لیے آپ چاہتے ہیں کہ مسجد شہید ہو جائے۔'' شمیر نے فوراً حملہ کیا۔

''استغفر اللہ! میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں اور میرا اندازہ ہے کہ یہ لوگ مسجد شہید کر کے مندر بنا کر رہیں گے۔ اس دن مسلمان خواب خرگوش سے جاگ جائے گا اور چاروں طرف آنکھیں کھول کر دیکھنا شروع کرے گا۔ کانگریس کے سحر سے مسلمان اسی طرح آزاد ہو سکتا ہے بس۔ یا پھر سرسید جیسا کوئی ہوتا جس نے کانگریس کا جادو چلنے ہی نہ دیا۔ جس دن ۱۸۸۵ء میں کانگریس نے سحر پھونکا کہ ہندوستانی ایک قوم ہیں، ہمارے سید صاحب تلوار لے کر میدان میں آ گئے کہ نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ ہندوستان میں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔''

''یہ نیا ٹاپک شروع ہو گیا۔ ایسا ہے کہ پہلے اٹھ کر ہاتھ دھو لیے جائیں۔ صوفے پر بیٹھ کر کالے جام کھائیں گے اور پھر چائے پر تنبیہ الغافلین سے سوالات کیے جائیں گے۔'' اقبال نے ٹیبل سے اٹھتے ہوئے کہا۔ سب لوگ باری باری اٹھ کر اٹیچڈ باتھ روم میں ہاتھ دھو کر صوفے پر بیٹھ گئے۔

''یہ تنبیہ الغافلین نام اچھا دیا ہے فضل صاحب کو آپ نے۔'' امین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور نہیں تو کیا۔ ہم غافلوں کو تنبیہ کرنے ہی تو دہلی سے وارد ہوئے ہیں۔''

''دل و دماغ اور آنکھوں پر اتنی سیاہ پٹی باندھ دی ہے ان نیشنلسٹ مسلمانوں نے کہ پوری زندگی یوم سیاہ ہو کر رہ گی۔ نوکریاں نہیں غم نہیں، غربت ہے جہالت ہے کوئی بات نہیں۔ فسادات میں مارا جاتا ہے، ایک دن مرنا ہی ہے۔ نسلیں کی نسلیں تباہ ہو گئیں مگر قومیت کا سحر نہ ٹوٹا۔ پتہ نہیں کہ کون سا دن ہوگا کہ نئی شروعات ہوگی اسلامیان ہند کی۔'' کلیم پر مایوسی اور غصہ ایک ساتھ طاری ہو گئے۔

''بابو! کیا کر رہے ہو؟ پلیٹیں بعد کو اٹھانا پہلے سب کو کالے جام دو۔'' اقبال نے زور سے کہا۔

''یہ لیجئے صاحب موجی کے جام حاضر ہیں۔''

''یہ موجی اچھی مٹھائی بناتا ہے۔'' کلیم نے مزا لیتے ہوئے اعتراف کیا۔

''پہلے سال جب میں علی گڑھ آیا تھا تو روز کھنڈیل والے کے یہاں گرم گرم کالے جام ضرور کھاتا تھا۔'' امین نے پرانا زمانہ یاد کیا۔

''والد صاحب کا مال اس بے دردی سے اڑایا گیا؟'' کلیم نے ہنس کر کہا۔

''اس زمانے میں کوئی احساس ہی نہیں تھا۔'' امین نے اعتراف کیا۔

''احساس تو خیر آپ کو آج بھی نہیں ہے؟'' کلیم نے فوراً وار کیا۔

''یہاں تو بس کوئی لوز بال پھینکی اور یاروں نے باؤنڈری دکھائی۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہے۔ یہاں تو پیڈ باندھے ہر وقت تیار رہنا ہے؟'' اقبال نے تائید کی۔

''کوئی لوز ڈلیوری آئی اور ہوئی اسٹیڈیم کے باہر۔'' شمیر نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''باقی لوگ تالیاں بجانے کے لیے تیار ہیں ہی۔'' ضمیر بولا۔

''کئی تیز بالرز کو ڈک کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ پتہ چلا کہ سیدھی منہ پر لگی۔'' کلیم نے یاد دلایا۔

''اور بھائی کافی دیر تک ریٹائرڈ ہرٹ، آؤٹ آف گیم۔''

'ٹیڑھے زیدی کو تو فٹ بال ٹیکنک سے ہی پھنسایا جا سکتا ہے۔ ہلکا سا پاس ملا۔ پھر ایک اور پاس ڈی کے قریب کسی کو دیا گیا، اور تیسرے نے زائیں سے گول داغا۔'' اقبال بیان کر ہی رہا تھا کہ زیدی دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہوا۔

''لیجئے صاحب شیطان حاضر۔ تھنک آف دی ڈیول۔'' امین نے ہنستے ہوئے کمنٹ کیا۔

''اپنی ہی محفل میں آیا ہوں! یا کوئی فرشتہ بھی ہے یہاں؟'' اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے فلمی انداز میں سوال کیا۔ ''مگر یہ کیا! جیل میں سرنگ! ہاتھوں میں کالے جام، ٹیبل پر پلیٹس، مابدولت کو نظر انداز کیا گیا؟''

''آؤ بیٹھو بیٹھو۔'' اقبال نے فورا! اٹھ کر اس کے کندے پر ہاتھ رکھا۔

''نہیں۔ پہلے مابدولت کے ہاتھ دھلوانے کا انتظام کیا جائے۔'' اس نے مغلیہ انداز جاری رکھا۔

''کیا کمرے سے بھوکا چلا ہے۔'' امین نے پھر حملہ کیا۔

''یہ کون بدتمیز ہے ہماری محفل میں؟'' اس نے پھر ڈائیلاگ میں اقبال سے پوچھا۔

''بابو! فوراً صاحب کے لیے کھانا لگاؤ، اگر بچا ہو۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے آواز دی۔

''ایں ہماری یہ انسلٹ! مابدولت بچا ہوا کھانا کھائیں گے؟'' اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پھر فلمی انداز میں کہا۔ اتنے میں بابو نے پیالی میں کالے جام پیش کرتے ہوئے بتایا۔

''صرف یہ بچا ہے۔''

''چلو کچھ تو ہاتھ آیا۔'' زیدی نے نارمل لہجے میں پیالی پکڑتے ہوئے شکایت کی۔ ''بلوا نہیں سکتے تھے؟''

''پوری رات ڈھابے پر کٹ گئی۔ بارہ بجے تو سو کر اٹھے ہیں۔''

''پوری رات۔''

''جی فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب ہم لوگ اٹھے۔''

''تب تو خلافت کا فیصلہ ہو ہی گیا ہوگا؟'' اس نے رات کی بات یاد کرتے ہوئے ہنس کر سوال کیا۔

''ایک خلافت ہی کیا اور جانے کتنے مسائل چھڑ گئے۔ پتہ ہی نہیں چلا کہ کب صبح ہو گئی؟''

''جب سے یہ تنبیہ الغافلین آئے ہیں۔ پوری شخصیت تہہ و بالا ہو کر رہ گئی ہے۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے شکایت کی۔

''تنبیہ الغافلین؟'' زیدی نے پوچھا۔

''فضل حق صاحب کا نام رکھا ہے اقبال نے۔'' ضمیر نے بتایا۔

''نام تو بالکل ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کو ایسا ہی آدمی چاہیے تھا۔ ہر وقت سیاست اور مذہب پر فلسفیانہ بحثیں کرتے رہتے تھے بغیر پڑھے ہوئے۔ اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے تو

بلبلا رہے ہیں۔''

''بلبلانے کی تو پوری بات ہے۔رات کیا فرما رہے تھے پتہ ہے۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہ سرسید نے شبلی کو نوکری اور محمد علی کو داخلہ نہ دیا ہوتا تو علی گڑھ تحریک اتنی طاقتور تھی کہ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو برابر کا حصہ ملتا۔ریاستیں جو باقی رہتیں وہ الگ۔''

''ایسا ہے کہ میں چل رہا ہوں خدا حافظ۔'' زیدی نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے کہا۔

''آج نہیں بھاگ سکتے۔پوری بات سننی پڑے گی۔''ضمیر نے اس کو زبردست بٹھا دیا اور اس کے پاس ہی ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''آج اس کو جانے نہیں دینا۔''امین نے ضمیر کو شاباشی دی۔

''مجھے اپنا دماغ خراب نہیں کرنا۔جو اساتذہ نے بتا دیا ہم نے مان لیا نیک پروین ٹائپ کے طلباء رہے ہیں ہم لوگ۔جانے دو مجھے یار'' زیدی نے ضمیر کی خوشامد کرتے ہوئے کہا۔'' اور دوسری بات یہ کہ میرے مسائل ذرا الگ ہیں۔یہ فلسفہ بازی تم ہی کو مبارک ہو۔''

''ہم لوگوں کا قیمہ بنتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے؟''ضمیر نے سوال کیا۔

''بننے کی کیا ہے میں تو کھا بھی جاؤں۔مگر مشکل یہ ہے کہ اس میں میری بھی بوٹیاں شامل ہوں گی۔''

''پھر تو اور مزا آئے گا۔غم بانٹنے سے کم ہوتا ہے۔''

''نہیں مجھے جانے دو۔شام پانچ بجے ملاقات طے ہے کوالٹی میں۔آج سنڈے ہے نا۔تم لوگ غم کھاؤ میں پیسٹری کھاؤں گا۔''

''یہ بنائی ہے اس نے ابھی ابھی۔''امین فوراً ہی زور سے بولا۔

''نہیں یہ دیکھو سو روپیے ایک دوست سے ادھار مانگے ہیں کافی اور پیسٹری کے لیے۔''اس نے نوٹ نکال کر دکھایا۔

''یہ ادھار کا عشق بہت خطرناک ہوتا ہے اسے جانے دو۔''کلیم نے زیدی کی سفارش کی۔

''اچھااس کی قسم کھاؤ کہ سچ کہہ رہے ہو۔''

''کس کی قسم۔''

''جس سے ملنے جارہے ہو۔''

''ہاں ہاں اس کی قسم۔ سچ کہہ رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔مگر کب تک بچو گے۔''ضمیر نے اس کو چھوڑ دیا۔

'جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے۔ ہے نا؟'' زیدی نے کمرے کے باہر سے چق اٹھا کر کہا۔

''میں کہہ رہا تھا نا کہ اس نے ابھی ابھی بنائی ہے۔''امین نے یاددلایا۔

''اس کے مسائل واقعی دوسرے ہیں۔فلسفہ بازی میں ہر ایک کومزانہیں آتا۔''

''فلسفہ بازی کی ترکیب بھی اسی نے نکالی ہے۔''شمیر نے پرخیال انداز میں کہا۔

''اور نیک پروین طلباء والی بات بھی خوب کہی اس نے۔''

''مجھے یاد ہے کہ ہمارے پرووسٹ پروفیسر خلیق احمد نظامی اپنے سرخ سفید خوبصورت چہرے، اس پر برف جیسے لمبے گھنگھرالے بال، عمدہ شیروانی اور ہاتھ میں چھڑی لیے، جب ایس ایس ہال میں آتے تھے تو ہم سب لوگ مارے رعب کے ان کو بس دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔اور جب تقریر کرنے کھڑے ہوتے تھے تو ہر ہر لفظ پر بس آمنا وصدقنا ہی نکلتا تھا منھ سے۔لیکن تھے بڑے پکے نیشنلسٹ۔ ہر تقریر میں سرسید کو قوم پرست ثابت کرتے تھے اور ہم لوگ یقین۔ایسے طلباء کو آپ نیک معصوم ہی تو کہیں گے۔اب اتنے دنوں کے بعد احساس ہوتا ہے کہ تھیوریز اور نظریات بھی کیا گل کھلاتے ہیں۔آدمی کو تمام زندگی پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس بزرگ یا استاد نے کب کیا نظریہ اس کے دل میں ڈال دیا اور پھر وہ تمام عمر اسی راہ پر چلتا رہتا ہے۔''فضل حق نے ٹھنڈی آہ بھری۔ چند منٹ خاموش رہ کر وہ پھر شروع ہو گئے۔

''ان چالیس سالوں میں اگر تین ہزار طلباء ہر سال نکلے ہوں تو ڈیڑھ لاکھ اولڈ بوائز سماج میں مسلمانوں کا مڈل کلاس بنے۔مگر مشکل یہ کہ تمام لڑکے یہ تاثر لے کر گئے کہ سرسید

نیشنلسٹ تھے اور مسلم سیاست فرقہ پرستانہ عمل ہے کہ اساتذہ نے یہی سمجھایا ہر مقرر نے یہی کہا اور رائٹر نے یہی لکھا۔ لیاقت علی خاں کی جگہ ذاکر حسین ہیرو بنائے گئے۔ سرضیاء الدین کی جگہ علی برادران ہیرو بنا دیے گئے۔ جو ہونا تھا وہ ظاہر ہے۔ سب کے ہاتھوں میں تلوار کی جگہ رحم کی درخواست تھی۔ اپنے پرچم کے علاوہ ہر جھنڈا تھا زبان اپنے حقوق مانگنے کے بجائے قصیدہ گو تھی کہ کیا نہرو جی، کیا چرن سنگھ، کیا بہوگنا جی اور کیا ملائم سنگھ ہیں۔ لہٰذا اپنے قانونی حقوق تو منوانا دور کی بات ہے مسلمان اپنی عزت آبرو تک نہ بچا سکا۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

سب لوگ خاموشی سے فضل حق کو سنتے رہے۔

''اب تبلیغی جماعت کو ہی دیکھ لیجئے کہ کتنے استاد ہوسٹلوں میں طلباء کے کمرے کمرے جا کر اللہ رسول کا نام لے کر ان کو ایک نظریے کا پابند بنا رہے ہیں۔ جو طلباء کم عمری میں ان کے ساتھ نکل لیے وہ کبھی پلٹ کر نہیں آئے۔ لمبی شیروانی اور اٹنگا پائجامہ اور دن رات جماعت کا نصاب پورا کرنے میں ہی ان کی زندگی کٹ رہی ہے۔ صرف نماز روزے سے ہی مطلب نہیں، ان کی معیشت، معاشرت اور سیاست سب ہی اس کی نذر ہو گئیں۔ فرسودہ نظریات ان کی رگ رگ میں اتر گے۔'' لمبی سانس کھینچ کر فضل حق خاموش ہو گئے۔ اتنے میں اقبال کو ایک واقعہ یاد آ گیا۔

''میں ایک دلچسپ قصہ آپ کو سناؤں۔ میرا ایک بھتیجہ ہے منٹو سرکل میں۔ آٹھویں کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے اور ہوسٹل میں ہی رہتا ہے۔ ایک دن میں اس سے ملنے گیا تو کیا دیکھا کہ پانچ چھ چھوٹے چھوٹے ساتویں آٹھویں کلاس کے بچے کرتے پائجامے اور سفید ٹوپیاں پہنے، اس کو گھیرے کھڑے ہیں۔ بچوں کی تبلیغی جماعت کا گشت ہو رہا تھا اور ایک بچہ میرے بھتیجے کو لکچر دے رہا تھا کہ بھائی یہ زندگی چند روزہ ہے جلد ہی ختم ہو جائے گی اصلی زندگی تو وہاں کی ہے اس کی تیاری کرنی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ہے وہ۔ جس کو جنت مل گئی بس وہی کامیاب ہوا۔ دنیا تو فریب ہے اصل کامیابی تو بس وہاں کی ہے۔ جس نے

رسول اللہ کی اتباع کر لی بس وہی کامیاب ہوگیا۔ دنیا کی کامیابی کے کوئی معنہ نہیں اور نہ جانے کیا کیا۔ کئی احادیث بھی اس نے سنائیں اور بعد مغرب ''دین کی بات'' میں شریک ہونے کا وعدہ لے کر جماعت دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بس میں کیا بتاؤں کہ مجھے کتنا غصہ آیا۔ یہ بچے جن کی زندگی کی ابھی شروعات بھی نہیں ہوئی ان کو یہ بتایا جارہا ہے کہ زندگی کچھ نہیں ہے۔ میں نے بھتیجے کو ڈانٹا کہ ہرگز وہاں نہ جانا۔ اس نے پوچھا کہ کیوں نہ جائیں نماز روزے کی ہی تو بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ اللہ اور رسول کے راستے پر ہی تو بلا رہے ہیں۔ اب بتایئے کیا جواب ہوگا اس کی بات کا؟''

''کہنا تھا کہ اگر دنیا کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو رسول اللہ نے اتنی بہت سی جنگیں کیوں لڑیں۔ صرف تئیس سالہ رسالت کی زندگی میں تیس جنگیں لڑیں۔ بغیر سامان کے لڑیں؟ بغیر ٹریننگ کے لڑلیں؟'' کلیم نے جواب دیا۔

''اور رسول اللہ کی نقل کرنا، چال ڈھال پہناوے اور اٹھنے بیٹھنے میں خود علماء اس کو سنت کے درجے میں رکھتے ہیں۔ یعنی نہ فرض نہ واجب۔ سنت ہونے میں بھی علماء میں اختلاف ہے کہ صرف مذہبی سنتیں جیسے فرض نماز فجر سے پہلے دو رکعت سنت نماز۔ رمضان کے بعد کے روزے۔ یہ سنتیں ہیں۔ بندروں کی سی نقل کرنا کوئی سنت نہیں ہے۔'' امین نے مذہبی دلیل دی۔

''میں نے ایک ٹیچر دوست سے کہا کہ یار ہم لوگ پڑھاتے ہیں اگر طلباء ہماری بات سمجھنے کی بجائے ہماری نقل کرنے لگیں۔ ہمارے جیسے کپڑے پہنیں۔ ہماری ہی طرح اٹھیں بیٹھیں چلیں پھریں، تو غصہ نہ آئے گا۔ میں تو ایسے طلباء کو کلاس سے نکال دوں گا کہ میری بات تو سمجھ نہیں رہا اور بندروں سی نقل کیے جارہا ہے۔ رسول اللہ تو تا قیامت تمام انسانیت کے لیے ٹیچر بنا کر بھیجے گئے۔ اگر ان کا پیغام سمجھنے کی بجائے ہم بس ان کی ظاہری نقل کرنے لگیں تو کیا ان کو غصہ نہ آئے گا۔'' اقبال نے بھی دلیل پیش کی۔

''مگر یہ تو دنیا کی کامیابی کا طریقہ بھی یہی بتاتے ہیں کہ اگر مسلمان سنتوں پر عمل کرنے لگے تو پھر سے دنیا کی قیادت اللہ ان کے ہاتھ میں دے دے گا؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''رسول اللہ نے پھر جنگیں کیوں لڑیں؟'' زخم بھی کھائے اور شکست بھی۔ اگر سنتوں پر عمل کرنے سے ہی قیادت مل جاتی تو رسول اللہ تو خود مجسم سنت تھے ان کا وجود مبارک ہی قیادت کی مکمل دلیل تھا۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''ان کا کوئی الگ قرآن ہے کیا؟'' کلیم نے خود کلامی کی۔

''دنیا کی قیادت آج امریکہ کر رہا ہے۔ کیا وہ بھی سنتوں پر عمل کر رہے ہیں؟ وہ تو رسول اللہ اور مسلمان کے کھلے دشمن ہیں پھر اللہ نے ان کو قیادت کیوں دے دی۔'' امین نے دوسرے پہلو سے بات کی۔

''کہتے ہیں کہ وہ تمہارا امتحان ہے؟'' کلیم مسکرایا۔ ''اور یہ بھی کہ حق آئے گا تو باطل چلا جائے گا؟''

''مگر آج باطل تو خوب پٹائی کر رہا ہے۔ نمازی پرہیزگاروں کو بموں سے اڑا رہا ہے۔'' شمیر بولا۔

''بہانے ہیں۔ بس یہ ثابت کرنا ہے کہ ہم صحیح ہیں اور ہمارا راستہ عین اسلام ہے اور قرآن وحدیث کے مطابق۔ لہٰذا آنکھیں بند کر کے ہماری پیروی کرو۔'' فضل حق نے اقبال سے پوچھا۔ ''خیر آپ نے بھتیجے بادشاہ سے کیا کہا۔''

''میں نے سختی سے کہا کہ توحید، زکوٰۃ، نماز اور روزے کے علاوہ جتنی باتیں کرتے ہیں سب غلط ہیں۔ باقی اسلام کیا ہے؟ معیشت کیا ہے؟ سائنس کیا ہے؟ علم کیا ہے؟ معاشرت کیا ہے؟ عقل اور فلسفہ کیا ہے؟ ٹیلیویژن اور ریڈیو کیا ہے؟ یہ سب تم بڑے ہو کر خود سمجھنا۔ ہماری بدنصیبی سے کوئی عالم فاضل آج تک ایسا پیدا نہیں ہوا، جس نے ان مسائل پر اللہ کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت، عقل کی پیروی کی ہو۔ اور جنھوں نے کی، ان کو فضلاء نے اسلام سے نکال دیا۔''

''مان گیا وہ؟'' شمیر نے پوچھا۔

''نہ مانتا آخر بھتیجا کس کا ہے۔ خود مترجم قرآن خرید کر لایا ہے۔ نہیں مانتا تو سختی کی جاتی۔ اب ماشاء اللہ سمجھدار ہوتا جا رہا ہے ایک نارمل لڑکے کی طرح اور بڑے ہو کر انشاء

اللہ وہ بھی فلسفہ بازی کیا کرے گا۔''اقبال نے ہنس کر بتایا۔
''لگا دیا اس بیچارے کو بھی اپنے راستے پر۔'' کلیم نے ہنس کر کہا۔
''نہیں یار۔ یہ بھی بتایا کہ میری بھی مت مان اور دوسروں کی بھی۔ عقل استعمال کر عقل۔''اقبال نے صفائی دی۔
''یہ دوسرا طریقہ ہے اپنی پیروی کرانے کا۔'' شمیر نے دوسرا پہلو نکالا۔
''تو کیا آزاد چھوڑ دیں کہ کوئی بھی شکار کر کے لے جائے؟''
''نہیں باندھ کر رکھو۔'' امین نے طنز کیا۔
''نیک پروین بننے سے بہتر ہے کہ فلسفہ باز بن جائے۔'' فضل حق نے اقبال کی حمایت کی۔

7.2 سلسلۂ ملامتیہ

''ٹھیک ہے مگر اب چائے تو پلواؤ۔''
''ہاں باتوں میں یاد ہی نہیں رہا یہ بابو کہاں چلا گیا۔ میں ذرا باہر دیکھتا ہوں۔'' اقبال نے باہر آ کر دیکھا تو وہ سامنے لان میں پیڑ کے نیچے بیٹھا تھا۔ اشارے سے بلایا اور چائے بنانے کو کہا۔
''لیجئے صاحب گرما گرم چائے۔' بابو نے تھوڑی ہی دیر میں سب کو چائے دے دی۔
''تم باہر کیوں چلے گئے تھے؟'' اقبال نے اس سے پوچھا۔
''سچ بتاؤں صاحب۔'' اس نے جھجھکتے ہوئے پوچھا۔
''ابے کیا جھوٹ بولے گا؟'' اقبال نے اسے ڈانٹا۔
''نہیں صاحب! ہمیں بس یہ علماء کے خلاف باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ سننے سے بھی کافر ہو جاتا ہے آدمی۔ اسی لیے ہم باہر چلے گئے۔'' جواب سن کر اقبال سناٹے میں آ گیا۔
''اب بولو بیٹا، یہ ہے قوم کا فیصلہ۔ ایک بیئرر تک تمہیں مسلمان نہیں مانتا۔' امین نے شرارتی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

''سنے والا تک کافر،تو کہنے والا کیا ہوا؟''شمیر فوراً بولا۔سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

''تو کیا میں کافر ہوں تیری نظر میں؟''اقبال نے مصنوعی غصہ سے پوچھا۔بابو سنی ان سنی کر کے خالی کپ اٹھانے لگا۔

''اس کی خاموشی ہی جواب ہے۔''امین نے پھر اقبال کو چھیڑا۔

''بابو! جواب دو کھل کر بولو۔کیا میں کافر ہوں تمہاری نظر میں؟''اقبال نے دوبارہ سختی سے پوچھا۔

''اس دن مسجد میں امام صاحب تقریر کر رہے تھے کہ جہاں کفرانہ بات ہو رہی ہو وہاں سے ہٹ جانا چاہیے ورنہ ایمان خطرے میں آ جاتا ہے۔''بابو کپ لے جاتے ہوئے بولا۔

''یہاں کونسی کفرانہ باتیں ہو رہی تھیں؟''

''علماء نائب رسول ہیں صاحب''اس نے رک کر جواب دیا۔

''ابے نائب رسول کوئی نہیں ہوسکتا۔یہ سب ڈھونگ ہے۔قرآن میں کہیں نہیں ہے کہ رسول کا کوئی نائب بھی ہوگا۔''اقبال کو سچ مچ غصہ آ گیا۔

''قرآن آپ کی سمجھ میں آ گیا صاحب؟''اس نے الٹا سوال کیا۔اقبال نے اس کے جواب پر سر پیٹ لیا۔

''یہ یزیدان وقت کا چھوڑا ہوا تیر ہے جو مولانا کے سینے پر بے خطا نشانہ لگاتا ہے۔ہے کوئی جواب؟''فضل حق نے اقبال سے پوچھا۔

''جاؤ تم باہر جا کر بیٹھو۔''اقبال نے اسے ڈانٹا۔

''اس بیچارے پر کیوں غصہ اتار رہے ہو۔ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام امت کیا ہوگا۔''امین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''دنیا کی ہر مسجد میں ملا یہی تقریر کر رہا ہے۔ہزار باتیں گنا دیتا ہے جس سے ایمان چلا جاتا ہے۔حالانکہ توحید، قیامت، رسالت اور کتاب کے انکار سے ہی بس ایمان جاتا ہے۔سر سید کے زمانے میں تو انگریز سے ہاتھ ملانے والا ان کے ساتھ میز کرسی پر کھانے والا بھی کافر تھا۔ہمارے بچپن میں ٹائی لگانے والا، انگریزی بال کٹوانے والا، پینٹ پہننے

والا ریڈیو پر گانے سننے والا اب ٹیلی ویژن دیکھنے والا اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔اتنی لمبی فہرست بنا رکھی ہے احمقوں نے کہ بس اللہ ہی ان سے سمجھے گا۔فارغین مدرسہ کو نائب رسول کا لقب دے رکھا ہے۔بابو جیسے کروڑوں مسلمان ان نائبین رسول کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔''کلیم کو سخت غصہ آ گیا۔

''اس دن یونیورسٹی جامع مسجد کا امام بھی ایسی ہی تقریر کر رہا تھا۔میری موجودگی میں اس نے کہا کہ یہ سائنس ٹکنالوجی کیا ہوتی ہے۔روحانی طاقت پیدا کرو۔پھر ایک واقعہ سنایا کہ حضرت عمر نماز جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے۔اچانک پیچھے مڑ کر انھوں نے کہا کہ اپنے پیچھے دیکھو، پہاڑوں کے پیچھے دشمن کی فوج ہے۔سیکڑوں میل دور، نہ موبائل تھا، نہ وائرلیس، مسلم سپہ سالار نے ان کی آواز سنی پلٹ کر حملہ کیا اور فتح ہوئی۔ایسی روحانی طاقت پیدا کرو۔کتنے طلباء نے یقین نہ کیا ہوگا اسکی بات پر؟ نیک بچے تو مولوی پر ایمان رکھتے ہیں۔''اقبال نے قصہ سنایا۔

''اس دن کی نماز تو ضرور قبول ہوگئی ہوگی تمہاری؟''شمیر نے طنزاً پوچھا۔

''نماز کیا ہوتی، تمام وقت امام پر غصہ آتا رہا۔ہر بار دھیان ہٹاتا تھا مگر پھر وہی ملا کا چہرہ سامنے آ جاتا تھا اس دن بہت مشکل ہوئی۔بڑی معافی تلافی کی اللہ میاں سے۔''

''بیٹا ایسے معافی نہیں ملتی کسی نائب رسول کے وسیلے سے مانگنی پڑے گی۔''امین نے ہنستے ہوئے چھیڑا۔

''خیر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دوسرے دن بینک میں مل گئے۔فارم بھرنا آتا نہیں تھا۔قسمت کے مارے میرے پاس آ گئے فارم بھروانے کے لیے۔''

''پھر تو ان کا پورا کام ہو گیا ہوگا؟''ضمیر کی خوشی قابل دید تھی۔

''بدنصیب کو کوئی اور نہیں ملا تھا۔''کلیم نے اس پر افسوس کیا۔

''کہا حضرت میں تو آپ کی تلاش میں ہی تھا۔فرمایا کہئے۔میں نے کہا کہ کل آپ کیا تقریر کر رہے تھے۔اتنے بہت سے استاد اور طلباء وہاں ہوتے ہیں۔آپ سائنس ٹکنالوجی اور سرسید کے مشن کے خلاف تقاریر کرتے ہیں۔یہ بہت غلط بات ہے اور وہ حضرت عمر کی

مثال ہمیں کیوں سنا رہے تھے؟ مقام عمر پر تو آپ کھڑے تھے۔ خطبہ ان کی طرح آپ دے رہے تھے۔ صدام حسین کو ذرا امریکن فوج کے ٹھکانے بتا دیتے اپنی روحانی طاقت سے۔''

''پورا قتل عام کر دیا آپ نے تو۔''

''اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کاٹو تو خون نہیں۔''

''الٹی چھری سے گلا کاٹا آپ نے اس کا۔ پھر کیا ہوا؟''

''فارم بھرنے تک کسی طرح وہاں کھڑے رہے پھر آئندہ بات کرنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔''

''اگلے جمعہ کو مناسب تقریر کی ہو گی؟''

''مناسب! اور زیادہ سخت تقریر کی سائنس کے خلاف۔ مسلکی اختلافات کو بھی ہوا دی میں نے کان پکڑ لیے۔''

''الٹا اثر ہوا آپ کی بات کا۔''

''اس دن میں نے عہد کر لیا کہ کسی ملا سے ڈائرکٹ نہیں بھڑوں گا۔ وہاں نماز تک پڑھنی چھوڑ دی۔''

''لیجئے صاحب ہفتہ کی ایک نماز بھی گئی۔'' امین نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''میرا مطلب ہے کہ وہاں نہیں پڑھتا۔ سامنے صاحب باغ کی مسجد میں پڑھتا ہوں۔'' اقبال نے جلدی سے صفائی دی۔

''اصل مقصد تو حضوری ہے۔ جگہ سے کیا ہوتا ہے۔'' فضل حق نے مقصد نماز بیان کیا۔

''دل اگر صنم آشنا ہو تو سجدہ بے معنی ہے۔'' اقبال بولا۔

''یعنی سجدے چھوڑ کر آشنائی میں اور سر گرم ہو جاؤ۔'' امین نے سوال کیا۔

''نہیں، یہ مطلب نہیں ہے۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''پھر کیا مطلب ہے؟'' کلیم نے پوچھا۔

''چاہے صرف ایک لمحے کے لیے ہی سہی، دوران سجدہ، اصنام سے جدائی تو حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ وصال کی لحاتی کیفیت بھی غنیمت ہے عشاق کے لیے۔''

''مکمل وصال تو صرف منصور کو حاصل ہوا تھا کہ ان الحق کا نعرہ لگا بیٹھے۔'' فضل حق نے یاددلایا۔

''حسن کے شوق خودنمائی نے یہ منزل دکھائی کہ کبھی اس در پر پڑے ہیں کبھی اس در پر۔'' اقبال نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''جب سارے در چھوڑ کر ایک ہی کا ہو جائے انسان تو شعلۂ طور میں جل جانا ہی اس کا مقصد حیات ہو جاتا ہے۔'' فضل حق کو کوہِ طور یاد آیا۔

''ثابت ہوا کہ منصور کو پھانسی پر چڑھنا ہی تھا۔شارعین شرع کی کوئی غلطی نہ تھی۔'' امین نے مفتیان شرع کی حمایت کی۔

''مفتیان کرام بھی صحیح تھے کہ ان کو کسی کی حالت قلب سے کیا مطلب۔بے رحم قوانین پرعمل کرنے والے کسی کے قلب سے اٹھنے والی اللہ اللہ کی صدائیں کب سن سکتے ہیں۔ صرف دل ہی نہیں جب جسم کا رواں رواں تک ہر دم ذکرالٰہی میں مشغول رہے اور ذاکر فنا فی اللہ ہو جائے تو پھر بندے اور اللہ میں کیا فرق رہا؟ اس لیے منصور کا انا الحق کہنا بھی درست تھا۔'' اقبال کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

''حضرت آج سے میں آپ کا مرید ہوا چاہتا ہوں۔سفر ہجر تا وصال کے لیے زادراہ عنایت ہو۔بڑی مہربانی ہوگی۔'' امین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر درخواست گزاری۔

''کیفیت قلب بیان کر۔'' حکم ہوا۔

''واردات قلبی یہ کہ کوشش ہزار کے باوجود دل مائل معاصی رہتا ہے۔رونق دنیا سے قلب سیاہ ہو چکا ہے۔نفس ہے کہ موٹا ہوتا جاتا ہے۔جہان فانی میں سامان ثبات تلاش کرتا رہتا ہوں۔انکارحق اور اقرار شیطانی کا مجروم ہوں۔اصنام دنیا کے آگے سجدہ ریز رہتا ہوں اور اقرار حق کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔شب سیاہ میں گاہ یہ لحاتی صورت اقرار ہوتی ہے۔ہلکی سے روشنی میں غائب ہو جاتی ہے۔'' اعتراف کافی طویل تھا۔

''قرآن میں آتا ہے کہ مصیبت کے وقت انسان ہمیں یاد کرتا ہے اور جیسے ہی ہم مصیبت ہٹاتے ہیں سب کچھ بھول جاتا ہے۔'' اقبال کو آیت قرآنی یاد آئی۔

''آپ پر تمام احوال دل دیاں ہے حضرت۔ بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔''امین نے اعتراف کیا۔

''پھر تو تیرا ادھار در لبھ ہے بچا۔''فوراً ہی جواب دیا۔

''حضور! یہ سنسکرت آپ نے کیوں شروع کر دی؟''امین نے شکایت رکھی۔

''ہمیں حضرت امیر خسرو کی یاد آ گئی۔''

''حضرت امیر کا کوئی دوہا تبرک ہو مہربانی ہوگی۔''امین نے عرض گزاری۔

''کیا فرمائش کی ہے؟ وہ تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے۔سن دنیائے تصوف کی سب سے اہم واردات قلبی۔حضرت خسرو نے اپنے پیر کے وصال کی خبر سن کر یہ دوہا پڑھا اور دار فانی سے کوچ کر گئے۔

گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو دیس آپنے سانجھ بھئی چھو دیس

حضرت نظام الدین اولیاء دعا کرتے تھے کہ بار الہ اس ترک بچے کے سوز جگر کی بدولت مجھے بخش دے۔''

''سبحان اللہ۔''فضل حق کا نعرۂ حق ہر طرف گونج گیا۔

''اور کچھ عنایت ہو۔''امین نے درخواست کی۔

''دل حزیں کے لیے اتنا ہی کافی ہونا چاہیے۔مسلسل روزوں سے نفس کو لاغر کر دے۔ شب تنہائی میں اٹھ کر ذکر الٰہی میں مشغول رہ۔قلب سیاہ پر لا الہ کی ضروب لگایا کر۔راہِ وصال روشن ہو جائے گی۔آج کے لیے اتنا ہی بس۔''

''حضور بس آخری سوال اور۔اجازت عنایت ہو۔''

''بیان کر۔''

''آپ کس سلسلے میں بیعت ہیں، چشتیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ، قادریہ یا کوئی اور۔''

''بے ادب! جب تجھے یہ معلوم نہ تھا تو اس محفل میں کیوں آیا، یہاں آنے کی جسارت کیوں کی؟''

''حضور معافی۔معترف بے خبری ہوں۔مگر معلوم ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''سن اور یاد رکھ! یہ وہ سلسلہ ہے جو ازل سے قائم ہے اور ابد تک رہے گا۔ یہ ملامت کرنے والوں کی ملامت پر خوش ہونے والوں کا سلسلہ ہے اور ملامتیہ کہلاتا ہے۔'' اقبال نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔''اس راہ کا ہر سالک خود اپنا پیر ہے۔''

''سلسلۂ ملامتیہ؟'' امین نے حیرت سے کہا۔

''ابے یہ کون سا نیا سلسلہ نکالا تو نے؟'' کلیم نے غصہ سے اقبال کا کندھا ہلا کر پوچھا۔

''ہم سب لوگ اسی سلسلے کے ہیں۔'' جواب آیا۔

''مگر یہ ہے کیا؟'' کلیم نے پھر زور دے کر پوچھا۔

''بنیادی اصول اس کا یہ ہے کہ بظاہر ایسے کام کرو کہ لوگ ملامت کریں حتیٰ کہ لعنت بھی کریں۔اور خود کو عاصی سمجھو۔داہنے ہاتھ سے دو کہ بائیں کو پتہ بھی نہ چلے۔دنیا گنہ گار سمجھے۔اس کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو۔دنیا کا سب سے بڑا سلسلہ یہی ہے۔کروڑوں بے شروع لوگ اسی راہ پر گامزن ہیں۔''

'پوری رات ڈھابے پر بیٹھو۔دنیا جہان کو دشمن بنالو۔کسی طاقت ور کی عزت نہ کرو اور خواروں میں شامل رہو۔یہی نا؟'' شمیر نے پوچھا۔

''یہ بچہ بہت سمجھدر ہے۔'' اقبال نے مربیانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔'سلامت رہو۔''

''سلامت رہو کے بچے! مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔اپنے علامہ اقبال بھی تم جیسے پاپی لوگوں کے لیے کچھ کہہ گئے ہیں۔'' ضمیر نے اس گفتگو سے تنگ آ کر غصہ سے کہا۔

''سالے باتیں اتنی لمبی لمبی کریں گے کہ بس۔'' کلیم کو سخت غصہ آ گیا۔''بھول گئے کہ اور لوگ بھی بیٹھے ہیں۔''

''ہمارے ایک پاکستانی دوست یوسف تھے بصرہ میں۔ان کی بیوی کا نام تھا زلیخا۔ان سے نماز کے لیے کہو تو کہتے تھے کہ اللہ میں مجھے خود آواز دیتے ہیں کہ چل یوسف نماز پڑھ۔تب میں مسجد جاتا ہوں۔میں نے پوچھا کہ آخری بار کب آواز آئی تھی کہنے لگے

کہ ایک سال سے زیادہ ہو گیا۔ پوچھا اور یہ پانچ وقت جو اذان دی جاتی ہے وہ کیا ہے؟ کہنے لگے مجھے نہیں پتہ۔ آخری بار بازار میں ضروری کام سے جا رہا تھا تین بجے تھے دھوپ میں تپ رہا تھا کہ آواز آئی۔ وہاں سے تین کلومیٹر دور مسجد تھی تلاش کر کے پہنچا۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے قصہ سنایا۔

''یہ کہو کہ بڑے بھائی تھے میرے۔''

''نہیں یار، اب ضمیر نے یاد دلایا ہے تو مغرب کی نماز تو ادا کر ہی لیں۔'' یہ کہتے ہوئے اقبال اٹھ گیا ساتھ ہی تمام لوگ اٹھ گئے۔

''ایسا ہے کہ دس بجے ڈھابے پر ملتے ہیں۔'' کلیم نے اقبال سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آج بھی تمام رات وہیں گزرے کی فضل صاحب سے پوری تفصیل جاننی ہے اور کل بھی چھٹی ہے۔''ضمیر نے فیصلہ سنایا۔

''کون سی تفصیل؟''شمیر نے پوچھا۔

''وہی جو ہرا اور شبلی والی۔'' کلیم نے یاد دلایا۔

''ہاں یار! وہ بات تو رہ ہی گئی اس نیک پروین کو بھی ضرور لے کر آنا وہاں۔'' اقبال نے کہا۔

''کون نیک پروین! اچھا وہ ٹیڑھا زیدی۔'' شمیر کو فوراً ہی یاد آ گیا۔

''اچھا خدا حافظ۔'' سب نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

○

(۸) غلط اسلام صحیح اسلام

8.1 تحریف وتفریق

''آج کوئی ادھرادھر کی بات نہیں ہوگی صرف فضل صاحب بولیں گے۔'' اقبال نے سب کو تنبیہ کی۔ رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔ شمشاد مارکیٹ تقریباً بند ہو چکا تھا۔ بس چند ڈھابے اور ریسٹورنٹ ہی کھلے ہوئے تھے یا پھر پان اور سگریٹ کے کھوکے۔ سڑک پر اکا دکا سواریاں گزر رہی تھیں۔ چوراہے پر ایک پیڑ کے نیچے چند پولیس والے بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ یونیورسٹی کے دو تین بُل بھی اپنے ڈنڈے لیے ٹہل رہے تھے۔ یہ لوگ اپنے مخصوص رضا کے ڈھابے پر چوراہے کے داہنی طرف مرحوم پروفیسر نورالحسن کی کوٹھی، جہاں اب علیگ اپارٹمنٹس بن چکے تھے، کے باہری حصہ میں ایک پرانے نیم کے پیڑ کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ اس چھوٹے سے میدان میں کوئی پچاس کرسیوں کی جگہ تھی جہاں اس وقت دس یا پندرہ طلباء ہی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ پیچھے ایک پھونس کی جھونپڑی کے آگے اینٹوں کے بڑے بڑے چولہوں پر پتھر کوئلے کی آگ دہل رہی تھی اور رضا اپنے ملازموں کے ساتھ گراہکوں کے انتظار میں مجسم میزبان بنا ہوا تھا۔ جھونپڑی کے دونوں طرف لکڑی کے کھوکھوں میں پان سگریٹ کی دوکانیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔ چند رکشہ والے سواریوں کے انتظار میں اپنی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ یہ جاڑے کی شروعات کا زمانہ تھا۔ موسم کافی خوشگوار تھا بس ایک سوئیٹر کی سردی تھی۔

''ہر بار وہ قصۂ دغا رہا جاتا ہے۔ جو ہر اور شبلی والا۔'' کلیم نے بھی اقبال کو سپورٹ کیا۔

''بہت دور سے شروع کرنا پڑے گی یہ دستان۔ تبھی سمجھ میں آئے گا کہ آخر یہ قصۂ دغا

کیا ہے۔'' فضل حق نے سب کو بتایا۔

''ہمیں اور کرنا ہی کیا ہے۔ تمام رات چائے پینی ہے اور آپ کو سننا ہے بس۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کوئی بولنے دے نا تجھی تو۔ ہر آدمی تو اپنی ٹانگ اڑاتا ہے یہاں۔'' اقبال نے پھر تنبیہ کی۔

''رضا! ذرا اسٹرونگ سی چائے بھیجنا۔'' شمیر نے رضا کو آواز دی۔ چند ہی منٹ میں سب کے ہاتھوں میں چائے کے گلاس آ گئے۔

''جی اب فرمائیے۔'' اقبال نے فضل حق سے کہا۔

''۱۸۵۷ء سے پہلے کی مسلم تاریخ تو اب ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی کہ اس سال تاریخ کا ورق الٹ دیا گیا تھا۔ بالکل ہی نئے دور کی شرعات تھی۔ مسلمان صدیوں پہلے سائنس، ریسرچ اور ٹکنالوجی سے ہاتھ اٹھا چکے تھے۔ لہٰذا اب ان کا وقت تھا جنھوں نے علمی تحقیق کو گلے لگا لیا تھا۔ سائنسی اور صنعتی انقلاب کے ساتھ ساتھ سیاسی جمہوری انقلاب بھی برپا کر لیا تھا۔ ان کے یہاں بھی ایک دور تھا جب نہانے تک کو صحت کے لیے نقصاندہ سمجھا جاتا تھا۔ یہودی اور عیسائی علماء اسی بات پر لڑتے رہتے تھے کہ سوئی کی نوک پر کتنے فرشتے بیٹھ سکتے ہیں۔ گیلی لو کو اس لیے پھانسی دے دی گئی کہ وہ مذہبی علماء کے عقیدے کے برخلاف سورج کے چاروں طرف، گردش زمین کا قائل تھا۔ اب یہ دور ہمارے یہاں تھا کہ علوم عقل سے نہیں بلکہ صرف قرآن وحدیث اور وجدان سے حاصل ہوتے ہیں۔ جبکہ قرآن وحدیث سمجھنے کے لیے بھی عقل چاہیے اور عمل صرف نماز روزے کا نام رہ گیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغربی اقوام جہالت سے علم کی طرف گامزن ہوئیں اور ہمارا قافلہ علم سے جہالت کی طرف؟'' کلیم نے حیرت سے سوال کیا۔

''بالکل ظاہر ہے۔'' امین بولا۔

''کتنی حیرت کی بات ہے کہ اسلام کی شکست کا سبب کوتاہ نظر حامیان اسلام ہی بنے۔'' کلیم نے ٹھنڈی سانس کھینچی۔

''ہر ملک میں ایک اتاترک چاہیے کہ رہبران گمراہی کوختم کیے بغیر اب منزل عزت آ گہی حاصل ہونا محال ہے۔'' اقبال جوش میں آ کر بیچ میں بول پڑا۔

''شروع اسلام میں تمام علوم کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ دنیا بھر کی تمام مشہور کتب کے تراجم عربی میں کرالیے گئے۔تمام دوسری اقوام مسلمانوں سے تحقیق و ریسرچ کے ہرمیدان میں بہت پیچھے رہ گئیں۔لہٰذا فتوحات کا ایک طویل سلسلہ قائم ہوگیا۔ تیرہویں عیسوی صدی کے بعد مغربی اقوام کا دور شروع ہوا اور مسلمانوں کا زوال۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ برطانیہ ہندوستان کی بھی ملکہ معظّمہ بن گئیں اور مسلمان غلام ہوگئے۔ ہندوستان پر برٹش پارلیمنٹ کی حکمرانی قائم ہوگئی۔''

''صرف مسلمان ہی غلام ہوگئے؟'' فضل حق کے خاموش ہوتے ہی ضمیر نے فوراً سوال کیا۔

''دوسروں کو کیا فرق پڑا۔ پہلے بھی باہر سے آ کر مسلمان حکمرانی کررہے تھے۔''

''مگر غلام تو ہندو مسلمان دونوں ہی ہوئے۔''ضمیر نے ضد کی۔

''سمجھنے کی کوشش کرو یار! اس کو بتاؤ۔'' کلیم نے اقبال سے کہا۔

''جب کوئی قوم کسی ملک پر قبضہ کرتی ہے تو سابق حکمرانوں سے دشمنی اور محکوموں سے دوستی کرتی ہے۔حکومت چلانے کے لیے کرنا ہی پڑتی ہے۔ جبکہ وہ تعداد میں بھی یہاں بہت زیادہ تھے اور مسلمان بہت کم۔'' اقبال نے تفصیل سے بتایا۔

''ہاں اب ٹھیک ہے۔''ضمیر نے اعتراف کیا۔

''چلو کوئی بات نہیں ہے۔ضمیر تو خیر پھر بھی سمجھدار ہے، مسلمانوں میں تو اس سے بھی بڑے بڑے گدھے پڑے ہیں۔'' کلیم نے اس پر حملہ کیا۔

''یہ غلط بات ہے ضمیر کو ایسا نہ کہو۔'' شمیر نے اور آگ لگانی چاہی۔

''اس سے بھی بڑے بڑے گدھے۔کہا نا؟ دوستوں کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔'' امین نے بھی ہمدردی جتاتے ہوئے تیل چھڑکا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے کہ مسلمانوں میں مجھ سے بھی بڑے بڑے گدھے

پڑے ہیں۔ جبکہ تین تو یہیں بیٹھے ہیں بالکل سامنے۔'' ضمیر نے بھی پیچھے ہٹ کر شمیر، کلیم اور امین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وار کیا۔

''کیا بات ہے! آج ضمیر نے بدلہ لے لیا۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے کہا۔ فضل حق بھی ہنسنے لگے۔

''تینوں ایک ساتھ مجھے گھیر رہے تھے۔ یہ دیکھئے بدمعاشی۔'' ضمیر بھی اپنی کامیابی پر ہنسنے لگا۔

''خیر اب چھوڑو اس بات کو۔ ہاں فضل صاحب بتایئے آپ کیا کہہ رہے تھے؟'' اقبال نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پھر سلسلہ جوڑا۔

''یہ صرف حکومت کی ہی تبدیلی نہ تھی بلکہ انگریزوں کے ساتھ نئی تعلیم سائنس، ٹکنالوجی اور جمہوری نظریات بھی آئے۔ ہزار جنگیں ہارنے کے باوجود بھی علماء اسباب شکست تلاش کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ چند ہی سالوں میں مسلمان ہر محکمہ سے باہر کر دیے گئے۔ ۱۸۳۵ء میں جب لارڈ میکالے کمیٹی نے ہندوستانیوں کو انگریزی و سائنس پڑھائے جانے کی سفارش کی تو ۳۵۰۰۰ سے زائد علماء اور رؤسا نے حکومت کو عرضی دی کہ یہ تعلیم مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی سازش ہے۔ نئی تعلیم تقریباً پچیس سال پہلے بنگال میں رائج ہو چکی تھی۔ ہندوؤں نے خوشی خوشی اسے گلے لگالیا۔ مسلمان جدید تعلیم سے سخت نفرت کرتا تھا۔ لہٰذا عام مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہ تھا اور ہر دم بغاوت کے فراق میں رہتا تھا۔ سرسید دنیائے اسلام کے پہلے آدمی ہیں جنھوں نے دینی علماء کے غلط تصورات کو سمجھا اور جدید تعلیم و سائنس اور جمہوری نظریات کی سچائی کو تسلیم کیا اور ان کو رواج دینے میں لگ گئے۔ بس پھر کیا تھا ایک طوفان بلاخیز ان کے خلاف پیدا کر دیا گیا نیچری، کافر، ملحد، یہودیوں کا ایجنٹ اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا۔ ہر طبقۂ فکر کے دینی علماء جیسے دیوانے ہو گئے تھے سرسید کے خلاف۔ ان کی بنیادی فلسفیانہ غلطی یہ تھی کہ علم اور عمل دونوں کے معنی محدود کر دیے تھے۔ صدیوں پہلے علم کے معنی میں تحریف اور عمل کے معنی میں تفریق کر دی گئی تھی۔''

''علم کے معنی میں تحریف اور عمل میں تفریق! ذرا تفصیل سے سمجھایئے۔ کچھ گاؤدی بھی

بیٹھے ہیں یہاں۔''کلیم نے ضمیر پر وار کرتے ہوئے کہا۔وہ تو اچھا ہوا کہ اس کا دھیان کہیں اورتھاورنہ ایک لڑائی شروع ہوجاتی۔

''سوال یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔ اورقرآن میں جگہ جگہ کائنات میں غوروفکر کرنے کو کہا گیا ہے کہ چاندستارے کیا ہیں۔ بارش کیسے ہوتی ہے۔زمین کیا ہے انسان کی پیدائش کیسے ہوتی ہے؟ انہیں سوالات سے سائنس شروع ہوتی ہے۔علم کے لفظی معنی ہی عربی میں سائنس ہیں۔چین میں تو آج تک اسلام نہیں پہنچا بجز مشرقی چین کے کچھ حصوں کے جہاں صدیوں بعد اسلام پھیلا۔رسول اللہ سائنس ہی کے حاصل کرنے کی بات تو کررہے تھے لیکن تیسری ہی صدی میں مذہبی تقدیر پرست علماء نے معتزلہ کوشکست دینے کے لیے علم کے معنی میں ہی تحریف کردی۔ تقدیر پرستی حکمرانوں کے لیے انتہائی فائدہ مند نظریہ تھا۔لہٰذا عوام کے ساتھ ساتھ چالاک حکمرانوں کی پوری مدد ان کو حاصل ہوئی اورعلم کے معنی صرف قرآن وحدیث کے جاننے تک محدود کردیے گئے اور وہ بھی بغیر عقل استعمال کیے ہوئے لفظی معنی سمجھ لیں بس۔''

''یعنی قرآن وحدیث جاننے کے لیے بھی بس رٹا لگالو۔عقل وہاں بھی استعمال نہ کرو؟''شمیر کی حیرانی دیکھنے کے لائق تھی۔

''عقل کا تو مولوی سخت دشمن ہے۔ابھی کچھ دن پہلے دارالعلوم دیوبند نے اپنا طبیہ کالج تک بند کردیا۔طلباء پر الزام یہی لگایا گیا کہ وہ عقل استعمال کرنے لگے تھے اور پوری طرح مولوی نہیں بننا چاہتے تھے۔حالانکہ ان کو اس سے یہ فائدہ ہورہا تھا کہ مولویت کے ساتھ ساتھ ان کو ایک باعزت ذریعۂ معاش بھی حاصل ہوجاتا تھا۔''

''پھرزکوٰۃ کا کیا ہوتا؟''کلیم نے طنز کرتے ہوئے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ خالص علمی اصولوں کے مطابق دینی مدارس کا نصاب پوری طرح بدل دینا چاہیے اورعلم کے صحیح معنی کو سمجھتے ہوئے قرآن کے ساتھ ساتھ سائنس،سوشل سائنس اورآرٹس وغیرہ کی تعلیم بھی ہائی اسکول لیول تک ضروری ہونی چاہیے۔اس کے بعد جو جدھر جانا چاہے چلا جائے۔''اقبال نے اپنا نظریہ بیان کیا۔

''آپ نے کہہ دیا اور انھوں نے مان لیا۔'' امین نے طنز کیا۔

''آپ کو پتہ ہے کہ مدارس کا ایک سیلاب سا آیا ہوا ہے۔ ہر قصبے، شہر اور دیہات میں۔ زندگی کرنے کے لیے فارغین مدرسہ کیا کریں؟ دو وقت کی روٹی اور ایک چھت چاہیے زندہ رہنے کے لیے۔ حکومت کی نوکری کے قابل نہیں۔ کوئی تجارت کرنے کی اہلیت نہیں۔ ہزاروں فارغین ہر سال مارکیٹ میں آتے ہیں۔ جو چالاک اور اچھے مقرر ہوتے ہیں، فقہی اختلافات کو ہوا دے کر اپنا گروپ بناتے ہیں اور ایک نیا مدرسہ کھول لیتے ہیں۔ پھر تو زکوٰۃ، صدقات اور چرم قربانی کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ باقی تعویذ بیچنے اور جادوٹونے کے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔'' فضل حق نے صورت حال بیان کی۔

''ہزاروں معصوم بچوں کو ہمیشہ کے لیے محتاج بنانے کا کام کر رہے ہیں یہ مدارس۔'' امین نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اور دعویٰ یہ ہے کہ ہم نائبین رسول پیدا کر رہے ہیں۔''

''جبکہ غاصبین زکاۃ پیدا کر رہے ہیں۔'' شمیر نے کہا۔

''مجھے ایک قصہ یاد آیا ہمارے ایک رشتہ دار بڑے عالم ہیں۔ ان کا ایک مدرسہ ہے۔ جمعہ کی نماز کے بعد تقریر کر رہے تھے کہ اچھے لوگ اپنے ذہین بچوں کو ہمارے یہاں نہیں بھیجتے۔ انگریزی اسکولوں میں داخل کراتے ہیں۔ میں نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا۔ مسجد کے باہر لوگوں کے سامنے ان سے پوچھا کہ اچھے لوگ کیوں آپ کے مدارس میں بھیجیں؟ ان سے کبھی پوچھا آپ نے کہ پڑھائی کیسے ہوگی اور کیا پڑھایا جائے گا۔ مدرسہ آپ کی ذاتی پراپرٹی ہے۔ کوئی کمیٹی نہیں۔ محلے کے پڑھے لکھے لوگوں سے پوچھئے کہ نصاب تعلیم کیا ہوگا۔ اور بچوں کا مستقبل کیسے بنے گا۔ بیچارے خاموش رہ گئے۔ چند سال پہلے تک ان کے پاس کچھ نہیں تھا اب ماشاء اللہ کروڑ پتی ہیں کہ عرب شیوخ سے رابطہ قائم ہو گیا ہے۔'' کلیم نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

''یہی مشکل ہے یہاں بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔ فضل صاحب کی بات رہ گئی'' امین نے سب کو تنبیہ کی۔

''تحریف علم کے بارے میں تو آپ نے بتادیا۔عمل کے معنی میں کیسے تفریق کی علماء نے؟''کلیم نے سوال کیا۔

''عمل کیا ہے؟ میں نے یہ اخبار اٹھا کر یہاں سے وہاں رکھ دیا یہ بھی عمل ہے۔ میں نے ایک رائے دی آپ کو یہ بھی عمل ہے۔میں ریسرچ کر رہا ہوں یہ بھی عمل ہے لیکن مولوی جب کہتا ہے کہ تمہارے اعمال خراب ہو گئے تمہاری نمازیں نمازیں نہیں،تمہارے روزے روزے نہیں، اس لیے تم پر اللہ کا عذاب نازل ہو رہا ہے تو اس کا مطلب صرف مذہبی اعمال سے ہوتا ہے۔ ہر منبر سے ہر جلسہ میں مولوی مسلمانوں کو لتاڑ پلا رہا ہے اور ان کو یہ سمجھا رہا ہے کہ تمہارے اعمال خراب ہیں اگر نماز روزہ وضو وغیرہ خشوع وخضوع سے کرو گے اور سنتوں پر عمل کرو گے تو اللہ تمہیں دنیا میں سرخ رو کرے گا۔جیسے صحابہ کو کیا۔ان کے اعمال درست تھے لہٰذا عزت ملی تمہارے اعمال خراب ہیں تو ذلت اٹھا رہے ہو۔ یہ بہت عام تھیسس ہے مولوی کی۔اس نے دنیاوی اور دینی عمل کے معنی میں تفریق کر دی۔ ریسرچ، سائنس اور تجارت دنیاوی عمل ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔ان کے نزدیک، صرف دینی اعمال سے ہی دنیا کی عزت وابستہ ہے۔ بلکہ میرے نزدیک دنیا میں ہی دین ہے جیسے اس کپ کے اندر چائے۔''فضل حق نے تفصیل بیان کی۔

''کیا خوب تھیوری ہے۔اور عذاب الٰہی کا تو اتنے وثوق سے ذکر کیا جاتا ہے جیسے اللہ میاں نے خود انہیں بتایا ہے۔قرآن وحدیث سے سیکڑوں دلیلیں لائی جاتی ہیں۔ کیو ٹی وی پر ایک پاکستانی مولانا اسرارالحق کا اکثر بیان ہوتا ہے۔پچھلے دنوں جب وہ ہماری یونیورسٹی میں آئے تو طلباء اور ٹیچرز کا اژدہام تھا ان کو سننے کے لیے۔ ہر جگہ بس ایک ہی بات دہرائی انھوں نے کہ مسلمانوں پر ان کے اعمال خراب ہونے کی وجہ سے عذاب الٰہی ہے۔''اقبال بیچ میں بول پڑا۔

''علی برادران کی طرح وہ بھی اللہ میاں کے ساتھ چائے پی کر آئے تھے کیا؟''کلیم کے کہتے ہی ہر طرف زوردار قہقہہ پڑا۔

''صرف چائے؟ بلکہ کھانا بھی۔نعوذ باللہ۔توبہ توبہ۔''امین نے اپنا منہ پیٹ لیا ہنستے

ہنستے سب کا برا حال ہو گیا۔ کچھ دیر بعد اقبال نے پھر بتانا شروع کیا۔

''جب وہ اصلی عربی لہجہ میں قرأت کرتے تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے قرآن ابھی ابھی نازل ہو رہا ہے۔ بس یہ عصاء گھمائیں گے اور کینڈی ہال کی چھت پھٹ جائے گی۔ قرآن کی نہ جانے کتنی آیات پیش کر دیں۔ حالانکہ قرآن میں صرف ان قوموں پر عذاب نازل کرنے کی بات ہے جنھوں نے توحید کا انکار کیا۔ اپنے نبیوں کا قتل کیا یا خدائی کا دعویٰ کیا۔ جیسے فرعون اور موسیٰ کی قوم نے، ہر کوئی تراجم قران دیکھ سکتا ہے۔ مسلمان بیچارے کتنی محبت کرتے ہیں اپنے نبی سے، بلکہ عشق کرتے ہیں۔ ان کے پیغام کی کیسی قدر کرتے ہیں کہ جان تک دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن یہ لوگ قرآن کو بھی غلط پیش کر رہے ہیں۔ پورا کنیڈی ہال بھرا ہوا تھا۔ اسرارالحق کا ایمان افروز بیان جاری تھا، اساتذہ اور طلباء دم بخود سن رہے تھے کہ انھوں نے پینترا بدلا اور سیاست پر آ گئے، کہا کہ لوگوں نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ بنائی اور کانگریس کی مخالفت کرنے لگے اور فرمایا کہ یاد رکھو جس دن پاکستان بنا اس کے نو مہینہ کے اندر اسرائیل بن گیا۔ اس سے پہلے یہودیوں کی سازشوں کا ذکر کیا کہ یو این او ورلڈ بینک، آئی ایم ایف وغیرہ ان کی سازشیں ہیں۔ مطلب صاف تھا کہ پاکستان بھی یہودیوں کی سازش ہے۔ بیچ بیچ میں پورے لحن کے ساتھ احادیث اور قرآن بھی پڑھتے جا رہے تھے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا کھڑا ہو گیا۔

''میں سوچ رہا تھا کہ ابھی تک یہ بیٹھا کیسے ہے۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''چند لمحے اور نہ اٹھتا تو ہم لوگ یہاں سے اٹھا دیتے۔'' کلیم نے بھی ہاتھ بٹایا۔

''اتفاق سے میں بالکل آگے کی لائن میں بیٹھا تھا۔ بالکل ڈائس کے نیچے اونچی آواز میں ایک سوال کیا اور بیٹھ گیا۔''

''کیا کہا؟ کوئی بہت ہی خطرناک بات کہی ہو گی۔''

''بہت معموی سا سوال کیا۔ حضرت! کیا کانگریس اسلامی جماعت تھی؟ بس اتنا ہی۔''

''پھر کا اثر ہوا؟''

''اثر، ایسا اثر ہوا کہ مت پوچھو۔ اس کے بعد جو انھوں نے کہا میں نے دل میں سوچا

کہ کہنے والے پراللہ کی لعنت اور چلا آیا۔''

''مگر کیا کہا انھوں نے؟''

''یہ مولوی کتنا خطرناک ہوسکتا ہے اس دن مجھے اندازہ ہوا۔ابھی جس پاکستان کے بننے کو یہودیوں کی سازش بتار ہے تھے۔میرے جملے کے بعد سمجھا کہ یہاں ماحول دوسرا ہے حالانکہ ایسا نہ تھا۔لہٰذا پینترا بدلا اور فرمایا کہ حضرت ابوالکلام آزاد خلاف تھے جمعیۃ العلماء ہند خلاف تھی، جماعت اسلامی خلاف تھی، مہاتما گاندھی مرحوم خلاف تھے،سب ہی لوگ خلاف تھے۔مگر آپ لوگوں کی بدولت اللہ نے یہ معجزہ کر دکھایا کہ پاکستان بنا۔''

''استغفراللہ! یہودیوں کی سازش بس ایک جملے سے اللہ کا معجزہ ہوگیا۔وہ بھی اتنے وثوق سے۔''شمیر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ غور کیجئے کہ اب پھر اللہ کی طرف سے بولے جیسے اللہ میاں سے ان کی ملاقات ہے''امین نے یاددلایا۔

''بس ان کو اللہ کے انصاف پر ہی چھوڑ دو۔کچھ کہنا سننا بے کار ہی ہے۔'' فضل حق نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''بیکار! اتنا بے کار ہے کہ تمام دوست نما دشمنوں نے کہا کہ اقبال تو بس ڈسٹرب کرنا جانتے ہیں۔پھر ایک دن انہیں اسٹاف کلب بلایا گیا۔ہمارے عقل کل سکریٹری اور صدر صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ کسی کو سوال نہیں کرنے دیا جائے گا کہ حضرت کی شان میں گستاخی ہوگی۔سیکڑوں ٹیچرز آئے اور اللہ کے عذاب کا فیصلہ خاموشی سے سن کر چلے گئے۔ اگر یونیورسٹی کے استاد سوال جواب نہیں کر سکتے تو کہہ دینا تھا کہ نعوذ باللہ نبی آیا ہے بس۔''

''اللہ کے عذاب کی بات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ سارا الزام معصوم عوام پر ہی ڈال دو کہ کوئی پلٹ کر نہ پوچھے کہ یہ بتا کہ کارواں کیوں لٹا۔اور یہ کہ مجھے رہزنوں کا گلہ نہیں تری رہبری کا سوال ہے۔''

''کتنی افسوسناک بات ہے کہ مسلمان پٹے بھی اور جرم بھی اس کا نکل آئے۔وہ بھی اتنا کہ عذاب الٰہی کا شکار ہو۔اماں یار کہیں زلزلہ بھی آتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کا عذاب

ہے اعمال خراب ہوں گے۔ایک بار شہر میں فساد ہوا مسلمانوں کی بہت سی دکانیں جلا دی گئیں۔تو یہ کہہ رہے تھے کہ زکوٰۃ نہ دی ہوگی، عذاب آ گیا۔ کتنے بے شرم ہیں یہ لوگ۔ اپنی حماقتوں کو بھی اللہ سے منسوب کرتے ہیں۔اللہ اور رسول تو جیسے ان کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔نعوذ باللہ۔'' کلیم نے گریہ کیا۔

8.2 واعظینِ گمراہی

''سرسید کے خلاف بھی اللہ رسول کو استعمال کیا ان لوگوں نے۔اگر آپ پوری مخالفانہ تحریک پڑھیے جو علماء نے سرسید کے خلاف چلائی تو ایسا لگتا ہے کہ ان سے لڑائی نہیں تھی سرسید کی۔ بلکہ وہ اللہ رسول کے خلاف تھے۔ بادشاہت نما فرسودہ خلافت کی حمایت بھی اللہ رسول کے نام پر کی گئی حتیٰ کہ کانگریس نیشنل ازم کی حمایت میں بھی اللہ رسول کو میدان میں اتارا گیا۔سب سے پہلے شبلی نے یہ کام کیا۔ جمعیۃ العلماء ہند اس نظریے کے تحت قائم ہوئی کہ اللہ رسول کا سیاسی پیغام بھی کانگریسی نیشنل ازم سے مماثل تھا۔ایک طوفان کھڑا کر دیا اسلام کے نام پر۔ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے مولوی خود آگے نہیں آتا۔ قرآن و احادیث کو آگے کرتا ہے اور پیچھے سے شکار کھیلتا ہے۔آزاد نے بھی سیاسی اغراض حاصل کرنے کے لیے حزب اللہ بنائی تھی۔ مدارس کو ذاتی جاگیر بنانے سے لے کر قومی اور بین الاقوامی معاملات میں ہر جگہ اسلام کا نام نامی استعمال کیا جاتا ہے اور عیش کی بنسی بجائی جاتی ہے۔''

''مگر سرسید کو بھی کیا ضرورت تھی کہ قرآن کی تفسیر سائنس کے مطابق کرتے۔سائنس تو بدلتی رہتی ہے۔'' ضمیر نے سوال کیا۔

''بہت عمدہ سوال کیا تم نے۔سرسید مخالف تحریک کا پورا جست بیان کر دیا۔ ہاں بھئی اب اس الزام کا جواب دیں آپ؟' امین نے اقبال کو چھیڑا۔

''اس پر پہلے ایک واقعہ سن لیجیے ایک پروفیسر قاسمی ہیں آرٹس فیکلٹی میں۔ایک بار سرسید کے تہذیبی شعور پر مقالہ پڑھ رہے تھے۔دوران مقالہ انھوں نے یہ بات کہہ دی کہ

سائنس تو بدلتی رہتی ہے اور سرسید نے جب سائنسی اصولوں کے مطابق تفسیر کی تو غلطی کی۔ مقالہ ختم ہوتے ہی میں نے ہاتھ اٹھادیا بلالیا گیا۔ میں نے کہا کہ آرٹس اور سوشل سائنس کے لوگوں کی پرابلم یہ ہے کہ وہ سائنس کے معنی نہیں سمجھتے۔ مثلاً ڈارون کی تھیوری کو سائنس سمجھتے ہیں۔ سائنس کبھی نہیں بدلتی۔ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ کوئی نظریہ یا مفروضہ اس وقت تک سائنس نہیں بنتا جب تک کہ یہ تجربہ گاہ میں یا ریاضی کے اصولوں سے ثابت نہ ہو جائے۔ ایک بار جب تھیوری ثابت ہوگئی تب وہ سائنس بنتی ہے۔ لہٰذا سرسید نے عقلی علوم کے حوالے سے تفسیر بالکل ٹھیک کی۔ اس کے برخلاف جو تفاسیر صرف تخیلی دلائل کی بنیاد پر کی گئی ہیں، ان میں غلطیوں کا امکان ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ فرانسیسی سائنس داں مورس بکالے نے کس طرح سائنسی تحقیقات اور قرآنی آیات میں، جو فطرت سے متعلق ہیں، تطبیق قائم کی ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں صرف اللہ ہی کو یہ حقائق معلوم ہو سکتے تھے جواب بیسویں صدی کے آخر میں سائنس نے دریافت کیے ہیں۔ لہٰذا سائنس قرآن کو کلام الٰہی ثابت کر رہی ہے۔ ساری کائنات خدا کی تخلیق کردہ ہے سائنسی اصولوں کے مطابق۔ یہ کوئی طلسم نہیں ہے کہ سورج کے چاروں طرف زمین گھوم رہی ہے۔ ایک سائنس ہے اس میں۔ جس کو معلوم کرنا عین اسلام ہے۔'' اقبال نے طویل جواب دیا۔

''آپ نے تو اس کا باجا بجادیا۔'' ضمیر نے تالی بجائی۔

''پورا آرٹس فیکلٹی لانج بھرا ہوا تھا ٹیچرز اور طلباء سے۔ کوئی ایک بھی ان کی حمایت میں نہیں کھڑا ہوا۔''

''پھر پروفیسر قاسمی پر اثر تو ہوا ہوگا۔''

''اثر کی سن لیجئے۔ اور سخت ہو گئے مذہب کے معاملے میں۔ ابھی تہذیب الاخلاق کے خاص سرسید نمبر میں ۱۷/ اکتوبر کے موقع پر ایک ریسرچ اسکالرلڑکی کا مضمون شائع کیا ہے سرسید کے مذہب کے خلاف۔ ایک زمانے سے تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر ہیں موصوف۔ کوئی موقع سرسید کے مذہب اور سیاست پر حملہ کرنے سے نہیں چھوڑتے۔''

اقبال نے بتایا۔

''کمال ہے یہ تو!''

''آپ لکھئے دنیا لکھے، لیکن خود تہذیب الاخلاق میں سرسید کے خلاف مضامین چھاپنے کا کوئی حق نہیں ہے کسی کو۔ اپنا رسالہ نکالو تو ایک بات ہے۔''

''وائس چانسلر سے شکایت کی آپ نے؟''

''کون سنتا ہے۔ چھوٹی سی ہی بات لے لیجئے یونیورسٹی میں سیکڑوں اصلاحی، فلاحی، قاسمی، ندوی ہیں۔ کیا کیا صاحب، دیو بند سے فراغت کر لی۔ پھر علی گڑھ نے داخلہ دے دیا اور اسکالرشپ بھی۔ اور پھر بی اے ایم اے کر لیا۔ اسکالرشپ ملی اور پی ایچ ڈی بھی ہو گئے۔ کہاں سے؟ علی گڑھ سے۔ مگر آج تک علیگ نہیں ہو پائے۔ لیکچرر ہوئے، ریڈر ہوئے، پروفیسر ہوئے، بہترین گھر بنا لیا مگر ہیں قاسمی کے قاسمی، ندوی کے ندوی۔''

''یہ تو پوری احسان فراموشی ہے۔''، ضمیر کو غصہ آ گیا۔

''نہیں، بلکہ مولویت کا وہ زہر ہے جو علی گڑھ کی رگوں میں سرایت کر رہا ہے۔ یہ لوگ اب بھی سرسید کو کافر گردانتے ہیں۔ لیکن کھل کر کہہ نہیں سکتے۔''

''مگر سرسید، شیطان اور فرشتوں کے قائل نہ تھے۔ سنا ہے میں نے کہ وہ جنت دوزخ کے بھی قائل نہ تھے۔ اسی لیے ان پر کفر کے فتوے لگے۔''، شمیر نے ایک نیا سوال کیا۔

''دو حضرات مخالفین سرسید کے سرغنہ تھے۔ ایک مولوی امداد علی کانپوری، دوسرے مولانا علی بخش خاں بدایونی۔ ایک دیو بندی تھے دوسرے بریلوی۔ دونوں انگریزوں کی ملازمت بھی کر رہے تھے۔ کوئی علمی حیثیت ان لوگوں کی نہیں ہے۔ لیکن مولوی علی بخش نے ایک کتاب لکھی ''تائید اسلام''، جس میں سرسید پر ہر طرح کے جھوٹے الزام لگائے گئے۔ لیکن وہ ایسے مشہور ہوئے کہ تمام دنیا وہی کہتی ہے جو یہ کاذب کہہ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بڑے اور چھوٹے عالم کی سپورٹ حاصل ہے علی بخش کو اس دروغ گوئی میں۔ میں نے کسی عالم فاضل کی کوئی کتاب یا تحقیقی مضمون آج تک نہیں دیکھا، جس میں سرسید پر ان الزامات کو ثابت کیا گیا ہو۔ لیکن ہر بزعم خود عالم فاضل کسی نہ کسی مضمون میں یا کتاب میں

یہ ضرور لکھتا ہے کہ سرسید کے عقائد ٹھیک نہیں تھے۔الزام تراشی کرتے وقت زرا خوف خدانہیں ہوتاان کو۔اب پروفیسر قاسمی کو ہی دیکھ لیجئے کہ سرسید کے مرنے کے سوسال بعد ایک نادان لڑکی کا مضمون ان کے مذہب کے خلاف تہذیب الاخلاق میں شائع کر دیا۔ اتنی زبردست حمایت حاصل ہے ان مولویوں کی مخالفین سرسید کو کہ پورازمانہ سرسید کو گمراہ سمجھتا ہے۔فضلائے اسلام ہر جھوٹ کو ہوادینے میں ماہر ہیں۔''

''ایک منٹ رکئے۔ یہ فاضل اور فضلاء دو الفاظ آپ نے کن معنوں میں استعمال کیے؟''امین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''میں خوب سمجھتا ہوں تمہیں۔''امین نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں، وہ مطلب نہیں ہے بالکل۔''اقبال نے سمجھتے ہوئے صفائی دی۔

''ہماری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ہمیں بھی بتاؤ۔''ضمیر نے امین کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

'جیسے یہ ٹوٹی ہوئی کرسی فاضل پڑی ہے۔انگریزی میں ایکسٹرا، بیکاراور فضلے کے معنی تم جانتے ہی ہو۔''امین نے سمجھایا۔

''پورے ماحول میں بدبو پھیلادی اس نے۔'' کلیم نے اٹھ کر جاتے ہوئے کہا اور پاس کے کھوکے سے سگریٹ خریدنے لگا۔

''اللہ رحم کرے تم لوگوں پر نہ جانے کیا کیا نکالتے رہتے ہو۔''فضل حق کو بھی زور کی ہنسی آ گئی۔

''خدا کی پناہ فاضل اور فضلاء کے یہ معنی لیے تم نے۔''شمیر نے اقبال سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ امین کی شرارت ہے۔''اقبال نے جواب دیا۔

''مگر ہے اچھی۔''

''بے شک مابدولت خوش ہوئے۔''اقبال نے اعتراف کیا۔

''اس خوشی کے موقع پر آج رات کی تمام چائے ہماری طرف سے۔''شمیر نے اعلان کیا۔

''اور نمک پارے بھی۔'' کلیم نے سگریٹ پیتے ہوئے اضافہ کیا۔

''ہاں وہ بھی مگر اور کچھ نہیں۔ رضا! ۔ چائے اور نمک پارے لاؤ فوراً۔'' شمیر نے آرڈر دیا۔

''یہ لیجئے گرما گرم نمک پارے۔ سامنے کھنڈیل وال کے یہاں سے منگائے تھے۔'' رضا نے چائے اور نمک پارے ٹیبل پر رکھتے ہوئے بتایا۔

''ایک مزے کی بات یاد آئی۔ ہمارے ایک دوست ہیں مولوی گھرانے کے، ابھی لیکچرر ہوئے ہیں۔ ایک دن مجھ سے بہت ہمدردی سے پوچھا کہ کیا سرسید نے آخری زمانے میں اپنے عقائد سے توبہ کر لی تھی؟ ہمیں کہاں یہ برداشت۔ میں نے کہا سن بے پروفیسر توبہ کریں غزالی، افغانی، توبہ کریں نانوتوی علی میاں، مودودی رضا خاں اور توبہ کر تو۔ ہزار بار بھی توبہ کرے گا تب بھی سرسید کی داڑھی کے ایک بال کے برابر بھی نہ ہو سکے گا مذہب میں۔'' اقبال نے واقعہ سنایا۔

''کیا حالت ہوئی ہوگی اس کی؟''

''اس دن سے بات چیت بند ہے۔''

''آپ کو تو اسی میں مزا آتا ہے۔'' کلیم نے کہا۔

''سامنے دشمنوں کی فوج نہ ہو تو کیا مزہ زندگی کا۔'' اقبال نے جوش سے کہا۔ ''ہر آدمی سرسید کو گمراہ جانتا ہے اور ان کے مذہب پر سرٹیفکٹ اشو کرتا رہتا ہے۔ آپ سوچئے، اس شخص کے بارے میں ایسے تاثرات ہیں لوگوں کے، جس نے پوری تاریخ اسلام میں پہلی بار مغرب کے لوگوں کو اسلام سمجھانے کے لیے وہ شہرۂ آفاق کتاب لکھی جس کا اعتراف یورپ کے بڑے بڑے علماء نے کیا اور ولیم میور کی علمی حیثیت ہمیشہ کے لیے مشکوک ہو گئی، جس نے ''لائف آف محمدؐ'' میں رسول خدا پر رکیک الزامات لگائے تھے۔ خطبات احمدیہ کو یہ وضو اور نماز کے فرائض اور سنن پر کتابیں لکھنے والے خود ساختہ عالم فاضل تو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ ان سے سرسید کے مذہب کا سرٹیفکٹ ہمیں چاہیے؟''

''یہاں تو فاضل کے وہی معنی ہیں۔'' امین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بیشک۔''اقبال بھی مسکرایا۔

''یہ کتاب لندن میں شائع کرائی تھی انھوں نے؟''کلیم نے پوچھا۔

''جی لندن میں ہی لکھی۔ وہیں سید محمود سے ٹرانسلیشن کرایا اور وہیں شائع کرایا۔''

''یہ ولیم میور کون تھا۔''شمیر نے پوچھا۔

''کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔علمی دنیا میں اس کی بڑی قدر تھی اور آئی سی ایس آفیسر تھا۔ یہیں ایٹہ میں ڈی ایم تھا جب اس نے لائف آف محمد لکھی۔ سرسید نے جب مہینوں کی دن رات محنت کے بعد کتاب لکھی، تو ان کے پاس شائع کرانے کے پیسے بھی نہ تھے۔لندن میں ہی اس کو شائع کرانا ضروری تھا کہ ولیم میور کو اپنے ہی گھر میں شکست دینا تھی۔ وقار الملک کو جو خط لکھا ہے انھوں نے پڑھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں اور آنکھیں لبریز۔انھوں نے لکھا کہ میرے گھر کے برتن بھاڑے فرنیچر سب بیچ دو اور پیسہ بھیجو کہ اس نے میرے دادا پر حملہ کیا ہے۔''

''یا خدا! ایسا بھی ہوتا ہے زمانے میں۔''فضل حق نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

''تم نے سب کو رلا دیا۔''کلیم نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

''خوامخواہ دشمن نہیں بناتے لوگوں کو ہم۔ان کی موت کے سوسال بعد بھی ہرا یرا غیرا علی گڑھ کی روٹی توڑنے والا، زکوٰۃ کے پیسوں پر زندگی کرنے والا، سرسید کے منہ لگتا ہے۔شرم نہیں آتی ان لوگوں کو۔''

''یہ تو ہے۔ایسا پروپیگنڈہ ہے کہ کسی سے پوچھ لیجئے سرسید کے عقائد پر سوال اٹھاتا ہے۔''شمیر نے تائید کی۔

''جب کہ انھوں نے خدابخش جیسے جاہل کی کتاب کا جواب بھی لکھا ہے۔ پچاس صفحات کا مضمون دافع البہتان کے نام سے تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔صورت اس کی اتنی دلچسپ ہے کہ بس۔ پہلے بہتان کے عنوان سے الزام لکھا۔ پھر الجواب کے عنوان سے جواب لکھا۔ جنت، دوزخ، فرشتوں، شیطان ہر وہ الزام جو ان پر عقائد کے سلسلے میں لگایا

گیا اس کا بالکل واضح اور نہایت درست جواب لکھا۔ ایک الزام ان پر یہ بھی لگایا گیا تھا کہ وہ عقل کو رہنما تسلیم کرتے ہیں۔''

''ایں! کیا مطلب؟''ضمیر چونکا۔

''جی مذہب میں عقل کے استعمال کو بھی یہ لوگ غیر اسلامی سمجھتے ہیں۔''فضل حق نے کہا۔

''تب پھر کیا بے عقل اور پاگل لوگوں کے لیے اسلام ہے؟''شمیر حیران تھا۔

''پوچھئے ان سے۔ سرسید نے کیا عمدہ جواب لکھا ہے کہ حضرت اگر آپ بھی ذرا عقل استعمال کرتے تو ایسی نامعقول اور بیہودہ کتاب نہ لکھتے۔''اقبال نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''کیا بات ہے مزہ آ گیا۔ لگتا ہے کہ خدا بخش کے ٹخنوں میں بھی عقل نہیں تھی۔''کلیم نے کہا سب لوگ ہنسنے لگے۔

''یہ سلسلہ دراصل پرانا ہے۔ علی بخش کی بھی کوئی خطا نہیں ہے۔ رسول اللہ کی تربیت میں اور قرآنی احکامات کے مطابق صحابہ اور ان کے بعد کے لوگوں میں عقلیت کا بے انتہا رواج تھا۔ حد یہ کہ حضرت عمر وغیرہ نے حالات کو دیکھتے ہوئے بہت سے واضح احکامات تک کو بدل دیا۔ مطلب یہ کہ مذہب عقل کے دائرے میں آتا ہے۔ یہاں تک کہ عرفان الٰہی بھی بذریعہ عقل حاصل کیا جا سکتا ہے۔ معتزلہ فلسفہ بنیادی طور سے یہی تھا کہ کائنات عدل پر قائم ہے۔ اور انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے لہٰذا ذمہ دار بھی۔ اور اسی لیے جنت دوزخ کا حقدار ٹھہرا۔ مگر یہ فلسفہ عقل دشمن طبقے کو پسند نہیں آیا۔ وہ کہتا تھا کہ عرفان الٰہی عقل سے نہیں صرف وجدان سے ہی ممکن ہے اور تقدیر لکھ دی گئی ہے۔ بس یہیں سے ابوالحسن اشعری کی قیادت میں اندھی تقلید پرستی کا دور شروع ہوا۔ جس کو حکمرانوں کی پذیرائی حاصل ہوتی رہی۔ لیکن عقل پرستوں کی مکمل شکست غزالی کی وجہ سے ممکن ہو سکی۔ پانچ سو سال تک اسلام میں دونوں خیمے قائم تھے مگر غزالی نے ابن سینا، فارابی، ابن رشید وغیرہ کے فلسفۂ عقل کی ہمیشہ کے لیے بیخ کنی کر دی۔ اب نئے دور کے مجدد اسلام، جس نے عقلیت کو اسلام میں دوبارہ رواج دیا سرسید ہیں۔ لیکن فضلائے دین یہ ماننے کے لیے

تیار نہیں ہیں مگر کب تک وہ وقت آئے گا جب سرسید کا صحیح مقام متعین ہوگا۔''اقبال نے تاریخ بیان کی۔

''مگر افسوس یہ ہے کہ سو سال ہوگئے سرسید کے انتقال کو مگر آج بھی آئے دن ان پر الزام تراشیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر طبقۂ فکر کا عالم آج بھی ان کو مسلمان نہیں مانتا۔ ہاں اتنا رحم کیا ہے کہ اب ان کے کفر پر اصرار نہیں کرتے۔''فضل حق نے تاسف کیا۔

''یہ الزام بھی تھا کہ سرسید حوروں کے قائل نہیں ہیں؟''ضمیر نے پوچھا۔

''اس کا جواب کیا لکھا انھوں نے؟''شمیر نے بھی سوال کیا۔

''ان کی بھی رگ شرارت جب پھڑکتی تھی تو مزا آجاتا تھا۔ لکھتے ہیں کہ حضور میں حوروں کو خوبصورت رنڈیاں تصور نہیں کرتا جو آنحضرت کی خدمت میں پیش کی جائیں گی۔ ہوگی کوئی صورت جس کا علم ہمیں نہیں۔''

''ہزار واٹ کا کرنٹ لگا ہوگا ملا کو۔''امین نے اندازہ لگایا۔

''خدابخش نے نماز روزہ سب چھوڑ دیا ہوگا۔''

''اب کا ہے کی نماز، کیسا روزہ چلو بازار چلیں۔''کلیم نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس جواب کو چھپاؤ یارو۔ بہت چکر پڑ جائے گا۔ ساری مساجد اور خانقاہیں ویران ہو جائیں گی۔''امین نے تشویش جتائی۔

''اسی امید پر تو بس نکاح پر قناعت ہے۔ اگر یہ راز کھل گیا تو بقول میر یہ صورت ہوگی۔ قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا۔''

''اب تو میں بھی آج سے سرسید کے خلاف ہوگیا۔''شمیر شرارت سے مسکرایا۔

''ایسا کیوں؟''

''وہ واقعی اسلام مخالف تھے۔ یہودیوں کے ایجنٹ اور ملحد تھے کہ انھوں نے تو مولوی کے اسلام کی جڑ ہی کاٹ دی۔ سارا تقویٰ اور پرہیز گاری اسی امید پر تو تھی کہ ایک دن ہاتھ میں جام ہوگا اور بغل میں حور۔''

''یہ تو حور کے بارے میں ان کا خیال تھا۔ اگر شراب کے بارے میں ان سے پوچھا

جاتا تو بتادوں وہ کیا جواب دیتے؟''اقبال نے پوچھا۔

''ہاں بتاؤ۔''

''کہتے کہ وہاں ایسے گلاسوں میں شراب ملے گی جن کا پیندا غائب ہوگا۔''

''لیجئے صاحب اس نے تو ہماری شراب بھی مٹی میں ملادی۔''ضمیر زور سے ہنسا۔

''حور نہیں، شراب نہیں، اس سے تو دوزخ اچھی کہ دنیا کی مشہور ہیروئنز شاید وہاں ہوں۔''کلیم کو اپنے اعمال پر ذرا بھروسہ نہ تھا۔

''تمام دنیا کی کون بات کرے بس اپنی سری دیوی ہی کافی ہے یا مدھوبالا۔''شمیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔

''مدھوبالا کا نام نہ لینا چکر پڑ جائے گا۔''امین نے ڈانٹا۔

''کیوں کیوں؟''

''کلیم خاں کی موجودگی میں کوئی اس کا نام لے، برداشت ہی نہیں ہے۔''

''کیوں بھئی خاں صاحب؟''شمیر نے تائید چاہی۔

''یہ تو بے پر کی اڑاتا ہے۔خود اس کا زبردست فین ہے ہر بلیک اینڈ وائٹ فلم اس لیے دیکھتا ہے کہ شاید مدھوبالا کی ہو۔''

''کاسٹ نہیں دیکھتا؟''

''شاید کاسٹ غلط چھپ گئی ہو۔ایک امید موہوم پر دنیا قائم ہے۔''کلیم نے ہنس کر بتایا۔

''مشکل یہ ہے کہ وہ جوانی میں ہی مرگئی۔ بڑھاپے میں مرتی تو اس کا جادو کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔''

''مگر عشق کہاں مرتا ہے۔آپ کو یاد نہیں وہ گانا، بن کے کلی بن کے صبا باغ وفا میں۔''

''قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔وقت آ گیا تھا۔''ضمیر اداس ہو گیا۔

''قسمت پر مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا ایک بار مولانا رابع ندوی صدر مسلم پرسنل لاء بورڈ......''اقبال نے بتانا شروع کیا۔

''آل انڈیا کہو یار، مسلمانوں کی ہر مجلس میں آل انڈیا ہوتی ہے۔'' شمیر نے اقبال کو ٹوکا۔

''ہاں! آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر صاحب کو اسٹاف کلب میں بلایا گیا۔ یونیورسٹی کی تمام شرعی شیروانیاں خشوع وخضوع سے حاضر تھیں۔قسمت پر انھوں نے ایسی بات کہی کہ ان کے بعد کئی لوگ کھڑے ہوئے اور حضرت کی بقول شخصے، بخیہ ادھیڑ کر رکھ دی۔ان کے کسی بھی سپورٹر کی حمایت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔''

''مگر کہا کیا انھوں نے؟'' شمیر نے پوچھا۔

''مسلمانوں کے زوال اور جاری عالمی پٹائی کا ذکر تھا۔کچھ اس طرح کی بات کہی کہ ہر تنزلی کے بعد ترقی کا دور آتا ہے اور ترقی کے بعد تنزلی کا۔آج مغرب کا زمانہ ہے کل وقت بدل جائے گا۔یہ قسمت کا پھیر ہے۔''

''اتنے بڑے مسئلے کو ایک جملے میں پانی کر دیا؟''

''جی صرف ایک جملے میں۔''

''کتنا بڑا فلسفہ ہے اس جملے میں۔کتنا سکون اور آرام ہے اس میں۔کوئی تکلیف یا غم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔قسمت پر بھروسہ کر کے چین کی بنسی بجاؤ۔''

امین نے طنز کیا۔

8.3 شرکِ مشرق علمِ مغرب

''خاص طور سے ہم مڈل کلاس کے لیے کتنا بڑا پیغام راحت ہے۔'' کلیم بولا۔

''یہاں تو ہر بات کے منفی پہلو کو ہی دیکھا جاتا ہے۔کاش سر سید کو بھی کوئی یہ بتا دیتا۔تو کتنے عیش وآرام سے ان کی زندگی کٹتی۔حکومت سے جاگیر لے کر پورا خاندان عیش کرتا۔ افسوس کہ حضرت اس وقت نہ ہوئے۔'' فضل حق نے حسرت کی۔

''اس سے پہلے بہادر شاہ ظفر ٹیپو سلطان سراج الدولہ یہ سب لوگ تمام پریشانیوں سے بچ جاتے۔کہتے کہ مغرب کا زمانہ آ گیا ہے۔حضور یہ لیجیے تخت وتاج اور ہم چلے جنگل

کی طرف۔'' امین نے بات بڑھائی۔

''مشرقی مذاہب جیسے ہندو، جین سکھ ازم کنفیوشش ازم اور بودھ دھرم میں قسمت کا بہت زبردست تصور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آدمی کا ہر کرم لکھا ہوا ہے۔ اسی کے انوسار آدمی کام کرتا ہے۔'' اقبال نے کہا۔

''اسی وجہ سے شاید، مشرق کے تقدیر پرست علماء اسلام کے نزدیک، اسلامیت اور مشرقیت تقریباً ایک ہی ہیں اور اصل میں صرف مغرب ہی شیطان اعظم ہے۔ جو انسانی عمل کی اہمیت کا قائل ہے۔'' فضل حق نے رائے دی۔

''جب کہ اگر آپ قرآن پڑھیں، تو صرف ایک گناہ کے بارے میں آتا ہے کہ اللہ کبھی معاف نہ کرے گا اور وہ گناہ ہے شرک۔ جس کو بدترین غلاظت کہا گیا ہے۔'' اقبال نے بتایا۔

''مگر ہمارے تمام دانشور، سیاسی یا مذہبی حتیٰ کہ شاعر بھی، مشرقیت کو اسلام سے قریب مانتے ہیں اور صرف مغربیت کو طاغوت بتاتے ہیں؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''مشرق کیا ہے؟ سوائے بدترین شرک کے۔ ہندوستان برما، تھائی لینڈ، چین، جاپان، تمام مشرقی ممالک میں شرک کے علاوہ کیا ہے۔ کمیونزم نے حالانکہ چین وغیرہ سے شرک کا جنازہ نکال دیا۔ مگر بنیادی فلسفہ ان تمام ممالک کا صرف شرک ہی رہا ہے اور قرآن کیا ہے؟ اسلام کیا ہے سوائے شرک کے خلاف اعلان جنگ کے! مگر تمام علماء اسلام نے یہ تاثر دیا ہے گویا اسلام اور مشرقیت ایک ہی چیز ہیں اور اسلام کا اصل دشمن صرف مغرب ہے جبکہ مغرب کیا ہے؟ توحید سے قریب ترین اگر کچھ ہے تو مغرب ہی ہے کہ عیسائیت میں اگر شرک ہے بھی تو صرف اتنا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں اور وہ بھی لفظی معنی میں نہیں بلکہ ان کو روحانی بیٹا مانتے ہیں۔ لیکن اگر مشرق کے مقابلے میں دیکھا جائے تو ان کا شرک کچھ بھی نہیں۔ یہاں تو کروڑوں خدا ہیں۔ حتیٰ کہ جانور، پہاڑ اور ندیاں تک خدا ہیں۔ لہٰذا علمائے اسلام نے جب مشرق کو مغرب پر ترجیح دی تو صاف احکام الٰہی اور پیغام اسلام سے بغاوت کی۔ قرآن میں فرمایا گیا کہ ''پاؤ گے دشمنی میں سخت یہود اور مشرکین کو

اور دستی میں نرم نصاریٰ کو، اس لیے کہ وہ اہل علم ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔'' اقبال نے آیت الٰہی بیان کی۔

''یہ تو بالکل نئی بات ہے ہمارے لیے!'' امین حیران رہ گیا۔

''سورۃ المائدہ کی ۸۲ویں آیت ہے۔ میں نے بھی پڑھی ہے۔''، فضل حق نے تائید کی۔

''یہ تو بالکل نیا فلسفہ ہے۔ اس سے تو دنیائے اسلام اور عیسائیت میں صلح کے ہزاروں امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔'' کلیم نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''مگر ہمارے قاسمی، ندوی وغیرہ یہی تاثر دیتے آئے ہیں کہ مغرب سے بری کوئی شے نہیں دنیا میں۔ اس کا مطلب صاف یہ ہوا کہ مشرق، مغرب سے بہت بہتر ہے اسلام کے لیے۔ حتیٰ کہ شاعر اسلام بھی کئی جگہ یہی پیغام دیتے نظر آتے ہیں۔ اور حد یہ کہ علامہ اقبال کو شاعر مشرق جیسے لغو لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ مودودی کی تو بنیادی تھیسس ہی مغرب کے خلاف نفرت پھیلانا ہے۔ جبکہ مشرق کے خلاف ایک لفظ بھی کہیں نہیں لکھا۔ یہاں تک کہ درمیان عروج کشمکش سیاسی، اسلامیان ومشرکین ہند، بھی انھوں نے تیسرا رویہ اختیار کیا جبکہ وہ کوئی آپشن ہی نہ تھا۔ طے یہ کرنا تھا کہ ادھر جانا ہے یا ادھر۔ ۱۹۴۲ء میں آپ کی ایک شخصی جماعت بنی۔ پورا ملک آتش آزادی کی لپیٹ میں تھا۔ کانگریس مسلمانوں کے نام سے کچھ بھی دینے کے لیے تیار نہ تھی۔ موصوف نے خوب جم کر جناح صاحب کی مخالفت کی اور پاکستان بنتے ہی بوریا بستر اٹھایا اور عازم مملکت خداداد ہوئے۔ ملک بنانے والوں نے بنا دیا۔ ہم نے مخالفت کی لیکن اب تقاضۂ اسلام یہ ہے کہ وہاں حکومت الٰہیہ کا قیام کرنا ہے۔ معصوم عوام سے اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کرنے ہیں۔ کتنا آسان راستہ ہے۔''

''میرے خیال میں اس آیت کے مطابق اسلام کی اصل لڑائی مشرق سے ہے نہ کہ مغرب سے۔'' امین بھی قرآن کا مطالعہ کرتا رہتا تھا۔

''بیشک! لیکن صلیبی جنگوں کے بعد سیاست اور خواہش ملک گیری غالب آئیں اور خالص پیغام اسلامی پس پردہ چلا گیا۔ ورنہ اگر صرف پیغام توحید کو مدنظر رکھا جاتا تو

عیسائیوں سے دشمنی اتنی نہ بڑھتی جتنی بڑھادی گئی۔اس پر مجھے ایک عیسائی دوست سے ہوئی گفتگو یاد آئی۔بصرہ میں عیسائی بہت ہیں۔ان کے دس بارہ خوبصورت گرجا گھر بھی ہیں۔ایسے ہی اسلام پر بات ہورہی تھی میں نے اس سے کہا کہ ایک مسلمان پہلے یہودی ہوتا ہے پھر عیسائی اورتب جا کر مسلمان ہوتا ہے۔وہ بڑا حیران ہوا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ میں نے سمجھایا کہ حضرت موسیٰ پر یہودیوں سے زیادہ ایمان ہے میرا اس لیے یہودی ہوا۔ عیسائیوں سے بہتر حضرت عیسیٰ پر ایمان ہے مرا لہٰذا عیسائی ہو۔اس کے بعد مجھے حضرت محمد پر ایمان لانا ہے۔جن کا پیغام وہی تھا جو حضرات ابراہیم موسیٰ وعیسیٰ کا تھا۔قرآن کا واضح اعلان ہے کہ تمام پیغمبران پر یقین لازم ہے اوران سب کا ایک ہی پیغام تھا۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے نبیوں کے پیغامیں ترمیم کرلی۔اس لیے اسلام کوآخری بار پھر دنیامیں بھیجا گیا۔''اقبال نے واقعہ سنایا۔

''اس بیچارے کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟''کلیم نے پوچھا۔

''مارے حیرت کے کافی دیر تک دیکھتا رہا۔لیکن میرے بات پر اسے یقین نہیں آیا۔''

''یقین کیسے آتا۔تمام دنیامیں صدیوں سے ایک ہی لڑائی ہے۔علمائے اسلام مغرب کے خلاف نفرت پھیلانے اور مشرکین سے دوستی کرنے میں لگے ہیں۔طاقت عیسائیوں کے پاس ہے اور مسلمانوں کے پاس نعرے۔لہٰذا ہر جگہ مسلمان بری طرح مار کھا رہا ہے۔'' فضل حق نے تجزیہ کیا۔

''ہونا یہ چاہیے تھا کہ ان کو بتایا جاتا کہ حضرت عیسیٰ کو ہم کیا سمجھتے ہیں۔''ضمیر نے افسوس ظاہر کیا۔

''میرے خیال میں اسلام سے قریب ترین مذہب عیسائیت ہے۔لیکن مغرب کو گالیاں دیتے دیتے مولوی کی زبان نہیں تھکتی اور مشرق کے خلاف پھوٹے منہ بھی ایک لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا۔جبکہ مشرق بدترین غلاظت شرک سے آلودہ ہے۔اگر وہ مادہ پرست ہیں تو کیا مشرق مادہ پرست نہیں ہے؟ یہاں تو باقاعدہ لکشمی کی پوجا ہوتی ہے۔اگر اخلاقی سطح پر بات کی جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ سچائی، ایمانداری، دیانتداری،

غرباء کی مدد کرنے، وعدے پورا کرنے، ڈیوٹی پورا کرنے اور شرافت میں مغربی اقوام سے کسی کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہے۔ جھوٹ، دغا، فریب، ریاکاری، کام چوری میں اس وقت ہم لوگ دنیا کی ہر قوم سے آگے ہیں۔ وہاں دو باتیں عام ہیں شراب اور فری سیکس۔ جوڑ ھکے چھپے یہاں بھی ہیں اس کے علاوہ کوئی برائی ان میں نہیں ہے۔ پچھلی صدی میں سیکڑوں امراض کی دوائیں انھوں نے ایجاد کیں اور دنیا کے کونے کونے میں مریضوں کو مفت بانٹیں۔ آج کے انسان کے کام کی تمام چیزیں صرف انہیں کی ایجاد ہیں۔ مولوی ایئر کنڈیشنڈ کار میں بیٹھ کر جلسہ گاہ میں جاتا ہے اور انھیں کے ایجاد کیے ہوئے پبلک ایڈریس سسٹم پر انہیں کی ملامت کرتا ہے۔ اس معاملے میں بھی سرسید کا فلسفہ صحیح تھا کہ عیسائیوں سے دوستی کرو۔'' اقبال سانس لینے کے لے رکا۔

''کہاں کہاں کی نکال کرلاتے ہو۔ لگتا ہے کہ پورا دل و دماغ ناسور بن چکا ہے۔'' کلیم نے اقبال کی کمر پر ہاتھ رکھ کر ہمدردی جتائی۔

''اچھا اب خاموش ہو جاؤ۔ سر میں درد کر دیا۔'' شمیر نے سختی سے کہا۔

''تمہارے حال پر اپنے مرزا کہہ گئے ہیں۔'' امین نے کہہ کر شعر پڑھا۔

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کی شاد نہیں

''بس ایسا ہی سمجھ لو۔ اس سے بھی حال ہے۔'' اقبال نے ٹھنڈی آہ بھر کر اشعار پڑھے۔

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی او ریہاں
طاقت بقدر لذت آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبال دوش
صحرا میں اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں

''دیواریں تو بہت ہیں بیٹا۔ پوری قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہی تو ہے۔'' فضل حق نے راستہ بتایا۔

''آخری شعر پڑھو اس غزل کا۔ وہ بتائے گا کہ تم کیا ہو۔ نرے دشمن عقل۔'' امین نے

شرارت سے ہنستے ہوئے شعر پڑھا۔

دیکھا اسد کو خلوت وجلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

ہوشیار لوگ کبھی ان باتوں پر غور نہیں کرتے جن پر تم اتنی دیر سے بکواس کیے جار ہے ہو۔ ارے بھئی گھر بناؤ بچے کو پڑھاؤ دوسر شادی کرو۔ ہر وقت بیوقوفی کی باتیں کرتے رہتے ہو۔''

''عام زبان میں ایک برا سا لفظ ہے۔چ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ ہے۔'' ضمیر کو غصہ آ گیا۔

''میں بس اسی ٹائپ کا ہوں۔'' اقبال نے اعتراف کیا۔

''یہ مان لو کہ اس دیوار میں کوئی روزن نہیں بننا۔ چاہے ہم سب مل کر ہی کیوں نہ سر ٹکرائیں۔ ہر دم مولوی اس دیوار کی مزید سیسہ کاری کرتا رہتا ہے۔ میر کو اس کے انتقال کی غلط خبر ملی تھی۔'' کلیم نے یہ کہہ کر شعر پڑھا۔

کس قدر تھا خبیث شیخ شہر
اس کے مرنے سے شہر پاک ہو

یہاں تو بس اپنی ہی موت ہوگی وہ بھی اس طرح۔

میر ہلکان ہوگیا تھا بہت
سو طلب ہی میں پھر ہلاک ہوا

''بہت خوب! واہ واہ کیا مروایا ہے۔'' ضمیر نے داد دی۔

''مرنے سے پہلے ایک چائے اور نہ ہو جائے؟'' شمیر نے آواز دے کر زاہد سے چائے لانے کے لیے کہا۔

''بالکل کیوں نہیں، ہم لوگوں کے تو جنازے میں بھی چائے پلائی جائے گی۔''

''جلدی لاؤ زاہد۔ اقبال نے دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔'' کلیم نے بھی زور سے پکارا اور سگریٹ سلگا کر لمبا کش لیا۔

''چلیئے میں نے سب کا موڈ خراب کیا ہے۔میر کی ایک خوبصورت غزل کے کچھ اشعار سناتا ہوں شاید موڈ ٹھیک ہو،عرض ہے۔''

چھٹتا ہی نہیں ہو جسے آزارمحبت
مایوس ہوں میں بھی کہ ہوں بیمارمحبت
تقصیر نہ خوباں کی نہ جلاد کا کچھ جرم
تھا دشمن جانی مرا اقرارِ محبت
مجھ سا ہی ہومجنوں بھی یہ کب مانے ہے عاقل
ہر سر نہیں اے میر سزاوار محبت

''واہ واہ مزا آ گیا۔کیا سہل اشعار تھے نغمگی سے بھرپور۔''

''میں بھی سناتا ہوں میر کی ایک خوبصورت غزل کے دو اشعار۔''فضل حق نے بھی ماحول دیکھ کر کہا۔

''فرمایئے۔آپ بھی میر کے مارے ہیں۔''امین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کون نہیں ہے مع مرزا کے سنئے عرض کیا ہے۔''

دل میں اس شوخ کے نہ کی تاثیر
آہ نے آہ نارسائی کی
کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

''کیا گدائی کی ہے اور کیا کاسہ ہے۔''کلیم نے تعریف کی۔

''شوخ کے دل میں اترنا تو کوئی زیدی سے سیکھے۔پھر آہ کی نارسائی کی کیسا شکوہ۔وہ تو خود حسینوں کو مار رکھتا ہے اور دیدار کو کوئی پرابلم ہی نہیں۔وہ کیا ہے فارسی میں۔''اقبال نے شعر پڑھا۔

ہمیشہ آہوان سحرا سرخود نہادہ برکف
بامید آں کہ روزِ بشکار خواہی آمد

''بھئی یہ فارسی ہمیں نہیں آتی۔'' شمیر نے لوز بال پھینکی۔

''اور زبانوں کے تو خیر آپ ماشاءاللہ ماہر ہیں۔'' ''امین نے فوراً بال باؤنڈری کے باہر پہنچائی۔

''یہاں لوز ڈیلوری نہیں!'' کلیم نے شمیر کو یاد دلایا۔

''اتفاق سے شارٹ پچ چلی گئی آئندہ خیال رکھیں گے۔'' شمیر نے اعتراف کیا۔

''اچھا بھئی اب اٹھا جائے۔ دو بج گئے۔'' فضل حق نے انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

''ابھی کیسے؟ صبح نہیں ہونی ہے حضور۔'' ضمیر فوراً بولا۔

''نہیں، آج موڈ کچھ اکھڑ رہا ہے۔''

''موڈ اکھڑنے کی پوری بات ہے۔ طے ہوا تھا کہ فضل صاحب قصۂ دغا بیان کریں گے اور ہوا یہ کہ بیٹ پینڈ باندھ کر اقبال جو اترے ہیں تو ہنڈریڈیٹن ناٹ آؤٹ چل رہے ہیں۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''حضور ڈبل سینچری بنا چکے ہیں۔'' کلیم نے تصحیح کی۔

''ہاں یار ساری۔ آج زیادہ تر میں ہی بولتا رہا۔ وہ بات رہ ہی گئی جس کے لیے فضل صاحب کو دہلی جانے سے روکا تھا۔''

''اب ایسا ہے کہ چلا ہی جائے۔'' فضل حق اپنی کرسی سے اٹھ گئے لیکن اقبال نے ان کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا۔

''ابھی حسن پرست زیدی آتا ہوگا۔'' امین نے کہا۔

''حد سے بڑھی ہوئی حسن پرستی بھی ایک طرح کا شرک ہے اور زن پرست کافر۔'' ضمیر کو صنف نازک سے خاص چڑھ تھی۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' کلیم کو غصہ آ گیا۔

''اس کے پیچھے بھی ایک حادثہ ہے، اس نے سلمیٰ سے مات کھا کر مولوی کے عمامے میں پناہ لی۔'' شمیر نے بتایا۔

''یہ سانحہ کب ہوا۔''

''آتش نے ابھی جوانی میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ محلے کی چنچل اور بے پناہ حسین سلمیٰ سے مات کھائی اور مسجد کا کونا پکڑ لیا۔''

''ہوا کیا تھا؟'' سب نے پوچھا۔

''ماروں گا اگر بتایا۔'' ضمیر نے شمیر کو ہاتھ دکھایا۔

''اب نہیں بتاؤں گا۔ مختصر یہ کہ اس کی شوخی کو یہ پیار سمجھے۔ اس نے سینڈل دکھایا تو بھائی مسجد میں پڑے توبہ کر رہے تھے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، ہر عاشق کو کافر کہتا ہے؟''

''کافر گر کوئی ہو تو اپنے سید کی طرح ہو ورنہ نہ ہو۔ وہ تو ہر زاویے سے کافر تھے۔'' اقبال نے کہا۔

''کیا مطلب؟''

''یعنی یہ کہ ۱۸۶۵ء بنارس کا ڈی ایم، سرسید کا مہمان ہوا۔ سرسید ضلع جج تھے، دونوں میں میں خوب دوستی تھی۔ محسن الملک جو ابھی مولوی سید مہدی ہی تھے۔ وہاں پہنچ گئے۔ منظر دیکھ کر واپس ہونے لگے۔'' اقبال نے بتایا۔

''کیسا منظر؟''

''کہ سید صاحب شیکسپیئر کے ساتھ میز کرسی پر کھانا کھا رہے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اس زمانے میں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانا اور وہ بھی انگریز کے ساتھ، یہ تو دوہرا کفر ہوگیا۔ سرسید نے دوڑ کر پکڑا اور ساتھ بٹھالیا۔ یہ خبر کسی طرح ایٹہ پہنچ گئی جہاں کے سید مہدی رہنے والے تھے۔ ایک غدر مچ گیا پورے ضلع میں۔ کہا گیا کہ خدا سید احمد پر لعنت کرے اپنے مولوی سید مہدی کو بھی کافر بنالیا۔ یہ پہلا باقاعدہ فتویٰ تھا سید احمد کے کفر پر۔''

''اس فتوے کی رو سے تو شاید پوری دنیا میں آج ایک بھی مسلمان نہ ہو۔'' ضمیر نے اندازہ لگایا۔

''ظاہر سی بات ہے۔ ہم لوگ بھی میز کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے ہیں، سو کافر

ٹھہرے۔'' کلیم نے ہنس کر کہا۔
''دوسرا فتویٰ کب آیا۔''

8.4 جاؤ وہ نہیں خدا پرست

''سر سید لندن کو چلے۔ اس زمانے میں سمندر کا لمبا سفر تھا۔ اکثر انگریز ہی جایا کرتے تھے۔ اب وہاں کھائیں کیا۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ عیسائیوں کا ذبیحہ مرغ کبوتر خوب شوق سے کھایا۔ بس ہو گئے کافر۔'' اقبال نے کہا۔
''یعنی؟''
''یہ کہ باقاعدہ کفر کا فتویٰ لگا اور کہا گیا کہ گردن مروڑی مرغی کھانا کفر ہے اور سر سید کافر ہو گئے۔ حالانکہ قرآن میں صاف ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ جائز ہے اور جان بچانے کے لیے تو حرام کھانا بھی جائز ہے۔ اہل کتاب خواتین سے نکاح بھی جائز ہے۔ عیسائی اور مسلمان میاں بیوی ہو سکتے ہیں۔''
''یعنی ضمیر کے لیے چانس بنا کہ گوری سینڈل میں نہیں دکھاتی صرف پیار کرتی ہے۔'' امین نے ضمیر کو چھیڑا۔
''یہ کیسے علماء تھے کہ انہیں قرآن تک نہ آتا تھا؟'' کلیم حیران تھا۔
''معاشرتی، مذہبی اور سیاسی مسائل میں انہیں تفریق کرنا آتی ہی نہ تھی۔'' امین بھی بولا۔
''خیر اب آیئے آپ اصل فتوے پر کہ اس میں تمام مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا گیا کہ سر سید کو قتل کر دیں اور ان کے مدرسے کو ڈھا دیں۔'' اقبال نے دھماکہ کیا۔
''استغفراللہ ایسا فتویٰ بھی تھا کہ سر سید کو قتل کر دیا جائے؟'' سب ایک ساتھ چونکے۔
''اور کوئی معمولی فتویٰ نہ تھا۔ سیکڑوں الزامات ان پر لگائے گئے تھے۔ گمراہ عقائد سے لے کر نئی انگریزی اور سائنس کی تعلیم شروع کرنے کے سنگین الزامات تھے۔ اور پتہ ہے کہ کس نے دیا تھا یہ فتویٰ؟'' اقبال نے پوچھا۔

''کس نے دیا تھا؟'' سوال آیا۔

''پہلے تو اس فتوے پر ہندوستان کے تمام نامی گرامی علماء،فضلاء کے دستخط کرائے گئے۔پھرایک صاحب کومکہ شریف حج کرنے کے لیے بھیجا گیا۔وہاں انھوں نے چاروں مسلکوں کےشیوخ کی خدمت میں ہندستانی علماء کی متفقہ رائے دکھائی۔حضرات شیوخ کی ایک میٹنگ مدینہ میں ہوئی اور فیصلہ ہوا کہ ایسے شخص کا توقتل واجب ہے تمام عالم کے مسلمانوں پر۔گرفتاری سے پہلے توبہ کرلے تو چھوڑ دیں اگر بعد کو کرے تب بھی قتل کردیاجائے کہ گرفتاری کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی اور اس کے مدرسے کومسمار کردیاجائے؟''

''یعنی حنفی،شافعی،حنبلی اور مالکی ہرفقہ کےشیوخ کی۔یہ متفقہ رائے تھی؟'' ضمیر کی حیرت قابل دید تھی۔

''جی حضوراور وہ بھی مکہ ومدینہ کے۔''

''یا خدایہ کیسےلوگ تھے؟'' شمیر نے آہ بھری۔

''اب جومکہ مدینہ میں ایسی ہی یونیورسٹیاں بنائی جارہی ہیں۔کیا یہ سارے شیوخ مرگئے ہیں کہ فتوےنہیں دیتے۔'' کلیم کوغصہ آگیا۔

''یہ رہبران اسلام تھے؟'' امین نے ہاتھ پھیلائے۔

''ان کے ہاتھ میں ہے ہمارے کاروان کی لگام! ملت اسلامیہ کے قائد ہیں یہ لوگ؟'' فضل حق نے گریہ کیا۔

ضعف سےاے گریہ، کچھ باقی مرےتن میں نہیں
رنگ ہوکر اڑ گیا جوخوں کہ دامن میں نہیں
قطرہ قطرہ ایک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرےتن میں نہیں

''دنیا کی ہرعدالت میں ملزم کو بلاکر پوچھا جاتا ہے۔اسے موقع دیاجاتا ہے۔ایک یہ عدالت ہے کہ کسی فتوے میں نام تک نہیں لکھاجاتا۔صفائی کا موقع دینا تو درکنا۔بس پورے

عالم میں ایک شور مچایا جاتا ہے۔ ہر منبر سے مولوی تقریر کرتا ہے کہ فلاں کافر ہو گیا اور فلاں اسلام سے خارج۔ سرسید کا قتل تمام مسلمانوں پر واجب ہو گیا۔'' اقبال نے بیان کیا۔

''تو پھر کیا لکھا جاتا ہے فتوے میں؟'' ضمیر نے پوچھا۔

''کچھ اس طرح کا سوال ہوتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین مفتیان شرع متین، درمیان اس مسئلے کہ ایک شخص زید کے یہ عقائد ہیں اور یہ اعمال۔ اس مہمل تحریر پر چونکہ علماء شہر کے دستخط ہوتے ہیں لہٰذا فتویٰ دینے والے ادارے آنکھیں بند کر کے اس پر اپنی مہر لگا دیتے ہیں اور سازشی علماء زمانے بھر میں شور مچاتے پھرتے ہیں بس یہی طریقہ ہے۔''

''یہی ہے اسلام کا نظام عدل؟ اللہ کی ایک صفت عدل بھی ہے۔ ان لوگوں کو شاید اس عادل مطلق کو منہ نہیں دکھانا۔'' کلیم نے غصہ سے کہا۔

''نہیں، بلکہ غرور علم میں ان کی گردنیں اتنی اکڑ گئی ہیں کہ غیروں کے لگائے ذرا سے وار سے ہی دھول چاٹنے لگتی ہیں۔ مسلمانوں کے لیے نہایت سخت اور مشرکین کے لیے نہایت نرم ہیں یہ لوگ۔ اندرا گاندھی کو دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ میں مہمان خصوصی بنایا تھا ان لوگوں نے۔'' فضل حق نے بتایا۔

''استغفر اللہ! بس اللہ ہی سمجھے گا ان لوگوں سے۔'' ضمیر بھی غصہ میں تھا۔

''پوری تاریخ اسلام کا یہ شاید واحد فتویٰ ہے جس پر چاروں فقہوں کے شیوخ کے دستخط ہیں؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''شاید نہیں بلکہ یقیناً۔''

''پھر اس پر عمل کیوں نہیں ہوا؟'' شمیر نے پوچھا۔

''اب آئی اصل بات۔ اللہ کی لاٹھی میں آواز نہیں ہوتی۔ فتویٰ دینے والے تمام لوگ ذلیل و خوار ہوئے۔ وقت نے ثابت کر دیا کس کے چراغ سے مسلمان کے گھر میں روشنی ہے۔ پوری دنیائے اسلام آخر کار سرسید کے راستے پر آ کر رہی۔ مفتیان کرام کی زبانوں پر تالے پڑ گئے۔ کسی میں دم نہیں کہ زور سے سانس بھی لے سکے۔ ہاں کچھ لوگ اب بھی سازشیں کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے۔'' اقبال نے بتایا۔

''کچھ لوگوں نے کوشش تو کی ہوگی کہ سرسید کو قتل کرنے کی؟''امین نے سوال کیا۔
''ایسا کون تھا جو سرسید کے ذرا بھی قریب آیا ہو، اس مردِ مومن نے ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھا ہوا اور ہمیشہ کے لیے غلام نہ ہو گیا ہو۔سید مہدی، مشتاق حسین وغیرہ وغیرہ سب مخالف ہی تو تھے شروع میں۔ایک وقت آیا کہ جان مال تن من ہر چیز سے حاضر ہو گئے تمام مسلمان اور ایسا کارواں بنا کہ مخالفین تنکے کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔دنیا میں شاید ہی کسی کا یوم پیدائش اتنی دھوم دھام سے منایا جاتا ہو۔نہ جانے کتنے ممالک میں سرسید ڈے منایا جاتا ہے۔ہے کوئی دوسری مثال دنیا میں ایسی کہ بغیر کسی حکومت کی سرپرستی کے کسی کا جشن پیدائش منایا جاتا ہو؟ مجھے لگتا ہے کہ یہ کاروان روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔انشاء اللہ۔'' فضل حق نے دعا کی۔
''بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے اور سرسید کی راہ پر چلنے کے دشمنی اختیار کی لوگوں نے؟'' شمیر کو حیرانی تھی۔
''دنیائے اسلام اگر سرسید کے بتائے ہوئے راستے پر چلتی تو مغرب سے کوئی لڑائی ہی نہ ہوئی ہوتی۔بلکہ عیسائیت اور اسلام دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے انسانوں کو پیغام سلامتی دے رہے ہوتے۔''اقبال نے کہا۔
''وہ کیسے؟ یہ تو عجیب وغریب تھیسس ہے؟''امین نے سوال کیا۔
''آپ سرسید کے رویے پر نظر ڈالیں جو انھوں نے مغرب کے ساتھ اپنایا۔وہ یہی تھا کہ مغرب کی ہر چیز جو بہتر ہو اس کی پیروی کرو۔عقلی علوم کے دائرے میں ہو یا تمدن کے معاملے میں۔مہذب انداز زندگی شائستہ نشست و برخاست اختیار کرو۔ ہر معامے میں اکیڈمک رویہ اپناؤ اور جذباتیت یک قلم مسترد کرو۔ان کی خراب چیزوں کو ٹھکرا دو جیسے شراب اور آزاد اختلاط۔دوسری طرف مذہب کے معاملے میں سرسید نے عین پیروی قرآن کی۔قرآن دسوں جگہ بائبل کی تصدیق کرتا ہے لہٰذا دنیائے اسلام کے شاید وہ پہلے اور آخری عالم ہیں جنھوں نے بائبل کی تفسیر لکھی۔اس طرح لکھی کہ ایک یہودی عالم سے عبرانی کی تعلیم حاصل کی اور پھر تفسیر لکھی۔مجھے نہیں پتہ کہ عیسائی دنیا کا اس پر کیا ردعمل ہوا۔

اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے کہ عیسائی علماء کا سرسید کی تفسیر پر کیا ردعمل ہوا۔ ہوا ضرور ہوگا میرا خیال ہے کہ لندن میں ضرور اس پر بہت کچھ چھپا ہوگا۔''

''انگریز کوئی مسلمان تو ہیں نہیں کہ پچاسوں سال کے بعد بھی نہ پڑھیں کہ کیا لکھا گیا ہے۔ انھوں نے ضرور سرسید کی تفسیر پر ریویوز لکھے ہوں گے۔'' امین نے اندازہ لگایا۔

''سرسید کوئی معمولی عالم نہیں تھے۔ ان کو رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا اوارڈ مل چکا تھا۔ اس کے علاوہ ولیم میور کی کتاب کا جواب ''خطبات احمدیہ'' پر لندن میں بہت لکھا گیا تھا۔ اسباب بغاوت ہند پر وہاں کے پارلیمنٹ میں بحث ہو چکی تھی۔ سرسید کا نام یورپ کی علمی دنیا میں ایک مشہور و معروف نام تھا ایک معتبر عالم کی حیثیت سے۔'' فضل حق نے بتایا۔

''پھر تو ظاہر ہے کہ ان کی تفسیر پر بھی خاصی بحث ہوئی ہوگی وہاں کے علمی رسائل میں۔'' امین نے اندازہ لگایا۔

''انگریز کوئی خواہ مخواہ ہی دنیا پر حکومت نہیں کر رہے تھے۔ آج بھی ان کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں کوئی بھی نئی چیز شائع ہوتی ہے اس پر پہلا ردعمل لندن میں ہوتا ہے۔'' شمیر بولا۔

''دینی علماء کا رویہ سوائے بغض معاویہ کے اور کیا رہا ہے مغرب کی طرف۔ دنیائے اسلام میں پہلی بار کسی عالم نے بائبل اور عیسائیت پر ہمدردانہ نظر ڈالی اور یہاں تک کہ تفسیر بھی لکھ ڈالی۔ یہ جو تمام دنیا میں عیسائیت، اسلام کے خلاف محاذ آرا ہے اور بے دردی سے مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا ہے اگر سرسید کے بتائے ہوئے راستہ پر مسلمان چلا جاتا تو یہ ٹکراؤ نہ ہوتا۔ بہت ممکن ہے کہ مستقل مصلح کی کوئی صورت نکلتی اور عیسائیت عقدۂ تثلیث میں کچھ نرمی کرتی اور انسانیت کی فلاح کا کوئی راستہ نکلتا۔ مگر ہمارا ہر عالم فاضل ہر وقت مغرب کو برا کہتا ہے اور آگ میں تیل ڈالنے کا کام کر رہا ہے۔ اور آگ بھی ایسی جو صرف مسلمانوں کو جلا رہی ہے۔'' اقبال نے افسوس کیا۔

''مگر سرسید کو بھی آپ عالم کہنے لگے اس گفتگو میں ہمیں بالکل اچھا نہیں لگا۔'' ضمیر نے شکایت کی۔

''یہ بات تو ہے۔'' کلیم نے بھی کہا۔

''ایک فرق نوٹ نہیں کیا آپ نے۔ میں مدارس کے فارغین کو ہمیشہ دینی عالم کہا یا عالم فاضل۔ فاضل کا مطلب زائد، کبھی صرف عالم نہیں کہا۔'' اقبال نے صفائی دی۔

''مگر یہ تو بڑا باریک فرق ہے جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ سرسید کو عالم کہہ کر سرسید کی توہین نہ کریں آپ۔'' کلیم نے مشورہ دیا۔

''پھر کوئی دوسرا لفظ بھی تو نہیں ہے ڈکشنری میں۔'' اقبال نے بے بسی ظاہر کی۔

''ان مدارس کی چالاکی یہ دیکھئے کہ اپنے طلباء کو ڈگری ہی عالم یا فاضل کی دیتے ہیں۔ دنیا کا کوئی بھی تعلیمی ادارہ اپنے فارغین کو عالم کی ڈگری نہیں دیتا۔ اور یہ لوگ کاغذ کا ٹکڑا ملتے ہی عالم اور فاضل بن جاتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے معنی کے ساتھ جانا جاتا ہے۔ جماعت بھی بنائیں تھے تو بزوم خود ''جمعیۃ العلما ہند'' جیسے ہندوستان کے نامی گرامی فلاسفر اور سائنٹسٹ اس میں شامل ہیں۔ خود کو عالم کہنے والے بس یہی لوگ ہیں دنیا میں۔ نوبل پرائز ونرز بھی اپنے آپ کو عالم نہیں کہتے بلکہ انکساری اور بڑھ جاتی ہے۔ اور یہاں تکبر علمی سے گردنیں مثل لنگور کڑی رہتی ہیں۔'' فضل حق نے غصہ نکالا۔

''یہ چالاک لوگ ہیں۔'' امین نے تصحیح کی۔

''حماقت تو ہماری یونیورسٹی کر رہی ہے۔ اس کو بھی اپنے بیچلر آف آرٹس و سائنس کو عالم بے بدل اور فاضل بے مثل کے نام سے ڈگریاں دینی چاہئیں تاکہ مسلمانوں کو پتہ تو چلے کہ ہم کتنے عالم فاضل ہر سال پیدا کرتے ہیں۔'' ضمیر نے مشورہ دیا۔

''عالم فاضل نہیں بلکہ علماء فضلاء پیدا کر رہے ہیں۔'' امین نے شرارت کی۔

''نہیں مجھے سخت اعتراض ہے فضلاء پر۔'' کلیم نے اعتراض کیا۔

''پھر یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟'' شمیر نے پوچھا۔

''سرسید یہ مسئلہ بہت پہلے حل کر چکے ہیں۔'' اقبال نے بتایا۔

''بتایئے کیسے؟'' شمیر نے سوال کیا۔

''فرمایا کہ ہندوؤں کی پرانی تعلیم منگنا پنڈت پیدا کرتی ہے اور مسلمانوں کی فاتحہ کی روٹی کھانے والا ملا۔''

''فاتحہ کی روٹی کھانے والا ملا! کیا حقیقت بیانی ہے۔'' امین نے فوراً تائید کی۔
''پھر تو اپنی ہی ڈگریاں صحیح ہیں۔'' ضمیر نے ہتھیار ڈال دیئے۔
''ایسا ہے فضلاء کرام! اب اٹھا جائے کافی دیر ہوگئی۔'' فضل حق نے اٹھتے ہوئے تجویز رکھی۔
''ڈھائی بج گئے۔اب چلا جائے آج کا تو تمام وقت اقبال کی نظر ہوگیا۔جبکہ طے یہ ہوا تھا کہ فضل حق صاحب قصۂ دغا سنائیں گے۔'' کلیم نے شکایت کی۔
''آج زیادہ تر میں ہی بولتا رہا۔وہ بات رہ ہی گئی جس کے لیے فضل صاحب کو دہلی جانے سے روکا تھا۔'' اقبال نے اعتراف کیا۔
''ایسا ہے کہ میں کل صبح کی ٹرین سے چلا جاؤں گا۔آئندہ کبھی علی گڑھ آنا ہوگا تو تفصیل سے بات ہوگی۔''
''نہیں پھر تو یہ پھانس دلوں میں چبھی رہے گی۔ ایسا ہے کہ کل دوپہر رسل گنج میں بریانی کھائیں گے پھر روبی میں چائے پر وہ قصہ بیان ہوگا۔ پھر ریلوے اسٹیشن پر فضل صاحب کی طرف سے سی آف ٹی۔'' اقبال نے تجویز رکھی۔
''صرف تین چار گھنٹے کا ہی تو فرق ہے۔آپ کہہ رہے ہیں کہ صبح جائیں گے۔ہم لوگ دوپہر دو بجے تک کسی ترین میں آپ کو بٹھا دیں گے۔'' امین نے سمجھایا۔
''چلئے یہ بھی ٹھیک ہے۔اب میں اپنے دوست کے یہاں امیر نشاں جا رہا ہوں۔کل دس بجے آپ لوگ وہاں آجائیں۔ان کو خدا حافظ کہہ کر رسل گنج چلیں گے۔'' فضل حق نے مان لیا۔
''نہیں بلکہ ایسا ہے کہ آپ میرے ساتھ ہی رہیں تاکہ ہم لوگ دس بجے تیار ہوجائیں۔ورنہ تو آپ امیر نشاں میں انتظار ہی کرتے رہ جائیں گے۔یہیں سے سب تیار ہوکر امیر نشاں آپ کے دوست سے ملتے ہوئے رسل گنج چلیں گے۔ورنہ تو یہ لوگ بارہ سے پہلے اٹھنے والے نہیں ہیں۔'' اقبال نے تجویز رکھی۔
''جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔یہیں رہتے ہیں مگر سب لوگ دس سے پہلے ہی

آجائیں۔''

''ارے آپ آرام سے رہیے۔گیارہ سے پہلے تو کوئی نہ آئے گا۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے فضل حق کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''یہ بدمعاشی نہیں چلے گی۔اب میں اور نہیں رک سکتا۔''

''ٹھیک ہے دس سے پہلے ہی آجائیں گے۔''ضمیر پھر ہنسا۔

''اب تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہوگے۔''فضل حق نے ضمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔''کوئی آئے نہ آئے،ہم تینوں دس بجے رسل گنج روانہ ہوجائیں گے۔''

''پکڑے گئے بیٹا۔بہت تیزی دکھا رہے تھے۔''کلیم نے ضمیر کو چھیڑا۔

''ٹھیک ہے صاحبان،پھر یہ طے رہا۔''اقبال نے اعلان کیا۔

سب لوگ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونے لگے۔تبھی امین کو کچھ یاد آیا اور سب کو روک کر بولا۔

''یار یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنے سخت دشمن تھے یہ سب عالم فاضل لیکن ہر بڑے فاضل کی اولاد نے علی گڑھ میں ضرور داخلہ لیا۔دیوبندی،ندوی،بریلوی،اصلاحی،فلاحی کتنے سرسید کے مدرسے میں پڑھ گئے اور پڑھ رہے ہیں۔''

اقبال نے جواب دیا۔''ان سب سے غالب کی زبان میں کہہ دیا جائے۔

ہاں وہ نہیں خداپرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

''بس اب چلو ورنہ یہیں صبح ہوجائے گی۔''کلیم نے سب کو دھکیلا۔

○

(۹) کشمکشِ سیاسی فی الہند

9.1 قومیتِ سرسید

''یخنی کی بریانی بناتا ہے وہ۔'' اقبال نے بتایا۔

''واقعی بہت لذیذ تھی مگر بیٹھنے کی جگہ صاف نہ تھی۔'' فضل حق نے شکایت کی۔

''ہر جگہ مسلم ہوٹلوں کا یہی حال ہے۔قصبات میں تو اور برا حال ہے۔ یہاں کرسیاں اور میزیں تو پڑی تھیں، بڑا سا کمرہ تھا۔وہاں تو بس سڑک کے کنارے دیگ چڑھی ہے۔تھوڑی سی جگہ پر شیڈ پڑا ہے اور لکڑی کی تپائیاں رکھی ہیں۔پھٹے حال لڑکے ہاتھوں میں بریانی کی پلیٹیں تھما دیتے ہیں۔نوش فرمائیے۔وہیں ایک کونے میں کوئی لڑکا گندی پلیٹیں دھو رہا ہے۔مگر مسلمان ہے کہ بریانی پر پلا پڑا ہے۔'' کلیم نے کہا۔

''جانے دیجئے۔دیکھئے کہ یہ ہوٹل کتنا شاندار ہے۔تھری اسٹار ہے، ابھی کچھ سال پہلے ہی بنا ہے۔'' امین نے دھیان ہٹایا۔

یہ لوگ اس وقت بس اسٹینڈ کے سامنے روبی سنیما کی بغل میں روبی ہوٹل کی کشادہ بالکنی میں بیٹھے ہوئے تھے۔فرش پر قالین بچھا تھا۔گدے دار صوفوں کے آگے ٹیبلس لگی ہوئی تھیں۔پورا ہوٹل ایئر کنڈیشنڈ تھا۔کھڑکیوں پر خوبصورت پردے پڑے تھے۔باوردی بیئر سروس کے لیے مستعد کھڑے تھے۔صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔پوری بالکنی میں صرف یہ لوگ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے کنارے صوفوں پر بیٹھے تھے۔برابر کی ٹیبل سے ایک اور صوفے کو ملا لیا گیا تھا۔پیسٹریز اور چائے کا آرڈر دے دیا گیا تھا۔

''ہاں اب فرمائیے۔آج کوئی اور بول ہی نہیں سکتا۔صرف ایک ہی ٹاپک پر گفتگو

ہوگی۔''شمیر نے اعلان کیا۔

''گفتگونہیں بلکہ تنبیہ الغافلین کوسننا ہےبس۔''اقبال نے تائید کی۔

''بیشک! اگر کوئی بولا تو فائن۔ابھی چکن روسٹ کا جرمانہ لگا دیا جائے گا۔''کلیم نے وارننگ دی۔

''علامہ اقبال کے ایک شعر سے شروع کرتا ہوں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے وہ اس شعر کی تشریح ہے۔عرض ہے۔

گلۂ وفا جفا نما جو حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بتکدے میں بیاں کروں تو صنم پکاریں ہری ہری

''یعنی اصنام بھی مارے صدمے کے ہری ہری کہنے لگیں اگر وہ شکوہ جو علی گڑھ کو علی گڑھ والوں سے ہے بتکدے میں بیان کیا جائے؟''امین نے سوال کیا۔

''بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔حالانکہ بتکدے اور حرم میں ازلی بیر ہے۔''

''پھر بھی اصنام کو اتنا صدمہ ہوگا!''ضمیر بھی حیران تھا۔

''جی، مگر بہت دور سے شروع کرنی پڑے گی یہ داستان۔سرسید کی سیاسی زندگی کو پوری تفصیل چاہیے۔پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کے جانشینوں اور علی گڑھ والوں نے اپنے اپنے دور میں کیا رویہ اختیار کیا ان کے سیاسی نظریات اور فلسفہ کو جانتے ہوئے بھی۔اور ایسا کیوں کیا؟ اس سے کیا نقصانات ہوئے برصغیر کے مسلمانوں کو۔لاکھوں لوگ بے وطن ہوئے، خاندان بنٹے ملک بٹا اور مسلمان، انگریزوں کے بعد صنم پرستوں کا غلام ہوگیا۔''

''صنم پرستوں کا غلام، کیا مطلب؟''ضمیر نے پوچھا۔

'وہی ہندوراشٹر والی تھیوری۔کل نہیں سمجھائی گئی تھی۔''امین نے یاد دلایا۔

''ہاں یاد آ گیا۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ اگر علی گڑھ کے لوگ دغا نہ کرتے تو یہ سب نہ ہوتا؟''اقبال نے سوال پوچھا۔

''بیشک۔میرا تجزیہ بالکل ٹھیک ہے۔''فضل حق نے دعویٰ کیا۔

''مگر ثابت کرنا مشکل ہوگا۔'' کلیم نے کہا۔

''اتنا مشکل بھی نہیں ہے مگر مشکل یہ ہے کہ آزادی کے بعد مسلم نوجوان کو اندھیرے میں رکھا گیا۔ اس سے جھوٹ بولا گیا۔ کذب اور دروغ بیانی سے کام لیا گیا۔ اپنے سیاسی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے اور کانگریسی مسلم قائدین کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے سرسید کے پیغام سیاسی کو بدل دیا گیا۔ ایسا کرنے کی ہمت تو تھی نہیں کہ سرسید کے سیاسی فلسفہ اور کارناموں کو سچ سچ بیان کیا جاتا پھر کہا جاتا کہ وہ غلط تھے اور کانگریسی نیشنل ازم ہی ٹھیک تھا۔ ایسا کہنے والے کی مسلمان کھال کھینچ لیتا۔ لہٰذا ترکیب یہ نکالی گئی کہ سرسید کو ہی کیوں نہ قوم پرست بنا دیا جائے۔ اگر کبھی سرسید کی کانگریس مخالف تحریک کا ذکر بھی آئے تو یہ کہہ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کو غدر کے بعد وقتی طور پر سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے کہ غدر ٹائپ کو کوئی دوسری سچوئیشن نہ پیدا ہو۔ ان کا کوئی متضاد سیاسی نظریہ نہ تھا۔''

''مگر ایسا تھا؟'' شمیر نے پوچھا۔

''بالکل تھا۔''

''مگر ہمیں بھی یہی بتایا گیا۔ دس سال سے زیادہ ہم لوگوں کو علی گڑھ کے ہوسٹلوں میں رہتے ہوئے ہو گئے، کتنی تقاریر سنیں کتنے مضامین پڑھے۔ ہر شخص نے ہر بار یہی کہا اور ہی لکھا کہ سرسید بہت بڑے قوم پرست تھے۔ ہندو مسلمان خوبصورت دلہن کی دو آنکھیں ہیں۔ نہ جانے کتنے قوم پرست لیڈران علی گڑھ آئے ان کو پھولوں سے لاد دیا گیا۔ ہر دانشور اور لیڈر نے جناح اور مسلم لیگ کو ولین بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جب اساتذہ بھی یہی کہتے چلے آئے ہیں۔ تو ہم آپ کی بات کیسے مان لیں؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''یہی تو مشکل ہے۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ میری بات نہ مانیں۔ لیکن جو کچھ بھی کہوں گا اس کی تحقیق تو کریں۔'' فضل حق نے گزارش کی۔

''تحقیق کا کام تو اقبال کے سپرد ہے۔ یہ تو بقول مدعی سنکی ہے لگ جائے گا اس کام میں۔ اپنا سبجیکٹ اور کیریئر چھوڑ بس اسی کا ہو جائے گا۔'' امین نے جواب دیا۔

''کیریئر ترقی اور خوشحالی کو تو کشمیر کی وادی میں دفن کر آیا۔ روٹی دینے کا وعدہ اوپر والے

کا ہے۔بس ایک بوریےاور تکے کا طلب طارہوں۔''اقبال کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹادیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

زخم سینےاورادھیڑنے دونوں کا مزہ جدا جدا ہے۔

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

''چھوڑ و یار، اداسی مت پھیلاؤ۔''کلیم نے اقبال کے کاندھے پر ہاتھ مارا۔

''نہ صرف ریسرچ کی جائے گی بلکہ اسی تنخواہ سے شائع بھی کرایا جائے گا۔چاہے ایک ایک مسلمان دشمن ہوجائے۔''اقبال نے میز پر ہاتھ مارا۔

''مسلمان کیوں دشمن ہوجائے گا؟''ضمیر نے پوچھا۔

''کوئی فلسفہ جب بچپن سے لگا تار کان میں پڑتا ہےتو وہ اپنی ذات بن جاتا ہے۔جب اس پرضرب پڑتی ہےتو لگتا ہے کہ ہماری ذات پرحملہ ہوا ہے۔اس لیے ہر مسلمان میرا دشمن ہوجائے گا اگر فضل صاحب کی تھیسس صحیح ثابت ہوئی۔''اقبال نے منطق بیان کی۔

''مسلمانوں کی دشمنی کا مزہ تو بعد کوآئے گا پہلے پیسٹری کا مزہ لیا جائے۔''کلیم نے کانٹے سے پیسٹری اٹھاتے ہوئے کہا۔

''سارا منہ میٹھا ہوگیا۔لہٰذا چائے سے پہلے پوٹاٹو چپس منگائے جائیں۔''ضمیر نے پیسٹری کھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔اقبال کو پرسوں ہی تو تنخواہ ملی ہےاور بھی جو چاہو منگالو۔''امین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل آرڈر دیا جائے۔''اقبال نے ہری جھنڈی دکھائی۔

''یہ ہوئی نا بات۔''ضمیر نے بیئررکو بلا کر چپس لانے کو کہا۔

کچھ دیر میں بیئرر چپس اور چائے دونوں ایک ساتھ لگا گیا۔

''ساس کے ساتھ کھایا جائےتواور مزہ آئے گا۔''ضمیر نے خالی پلیٹ میں ساس انڈیلی۔

''مگر یہ تنبیہ الغافلین صاحب خاموش کیوں ہو گئے۔آپ جاری رہیں۔''اقبال نے فضل حق سے کہا۔

''جونیئر کون ہے ہم لوگوں میں؟''فضل حق نے پوچھا۔

''یہ ضمیر ہی ہے۔''

''چلو سب کے لیے چائے بناؤ۔''حکم ہوا۔

''میرے لیے شکر ذرا کم۔''

''میرے لیے زیادہ۔''

''اور آپ کے لیے درمیانی!ایسا ہے کہ میں شکر ڈالتا ہی نہیں۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے چائے انڈیلی،تھوڑا تھوڑا دودھ ڈالا اور پیالیاں بڑھا دیں۔

''سلامت رہو۔''امین نے شرارت کی۔

''ہاں فضل صاحب آپ کیا کہہ رہے تھے۔''اقبال نے چسکی لیتے ہوئے پوچھا۔

''ہندوستان میں جمہوریت کی شروعات،لوگ سمجھتے ہیں کہ ۱۹۵۰ء میں ہوئی جبکہ اس کی شروعات ۱۸۸۲ء میں ہی ہوگئی تھی۔جب برٹش حکومت کی طرف سے پہلا انتہائی تاریخ ساز قدم بڑھایا گیا۔اس وقت کی پارلیمنٹ،کونسل آف وائسرائے میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل پاس کیا گیا۔جس کی رو سے میونسپلٹیز اور ڈسٹرکٹ بورڈز میں عوامی الکشن کے ذریعے منتخب لوگوں کو جگہ دی گئی۔یہ جمہوری کا بیج تھا جو سرزمین ہند میں انگریزوں کے مضبوط ہاتھوں سے پیوست کیا گیا جو آج ایک عظیم الشان درخت بن کر لہلہا رہا ہے۔''فضل حق نے بتایا۔

''جمہوریت کی شروعات تو ۱۹۵۰ء دستور ہند کے نفاذ کے بعد ہوئی؟''ضمیر حیران ہوا۔

''دستور کیا ایک دو سال میں بن گیا یا امبید کر نے بیٹھ کر لکھ دیا؟''پورے ستر سال کی طویل مدت سے مختلف جمہوری قوانین نافذ کیے جا رہے تھے۔ہر چند سال میں انگریز حکومت ریفارم جاری کرتی تھی جس کی وجہ سے ۱۹۳۵ء تک ملک میں مکمل جمہوریت آ چکی تھی بس فرق یہ تھا کہ قانون ساز اسمبلیاں انگریز حکومت کی سرپرستی میں کام کر رہی تھیں۔

۱۹۴۷ء میں انگریز چلے گئے۔قوانین موجود رہے۔ برٹش طرز حکومت کو جوں کا توں اپنالیا گیا بس اتنے فرق کے ساتھ کہ وہاں دستوری ہیڈ شاہی خاندان سے ہوتا ہے اور یہاں صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوتا ہے۔''

''امبیڈکر کو فادر آف دستور کہا جاتا ہے۔'' کلیم نے کہا۔

''فادر ہی کیوں مدر بھی تھے وہ تو۔سب بکواس ہے؟'' اقبال بولا۔

''لوکل سیلف گورنمنٹ بل ۱۸۸۲ء سے سرسید کی جمہوری سیاسی زندگی کی شروعات ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے عظیم دانشمند ڈیموکریٹک لیڈر سامنے آتا ہے۔ ویسے تو اسباب بغاوت ہند، آگرہ دربار سے واک آؤٹ، ہنٹر کی کتاب کا ریویو، اردو کی حمایت میں مضامین اور عرضداشتیں، یہ سب سیاسی ہی معاملات تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کی موت وحیات جڑی تھی ان تحریکات سے۔لیکن یہ جمہوریت کی شروعات سے پہلے کی باتیں ہیں۔اردو کا معاملہ الگ ہے یہ تو آج تک چل رہا ہے۔''

''اردو کا معاملہ کیا تھا؟'' ضمیر نے پوچھا۔

''اردو کو کیا خطرہ تھا انگریز حکومت میں؟ وہ تو ایک زمانے سے راج بھاشا چلی آ رہی تھی اور مشترکہ زبان تھی سب کی۔'' کلیم نے سوال کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آج اردو کا مرتبہ کیا ہے ہندوستان میں؟'' فضل حق نے سوال کیا۔

''کچھ بھی نہیں۔ ہمارے یہاں طلباء دینیات کا پرچہ بھی ہندی میں لکھتے ہیں مساجد پر ہندی میں لکھا ہوتا ہے۔''عید کی نماج کا سمے۔'' اب کوئی اردو نہیں جانتا۔صرف مکاتب میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کہنے کو یہ مشترکہ زبان ہے۔'' اقبال نے بتایا۔

''یہی خواہش ازلی تھی برادران وطن کی۔ جو آزادی کے بعد پوری ہوکر رہی۔ انگریزوں کے آتے ہی سب سے پہلی سیاسی تحریک ہی انھوں نے اردو کو ہٹا کر ہندی نافذ کیے جانے کی چلائی تھی۔۱۸۶۷ء کے آس پاس تمام شمالی ہند میں سبھائیں قائم ہوگئیں اور حکومت پر زور ڈالا جانے لگا کہ اردو ختم کی جائے۔سرسید اس وقت بنارس میں ڈسٹرکٹ جج تھے۔ پتہ ہے انھوں نے اپنے انگریز دوست سے کیا کہا؟''

''بتایے کیا کہا؟''ضمیر فوراً ہی بولا۔
''وہی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے انھوں نے کہا کہ'' اردو ہندی کے جھگڑے کی وجہ سے، تعلیم یافتہ لوگوں کی بدولت، ہندو اور مسلمانوں کا ایک ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا۔ اور جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔'' انھوں نے مزید کہا کہ'' مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہوگا، مگر مجھے اپنی پیشن گوئی پر پورا یقین ہے جیسے جیسے تعلیم بڑھے گی یہ فساد بڑھتا جائے گا۔''
''پھر سرسید نے کیا تجویز پیش کی؟''امین نے پوچھا۔
''اردو کو ہٹانے کی تحریک چلتی رہی اور اس کا دفاع بھی ہوتا رہا۔ ہندی نوازوں کی یہ پہلی جمہوری سیاسی تحریک تھی۔ خیر سرسید اس وقت کی پارلیمنٹ، وائس رائے کی کونسل کے ممبر تھے جب ۱۸۸۲ء میں لوکل سیلف گرنمنٹ بل پیش ہوا۔انھوں نے اس پر اتنی زبردست تقریر کی کہ ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ سب بدل گیا۔''
''ہندوستان کی تاریخ اور جغرافیہ بدل گیا؟ وہ کیسے؟''شمیر حیران ہو گیا۔
''سرسید نے اس بل کی بنیاد پر حملہ کیا۔ جمہوری طریقۂ حکمرانی پر جون اسٹورٹ مل جو ایک معتبر اور مشہور فلسفی ہے، کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں ثابت کیا کہ ہندوستان میں مثل برطانیہ اور فرانس ایک قوم نہیں بستی۔ یہاں بہت سی قومیں رہتی ہیں۔ بہت سے مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ جن کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ تاریخی، مذہبی اور معاشرتی اختلافات نہایت شدید ہیں۔ زبانیں الگ الگ ہیں۔ مختلف خطوں میں باہمی ہم آہنگی نہیں ہے لہٰذا اگر ہندوستان کو ایک قوم کا وطن مان کر برطانوی جمہوری اصول وضوابط یہاں بھی رائج کیے گئے تو بجائے امن ہونے کے یہاں شدید بدامنی پیدا ہوگی اور بڑی قوم چھوٹی قوم کے مفادات پر حاوی ہو جائے گی۔ لہٰذا چھوٹی قوم کو بڑی قانونی تحفظ دیے بغیر یہاں جمہوریت نافذ کرنا سودمند نہ ہوگا۔ یہ ایسی زبردست تقریر تھی کہ اس کا خاطر خواہ اثر ممبران پر ہوا اور سرسید سے تجویز پیش کرنے کو کہا گیا۔''

''کانگریس تو شاید ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔یعنی ابھی کانگریس بنی بھی نہ تھی کہ سرسید نے ایک قومی نظریہ کو یک قلم مسترد کر دیا۔وہ بھی پارلیمنٹ میں؟'' کلیم نے پوچھا۔

''کانگریس قائم ہونے میں ابھی تین سال باقی تھے کہ سرسید نے متحدہ قومی نظریہ کی مخالفت کی۔ثابت ہوا کہ سرسید کانگریس مخالف نہ تھے بلکہ کانگریس سرسید کے نظریات کے برعکس قائم کی گئی۔'' فضل حق نے بتایا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سرسید ری ایکشنری نہیں تھے بلکہ کانگریس ان کے سیاسی نظریات کی مخالفت پر قائم ہوئی تھی۔'' شمیر نے فیصلہ سنایا۔

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔''

''انھوں نے تجویز رکھی، جو پاس ہوئی اور قانون کا حصہ بنی کہ حکومت تمام نشستیں الیکشن سے نہ بھرے بلکہ ایک تہائی سیٹیں اقلیت کے لیے مخصوص رکھی جائیں۔اگر وہ الیکشن میں نہ جیت سکیں تو ان کو نامزد کیا جائے۔''

''ظاہری بات ہے مخلوط الیکشن میں مسلمان جیت ہی نہیں سکتا تھا۔'' اقبال نے کہا۔

'اور یہی ہوا جناب۔دو سال کے بعد جب الیکشن ہوا تو علی گڑھ تک میں کوئی مسلمان نہیں جیتا تھا۔محمد یوسف، رسل گنج کو اسی قانون کے تحت حکومت نے نامزد کیا۔''

''ایک طرح سے سرسید نے جمہوری نظام حکومت میں مسلم سیاست کی داغ بیل ڈال دی۔'' شمیر بولا۔

''بیشک اور مسلمانوں کے مذہبی تہذیبی اور سیاسی تشخص کو بچالیا۔اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کسی کو خیال بھی نہ آتا کہ ہندوستان میں مسلمان بھی رہتے ہیں اور تمام طاقت اکثریت کے ہاتھوں میں چلی جاتی۔''

مگر ان کے اس کارنامے کا تو کوئی بھول سے بھی ذکر نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف باتیں بتائی جاتی ہیں۔'' کلیم کو حیرانی تھی۔

''اتنے سالوں میں پہلی بار یہ بات کہی جارہی ہے وہ بھی کمرے کے اندر بیٹھ کر۔'' امین نے گریہ کیا۔

''کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ہمیں اپنے محسن کے اتنے عظیم کارنامے کے بارے میں آج تک کسی نے نہیں بتایا۔'' کلیم نے افسوس کے ساتھ کہا۔

''مگر یہ تقریر آپ نے کہاں پڑھی۔ یہ کہاں چھپی ہے۔'' ضمیر نے پوچھا۔

''ایک دن اتفاق سے میں یونیورسٹی لائبریری کے سرسید روم میں چلا گیا۔ وہاں سرسید کی تمام ارجینل چیزیں رکھی ہیں۔ گزٹ، تہذیب الاخلاق، تقاریر کے مجموعے اور خطوط وغیرہ۔ امام الدین گجراتی کا مجموعۂ تقاریر یوں ہی دیکھنے لگا۔ اس تقریر پر نظر پڑی۔ میں نے پوری نوٹ کی اور ایک مضمون اس پر قومی آواز میں شائع کرایا۔ پہلے صدر جمہوریہ راجندر پرشاد نے بھی اپنی کتاب میں اس تقریر پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بل آج بھی لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ ۱۸۸۲ء ہی کہلاتا ہے اور ڈبیٹس جو اس بل پر ہوئیں حکومت کے ریکارڈ میں سب موجود ہیں۔''

''جو قوم اپنی تاریخ بھول جائے اس کا نام ونشان مٹ جاتا ہے۔ تاریخ بھلا دو قوم مٹادو۔ یہی کیا گیا ہمارے ساتھ۔ سرسید نے ایک بار کہا تھا کہ اس سے زیادہ بدنصیب کوئی قوم نہیں ہوسکتی، جو اپنی تاریخ بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے۔'' اقبال نے افسوس کے ساتھ کہا۔

''بہر حال جب تین سال کے بعد کانگریس بنی تو سرسید بحیثیت ایک سیاسی لیڈر بھی قوم کے سامنے آنے پر مجبور ہوگئے۔ مستقبل کے جمہوری ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی لڑائی بھی سرسید نے شروع کی۔ قیام کانگریس سے پہلے وہ ماضی کا سرمایہ بچانے میں لگے ہوئے تھے اور قیام کانگریس کے بعد وہ مستقبل کے ہندوستان میں بحیثیت اقلیت مسلمان کیسے زندہ رہ سکے گا، اس فکر میں لگ گئے۔''

''کانگریس کیوں بنی تھی اسکا کیا مقصد تھا؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''ہندو ایک زمانے سے تعلیم حاصل کررہے تھے۔ ۱۸۸۲ء کے بل نے ان کے تعلیم یافتہ طبقے میں ہلچل مچادی۔ وقت نے ایک نادر موقع ان کو فراہم کردیا تھا۔ اس بل کا مطلب صاف تھا کہ اب ہندوستان شاہی نظام حکومت سے بہت دور چلا آیا ہے۔ اب

عوامی جمہوریت آئے گی۔اور جو تعداد میں زیادہ ہیں انہیں کو حکومت ملے گی۔لہٰذا کانگریس مستقبل کے ہندوستان میں حکمرانی کے دعوے کے ساتھ میدان میں آئی۔مگر کانگریس انھوں نے خودنہیں بنائی بلکہ ایک انگریز آفیسر سر ہیوم کو آگے بڑھایا تا کہ یہ نہ سمجھا جائے کہ حکومت کے خلاف کوئی سازش کی جارہی ہے۔'' فضل حق نے بیان کیا۔

''محتاط قوم ہے۔مسلمان نہیں کہ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔علامہ نے تو نبیوں کی تلوار بھی عام مسلمان کو تھمادی۔ظاہر ہے کہ آتش گلزار بننے سے رہی۔نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان راکھ ہوگیا۔اور بقول علامہ کے ہی۔اقبال نے شعر پڑھا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

''علامہ بھی اپنے خوب تھے۔فرمایا۔'' کلیم کو بھی علامہ اقبال کی یاد آئی۔

نہیں تیرا نشیمن قصرسلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

''مسلمان مکان نہ بنائے گپھاؤں میں رہے بے نام ونشان۔'' امین نے بھی مذاق کو ہوادی۔

''اس شعر پر پاکستانی مزاح نگار ضمیر جعفری نے تضمین کی ہے۔'' ضمیر نے مسکراتے ہوئے شعر پڑھا۔

مکانوں کے نہ ملنے کی شکایت کی تو فرمایا
تو شاہیں ہے بسرا کر پہاڑوں کو چٹانوں پر

''یہ شعر اس کے لیے ہے جو بے روزگار ہے مکان کا کرایہ نہیں دے سکتا۔آسان راستہ ہے چٹانوں پر بسیرا کرے۔'' ضمیر نے بھی اپنی سی کہی۔

''اور سنئے مومن کو بے تیغ لڑنے کی صلاح تک دے ڈالی۔ایٹم بم سے بھی ایمان کا مقابلہ کروادیا۔'' مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی۔'' امین کا دل بھرا ہوا تھا۔

''سب سے زیادہ پریشانی تو مجھے اس نغمہ سے ہے جو ہر جلسے میں گایا جاتا ہے۔''

کلیم نے سیرئس ہوکر کہا۔

''کون سا نغمہ؟'' شمیر نے پوچھا۔

''ارے یار وہی، سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا''

''مگر علامہ تو یورپ میں رہے تھے!'' ضمیر نے یاد دلایا۔

''فریب، غلاظت، غربت، بیماری، جہالت نظر نہ آئی انہیں۔ اس نغمے کی سب سے خراب لائن وہ ہے جب فرمایا یونان ومصر وروما سب مٹ گئے جہاں سے۔ برادری اور کاسٹ سسٹم پر بھی نظر نہ کی انھوں نے تمام جہان کو مٹا دیا اپنی ماتر بھومی کے پریم میں۔'' کلیم بھی بولا۔

''شاعری کی ترنگ ہے۔ تم لوگ سیرئس ہو رہے ہو۔'' اقبال نے تنبیہ کی۔

''سب سے اہم بات کا تو ذکر ہی نہیں آیا۔ علامہ مولے کو شہباز سے لڑانے کے بھی قائل تھے۔'' امین نے یاد دلایا۔

''ایک ہی جھپٹے میں چیتھڑے اڑ جائیں گے۔'' ضمیر نے انجام بتایا۔

''مگر ایک شعر ایسا کہا ہے علامہ نے کہ میں تو بس غلام ہوں ان کا۔ فرمایا:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا

کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

''ایسا ایک شعر ہے؟ نہ جانے کتنے اشعار ہیں۔ تمام شاعری ہی فلسفۂ اسلامی سے لبریز ہے۔ یہ سب مذاق چھوڑ دو۔ لفظی معنی پر جاؤ گے تو چکر پڑ جائے گا۔ صحیح معنوں میں عارف باللہ تھا وہ شخص۔'' اقبال نے سنجیدہ ہوکر کہا۔

'میں تو پریشان ہوگیا ان باتوں سے۔ جانے بھی نہیں دیتے۔ ہر بار کوئی نہ کوئی بات نکل آتی ہے۔ سب کچھ بھول کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں سب کے سب۔'' فضل حق نے ڈانٹ پلائی۔

''سوری۔ یہ سب امین کی بدمعاشی تھی باقی لوگ پھنستے چلے گئے۔'' کلیم نے ہنستے ہوئے سارا الزام امین پر ڈال دیا۔

''اس میں کیا شک ہے۔نغمۂ ہندی میں نے ہی سنایا تھا!''امین نے طنز کیا۔

''یاد تو تم نے ہی دلایا تھا۔''کلیم نے پھر وار کیا۔

''اور یہ یاد نہ رہا کہ فضل صاحب کو کس لیے روکا ہے۔قیام کانگریس کا ذکر ہو رہا تھا کہ کیوں بنائی گئی۔''امین نے جواب دیا۔

''ظاہر ہے کہ جمہوریت میں سیاسی پارٹیاں حکومت کرتی ہی۔اب کوئی بادشاہ نہیں آنے والا تھا سینٹرل ایشیا سے کہ بابر صاحب گھوڑے پر بیٹھے چلے آرہے ہیں اور کلیم خاں کو گورنر بنا دیں گے۔اب تو جس کے زیادہ ووٹ ہوں گے وہی گورنر بنے گا۔'شمیر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور اس بات کو کانگریس بننے سے پہلے ہی سمجھ لیا تھا ہمارے سید صاحب نے۔یہی کہہ رہے تھے نا آپ۔''اقبال نے فضل حق سے پوچھا۔

''بیشک۔کانگریس بننے کے دو سال کے اندر ہی انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد سیاسی تحریک کے سد باب کے لیے ملک گیر تعلیمی تحریک چلانا تھا کہ مسلمان کانگریس میں نہ لگ جائیں۔ہنگامے بازی ہمارے مزاج سے زیادہ مطابق رکھتی ہے۔بعد میں اس کا نام کانفرنس کر دیا گیا۔ہر سال مختلف شہروں میں مسلمانوں کا تعلیمی میلہ سا لگتا تھا۔وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور دینی حالت کا جائزہ لیا جاتا تھا۔تعلیمی ادارے کھولے جاتے تھے، جتنے بھی پرانے کالج ملک میں بنے، سب اس تحریک کی بدولت قائم ہوئے۔سرسید خود وہاں جاتے تھے لیکن دوسری سالانہ کانگریس کا صدر جب طیب جی کو بنایا گیا تو سرسید نے تلوار میان سے باہر نکال لی۔''

''کیا مطلب؟ طیب جی کا کانگریس کا صدر بنانے سے سید صاحب کیوں ناراض ہوگئے؟''ضمیر نے حیرانی سے پوچھا۔

''کانگریس متحدہ قومیت کے نام پر اب مسلمانوں کو بھی اپنی صفوں میں لانا چاہ رہی تھی۔اس لیے ایک مسلمان کو صدر بنایا گیا تا کہ ان کے جوش سے کانگریس کی طاقت بڑھائی جاسکے۔اب تک سرسید تحریری مخالفت کر رہے تھے۔لیکن اب وہ عوامی لیڈر بن

کر سامنے آئے۔۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۸ء میں میرٹھ اور لکھنؤ کی ایجوکیشنل کانفرنسوں کے جلسوں کے بعد رات میں اجلاس عام کیے گئے۔اعلان ہوا کہ سرسید صاحب اپنے سیاسی خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔اس وقت تک ہر مسلمان ان کا قائل ہو چکا تھا۔ہزاروں مسلمان جوق در جوق ان جلسوں میں شریک ہوئے جہاں سرسید نے کانگریس کو مسلمانوں کو بہکانے کی پالیسی چھوڑ دینے کا چیلنج بھی کر ڈالا۔یہاں تک کہا کہ ہم اپنی افتادہ قوم کو کسی کو بھی اپنے پیروں سے روندنے نہیں دیں گے۔یہ رسی جل ضرور گئی ہے مگر اس میں گرمی ابھی باقی ہے خبر دار سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا۔''

''سید صاحب کو غصہ بھی آتا تھا؟''ضمیر نے پوچھا۔

''ایسا ویسا آتا تھا۔جو طلباء نماز چھوڑتے تھے خود اپنے ڈنڈے سے خبر لیتے تھے ان کی۔ایس ایس ہال میں گھوم گھوم کر لڑکوں کی خبر رکھتے تھے۔یوں ہی تھوڑی قوم کو قوم بنا دیا۔فجر کی اذان ہوئی اور سید صاحب مسجد میں حاضر۔ایک ایک کو پہچانتے تھے کہ کون نہیں آیا۔''اقبال نے بتایا۔

''کانگریس کے لیے تو وہ شمشیر بے نیام تھے۔طیب جی کو نہایت سخت خطوط لکھے اور افسوس ظاہر کیا کہ انھوں نے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔طیب جی نے وہی متحدہ قومیت پر دلیل دی کہ سب ہندوستانی ایک ہی زمین کا پانی پیتے ہیں،ایک ہی زمین کا اناج کھاتے ہیں اور سانس لیتے ہیں۔لہٰذا ایک قوم ہوئے۔سید صاحب نے پتہ ہے کیا جواب دیا اس بات کا؟''فضل حق نے سب کی طرف دیکھا۔

''کیا جواب دیا؟''

''کوئی بہت ہی خطرناک دلیل دی ہوگی کہ طیب جی نے پھر کوئی خط نہ لکھا ہوگا۔''امین نے اندازہ لگایا۔

''دلیل یہ دی کہ اگر ایک ہی زمین کی ہوا اور اناج کھانے اور پانی پینے سے قومیں بنتی ہیں تو اس طرح تو انسان اور سور بھی ایک قوم ہوئے۔''

''انسان اور سور؟''

''وہ مارا، کیا بات ہے۔طیب جی کو کئی دن تک نیند نہ آئی ہوگی۔'' کلیم خوش ہو کر بولا۔
''اسی پر بس نہیں کیا سید صاحب نے۔ بلکہ خاص ان کے شہر بمبئی میں کئی بڑے بڑے جلسے کروائے اور مسلمانوں کی طرف سے یہ تجویز پاس کرائی کہ وہ کانگریس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ پورے ملک میں ہر بڑے شہر میں ہزارہا جلسے علی گڑھ میں بیٹھے بیٹھے صرف ایک گشتی مراسلے پر جو اسلامی انجمنوں کے نام لکھا گیا تھا، منعقد کرادیے اور تجاویز پاس کرائیں کہ حکومت نہ سمجھ بیٹھے کہ کانگریس سارے ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔''
''اتنی بڑی عوامی تحریک پیدا کردی انھوں نے؟'' ضمیر کو حیرانی ہوئی۔
''مگر یہ تفصیل آپ کو کیسے پتہ چلی۔کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ہے۔'' اقبال نے پوچھا۔
''اسی کا تو رونا ہے اگر مسلمان تحقیق وتصنیف میں دلچسپی رکھتے تو یہ حال نہ ہوتا ان کا پوری دنیا میں۔''
''آپ کو ہی سب کیسے پتہ چلا۔'' اقبال نے سوال دہرایا۔
''وہیں سرسید روم میں۔گزٹ عوامی اخبار تھا۔سید صاحب خود اس کو ایڈٹ کرتے تھے۔۱۸۸۷ء کے بعد کے تمام شمارے میں نے دیکھے۔ساری فائلیں موجود ہیں۔ ہر شمارے میں اینٹی کانگریس جلسوں کی رودادیں شائع ہوئی ہیں۔لندن کے اخبارات اور اس وقت کے پائینر اخبار میں خبریں شائع کرائی جاتی تھیں۔ اور گزٹ میں اطلاع دی جاتی تھی کہ فلاں فلاں تاریخ کو یہ خبریں شائع ہوئیں۔ پائینر اخبار میں اس مسئلہ پر بہت زوردار مباحثہ چلتا رہا ایک طرف سید صاحب اور ان کے دوست دوسری طرف کانگریسی خاص طور سے بنگالی دانشور اور لیڈران۔
''یہ تو حیرت انگیز کہانی سنا رہے ہیں آپ۔اتنا بڑا سیاسی معرکہ لیا سرسید نے؟'' کلیم حیران تھا۔
''نہ صرف معرکہ لیا بلکہ سر کرکے دکھادیا۔اگر کچھ باغی نہ پیدا ہوئے ہوتے یا سرسید کے ہی زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے تو وہ قیمہ ہی بنادیتے ان لوگوں کا۔کانگریس صرف

برہمنوں کی پارٹی ہوکر رہ جاتی یا زیادہ سے زیادہ ہندو جماعت بن کر زندہ رہ پاتی۔''

''جب اتنا کچھ کررہے تھے تو اپنی پارٹی کیوں نہ بنائی انھوں نے؟''ضمیر نے سوال کیا۔

''یہ کس نے کہہ دیا آپ سے کہ اپنی پارٹی نہیں بنائی؟ ایک نہیں بلکہ تین سیاسی پارٹیاں بنائیں انھوں نے ایک کے بعد ایک۔''

''تین تین سیاسی پارٹیاں بنائیں سرسید نے؟''کلیم خاں کا تو منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ سرسید تو تعلیم دینے آئے تھے بس۔''امین بھی بولا۔

''یہی بتایا گیا کہ سرسید اسکول ماسٹر تھے۔اے بی سی پڑھانے آئے تھے بس۔''شمیر نے بتایا۔

''جی چاہتا ہے کہ آزادی کے بعد کے تمام مسلم دانشوروں اور تاریخ دانوں کو سرعام پھانسی دے دوں مگر کیا کروں۔قوم بھی انہیں کے ساتھ ہے۔اتنا بڑا دروغ، ایسا فریب کہ میر جعفر اور میر صادق بھی شرما جائیں۔''فضل حق کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔

''نہ صرف قوم بلکہ حکومت وقت کی سرپرستی بھی حاصل ہے انہیں۔''امین نے کہا۔

''حکومت کی کون پرواہ کرتا ہے اگر قوم ساتھ ہو۔''

''ان سیاسی پارٹیوں کی تفصیل بھی گزٹ میں موجود ہے؟''ضمیر نے پچھا۔

''اور کیا میں ہوا میں کہہ رہا ہوں؟ میں بھی اولڈ بوائے ہوں پورے بارہ سال ہوسٹل میں رہا۔میرے معصوم ذہن کو بھی ان دانشوروں اور تاریخ دانوں نے جھوٹے خیالات اور دروغ سے بھر دیا۔آپ لوگ جان بھی نہیں سکتے جو مجھ پر گزری جب میں نے اتفاقاً گزٹ کی ورق گردانی کی۔ ہر ہر صفحہ پر مجھ پر بجلی سی گرتی تھی۔ میں بھی سرسید کو اسکول ماسٹر اور قوم پرست سمجھتا تھا۔۱۹۴۷ء کے بعد سے یہ سازش چلی آرہی ہے نہ جانے کب تک چلے گی۔''

''میں بھی دیکھوں گا، نوٹ کروں گا اور شائع بھی کراؤں گا یہ وعدہ ہے ایک سرسید کے پیرو کا۔''اقبال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا۔

''محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی ایک سیمی سیاسی جماعت تھی۔جس کا مقصد تعلیم کو فروغ

دینے کے علاوہ یہ تھا کہ مسلمان کانگریس میں نہ جائیں۔کئی مرتبہ سرسید نے اس پلیٹ فارم کو سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا۔جیسے لکھنؤ اور میرٹھ کے عوامی جلسے۔دوسری خالص سیاسی جماعت انھوں نے انڈین لائلز ایسوسی ایشن بنائی جس کا مقصد مسلمانوں کے تئیں انگریزوں کی نفرت کو کم کرنا تھا۔اس کے بعد انھوں نے انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن بنائی جس میں مہاراجہ بنارس جیسے بااثر ہندوؤں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔اس کا مقصد تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا اینٹی کانگریس فرنٹ بنادیا جائے جس کے بینر تلے سے عوامی جلسے ہوئے لیکن جلد ہی ہندو اور مسلم ممبران میں اختلاف ہوگیا۔''

''مگر یہ دونوں جماعتیں تو کانگریس کی مخالفت میں قائم کی گئیں۔''امین نے کہا۔

''یقینی طور سے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ری ایکشنری اقدام تھا۔مگر دووجوہات سے ضرور تھا۔ایک یہ کہ مسلمانوں کو کانگریس میں جانے سے روکا جائے۔اور دوسرا یہ کہ حکومت پر ظاہر کردیا جائے کہ کانگریس پورے ہندستان کی نمائندگی نہیں کرتی۔''

''مگر تیسری جماعت کے بارے میں آپ نے ابھی تک نہیں بتایا؟''امین نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ سید صاحب ابھی آخری معرکے کی تیاری میں لگے تھے۔فرصت چاہیے تھی۔حجت تمام ہونی چاہیے تھی اور فلسفیانہ خامیاں ابھی باقی تھیں۔انتظام دائمی کرنا تھا۔ابھی کالج قائم ہوئے چند ہی سال ہوئے تھے۔بقول شاعر یہ صورت حال تھی:

دکھاؤں گا تماشا،دی اگر فرصت زمانے نے
میرا ہر داغ دل،ایک تخم ہے سرو چراغاں کا

مگر آخر کار انھوں نے یہ کردکھایا۔

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنستاں کا

مدعی شبنم کی طرح تحلیل ہوگئے۔مسلمانوں کے لیے آخر کار انھوں نے ۱۸۹۳ء میں اپنے انتقال سے صرف پانچ سال پہلے وہ تجویز پاس کرادی،جس کے تحت صرف تعلیم کو

زندگی کرنے کے لیے ناکافی قرار دیا گیا۔''

''کیا مطلب؟ سرسید نے ہی یہ تجویز پاس کرائی کہ صرف تعلیم زندگی کے لیے ناکافی ہے۔'' ضمیر حیران تھا۔

''یقیناً۔ منظر تھا ان کا اپنا گھر۔ موجودہ سرسید ہاؤس۔ موجود تھے سبھی تحریک علی گڑھ کے قائدین، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ اور پرنسپل پروفیسر بیک جو سید محمود کے لندن کے دوست تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کالج کے روح رواں اس کی شریانوں میں دوڑتا ہوا لہو۔ موضوع تھا ملک کی بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال، جمہوری قوانین کا اجراء، کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت کہ تمام ہندو اس میں شریک تھے اور مسلمانوں کا جمہوری ہندوستان میں مستقبل۔ سرسید نے ایک افتتاحی تقریر میں صورت حال کا نقشہ کھینچا اور حاضرین سے سوال کیا کہ مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ سب نے اپنے اپنے خیالات رکھے محسن الملک نے عرض کیا کہ تمام ہندوستان کے مسلمان اس وقت آپ کے پیچھے کھڑے ہیں آپ سے زیادہ ان کے دکھ کا درماں کوئی نہیں جانتا۔ آپ کی تجویز ہر شخص سر آنکھوں پر رکھے گا اور آخری سانس تک اس پر عمل پیرا رہے گا۔ سید صاحب نے تجویز پیش کی کہ اب جبکہ ملک ایک نئے سیاسی انقلاب کے دہانے پر ہے صرف تعلیم کی حد تک اپنی کوششوں کو محدود رکھنا سودمند نہ ہوگا۔ لہٰذا ایک سیاسی جماعت محمڈن ڈیفنس ایسوی ایشن آف اپرانڈیا تجویز کی۔ لیجئے صاحب، جمہوری ہندستان میں مسلمان کیسے رہے سرسید نے اسکا انتظام بھی کر دیا۔ اور مسلمانوں کی سیاسی جماعت قائم ہوگئی۔''

''آج تک کہیں یہ ذکر نہیں آیا کہ سید صاحب نے کوئی سیاسی پارٹی بھی بنائی۔'' کلیم نے حیرانی سے کہا۔

''اتنا بڑا فریب کیا ان دانشوروں نے ہمارے ساتھ! کتنی نسلیں قومیت کی دیوی پر بھینٹ چڑھا دیں۔'' امین کو غصہ آ گیا۔

''اتنی انقلاب آگیں اور حیات افروز تحریک کو یہ تاریخ داں اور استاد ایک دم ہضم کر گئے کہ پچھلی نصف صدی میں طلبا اور نوجوانوں کو ہوا تک نہ لگنے دی۔'' اقبال بھی حیران

رہ گیا۔

''صرف یہی نہیں بلکہ الٹا سبق پڑھایا۔ایسی داستان سنائی سرسید کے نام پر کہ کوئی دشمن بھی کیا دغا کرے گا لعنت اللہ علی الکاذبین۔''ضمیر نے کہا۔

''ایک عوامی جلسے میں یہاں تک کہا انھوں نے کہ فرض کیجئے انگریز آج ہندوستان چھوڑنا چاہیں تو کون ہندوستان پر حکمرانی کرے گا؟انگریزوں کے سامنے ہم یہ تجویز رکھیں گے کہ ہمیں اپنے اجداد کا وہ قلم استعمال کرنے کی اجازت دی جائے جو حکمرانی کی سند لکھنے کا اصل قلم ہے۔''

''سبحان اللہ جو ہاتھ ماں اور بھائیوں کے مرنے پر بھی تلوار تک نہ پہنچا وہ کانگریس کے خلاف شمشیر بے نیام ہو گیا۔''کلیم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''میں نہیں سمجھتا کہ سرسید کو زندگی میں کبھی اتنا غصہ آیا ہوگا۔علماء فضلاء کے الزامات کو تو وہ مزاحیہ فقروں سے اڑا دیتے تھے لیکن اب سوال اہل اسلام کو نئے انداز سے غلام بنانے کی سازش کا تھا۔لہٰذا زندگی میں شاید پہلی بار انھوں نے قرآن کی آیت پیش کی۔جس میں عیسائیوں کی دوستی پر بمقابلہ یہود و مشرکین اعتماد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔''

''مگر ہمارے دینی فضلاء نے تو اس حکم کو بالکل الٹ دیا۔انگریزوں سے نفرت، مغرب سے نفرت میں بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں اور مشرق میں انہیں اسلام نظر آتا ہے۔''اقبال نے کہا۔

''یعنی شرک میں اسلام!''امین نے جوڑتے ہوئے کہا۔

'اور اسلام میں شرک!اتنا ظلم کیا ہے ان لوگوں نے کہ اصنام بھی ہری ہری پکارنے لگیں۔

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسد کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

سرسید نے اس پر ہی بس نہ کیا بلکہ مسلمانوں کو یہاں تک یاد دلایا کہ میرے پیارے بھائیو اور دوستو یہ ہمارے ہی اجداد تھے جنھوں نے نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کو بھی لرزا دیا تھا۔تم جانتے ہو کہ حکمرانی کسے کہتے ہیں اور حکومتیں کیسے کی جاتی ہیں۔یہ بنگالی کانگریس

جو چھری دیکھ کر میز کے نیچے چھپ جائیں گے ہمیں محکوم بنانا چاہتے ہیں اور بھی بہت کچھ۔'' فضل حق نے بتایا۔

''باپ رے باپ۔ اتنا غصہ آ گیا تھا سید صاحب کو؟'' ضمیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''دوراندیش نگہ چاہیے جو زمانوں کو چیرتی ہوئی مستقبل کا راز فاش کر دے۔ معاملہ بالکل صاف تھا بقول سید صاحب کہ مسلمان ایک ہے تو ہندو چار ہیں۔ جوئے کے اس کھیل میں چار پانسے ہمارے خلاف ہیں۔ ہمارے جیتنے کی کوئی راہ ہی نہیں۔ لہٰذا ہم اپنے تحفظ کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں کریں۔ زمانے کی رو کو تو بدل نہیں سکتے۔ مکمل جمہوریت آ کر ہی رہے گی جس کی شروعات ہو چکی ہے۔ لہٰذا پہلا بنیادی کام انھوں نے کر دکھایا کہ متحدہ قومیت کو مسترد کر کے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈال دی جو مسلمانوں کے حقوق کی جنگ جاری رکھے۔ مگر خدا کو دوسرے مسلمانوں کا بھی امتحان منظور تھا۔ اگلے پانچ سالوں میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ۔ لازم ہے کہ ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے۔''

''مارچ ۱۸۹۸ء میں انتقال ہوا شاید؟'' شمیر نے اندازہ لگایا۔

''آخری زمانہ بہت مشکل رہا ان کے لیے۔ کالج میں غبن ہوا۔ سید محمود کو دماغی عارضہ لاحق ہوا۔ کئی دوست بھی دشمن ہو گئے کہ جانشینی کا سوال تھا۔ بورڈ آف ٹرسٹیز کے سکریٹری بننے کے کچھ لوگ خواہش مند تھے۔ آپ کو پتہ ہے کہ جو شخص اتنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہا اس کے کفن تک کے لیے چندہ ہوا۔ وقار الملک نے روتے ہوئے کہا کہ یہ آخری چندہ ہے سید صاحب کے لیے اب وہ کبھی ہاتھ نہ پھیلائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے فضل حق کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ باقی سب کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

''ایک تقریر میں کہا کہ میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو لکھے کی بدملا تا ہوں۔ مگر اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔'' امین نے بتایا۔

''ایک بار سید صاحب حیدر آباد گئے۔ وقار الملک وہاں وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے سید صاحب کے اعزاز میں ایک بڑی دعوت کرنی چاہی۔ پوچھا کہ کتنا پیسہ خرچ ہوگا اور سب کالج کے چندے میں رکھوالیا۔ دوبارہ امراء نے تحریک کی کہ شاندار ڈنر ہو۔ پھر یہی

صورت ہوئی۔ پتہ ہے جناب کہ اپنے بیٹے کی شادی میں ولیمہ تک نہیں کیا۔لوگوں نے شکایت کی تو جواب دیا کہ اگر ولیمہ کرتے تو اتنا پیسہ خرچ ہوتا،سو وہ کالج فنڈ میں دے دیا۔''

''بیٹے کا ولیمہ تک نہیں کیا؟ کتنی حیرت کی بات ہے آج تو ہر شخص ولیمے پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔''شمیر نے کہا۔

''کوتاہ بین کرتے ہیں۔عارضی شان وشوکت دکھانے کے لیے۔''اقبال بولا۔

''عارضی ہی سہی۔مگر اب چائے ہو جائے کہ اتنی دیر ہوگئی صرف باتیں ہو رہی ہیں۔'' ضمیر نے یاد دلایا،سب لوگوں نے تائید کی۔

''باتوں میں بالکل دھیان ہی نہ رہا۔''اقبال نے بیئرر کو اشارے سے بلایا اور چائے لانے کو کہا۔

''صرف خالی چائے۔''کلیم نے سوال کیا۔

''یہاں نمک پارے نہیں ملتے۔کہو تو چپس منگائیں۔''اقبال نے پوچھا۔

''مگر پھر وہ علی گڑھ کی چائے نہیں رہ جائے گی۔''فضل حق نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اسپریسو کافی تک قربان موسیٰ خاں کی چائے پر۔''کلیم کو موسیٰ خاں کی یاد آئی۔

''پھر وہیں چلیں۔''شمیر فوراً بولا۔

''فضل صاحب سے پوچھ لو۔''اقبال نے کہا۔

''پھر تم لوگ چکر ڈال رہے ہو۔مجھے یہیں سے اسٹیشن جانا ہے۔''فضل حق فوراً سختی سے بولے۔

''پھر کوئی دوسری ترکیب سوچتے ہیں۔''امین نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟''فضل حق چونکے۔

''کچھ نہیں۔آپ کو آج ہی روانہ کرنا ہے۔یہ سمجھ لیجئے کہ آپ ٹرین میں بیٹھے ہیں۔'' امین نے جلدی سے صفائی دی۔

''ہاں بھئی جونیئر، چائے بناؤ۔''بیئرر کے چائے رکھتے ہی کلیم نے ضمیر کو یاد دلایا۔

''ہمیشہ جونیئر ہی رہوں گا میں؟''شمیر نے ٹی پاٹ اٹھاتے ہوئے شکایت کی۔

''ظاہری بات ہے ایز ولمنٹ نمبر تو بدلنے سے رہا قبرستان تک۔'' امین ہنسنے لگا۔

''اس سے تو رضا کی ہی چائے اچھی تھی کہ لڑکے نے گلاس میں چائے تھما دی۔ بنانے ونانے کا کوئی چکر ہی نہیں۔'' ضمیر نے حسرت کی۔

''مگر ہمیں تو مزا آ رہا ہے۔'' کلیم نے چڑایا۔

''بیٹا تم بھی کہیں نہ کہیں جونیئر ضرور نکلو گے۔''

''میں تمہارے بغیر کہیں جاتا ہی نہیں۔ ایک جونیئر ہمیشہ بغل میں رکھتا ہوں۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''یہ گلاس کی چائے تو اب شروع ہوئی ہے۔ ہمارے زمانے میں تو پورے اہتمام سے دم کی ہوئی گرین لیبل چائے آتی تھی۔ دودھ شکر سب الگ الگ۔ کپ میں گرم پانی پڑا ہوا۔ لائبریری کینٹین میں صوفے پڑے ہوئے تھے۔ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر گھنٹوں بیٹھے ہوئے غزلیں اور پرانے گانے سنتے رہتے تھے گراموفون پر۔ کیا آرام کا زمانہ تھا۔ اب تو لگتا ہے کہ ایک آفت ہے ہر طرف بے پناہ طلباء اور آس پاس کس قدر آبادی ہوگئی ہے کہ بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں۔ صرف چند ہزار طلباء تھے اور دور دور تک آبادی کا نشان نہیں تھا۔ اب تو شاید بیس ہزار سے زیادہ طلباء ہیں۔ وقت کتنا بدل گیا ہے مگر یہ لڑکے مجھے زیادہ فاسٹ لگے۔ پڑھائی میں زیادہ تیز اور زندگی سے زیادہ قریب۔ ہمارا زمانہ تو خوابوں کا زمانہ تھا۔ یہ حقیقت کا زمانہ ہے۔ وقت کے ساتھ علی گڑھ خوب بدل گیا ہے۔ لڑکیاں بھی تعلیم میں بہت تیز ہوگئی ہیں۔ لڑکوں کو جلد ہی پیچھے چھوڑ جائیں گی۔'' فضل حق نے اپنا زمانہ یاد کیا۔

''انشاءاللہ کہئے حضور۔ ٹیڑھا زیدی تو اسی خواہش میں مرا جا رہا ہے۔'' امین بولا۔

''کہتا ہے کہ ان کی شکست تو ہماری جیت ہے ہی۔ ان کی فتح میں بھی ہماری جیت ہے۔''

''کیا خوب منطق ہے۔''

9.2 سبز ہلالی پرچم

''چھوڑیئے ان باتوں کو یہ بتایئے کہ سرسید کے انتقال کے بعد کیا ہوا؟'' اقبال نے فضل صاحب کومخاطب کیا۔

''گزٹ بند ہوگیا۔سکریٹری بننے کی سیاست تیز ہوگئی۔ایسا لگنے لگا کہ کارواں منتشر ہوجائے گا۔مگر پھر جلد ہی محسن الملک کوسکریٹری منتخب کرلیا گیا۔پچھلے تیس سال سے وہ سرسید کے ہم قدم اور ہمراز تھے۔سرسیدتحریک کوان سے زیادہ کوئی نہیں جانتا تھا۔دوسرے شخص تھے وقارالملک۔مگران کا رجحان تحریک کے سیاسی پہلو کی طرف زیادہ تھا۔لہٰذاایک نہایت مناسب جانشین مقرر کرلیا گیا۔گزٹ ایک سال بند رہنے کے بعد جب محسن الملک کی ادارت میں شائع ہوکر دوبارہ منظرعام پرآیا تو اس میں محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی پوری روداد شامل تھی۔مسلمانوں کو یاددلایا گیا کہ سرسید کا سیاسی اقدام یہ تھا۔لیکن چونکہ جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا اس لیے سیاسی محاذ پر زیادہ کام نہ ہوسکا اس لیے اب وہ اپنے مشوروں سے نوازیں کہ کس طرح سیاسی کام کوآگے بڑھایا جائے۔۱۹۰۱ء کے بعد کے تمام شماروں میں اس وقت کے تمام اہم مسلم رہنماؤں کے مضامین اورخطوط سیاسی تحریک کی حمایت میں شائع ہوتے رہے۔وقارالملک نے تمام شمالی ہندستان کے شہروں کا سیاسی دور شروع کردیا۔ جہاں بھی وہ جاتے تھے لوگ سرسید کے جانشین کی طرح ان کا استقبال کرتے تھے۔ہرشہر سے دوآدمیوں کا انتخاب عمل میں آتا گیا۔آخرکارلکھنؤ میں مسلمانوں کا پہلا سیاسی کنونشن منعقد ہوا۔اوروقارالملک وغیرہ نے شملہ ڈیپوٹیشن ترتیب دیا جوسرآغا خان کی قیادت میں وائسرائے آف انڈیا کی خدمت میں پیش ہوااورمسلمانان ہند کی طرف سے چارٹرآف ڈمانڈ پیش کیا گیا۔''

''کیا اب پوراعلی گڑھ مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کے لیے کام پر لگ گیا تھا؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''نہیں ایسانہیں تھا۔مگر چونکہ کانگریس پچھلے بیس سالوں میں کتنے ہی سیاسی جلسے کرچکی تھی۔جن کی رودادیں ہراخبار میں شائع ہوتی تھیں۔لندن میں بھی کانگریس قائم کرلی گئی تھی۔دوسری طرف مسلمان اس میدان میں بھی ان سے بہت پیچھے تھے۔سرسید نے چونکہ

مسلمانوں پر کانگریس کی مضرت رسانی ثابت کر دی تھی لہٰذا اب ان کے متحدہ سیاسی عمل کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ شملہ ڈیپوٹیشن نے تین اہم مطالبے حکومت کے سامنے رکھے۔''

''کیا مطالبات تھے اور کیا حکومت نے مان لیے؟'' امین نے پوچھا۔

''پہلا مطالبہ تھا یہ کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا انتظام کیا جائے۔ دوسرا یہ تھا کہ ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے اور تیسرا یہ تھا کہ نوکریوں میں مسلمانوں کو رزرویشن دیا جائے۔''

''جدگانہ انتخاب؟ یہ کیا ہوتا ہے۔'' ضمیر حیران ہوا۔

''یہی تو تھا مسلمانوں کی تمام سیاسی قوت کی اساس۔ اگر یہ نہ ہوتا تو برصغیر کے مسلمان سیاسی اور اقتصاری طور پر کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔''

''مگر ایسا کیا تھا اس میں کہ اس کے بغیر برصغیر کا مسلمان سیاسی اور اقتصادی طور سے ختم ہو گیا ہوتا؟'' شمیر نے جاننا چاہا۔

''پاکستان اور بنگلہ دیش کا تو نام ونشان بھی نہ ہوتا۔ پورے برصغیر کا مسلمان برما سے لے کر کوئٹا تک پنڈتوں، راجپوتوں اور یادووں وغیرہ کی مصاحبت کر رہا ہوتا۔''

''جناح و لیاقت علی خاں وغیرہ کوئی نہ ہوتا؟'' امین نے پوچھا۔

''جی کوئی نہ ہوتا بس آزاد اور چھاگلہ ٹائپ کے مسلمان ہوتے۔''

''آپ تو پہیلیاں بجھا رہے ہیں۔ ذرا کھل کر بیان کریں۔'' امین نے تفصیل جاننی چاہی۔

''علی گڑھ نے اتنا طاقتور ہتھیار مسلمانوں کے ہاتھوں میں دے دیا تھا کہ آزادی کے بعد سب پہلے دستور ہند سے جداگانہ انتخاب کو ختم کیا گیا اسی متحدہ قومیت کے نام پر جس پر کانگریس قائم ہوئی تھی۔ اگر یہ انتظام قائم رہتا تو مسلمان دوبارہ ہندوستان میں سیاسی طاقت بن جاتا۔ لہٰذا متفقہ طور سے اس کو کالعدم قرار دیا گیا اور مخلوط انتخاب کو جاری کر دیا گیا، جس کی بنیاد پر اب الیکشن ہوتے ہیں۔ مسلمان چونکہ آبادی میں کم ہیں اور انہیں اپنے قائد چننے کا اختیار نہیں ہے لہٰذا ہر بااثر مسلمان ہندو پارٹیوں میں ٹکٹ مانگنے کے لیے لائن

لگا تا ہے۔اور جوان میں سب سے زیادہ وفادار ہوتا ہے پیسے دے کر ٹکٹ پا تا ہے اور پھر ہمارا نمائندہ بن کر پارلیمنٹ اور اسمبلی میں مدعی کی حمایت میں تقاریر کرتا ہے۔اگر نہ کرے تو آئندہ ٹکٹ ہی نہ ملے گا کہ لائن میں اور بہت سے مسلمان کھڑے ہیں۔''

''یہ تو ایسا معاملہ ہے کہ کبھی ختم ہی نہیں ہوسکتا؟''اقبال نے کہا۔

''ظاہری بات ہے جہاں بھی بیس فیصد سے زائد مسلمان ہیں۔زیادہ تر وہیں، سے ٹکٹ پاتے ہیں۔اسمبلی یا پارلیمنٹ میں پہنچنا کسے اچھا نہیں لگتا۔''کلیم نے تجزیہ کیا۔

''اس طرح تو مسلمان کبھی اپنا لیڈر پیدا ہی نہیں کرسکتا۔وہ تو پہلے ہی کسی پارٹی میں رہن رکھا ہوتا ہے۔''شمیر نے کہا۔

''ظاہری بات ہے۔یہی وہ بات ہے جو سرسید نے ۱۸۸۲ء میں ہی سمجھ لی تھی اور لوکل سیلف گورنمنٹ بل میں ترمیم پاس کرائی تھی۔لہٰذا محسن الملک وقار الملک وغیرہ نے سرسید کے انتقال کے بعد جداگانہ انتخاب کو مسلمانوں کا متحدہ مطالبہ بنا کر حکومت کے سامنے پیش کیا اور حکومت کو ماننا پڑا۔''

''حکومت نے مان لیا؟''شمیر نے حیرانی سے پوچھا۔

''تو کیا وہ کانگریس کی حکومت تھی کہ نہ مانتی؟ ان کو کوئی ازلی پرخاش تو تھی نہیں مسلمانوں سے۔لہٰذا تینوں مطالبات تسلیم کر لیے۔اب مسلمان اپنے نمائندے خود منتخب کرنے کا مختار تھا۔لہٰذا اب صرف وہی مسلمان جیت سکتا تھا جو ان کی صحیح نمائندگی کرسکتا ہو۔''

''جداگانہ انتخاب میں مسلمان خود اپنا نمائندہ چنتے تھے اور ہندو اپنا؟ یعنی ہندو امیدوار کو صرف ہندو ووٹ دیتے تھے مسلم امیدوار کو مسلمان؟''شمیر نے جاننا چاہا۔

''بالکل ٹھیک سمجھا تم نے۔''

''پھر تو دلال مسلمان کا پتہ ہی کٹ گیا۔نہ ہندو پارٹی کوئی مسلم ایجنٹ جتا سکتی تھی اور نہ مسلم پارٹی کسی ہندو ایجنٹ کو جتا سکتی تھی۔''ضمیر بولا۔

''ایک دم ٹھیک نتیجہ نکالا تم نے۔''

''کانگریس نے مخالفت نہیں کی؟''اس نے پھر پوچھا۔

''شکار ہاتھ سے نکلتا ہوا دیکھ کر کسمکسا کر رہ گئی کہ یہ ہندستانی مسلمانوں کی متحدہ خواہش تھی۔علی گڑھ جس کی نمائندگی کر رہا تھا۔سرسید احمد کے سیاسی ایجنڈے کی تکمیل ان کے جانشین کر رہے تھے۔شملہ ڈیپوٹیشن کا ایک نتیجہ اور نکلا کہ حکومت کو بنگالی مسلمانوں کے لیے بھی انصاف کرنے کا خیال آیا اور انھوں نے بنگال کی تقسیم کر دی۔مشرقی بنگال کو مغربی بنگال سے الگ کر کے ایک نیا صوبہ بنا دیا جس سے وہاں کے مسلمانوں میں بھی خوشحالی کے دور کی شروعات ہوگئی۔مگر اس فیصلے کے خلاف بنگال میں زبردست پرتشدد تحریک کانگریس نے چلائی۔مسلمانوں کی جب تک کوئی فعال تنظیم نہ تھی لہٰذا وہ کچھ نہ کر سکے اور صرف پانچ سالوں میں ہی حکومت نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا۔''

''مسلمانوں کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی اس وقت تک؟'' کلیم نے دریافت کیا۔

''وقار الملک اور محسن الملک کوششوں میں لگے ہوئے تھے کہ مسلمانوں کی بھی کوئی آل انڈیا سیاسی تنظیم بمقابل کانگریس بن جائے۔یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔مگر چونکہ سرسید بذات خود واضح ہدایت کر گئے تھے اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن بنا گئے تھے لہٰذا گزٹ اور دوسرے اخبارات میں یہ بحث جاری تھی کہ مسلمان اب کیا کریں۔''

''کتنے سال یہ ڈسکشن چلا؟''

''تقریباً چھ سال یہ مباحثہ چلتا رہا۔ڈیفنس ایسوسی ایشن کو آگے بڑھانے کی بات چلتی رہی۔لیکن آخرکار ایک نئے نام سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ہوا۔جس کی صدارت وقار الملک نے کی اور ایک جامع صدارتی خطبہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی راہ متعین کر دی۔اس وقت صرف دو ہی عہدے رکھے گئے تھے۔محسن الملک اور وقار الملک کو جوائنٹ سکریٹری بنایا گیا تھا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، مسلم لیگ تو جناح صاحب نے بنائی تھی؟'' شمیر نے حیرانی سے پوچھا۔

''جناح صاحب نے؟''

''جی ہم نے بھی یہی سنا ہے کہ انھوں نے بنائی تھی اور وہ ہندوستانی سیاست کے ولین تھے لہٰذا ان کا ہر کام غلط ٹھہرا۔'' کلیم بھی بولا۔

''ہم سب یہی جانتے ہیں۔'' ضمیر نے بھی تائید کی۔

''اب میں کیا عرض کروں کہ ہماری قوم کا تو یہ حال ہے:

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ ظرف ہے نہ ذوق

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

اتنے بڑے بڑے نام ان نام نہاد دانشوران قوم نے مٹا دیئے۔ اتنا دروغ اور ایسا فریب معاذ اللہ۔ جن لوگوں نے تمام زندگی راہ وفا کی نظر کر دی اور ساری راتیں اللہ کے حضور نالہ کرتے ہوئے گزاریں ان دو ٹکے کے غلام اہل قلم نے حرف غلط کی طرح ہمارے حافظے سے مٹا دیے۔'' فضل حق نے آہ بھر کر شعر پڑھا۔

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز

کس نے پایا اثر نالۂ دل ہائے حزیں

ہندوستانی مسلمانوں کے انتہائی کامیاب فلاسفر لیڈر تھے یہ لوگ۔ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی پارٹی قائم کی، جداگانہ انتخاب کا اصول بھی حکومت سے منوالیا، جس بدولت ہی جناح جیسے قائدین الیکشن میں کامیاب ہوتے رہے۔ ورنہ تمام مخلص لوگوں کی ضمانتیں بھی نہ بچتیں اور کوئی نام بھی نہ جانتا کہ اس نام کا کوئی لیڈر بھی تھا۔ ایم اے او کالج کو یونیورسٹی بنوانے کی تحریک چلائی۔ مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کا قیام کیا۔ جس نے صرف چند ہی سالوں میں حکومت کا مطالبہ پورا کر دکھایا کہ تیس لاکھ روپیہ کالج فنڈ میں جمع کرائے۔ اس کے بعد ہی کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے گا۔ درحقیقت مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی ایک ہی جماعت کے دو نام تھے۔ ایک علی گڑھ تحریک کے سیاسی ایجنڈے کے لیے قائم ہوئی اور دوسری تعلیمی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے۔''

''کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہمیں اتنی اہم تاریخی بات کا علم تک نہیں۔ دس سال سے زیادہ ہوگئے وی ایم ہال میں کبھی کسی فنکشن میں، کسی بڑے سے بڑے پروفیسر یا لیڈر نے

دھوکے سے بھی یہ بات نہیں بتائی کہ وقار الملک ہندوستانی مسلمانوں کے اتنے اہم لیڈر تھے۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں ان کی سیاست سے اتفاق نہیں ہے لیکن تاریخی حقیقت تو بتایئے۔ ہم جیسے طلباء کو کتنا گمراہ کیا گیا۔ سالانہ میگزین میں نہ جانے کتنے آرٹکل ان کی زندگی پر ہم نے پڑھے لیکن کبھی کہیں یہ ذکر تک نہ آیا۔ جو حقائق آپ بتا رہے ہیں ان کو ایسا چھپا دیا گیا کہ شیطان بھی ان سے سازشیں سیکھنے آئے۔''امین نے شکایت کی۔

''ہمارے بعد بھی نہ جانے کتنے طلباء یہاں آ کر رہیں گے اور چلے جائیں گے بغیر یہ حقائق جانے ہوئے۔ کیا مقام حیرت ہے!''شمیر نے تائید کی۔

''یہ صرف مقام حیرت نہیں ہے بلکہ تم لوگ اپنی قسمت پر روؤ کہ تمہیں ایسا ماحول ملا جس میں مسلمانوں کے خلاف تمام سازشیں کامیاب ہیں اور سازشی ترقی کر رہے ہیں۔ جیسا کہ وقار الملک نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ''اے مسلمانو تم اپنی قسمت پر روؤ اس وقت پر جب ہمیں ان لوگوں کا غلام ہو کر رہنا پڑے جو صدیوں بعد اورنگ زیب کا بدلہ ہم سے لینا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہماری عزت، آبرو، مذہب ہر چیز ان کے اختیار میں ہوگی۔''

''۱۹۰۶ء میں یہ بات کہی گئی؟ کتنے دور اندیش تھے وہ لوگ!''کلیم حیران رہ گیا۔

''اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی بھی ان کے ہاتھ میں ہے اگر فسادات میں قتل عام سے بچنا ہے تو ملائم جی، لالو جی، کانگریس اور کمیونسٹ پارٹیز کو ووٹ دو ورنہ مرو۔ نوکری، روزی، روٹی، عزت آبرو کا تو کوئی ذکر ہی نہیں۔ یہاں تو زندگی داؤ پر ہے۔''امین نے کہا۔

''لاؤ سگریٹ پلاؤ۔''اقبال نے کلیم سے فرمائش کی۔

''سگریٹ سے کیا ہوگا۔ کچھ اور پیو یہاں سب ملتا ہے؟''

''غرض نشاط نہیں ہے بھائی۔ بیخودی میں ہی یہ غم برداشت ہو سکتا ہے۔''اقبال نے ہاتھ بڑھا کر کلیم سے پیکٹ چھین لیا اور ماچس سے سگریٹ سلگا کر کش لیا تو پھندا لگ گیا۔ کافی دیر تک کھانستا رہا۔

''ان لوگوں نے پوری قوم کٹوادی۔خود ان کی اولاد بھی بھیک مانگ رہی ہے۔فساد میں ایک بڑا شاعر پھنس گیا۔بھیک مانگتا رہا کہ میں تو بڑا اسیکولر ہوں۔مسلمانوں کے محلے تک میں نہیں رہتا۔گاندھی،نہرو وغیرہ کی دہائی دی۔کئی ہفتے بعد اس کی لاش کنویں میں سڑی ہوئی ملی۔''ضمیر کو سخت غصہ آ گیا۔

''ایک کانگریسی ایم پی فساد میں پھنس گیا۔موبائل سے نہ جانے کس کس کو فون کرتا رہا۔پرائم منسٹر تک کو فون کیا۔اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے اور اس کی ایک رشتہ دار عورت کے پیٹ سے بچہ نکال کر نیزے پر چڑھا دیا گیا۔''امین نے جھرجھری لی۔

''ہم تو خوش ہو لیتے اگر ان کا اپنا ہی کوئی بھلا ہو جاتا۔ان کی اولادوں کو کوئی اسکالر شپ یا رزرویشن ملتا یا فسادات میں نہ مارے جانے کی گارنٹی ملتی۔وفاداری کا کچھ تو صلہ ملتا!''کلیم نے تاسف کیا۔

''اچھا یہ بتایئے کہ یہ ڈھاکہ میں ہی مسلم لیگ کیوں بنی۔اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟ اگر افتتاحی جلسہ علی گڑھ میں ہوتا تو شاید یہ بات چھپی نہ رہتی۔''شمیر نے سوال کیا۔

''ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے مختلف شہروں میں ہوتے تھے جہاں کے لوگ مدعو کرتے تھے۔اس زمانے میں کسی کو اگر کانفرنس کا دعوت نامہ مل جاتا تھا تو پورے شہر میں دکھاتا پھرتا تھا۔اس سال نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے میزبانی کی خواہش کی اور اتفاق سے وہاں جلسہ ہوا۔مسلم لیگ کا بھی افتتاحی جلسہ شام کو اسی پنڈال میں ہوا۔کوئی اور وجہ بھی ہو تو اس کا مجھے علم نہیں۔''فضل حق نے بتایا۔

''تو بہر حال آج اتنے زمانے کے بعد یہ بات صاف ہوگئی کہ مسلم لیگ جناح صاحب نے نہیں بنائی بلکہ جانشین سرسید نے قائم کی تھی۔''ضمیر نے ٹھنڈی سانس لی۔

''وہ تو افتتاحی جلسے میں موجود بھی نہیں تھے۔بعد میں مسلم لیگ جوائن کی اور اپنے خلوص و ذہانت کی وجہ سے قائداعظم بن گئے۔''

''ہم لوگ تو خیر ابھی اسٹوڈنٹ ہی ہیں ایک طرح سے۔لیکن اگر آپ یونیورسٹی کے کسی پروفیسر سے بھی پوچھیں گے تو یہی کہے گا کہ جناح صاحب نے مسلم لیگ بنائی تھی۔''

امین نے بتایا۔

''حضور، تاریخ کے پروفیسرز کا بھی یہی حال ہے۔'' کلیم نے جوڑا۔

''ہے جرم لاعلمی کی سزا مرگ مفاجات۔ ذرا تصرف کے ساتھ۔'' اقبال نے علامہ اقبال کو پیش کیا۔

''خیر مسلم لیگ کے بنتے ہی کانگریس کی وہ حالت ہوئی کہ سٹّی چلی گئی۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کی دعویداری چھوڑنی پڑی۔'' فضل حق نے بتایا۔

''یہ تو کمال ہو گیا۔ مگر ہوا کب اور کیسے؟'' شمیر نے پوچھا۔

''سرسید کی ذاتی کوششوں سے کوئی مسلمان بھی کانگریس میں شریک نہ ہوا تھا بلکہ مسلمان کو کانگریسی کہنا گالی دینے کے مترادف تھا۔ اب ان کے جانشینوں نے مسلم لیگ قائم کی۔ تمام مسلمان تو انتظار میں تھے ہی اپنی جماعت کے قیام کے۔ بس اعلان ہوتے ہی پوری قوم مسلم لیگ میں آ گئی۔ اب حکومت ہر معاملے میں کانگریس کے علاوہ مسلم لیگ سے بھی مشورہ کرنے لگی لہٰذا اب کانگریس کی مجبوری بن گئی کہ وہ مسلم لیگ سے بھی مشورہ کرنے لگی لہٰذا اب کانگریس کی مجبوری بن گئی کہ وہ مسلم لیگ کو بھی رائے مشوروں میں شامل کرے۔ ملک میں جمہوری اداروں کی شروعات ہو ہی چکی تھی۔ وقتاً فوقتاً نئے نئے قوانین بن رہے تھے۔ کانگریس کا کوئی مطالبہ حکومت مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر نہیں مانتی تھی۔''

9.3 قومیتِ مکی و مدنی

''مختصر یہ کہ کانگریس ہندو پارٹی اور مسلم لیگ مسلم پارٹی مان لی حکومت نے۔'' کلیم نے پیوند لگایا۔

''کانگریس کو بھی کوئی خاص اعتراض نہ تھا اس بات پر۔ اعتراض ہو بھی کیسے سکتا تھا جب کہ تمام مسلمان مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ بہر حال اب وقت آ گیا کہ باقاعدہ معاہدہ ہوا دونوں پارٹیوں میں۔ ۱۹۱۶ء کا مشہور لکھنؤ پیکٹ جناح صاحب کی کوششوں سے

وجود میں آیا۔ یاد رہے کہ اس وقت تک محسن الملک وقار الملک دونوں کا انتقال ہو چکا تھا۔ سر ضیاء الدین، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وغیرہ علی گڑھ کی نمائندگی کر رہے تھے۔اس پیکٹ میں کانگریس نے بھی جداگانہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا۔ پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریت کے عوض مسلم لیگ نے مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے زیادہ نشستیں حاصل کرلیں۔مستقبل کے دستور میں مسلمانوں کے لیے برابری کا اصول بھی تسلیم کرلیا کانگریس نے۔''

''یہ معاہدہ تو نہایت سودمند تھا ہمارے لیے۔''ضمیر نے اعتراف کیا۔

''اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سیاسی برابری کانگریس سے تسلیم کرالی تھی اور یہ انتظام تمام ہندوستانیوں کے لیےامن کا پیغام تھا۔لیکن............

''لیکن کیا؟''کلیم نے پوچھا۔

''اب میں اس قصہٗ دغا کی طرف آتا ہوں کہ اگر شبلی اور جوہر نہ ہوتے تو ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ ہی دستور ہند کی بنیاد بنتا۔کانگریس ہندوہی پارٹی رہتی وہ کبھی بھی مسلمانوں کی نمائندگی کی دعویداری نہ کرسکتی تھی۔اگر یہ لوگ نہ ہوتے۔''

''مگر کیسے، ذرا ثابت کر کے دکھائیں؟''امین نے چیلنج کیا۔

''اتنی بیک گراؤنڈ اسی بات کو تو ثابت کرنے کے لیے تیار کی گئی۔ ہوا یہ کہ سرسید کے مخالفین کی مکمل شکست ہو چکی تھی ان کے انتقال سے بہت پہلے ہی۔لیکن ایک شخص خود ان کی ہی سرپرستی میں پل رہا تھا جو دینی فضلاء کا فاضل نمائندہ تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ معتزلہ کی سب سے زبردست مخالفت ابوالحسن الاشعری نے کی جو خود معتزلہ فلسفیوں کی سرپرستی میں پروان چڑھے تھے۔ یا جیسے عقلی علوم اور فلسفہ کی سب سے زبردست مخالفت غزالی نے کی، حالانکہ وہ خود فلاسفر تھے۔سرسید کے انتقال کے بعد ہی شبلی نے ان کے خلاف مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ایک مدرسے کے مولوی کو سرسید نے جو قلم تھمایا اب وہی قلم انہیں کے خلاف برسرپیکار ہو گیا۔سرسید کے مذہب کے علاوہ شبلی پہلے دینی فاضل

ہیں جنھوں نے کانگریسی متحدہ قومیت کو بروئے اسلام صحیح قرار دیا اور علی گڑھ تحریک کے سیاسی ایجنڈے کی بیخ کنی میں لگ گئے۔ یہ پہلا بیج تھا جو از سرِ نو علی گڑھ تحریک کے خلاف خود علی گڑھ کے ہی ملازم نے سرزمین ہند میں بویا جو بعد کو علی برادران کی وجہ سے تناور زہریلا درخت بنا۔ جس کی جڑ اگر اتاترک نہ کاٹتے تو تمام مسلمانان ہند کی دنیا اندھیری بنادیتا۔''

''یہاں بھی اتاترک آ گئے؟'' شمیر حیران ہوا۔

''یہ اتارترک یہاں کیسے آ گئے، کہاں علی گڑھ اور کہاں ترکی؟'' کلیم کو بھی حیرت تھی۔

''یہ کیا پہیلی ہے کہ اتاترک نے علی برادران کی جڑ کاٹ دی؟'' امین نے سوال کیا۔

''ذرا آسان کر کے بتایئے؟'' ضمیر بھی بولا۔

''اس سے پہلے ذرا ایک ایک کولڈ ڈرنک ہوجائے۔ ماحول کافی گرم ہوگیا ہے۔ یہ اتاترک سے علی گڑھ والوں کی ملاقات سمجھ میں نہیں آئی۔'' اقبال نے بیئرر و بلا کر پیپسی کا آرڈر دیا۔

''میں پیپسی نہیں، چائے ہی پیوں گا۔'' کلیم نے کہا۔

''میں بھی۔'' ضمیر بولا۔

''لیکن میں مرانڈا۔'' امین نے کہا۔

''یہ علی برادران کی اتاترک سے کب ملاقات ہوئی اور وہ کیوں محمد علی کی جڑ کاٹنے لگے؟ آپ بھی خوب ہیں۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''کوئی ملاقات نہیں ہوئی دونوں کی۔ وہ تو علی گڑھ کو جانتا بھی نہ ہوگا۔ بلکہ اسے فرصت ہی کہاں تھی انڈیا کے بارے میں جاننے کی۔ تماعمر تو وہ لڑتا ہی رہا۔''

''لیجئے آپ بھی وہی کہنے لگے جو ہم کہہ رہے ہیں۔'' امین نے ہنس کر کہا۔

''میں وہ نہیں کہہ رہا ہوں غور سے سنئے۔ محمد علی خلافت تحریک کے روح رواں تھے اور مسلمان اس تحریک سے جڑ گیا تھا۔ ٹھیک ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔''

''خلافت کہاں تھی؟ ترکی میں۔آخری خلیفہ عبدالحمید، اتاترک کا جانی دشمن تھا اور یہاں خلافت بچانے کے لیے تحریک چل رہی تھی ٹھیک؟''

''بالکل صحیح۔مگر یہاں کیوں تحریک چل رہی تھی، ترکی میں چلتی؟''ضمیر نے معصومانہ سوال کیا۔

''یہاں کے قائدین، انگریزی حکمرانوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ خلافت کا دفاع کیا جائے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔گاندھی، علی برادران کے کاندھوں پر چڑھ کر مسلمانوں کو متحدہ قومیت کا پیغام دے رہا تھا۔وہ اپنے مشن میں پوری طرح کامیاب تھا۔مسلم لیگ اس طوفان بلاخیز میں تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ سارے مسلمان، آزاد اور دینی فضلاء کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے جو کھلے عام کانگریس کا کام کر رہے تھے۔ یہ طوفان چل رہا تھا اور مسلمان تھا کہ اس میں بہا جا رہا تھا۔ چند ہی سال میں اتاترک نے خلیفہ کو ملک بدر کر کے خلافت ختم کر دی۔ اس نے فرسودہ خلافت ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی۔''

''وہ شاخ نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔''اقبال بولا۔

''اس نے شاخ ہی کیا، بلکہ پورا پیڑ ہی جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔''کلیم نے راحت کی سانس لی۔

''اب سمجھ میں آیا کہ اتاترک کا علی گڑھ سے کیا رشتہ ہوا؟''فضل حق نے سوال کیا۔

''سرضیاءالدین کے ساتھ ساتھ اسے بھی کچھ کریڈٹ دینا پڑے گا۔''امین نے شرارتاً مسکرا کر کہا۔

''بالکل دینا پڑے گا۔ اگر وہ وہاں خلافت ختم نہ کرتا تو یہاں نہ جانے کب تک یہ طوفان بلا چلتا رہتا اور نہ جانے کیا کیا اس کی زد میں آتا۔سرضیاءالدین کہاں تک علی گڑھ کو بچاتے۔۱۹۲۲ء میں خلیفہ کو اتاترک نے معزول کر دیا تھا۔ یہاں صرف چند سال میں اتنا بھیانک طوفان کھڑا کر دیا تھا ان دینی فضلاء، آزاد، گاندھی اور علی برادران نے کہ مسلمان بس دیوانہ ہو کر کانگریس میں شامل ہوتا جا رہا تھا۔علی گڑھ کب تک بچتا۔مگر شکر

خدا کا کہ وہاں خلافت ختم ہوتے ہی برادران زر کی پوری عمارت تاش کے پتوں کی طرح زمین دوز ہوگئی۔''

''بالفاظ دیگر بادشاہ سر بازار مادرزاد ننگا کھڑا تھا۔'' اقبال نے مثال دی۔

''جیسے اس کہانی میں ایک چھوٹے بچے کے سچ نے پور دروغ کا پردہ فاش کر دیا، یہاں بھی اتر ترک کے عمل کے خلافت تحریک کا پورا طوفان سرکر دیا۔ بالکل ایسے جیسے کہ کسی نے جادو کر دیا ہو۔ خلافت تحریک کا ایک نتیجہ بہت بھیانک نکل کر آیا کہ اب کانگریس مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت بن گئی تھی۔ جمعیۃ اعلماء ہند مع اپنے علم قرآن وحدیث، کانگریس کی حمایت کے لیے قائم کر دی گئی، ۱۹۱۶ء کا لکھنؤ پیکٹ سردخانے میں جا چکا تھا۔ اب کوئی اس کا نام بھی لینے والا نہ تھا۔ مسلم لیگ کو یہ ثابت کرنا تھا کہ اس نام کی بھی کوئی پارٹی ہے ملک میں'' فضل حق نے پھر اسی موضوع کو پکڑا۔

''سرسید اوران کے جانشینوں کی تمام کوششوں کو ان برادران زر نے اس مقام پر لا کھڑ چھوڑا؟'' کلیم حیران تھا۔

''صرف دس سال اور خلیفہ باقی رہتا تو ہندوستان مسلمانوں کو قبرستان بن جاتا۔'' فضل حق نے اندازہ لگایا۔

''مگر اس تحریک میں شبلی کا کیا رول تھا؟ ان کا تو نام بھی نہیں آیا۔'' امین نے پوچھا۔

''شبلی کا انتقال ۱۹۱۶ء میں ہو چکا تھا۔'' فضل حق نے بتایا۔

''یعنی جس سال گاندھی، ساؤتھ افریقہ سے انڈیا آئے۔''

''جی اسی سال۔''

''اللہ میاں نے سوچا ہوگا کہ ایک ہی کافی ہے۔'' شمیر نے شرارت کی۔

''دونوں رہتے تو کیا قیامت ہوتی۔'' کلیم نے خود سے پوچھا۔

''لیکن اپنے مرنے سے پہلے ہی وہ علی گڑھ تحریک کی جڑوں میں ٹائم بم لگا چکے تھے وہ پہلے فاضل عالم ہیں جنھوں نے کانگریسی نظریۂ قومیت کی حمایت اور سرسید کی مخالفت میں مضامین لکھے۔'' فضل حق نے انکشاف کیا۔

''ذرا تفصیل سے بیان ہو یہ معاملہ بھی۔''امین نے عرض گزاری۔

''ندوہ سے ان کو جانا پڑا صرف آزاد کی محبت میں۔آزاد کی ساری تربیت علی گڑھ دشمنی میں مکمل ہو چکی تو ان سے الہلال والبلاغ شبلی نے ہی نکلوایا۔''فضل حق نے بتایا،

''اس کا کیا ثبوت ہے؟''کلیم نے پوچھا۔

''یہ تو پوری دنیا جانتی ہے۔سید سلیمان ندوی نے جو شبلی کے شاگرد خاص تھے،کلکتہ جا کر ادارت سنبھالی تھی،اس کے علاوہ شبلی کی اپنی نظمیں اور مضامین بھی ان رسائل میں شائع ہوتے تھے۔''

''مگر ان رسائل میں کیا برائی تھی؟ اہل ادب تو بڑی تعریفیں کرتے ہیں کہ آزاد نے قرآن کی زبان میں الہلال نکالا۔وہ قرآنی لہجے میں بات کرتے تھے اور نہ جانے کیا کیا؟''امین نے سوال کیا۔

''اکثر اہل ادب کو دماغ لگانے کی عادت نہیں ہوتی۔وہ تو بس حکمرانوں کی مصاحبت کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔یہ کون کہہ رہا ہے کہ الہلال میں قرآن کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔بلکہ کچھ زیادہ ہی قرآن واحادیث کے حوالے دیئے جاتے تھے۔اس کے باوجود بھی آپ اگر ان رسائل کو دیکھ لیں تو دل چاہے گا کہ آگ لگادیں۔''

''ایسا کیوں؟''کلیم حیران ہوا۔

''الہلال البلاغ کا بس ایک ہی مقصد تھا کہ سرسید کی تعلیمی اور سیاسی دونوں پالیسیوں کی بیخ کنی کی جائے اور کانگریسی قومیت کو مضبوط کیا جائے۔نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا میں آزاد کے علی گڑھ تحریک مخالف ہونے کا اعتراف کیا ہے۔عرش ملسیانی نے بھی علی گڑھ تحریک کی مخالفت کو ان کا مقصد حیات قرار دیا ہے۔اسی وجہ سے آزاد آج تک کانگریس کے ہیرو ہیں۔میں نے ایک ایک صفحہ دیکھا ہے ان چیتھڑوں کا۔''

''چھیتھڑے؟''امین کا منہ کھلا رہ گیا۔

''یہ بھی ایک اچھا لفظ ہے ان رسائل کے لیے۔آپ خود دیکھیں،کوئی بھی دیکھ سکتا ہے ہماری لائبریری میں تمام فائلیں موجود ہیں۔مسلمان کوئی ہوتا تو اس کو خوف خدا ہوتا کہ

قرآن وحدیث کو میں اس طرح کیسے استعمال کروں۔ ہزار بار سوچتا تب بھی اس کا قلم نہ اٹھتا۔ ہر مضمون آیات قرآنی سے لبریز ہے۔ بس ایک ہی صدا ہے قرآن وحدیث کے حوالے سے، کہ خلافت بچانا ضروری ہے اور یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے جو تیس لاکھ روپیہ جمع کیا ہے وہ خلافت میں چلا جائے اور یونیورسٹی نہ بنے۔ متحدہ قومیت کی حمایت میں بھی نہ جانے کتنی قرآنی آیات اور احادیث جمع کر دی ہیں آزاد نے کہ بس حیرت ہوتی ہے۔ دینی فضلاء کو آج تک یہ توفیق نہ ہوئی کہ تحقیق کرتے کہ یہ آیات یہاں استعمال ہو سکتی ہیں کہ نہیں۔ بلکہ آج تک ان کی پوری حمایت حاصل ہے متحدہ قومیت کے فلسفہ کو۔ مختصر یہ کہ گاندھی نے آتے ہی، آزاد کے ذریعے دینی فضلاء کو جمع کرنا شروع کیا۔ عبدالباری فرنگی محلی کے ذریعے علی برادران کو قبضے میں کیا اور خلافت کانفرنس کی داغ بیل ڈال دی۔ جمعیۃ العلماء ہند بنوا دی جس کی بنیاد ہی متحدہ قومیت پر ایمان ہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ اس عنوان سے حسین احمد نے ایک رسالہ تحریر کیا جس کا جواب علامہ اقبال نے دیا۔ ایک فارسی قطعہ بھی مدنی کے خلاف لکھا کہ وہ اسلام نہیں جانتے۔''

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ
ایں حسین احمد ز دیوبند چہ بوالعجبیست
سرود برسر ممبر کوملت از وطن است
چہ بے خبر است ز مقام محمد عربیست

''اتنا بڑا کاروان بنالیا گاندھی نے صرف چند سال میں؟'' امین حیران رہ گیا۔

''جی، صرف تین سال میں یہ کارنامہ انجام دیا اس نے۔''

''گاندھی صرف مسلمانوں میں ہی سیاست کر رہے تھے؟'' کلیم نے پوچھا۔

''جی نہیں بالکل اسے پتہ تھا کہ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کا کیا مطلب ہے۔ اگر یونیورسٹی بن گئی تو اس کا کیا مطلب ہوگا۔ دلتوں کو جداگانہ انتخاب دیا گیا تو کیا ہوگا۔ سکھوں نے اگر خالصتان کا مطالبہ انگریزوں سے کر دیا تو کیا ہوگا۔ وہ کانگریس کا واحد قائد تھا جسے ان تمام معاملات کی فکر تھی اور وہ بھی بغیر کسی لالچ کے۔'' فضل حق نے تفصیل بتائی۔

''بغیر لالچ؟''شمیر بولا۔

''جی وہ ہندو دھرم کی سیوا بغیر کسی لالچ کے کر رہا تھا۔آزادی والے دن بھی خوشی نہیں منا رہا تھا۔مستقبل کا بھارت بنانے کے لیے دھرنا دے رہا تھا۔اسی لیے وہ فادر آف دی نیشن ہے اور بالکل صحیح ہے۔''

''اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا جا رہا ہے کہ شبلی اور جوہر نہ ہوتے تو متحدہ ہندوستان میں حصہ ملتا مسلمانوں کو۔''کلیم نے سر ہلایا۔

''اب تو وہ خواب ہو چکا تھا۔اب تو یہ حال تھا کہ مسلمان اگر علی گڑھ ہی بچالیں تو بڑی بات ہوگی۔لیکن کانگریس ایک بھیانک غلطی کر گئی جس کی وجہ سے مسلمان پھر جمع ہونے شروع ہوئے۔''

''کیسی غلطی؟''،ضمیر نے سوال کیا۔

''اس نے ۱۹۳۰ء میں موتی لال نہرو رپورٹ پیش کر دی۔''

''کیا تھی یہ رپورٹ؟''شمیر نے پوچھا۔

''یہ ہندوستان کے مستقبل کا دستور تھا۔جس کی رو سے اکثریت کو محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر پورے ملک کا اختیار حاصل ہو جاتا۔''

''اقلیتوں کے لیے کچھ نہیں تھا؟''امین حیران تھا۔

''ہم ہیں تو ہمارے اوپر بھروسہ کرو۔طاقت ہمارے پاس ہوگی تو رام راجیہ ہوگا اور ہم نیائے کریں گے،کہ ہم ایک ہی قوم تو ہیں۔نیائے ہم کریں گے آپ عرضی گزارتے رہئے۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''کلیم نے ہاتھ پھیلائے۔

''آپ کو صرف بھروسہ کرنا ہے ہمارے نیائے پر۔بہر حال اس رپورٹ کے آتے ہی مسلمان پھر جمع ہونے شروع ہوئے۔جناح صاحب مایوس ہو کر لندن قیام پذیر ہو گئے تھے۔ان سے واپس آنے کی درخواست کی گئی ان کی تمام زندگی مسلمانوں کے لیے کھلی کتاب تھی۔پورا بھروسہ تھا قوم کو ان پر۔وہ آئے اور مسلم لیگ کے واحد لیڈر بنے۔اب جناح صاحب آ گئے تھے اور علی گڑھ ان کے پیچھے۔لیاقت علی خاں،چودھری خلیق الزماں

وغیرہ نے ان کو لندن سے واپس آنے پر راضی کیا تھا۔''

''یہ تو بالکل ہی عجیب تجزیہ ہے اس وقت کے حالات کا۔'' کلیم حیرانی سے فضل حق کا منہ دیکھنے لگا۔

''۱۹۱٦ء میں مسلم لیگ، کانگریس سے وہ منوا چکی تھی جس کی رو سے پورے ملک میں تقریباً برابر کے اختیارات ہوتے مسلمانوں کے پاس۔ ان کی جماعت روز بروز مضبوط ہی ہوتی چلی جاتی اگر خلافت تحریک کی حماقت نہ کی گئی ہوتی۔ کوئی مسلمان بھی دلالی نہ کر رہا ہوتا۔ لیکن جو بیج شبلی نے بویا۔ آزاد نے پروان چڑھایا، اسے ہمارے برادران زر نے طوفان بنا دیا کہ مذہب تک اس کی زد میں آ کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔''

''یعنی اسلام بھی اصل اسلام نہ رہا؟'' شمیر نے پوچھا۔

''جی بیشک،'' عجم ہنوز نہ داند رموز دین، والی بات ہوئی۔''

''کیا مطلب ہوا اسکا؟'' شمیر کو فاسی نہ آتی تھی۔

''یہ کہ عجم ابھی تک دین اسلام کے معنی نہ سمجھ سکا، ورنہ یہ نہ ہوتا کہ مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر کوئی امام یہ کہے کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ کیسا مقام حیرت ہے۔''

''یہ کس نے کہا تھا؟'' شمیر نے پھر دریافت کیا۔

''یہ فارسی کا وہ مشہور قطعہ ہے جو شاعر اسلام نے حسین احمد مدنی کے نظریۂ وطنیت کو اسلام سے ثابت کرنے پر کہا تھا۔''

''پھر تو ظاہر ہے کہ اسلام بھی وہ اسلام نہ رہا۔ جس کی تبلیغ رسول عربی نے کی تھی۔'' کلیم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

''دینی فضلاء تمام دلائل اسلام سے ہی لا رہے تھے۔ قرآن بیان کیا جا رہا تھا۔ اسوہ رسول سے مثالیں پیش کی جا رہی تھیں۔ کہا جا رہا تھا کہ جس طرح رسول اللہ نے صلح حدیبیہ کی تھی وہی ہم کر رہے ہیں۔ وہی ہندی مسلمان کریں۔ ان لوگوں کو صلح کے معنی تک معلوم نہ تھے۔''

''معلوم نہ ہوں، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ جان بوجھ کر اسلام کو تابع شرک بنانیکی سازش

میں شریک تھے یہ لوگ۔''اقبال نے سختی سے کہا۔

''کیا فائدہ تھا ان کا اس میں؟''شمیر نے سوال اٹھایا۔

''فائدہ ہی فائدہ تھا۔ مدرسے کا مولوی امام الہند بن گیا۔فضلاء اب عوامی اسٹیج پر ملک کی سیاست طے کرر ہے تھے۔ملک کے تمام ہندوان کے ساتھ تھے۔ جتنے مسلمان بھی ساتھ آجاتے زیادہ ہی زیادہ تھے۔قوم ہنود کی پوری سیاسی اقتصادی اور علمی طاقت اب ان کے ساتھ تھی۔مسلمانوں کے حقوق کا جھنڈا اٹھا کر انہیں کیا ملتا؟اس کے لیے تو پہلے سے ہی مسلک لیگ موجود تھی۔مسلمانوں کی قیادت علی گڑھ کر ہی رہا تھا۔سرسید اور علی گڑھ سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا،اس شکست کا جوانہیں نئی تعلیم کے اجراء سے اٹھانی پڑی تھی اور ہزار کوششوں کے باوجود جسے یہ لوگ روک نہیں سکے تھے۔لیکن بغیر اسلام کا حوالہ دیئے بدلہ لینا آسان نہ تھا۔لہٰذا اسلام کو متحدہ قومیت کی حمایت میں استعمال کیا گیا۔''

''صلح حدیبیہ سے کانگریس میں شرکت کا جواز نکال رہے تھے یہ لوگ!'' کلیم نے حیرانی سے دہرایا۔

''الہلال البلاغ پڑھیے۔حسین احمد مدنی کی تحریریں پڑھیے،بار بار ذات مقدس کو کانگریس کی حمایت میں میدان سیاست میں اتارا ان لوگوں نے۔کہا گیا کہ جس طرح حضرت محمد نے دوسری اقوام سے صلح کی ہم بھی وہی کرر ہے ہیں۔صلح حدیبیہ کی مثال بار ہا پیش کی گئی۔''

''صلح تو دو جماعتوں کے درمیان ہوتی ہے۔یہ کیسی صلح تھی کہ سپاہ اغیار میں شامل ہوکر اہل اسلام سے لڑو۔''امین کی حیرت بڑھتی ہی جارہی تھی۔

''مسلم پارٹی تو پہلے سے موجود تھی۔اگر بالفرض محال اسلام سے مثال ہی لانی تھی،تو صلح حدیبیہ کا اطلاق تو ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ پر ہونا چاہیے تھا کہ جب کانگریس اور مسلم لیگ نے ایک معاہدہ کیا۔''اقبال نے کہا۔

''جبکہ مسلم لیگ نے کبھی یہ دعویٰ نہ کیا کہ انھوں نے صلح حدبیہ کی پیروی کی ہے۔ان کو کرنا چاہیے تھا''،کلیم نے جوش میں آ کر دعویٰ کیا۔

''خدا سے ڈرتے تھے یہ لوگ لہٰذا نہ کہنا ہی بہتر تھا۔لوگوں کو جذباتی بنا کر بیوقوف بنانا مقصد نہ تھا کام کرنا تھا۔پروپیگنڈہ نہیں۔مگر ہوا یہ کہ حریف جماعت کی ممبر شپ اختیار کر کے،اس کے اصول وضوابط کے پابند ہونے والے دعویٰ پیروی رسول کررہے تھے؟ نعوذ باللہ''امین رسول خدا کے معاملے میں بہت حساس تھا۔

''یہ گمراہی کی نہ جانے کون سی منزل ہے بس خدا ہی جانے۔''اقبال نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''مستقل ایک جماعت، جمعیۃ العلماء ہند بھی بنالی متحدہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر کہ بروئے اسلام قومیں اوطان سے ہی بنتی ہیں۔یہ درحقیقت کانگریس کی مولوی ونگ تھی۔''فضل حق نے جمعیۃ کا مقصد بیان کیا۔

''اگر قومیں وطن سے ہی بنتی ہیں تو حجاز کے مشرکین اور یہود ونصاریٰ سے کیا لڑائی تھی رسول اللہ کی؟''کلیم نے سوال کیا۔

''ان کی تو زبان،تاریخ اور ثقافت وطن سب ہی میں مکمل اتحاد تھا سوائے مذہب کے؟''اقبال نے قومیت وطنی کی شرح کرنا چاہی۔

''اور یہاں تو مذہب کے ساتھ ساتھ کسی ایک بات میں اتحاد ہونا تو در کنار متضاد تھی ہر بات،چاہے زبان ہو ثقافت ہو تاریخ ہو۔ہر شعبۂ زندگی میں مشرق ومغرب کا بُعد ہے۔'' کلیم نے مسئلہ قومیت پر مزید بات بڑھائی۔

''مشرکین حجاز یہودی ونصاریٰ سب عرب تھے۔سب کا ایک وطن تھا عربی ان سب کی زبان تھی۔ثقافت بالکل ایک تھی نسل اور تاریخ بھی ایک۔لہٰذا قوم سیاسی ان فضلاء ہند کے مطابق تو رسول اللہ کو بنانی چاہیے تھی۔نعوذ باللہ۔اس کے برخلاف تیس سالہ حیات رسالت میں تقریباً چالیس جنگیں لڑیں۔اکثر میں وہ بنفس نفیس شریک ہوئے ہتھیار سجا کر۔''امین کو تاریخ اسلامی میں کافی دخل تھا۔

''زبان کا جھگڑا ہی عربی رسم الخط کی وجہ سے ہے۔ثقافت میں بھنگ کے کلہڑ اور صہبا کے پیمانے جیسا فرق ہے۔سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اس کو جل چڑھا کر پوجتے ہیں۔ہم

کہتے ہیں شکر خدا کہ ایک دن تو نے اور دیا ہمیں۔مگر مشکل یہ تھی کہ اگر یہ نہ کہا جاتا تو کیا کہا جاتا۔کیا یہ کہتے کہ ہم کانگریس سے مسلمانوں کو اختیارات دلائیں گے۔الحمدللہ دلا ئیے۔ کانگریس کوئی مسودہ سامنے لائی۔لائی تو پہلے جلسے میں پندرہ مطالبات اور بعد میں نہرو رپورٹ۔جس میں صرف اکثریت کو حکمرانی کا اختیار تھا۔چلئے وہ زمانہ بہت پہلے گزر گیا پچاس سال سے ان کی حکمرانی ہے۔دلانا تو درکنار پورا ملک مسلمانوں کے خون سے سرخ کر دیا گیا۔اور یہ راجہ سبھا کی صرف ایک سیٹ پر نظر جمائے رہے۔''فضل حق نے بیان کیا۔

''اللہ، رسول کے نام نامی استعمال کئے بناوہ کس طرح مسلمانوں کو اپنی طرف لا سکتے تھے؟ بس ایک یہی ہتھیار تھا،جس کو ان لوگوں بے دریغ استعمال کیا۔''شمیر نے حقیقت حال بیان کی۔

''اور تماشہ یہ کہ جن انگریزوں کی دشمنی میں خلافت تحریک چلائی جارہی تھی۔ان ہی انگریزوں کا دوست تھا خلیفہ عبدالحمید۔انگریزوں کی مدد سے اتاترک سے لڑ رہا تھا۔اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔''کلیم کو اتاترک کے بارے میں کافی معلومات تھیں۔

''وہاں انگریز دشمنی کا مطلب تھا اتاترک کی حمایت اور یہاں انگریز دشمنی کا مطلب تھا خلیفہ کی حمایت۔کیا خوب کامیڈی تھی۔''اقبال نے طنز کیا۔

''یہ کامیڈی نہ تھی۔بلکہ سوچی سمجھی سازش تھی۔جوہر کو اپنی لیڈری چمکانی تھی۔آزاد کو سب پتہ تھا۔آپ کو معلوم ہے کہ جیسے ہی اتاترک نے خلافت ختم کی،آزاد نے مبارک کا تار بھیجا اسے۔اس کے علاوہ معزول خلیفہ کے خلاف ایک مضمون بھی لاہور کے زمیندار میں شائع کیا۔''فضل حق نے بتایا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ؟''سب کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

''جی!دونوں ریکارڈ میں موجود ہیں دیکھ لیجئے؟''فضل حق نے دعویٰ کیا۔

''اتنا بڑا فریب کیا گیا اسلامیان ہند کے ساتھ؟''ضمیر کو تیز غصہ آ گیا۔

''کیا کریں ہم لوگ؟''کلیم نے تاسف کیا۔

''کیا کر سکتے ہیں ہم لوگ سوائے صدمہ اٹھانے کے؟''ضمیر نے ٹھنڈی سانس

بھری۔

''اور ہم تو ایک سیمینار بھی نہیں کر سکتے ہیں اس معاملے پر۔'' شمیر نے آہ بھری۔

''الٰہی یہ ترے سادہ لوح بندے کہاں جائیں۔ کہ سلطانی بھی عیاری ہے اور درویش بھی عیاری۔'' امین نے علامہ اقبال کا سہارا لیا۔

''ہندی مسلمان تو لاشیں ڈھوتے ڈھوتے اتنا لاغر ہو گیا کہ فریب کا ماتم کرنا بھی سہل نہیں اس کے لیے۔ بقول شاعر یہ حال ہے کہ:

ایسا آساں نہیں لہو رونا　　دل میں طاقت جگر میں جان کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں　　میں کہاں اور یہ وبال کہاں

''وبال ہے یہ سب سوچنا اور اس پر غور کرنا۔ دو وقت کی روٹی کا تک بندوبست ہے نہیں۔ ریسرچ اسکالرز اپنے کیریئر بنانے میں لگے ہیں۔ اگر کچھ معلوم بھی کر لیں تو کون سنے گا۔ اتنے بڑے بڑے بت بنا کر کھڑے کر دیے گئے ہیں کہ کوئی دیوانہ اگر سر اٹھا کر بھی دیکھے تو اس کی ٹوپی مٹی میں رُل جاوے اور زمانہ تماشہ دیکھنے آوے۔ کسی پر تنقید کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' کلیم نے قوم کی صورت حال بیان کی۔

''قویٰ فکر و فن قومی مضمحل ہو چکے ہیں۔ بلکہ دار فانی کو کوچ کر چکے کہ زمانہ گزرا۔'' اقبال نے یہ کہہ کر شعر پڑھا۔

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب　　وہ عناصر میں اعتدال کہاں

''یہاں تو اپنی بے بسی کا ماتم کرتے کرتے نسلیں گزر گئیں جیسے زمین پر گرا کر خبر لی گئی ہو کہ اپنی سدھ تک کھو بیٹھے۔'' امین نے یاس بھرے لہجے میں میر کو پیش کیا۔

پر غبارئی جہاں سے نہیں سدھ میر ہمیں

گرد اتنی ہے کہ مٹی میں رلے جاتے ہیں

''اور ایک ہمارے یہ اقبال صاحب ہیں۔ کہتے ہیں تحقیق کروں گا اور شائع کراؤں گا۔ میر صاحب کی طرف سے ایک مشورہ ان کی نذر ہے، شاید کہ عقل آوے۔'' کلیم نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اشعار نظر کیے۔

زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مرجاوے
پردام محبت میں گرفتار نہ ہووے
ہوں دوست جو کہتا ہوں سن اے جان کے دشمن
بہتر تو تجھے ترک ہے تاخوار نہ ہووے

''احباب ہمیں مشورۂ ترک دیتے رہیں گے اور اغیار ہماری رسوائی کا انتظار کرتے رہیں گے مگر ہمارا بھی کوئی ہے اسی کے سہارے جو کرنا ہے کریں گے۔'' اقبال نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔

''کیا ہے دنیا؟ مت ڈراؤ اقبال کو۔آج مرے کل دوسرا دن۔'' امین نے یہ کہہ کر پرسوز لہجے میں فلسفہ باندھا۔

ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے
چشم دل کھول اس بھی عالم پر   یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

''عالم بے ثبات کی اتنی فکر بے جا ہے۔زیادہ یہاں لو لگانا یا اہل ثروت سے ڈرنا، نادانی ہے۔'' فضل حق نے آہ سرد کھینچی۔

تری آہ کس سے خبر پایئے
وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے
جہاں سے تو رخت اقامت کو باندھ
یہ منزل نہیں بے خبر راہ ہے

''چلئے یہ بھی اچھا ہوا کہ میر صاحب ہی کو اقبال کی حمایت میں اتار لائے آپ لوگ۔ ورنہ کلیم نے تو درس ترک دے ہی دیا تھا۔'' شمیر نے اطمینان کی سانس لی۔

''اور وہ بھی انہیں حضرت میر کے حوالے سے۔'' ضمیر نے ہنستے ہوئے یاد دلایا۔سب لوگ ہنسنے لگے۔

''ہاں تو جناب آپ بتا رہے تھے کہ ۱۹۳۰ء میں نہرو رپورٹ آنے کے بعد سیاسی حالات پھر بدلنے شروع ہو گئے۔'' کلیم نے فضل حق کو یاد دلایا۔

''بہ مہربانی اتاترک، خلافت کا طوفان گزرا تو ہر طرف تباہی کا سماں تھا۔ لکھنؤ پیکٹ بے معنی ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ ختم ہو چکی تھی۔ علماء فضلاء شمشیر برہنہ ہو کر متحدہ قومیت کی حمایت میں سڑکوں پر آ گئے تھے۔ جمعیۃ العلماء ہند، گاندھی اور برلا کی سرپرستی میں نیا اسلام پیش کر رہی تھی۔ مسلمانوں کے مستقبل کے سوال کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ کانگریس کے انصاف پر بھروسہ رکھو۔ لیکن موتی لال نہرو رپورٹ نے اس وعدۂ انصاف کی بھی قلعی کھول کر رکھ دی اور مسلم سیاست میں پھر دم پڑنے لگا۔ ۱۹۳۵ء کے الیکشن کے بعد یو پی کی وزارت کی تشکیل کے معاملے نے متحدہ قومیت کے تابوت میں ایک کیل اور ٹھونک دی۔''

''یو پی کی وزارت کی تشکیل کا معاملہ؟ یعنی مکمل جمہوری حکومتوں کا قیام ۱۹۳۵ء میں ہو چکا تھا؟'' شمیر نے سوال کیا۔

''جی بالکل۔''

''مگر جمہوریت تو ۱۹۵۰ء میں آئی جب ۲۶ رجنوری کو دستور ہند نافذ کیا گیا!'' ضمیر حیران تھا۔

''یار یہ بھول جاتا ہے۔ جمہوریت کی شروعات ۱۸۸۲ء میں ہو چکی تھی۔'' اقبال نے ضمیر پر غصہ کرتے ہوئے بتایا۔

''پوری بات ہو چکی ہے اس معاملے پر۔ خیر آپ بتائیے کہ ۱۹۳۵ء میں کیا خاص واقعہ پیش آیا۔'' کلیم نے بھی اقبال کی طرف داری کرتے ہوئے فضل حق سے کہا۔

''طے یہ ہوا تھا کہ کانگریس اور مسلم لیگ مل کر حکومت بنائیں گے مگر کانگریس کو غیر متوقع کامیابی ملی۔ حکم جاری کیا گیا کہ مسلم لیگ کے دو ممبران وزارت میں لیے جائیں گے مگر ایک شرط پر۔''

''شرط پر! کیا شرط تھی وہ؟''

''مسلم لیگ چھوڑ کر کانگریس کے ممبر بن جائیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی! پھر تو سب ہی کانگریس کے ہو گئے۔ مسلم لیگ کہاں رہی۔'' کلیم نے فوراً ہی کہا۔ سب لوگ حیرت سے فضل حق کا منہ دیکھنے لگے۔

''یہی تو اصل بات تھی باقی تو سب خرافات تھی۔کانگریس کو ۱۹۰۶ء سے ہی یہ غم ستا رہا تھا کہ مسلم پارٹی کیسے بن گئی۔موقع ملتے ہی نہرو نے مطالبہ رکھ دیا۔''

''جیسے مسلمان تو وزارت کے بھوکے ہیں مان ہی جائیں گے۔ایسا منہ توڑ جواب ملا کہ کانگریس سناٹے میں آ گئی۔''

9.4 بابر کی کٹیا

''وہ بھی آج کے خودغرض مسلمان سمجھا تھا کہ لالچ دو اور خریدلو۔''امین بولا۔

''اب تو مسلمان ایسا ماہر آداب غلامی ہو چکا ہے۔دنیا کی کوئی قوم جو اپنے آپ کو سورما سمجھتی ہو ہندوستانی مسلمانوں کی صحبت میں رکھ دو، کچھ ہی دنوں میں آقاؤں کی تلاش میں نہ ماری ماری پھرے تو نام بدل دینا۔''اقبال نے تجزیہ کیا۔

''کیا رکھ دیا جائے۔مہا بکو؟''کلیم نے کہا۔

''بے شک یہ بھی منظور ہوگا ہر چند کہ اس سے زیادہ ذلیل نام تم میرے لیے تلاش نہیں کر سکتے تھے۔''

''میں تو گاندھی کے مہاتما ہونے کا قائل ہوں۔چاہے کوئی برا مانے۔'' شمیر نے رازدارانہ انداز میں انکشاف کیا۔

''وہ کیوں؟''ضمیر نے پوچھا۔

''اگر بیان کردوں، تو ہم سب ہی اس کی مہانتا کے راگ الاپنے لگیں گے۔''

''بیان تو کرو۔آدھے مسلم تو پہلے ہی ہیں ہم بھارتیہ مسلمان۔''امین نے کہا۔

''کچھ زیادہ فرق نہیں پڑنا ہے۔دل تو کافر ہے ہی، بس ماتھے پر تلک لگا کر اعلان کرنا باقی ہے۔''کلیم نے ایک اور وجہ بتائی۔

''سنئے صاحبان! کانگریس مسلمانوں سے کیا مطالبہ کر رہی تھی۔یہی نا کہ مستقبل کے ہندوستان میں اپنی سیاسی حیثیت مٹا کر کانگریس میں شامل ہو جائیں۔بالالفاظ دیگر مسلمان یہ کہے کہ ہمارا ہندوستان میں سیاسی طاقت حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور اب

خوشامد ہی ہمارا واحد ہتھیار ہے بلکہ متحدہ قومیت کے نام پر گاندھی کے رام راجیہ میں زندگی کرنے پر ہم بخوشی راضی ہیں فضلاء اسلام نے اس سے یہ منوالیا۔ یہ ہے گاندھی کا کارنامہ کہ اس نے مارشل ریس کے ہاتھ میں بھیک کا کٹورہ تھما دیا وہ بھی خوشی خوشی۔''

''پھر تو بابر سے بڑا کوئی احمق نہیں تھا۔ ترکی سے چل کر یہاں تک آیا۔ خوامخواہ جنگیں لڑیں۔ بڑے پجاری کی آ گیا لے کر ایودھیا کے کسی کونے میں کٹیا ڈال کر پڑ رہتا۔ اگر پنڈت جی آگرہ کرتے تو جنیو بھی دھارن کرتا اور رام کے گن گاتا۔ کندمول کھاتا اور آنند مئے جیون ویتیت کرتا اور محمود غزنوی بیچارہ خوامخواہ اتنی بار سومناتھ آیا اور گیا۔ کتنی تکلیف ہوئی ہوگی۔ کہاں سنٹرل ایشیا اور کہاں گجرات۔ سومناتھ کے بڑے دیوتا کے سامنے دنڈوت کرتا۔ پنڈت پجاری کتنے پرسن ہوتے دھن، مکان، استری، سیوک، سب اس کی سیوا میں پرستت کرتے۔ اتی آنند مئے جیون ہوتا اس کا اور گجرات فسادات میں جو ہزاروں مسلمان قتل ہوئے ان کا گناہ بھی اس کے ذمہ نہ جاتا۔ واللہ کیا حماقت کی اس نے۔'' اقبال نے اپنا ماتھا پیٹھا۔

''صد افسوس کہ ہمارے مدنی صاحب، چھیڑے بھائی اور محمود الحسن، شبلی وغیرہ جیسے کسی فاضل عالم سے صحبت نہ رہی اسے۔ خوامخواہ آخرت خراب ہوئی کہ ایک مسلمان کے مارنے یا مروانے والے کی مغفرت نہ ہوگی۔'' امین نے بھی پیوند لگایا۔

''اور بابر صاحب کی مزید حماقت سنئے۔ نہ صرف سیاسی طاقت بزور شمشیر حاصل کی، ایودھیا میں کٹیا ڈال کر رہنا جنیو دھارن کرنا تو دور کی بات اتنی بڑی مسجد اور بنوا گئے۔ بھگتنا ہمیں پڑ رہا ہے۔ کتنے فسادات بابر صاحب کی وجہ سے ہو چکے ہیں۔'' اقبال پھر بولا۔

''عجیب بیوقوف انسان تھا۔ ہمارا ذرا خیال نہ کیا۔'' کلیم نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔'' باہر سے آئے ہوئے مسلمان تو پھنسے ہی اپنے ساتھ ساتھ ان کروڑوں برادران وطن کو اور پھنسوا گئے جو اسلام لے آئے۔ یہ بیچارے خوامخواہ مارے گئے۔''

''کوئی پوچھے کہ کیا ضرورت تھی دھرم بدلنے کی۔'' شمیر نے افسوس کیا۔

''قطب الدین کی سنئے، بلکہ میں تو یہی کہوں گا کہ ذرا عقل نہ تھی اسے۔

اتنا بڑا بادشاہ کیسے بنا حیرت ہوتی ہے۔ارے بھئی قطب مینار بنوادی ٹھیک کیا ہماری حکومت کو آمدنی ہوتی ہے۔مگر اس کے برابر میں مسجد قوت الاسلام بنانے کی کیا ضرورت تھی۔چلو مسجد بنالی معاف کیا،اگر ایک،صرف ایک مورتی شیو جی کی استھاپت کردینا مسجد کے صحن میں تو کیا بگڑتا اس کا۔ہم لوگ کتنی پریشانیوں سے بچ جاتے۔''اقبال نے گریہ کیا۔

''سمجھدار علماء،فضلاء کی کمی تھی اس زمانے میں آج کل دیکھئے کہ ہر فاضل عالم کسی نہ کسی پارٹی کے لیے تقاریر کرتا ہے،فتوے دیتا ہے مگر پورا معاوضہ پلے ہی رکھوالیتا ہے۔یہ ہوتی ہے سمجھداری ہمارے امام الہند کو دیکھئے،انگریزی،سائنس،ٹکنالوجی کا ایک حرف نہ آتا تھا۔صرف مدرسے میں عربی پڑھی۔مگر دیکھئے کہ ہمیشہ ایم پی رہے اور ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم بنے۔پورے ملک کو پڑھانے کا ذمہ دار بنایا گیا،راجہ رام موہن رائے کا درجہ ملا انہیں۔اور مدنی صاحب ہمیشہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔کتنی بڑی بات ہے۔یہ تھے سمجھدار لوگ۔''امین نے پررشک لہجے میں بتایا۔

''بابر کی بدنصیبی دیکھئے ڈاکٹر صاحب کہ اسے کوئی گاندھی نہ ملا۔ورنہ توپ تلوار نیزہ بھالا سب رکھوالیتا۔اتنے آدر اور پریم پورک کھڑاؤں بھینٹ کرتا کہ آگرہ کی سڑکوں پر کھڑکھڑاتے پھرتے۔''شمیر نے بھی اندازہ لگایا۔

''کیسے لگتے بابر صاحب کھڑاؤں پہنتے ہوئے؟''ضمیر نے پوچھا۔

''محمود غزنوی کتنا پیارا لگتا۔سرخ سفید لمبا نوجوان ترک،گلے میں جنیوڈالے گائے دوہتے ہوئے۔''کلیم نے اندازہ لگایا۔

''اور قطب الدین! بھور سے پہلے گنگا میں اسنان کرتے ہوئے کتنا سندر لگتا جب وہ چلوؤں میں بھر بھر کے سوریہ دیوتا کو جل ارپن کرتا تو کیسا آنند مئے واتاورن ہوتا سمست دیوتاوک میں۔اندر دیوتا تو اپنی نرتکیوں کے ساتھ اس پر آکاش سے پشپ ارپن کررہے ہوتے۔''اقبال نے کہا۔

''افسوس کہ انہیں کوئی گاندھی نہ ملا۔کیسا انرتھ ہوگیا۔سمست جیون ہی ویرتھ گیا ہوئے۔''شمیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''تم افسوس کرتے رہو، مگر ہمارے علماء، فضلاء نے ان سب بیوقوف بادشاہوں کی غلطیوں کو سدھارنے میں تمام زندگی لگادی مگر افسوس کہ مسلمان سمجھ نہ سکا۔ حالانکہ کیا عمدہ عقیدۂ اسلام پیش کیا تھا انھوں نے منظر پر غور کریں۔ دو فٹی دھوتی باندھے، جنئو دھارن کیے، ماتھے پر بڑا سا قشقہ کھینے، گئو موتر کا تڑ کا لگائے، ہاتھوں میں کھڑاؤں......۔''

''ہاتھوں میں کھڑاؤں! وہ تو پیروں میں پہنی جاتی ہے؟'' ضمیر نے اقبال کو ٹوکا۔

''خاموش بے ادب! پوری بات سن پھر کہنا۔''

''مگر یہ ہاتھوں میں کھڑاؤں کیوں؟'' ضمیر بضد کی۔

''یار بتاؤ اسے۔'' اقبال نے کلیم سے کہا۔

''اب مسجد کا اتنا تو آدر کرنا پڑے گا۔ وہ بھی شاہجہانی مسجد دہلی کا۔''

''اوہ اب میں سمجھا۔'' ضمیر نے سر ہلایا۔

''ہاں تو وہ اتی مہان سوامی، شولنگ کی پوجا سے ابھی ابھی فارغ ہوا تھا۔ پستک کا دوسرا دھیائے لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہی تھا کہ فضلاء کا ایک گروہ اس کی کٹیا میں پرنام بجالایا۔ لمبی، چھوٹی داڑھیوں پر سرخ چہرے روشن ہو رہے تھے کہ ابھی ابھی یہ لوگ حویلی اعظم خاں سے گرم گرم نہاری کھا کر آئے تھے۔ سوامی نے قلم رکھ دیا اور بھور سمے آنے کا کارن پوچھا۔ فرمایا کہ بہت سے نامعقول انگریزی پڑھے لوگ اسلام اور ہندو دھرم کے مت بھیدوں کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ اگر یہ بڑھتا گیا تو ہمارا مہان دیش سنکٹ میں پڑ جائے گا۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ دونوں ایک ہو جائیں یہاں تک کہ ہمارے عالم نے نئی تفسیر بھی لکھ دی ہے جس میں ان کا ذکر ہی نہیں کیا گیا جن کی وجہ سے یہ سارا فساد ہے اور سارے دھرموں کو ایک سمان بتایا گیا ہے ہم چاہتے ہیں کہ آپ جلد کوئی اپائے کریں۔ سوامی ترنت کھڑا ہو گیا اور اور برائے نام داڑھی والے کو انگ لگاتے ہوئے اپنی پستک کا پہلا دھیائے دکھایا۔ چاند تارے ٹوپی کو اگنور کرتے ہوئے سب سے استھان گرہن کرنے کا آگرہ کیا اور سیوم بھی دھرتی پر بیٹھ گیا۔ چاند تارے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کچھ زیادہ ہی لمبی ہوگئی۔''امین نے شرارت کی۔

''چاندتارے کی آنکھوں میں آنسو؟''شمیر نے پوچھا۔

''وہ سوامی کا اگنور کرنا برداشت نہ کرسکے۔فوراًہی چھوٹی داڑھی نے اس انیائے کی شکایت کی۔سوامی نے اتر دیا کہ یہ کالج میں پڑھا ہے کسی مدرسے میں نہیں۔چھوٹی داڑھی نے صفائی دی کہ وہ غلطی ماں باپ کی وجہ سے ہوگئی۔مگراب یہ کالج ختم کرکے وہاں گئوشالا بنانا چاہتے ہیں۔سوامی نے ترنت کھڑے ہوکر چاندتارے کوانگ لگالیا۔''

''چاندتارے ٹوپی کا؟''ضمیر نے سوالکیا۔

''یار یہ کیسااولڈ بوائے ہےاسے ہٹاؤیہاں سے۔''

''مگر چاندتاراٹوپی کیا؟''ضمیر نے پھرسوال کیا۔

''خاموش نادان!سوامی نے پستک جلد پوری کرنے کاوچن دیا۔مگرفضلاءکواطمینان نہ ہوا۔اورشردھاپوروک آگرہ کیا کہ اگلے جمعہ کے وقت نماز سے پہلے ان پوتر پاون چرنوں کومسجد کے ممبر پراپستھت کریں اور بہکے ہوئے مسلمانوں کودھرم کا اپدیش دیں تو کرپا ہوگی۔ایک سمجھدار فاضل فوراًبولا کہ اگر یہ پستک بھی لے کرآئیں تواتی اتم ہوگا۔سوامی نے پستک اتنی جلدی پوری کرنے میں اسمرتھتا دکھائی پرنتو مسجد آنے کانمنترن سوئے کارکرلیا۔فضلاءایک دوسرے کے گلےمل کرمبارکباد دینے لگے۔سمجھدار فاضل کی تو آنکھیں خوشی سے بھیگ گئیں اورچاندتارےٹوپی کے کاندھے پرسررکھ دیا۔''

''ہرہرمہادیو۔اتنی اتم پائے کیا فضلاءنے۔''امین نے نعرہ لگایا۔

''پھرکیاوہ سوامی اپدیش دینے آیا؟''کلیم نے پوچھا۔

''صرف بڑے بڑے فضلاءہی اسکے آس پاس لوگوں کو بچاتے ہوئے چل رہے تھے۔سمجھدار فاضل نے نمازیوں کے ہجوم سے بچانے کے لیے سوامی کے ہاتھ سے کھڑاؤں لینا چاہی۔مگرسوامی کوواپس بھی جاناتھا۔اس نے کھڑاؤں اپنی بغلوں میں دبالیں اوردونوں ہاتھوں سے نمازیوں کے پرنام کانمرتاپوروک اتر دینے لگا۔سخت گرمی کا زمانہ تھا۔سوامی کے پیر پتھر کے فرش پرجل رہے تھے اوراس کاقشقہ پھیل کرگالوں تک

آ گیا تھا۔ ننگا دھڑ پورا پسینے سے شرابور ہورہا تھا۔ پرنتو دھرم کی سیوا کے اتساہ میں وہ ساری کٹھنائیوں کو پار کر گیا۔ امام نے اسے دیکھتے ہی بلند منبر خالی کردیا اور سوامی کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ پرنتو سوامی نے ہاتھ جھڑک دیا کہ گائے دوہنے کے بعد ایک گھنٹے تک کسی ملچھ کا ہاتھ چھونا مہاپاپ ہے۔ بغیر کسی مدد کے سوامی ممبر پر براجمان ہوگیا اور اپنے آگے ترشول استھاپت کردیا۔''

''جے جے شری رام۔''امین نے پھر نعرہ لگایا۔

''کیا منظر رہا ہوگا۔ ڈھانپنے سے زیادہ ظاہر کرتی ہوئی گیروئی دھوتی، سینے پر جنیو، جسم پر پسینہ کی خوشبو، ایک ہاتھ میں ترشول۔ ایک گھنٹے تک وہ اہل اسلام کو دھرم کا اپدیش دیتا رہا اور مسلمان جے جے کار کرتے رہے۔ یہ صرف ایک منظر تھا بلکہ توحید اور شرک کو ملانے کی ایک نایاب کوشش تھی جو ناکام ہوئی کہ سوامی کی پیتک معصوم مسلمان کو پسند نہیں آئی۔ اس نے سوامی کو گولی ماردی اور سولی پر چڑھ گیا۔''

''سولی پر چڑھ گیا؟''

''جی اس نے خود عدالت میں تسلیم کیا کہ میں نے عشق رسول میں سوامی کو گولی ماردی۔ حالانکہ فضلاء نے فتویٰ دے دیا تھا کہ جان بچانے کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے مگر اس عاشق رسول نے جھوٹ بولنا گوارانہ کیا اور خوشی خوشی پھانسی پر جھول گیا۔''

''فضلاء نے جھوٹ بولنے کا جواز تلاش کرلیا تھا؟''ضمیر نے پھر حیرت ظاہر کی۔

''پھر کس بات کے لیے عالم فاضل ہوتے ہیں؟''کلیم نے اسے ڈانٹا۔

''سمجھتا نہیں ہے۔''شمیر نے مذاق اڑایا۔

''اگر بچ بھی جاتا تو کتنے دن زندہ رہتا۔ دس بیس سال اور مگر فضلاء چاہتے تھے کہ جھوٹ بول کر زندہ رہے بیچارہ۔''

''کتنے نازک دل ہوتے ہیں یہ لوگ۔''امین نے طنز کیا۔

''کسی اور مسجد میں ایسا واقعہ پیش آیا؟''

''ہاں بس ایک اور۔ شاید دنیا کی یہ دو ہی مساجد ہیں جن میں سیاسی اتحاد کے نام

پر مذہب کو بھی نہیں بخشا گیا۔اور شرک وتوحید کو گلے ملایا گیا۔''

''دوسری مسجد کون سی ہے۔''ضمیر نے پوچھا۔

''ہماری یونیورسٹی جامع مسجد۔''

''مگر وہاں کسی سوامی کا اپدیش نہیں ہوا۔''امین نے بتایا۔

''کسی سوامی کا اپدیش تو نہیں ہوا مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے افتتاح کے وقت مسجد کے صحن میں بہت برادران وطن کی کھڑاؤں جل ترنگ بجا رہی تھیں۔''

''افتتاح کس نے کیا تھا؟''ضمیر نے سوال کیا۔

''اسیر مالٹا نے۔''

'مالٹا تو چاروں طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے اسی میں دھکیل دینا تھا۔''ضمیر کو غصہ آ گیا۔

''اسیر مالٹا کو وہاں نیند تک نہ آتی تھی؟''اقبال نے بتایا۔

''وہ کیوں؟''

''ہر دم ایک ہی فکر تھی انہیں کہ ہائے مسلمانوں کی تعلیم کا کیا ہوگا۔لہٰذا ہندوستان آتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا کہ چاندتارر اٹوپی سے ہاتھ ملا کر مسلمانوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے نکلے۔یونیورسٹی چونکہ بہت بڑی بنانا تھی۔پورے بھارت میں اتنی بڑی جگہ کہیں نہ ملی۔تو خدا کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے ذات الٰہی کے بالکل زیرِ سایہ مسجد کے صحن میں ہی یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔اس میں ایک راز اور بھی تھا کہ ہمارے سید صاحب کے تجربے کا بھی کچھ فائدہ اٹھانا تھا۔''

''سرسید کہاں سے آ گئے یہاں؟''ضمیر کو حیرانی تھی۔

''وہ خود اپنی آرام گاہ سے بچشم حیرت یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔''

''میں سمجھا نہیں۔''ضمیر نے پھر سوال کیا۔

''یار اسے کیوں ساتھ لئے پھرتے ہو؟''اقبال نے کلیم سے پوچھا۔

''پہیلیوں میں بات کرو گے تو کیا سمجھ میں آئے گا۔یہ کہو نا کہ سرسید کے مزار کے پاس

ہی اس عظیم یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔‘‘ضمیر نے مسکراتے ہوئے صفائی دی۔

’’ہے، مگر ذرا دیر سے استعمال کرتا ہے۔‘‘کلیم نے مسکرا کر اقبال کو بتایا۔

’’اور آپ کو پتہ ہے کہ حضرت اس قدر علیل تھے کہ اپنے پیروں پر کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے اور چارپائی پر لٹا کر لائے گئے تھے۔‘‘اقبال نے آگے بتایا۔

’’نہ ہوئے ہم لوگ بجائے مسجد کے منٹوای میں ہی پہنچا کر دم لیتے۔‘‘ضمیر نے ہنستے ہوئے دعویٰ کیا۔

’’یہ دنیا کی پہلی جائز زندہ تدفین ہوتی۔‘‘امین نے شرارت کی۔

’’پہلوان شوکت ہم سب کا بھوسہ بنا دیتے۔‘‘اقبال نے تنبیہ کی۔

’’اتنے بہادر تھے وہ!‘‘شمیر حیران رہ گیا۔

’’جی پاپا میاں کو جو چانٹا مارا ہے، کسی نے ابھی انہیں خواب میں دیکھا، پانچوں انگلیاں ابھی تک چھپی ہوئی ہیں۔ مستقل گال سہلا رہے تھے بیچارے دھان پان آدمی۔ بتا رہے تھے کہ سو سال گزرنے کو آئے مگر اس کی سوزش نہیں جاتی۔‘‘

’’اچھا تم لوگ مجھے کب معاف کرو گے۔ تین بج گئے ہیں۔ جانا بھی ہے۔‘‘فضل حق نے جھنجھلا کر کہا۔

’’اقبال پتہ نہیں کیا کیا شروع کر دیتا ہے۔ بابر کو کھڑاؤں پہنا دیں اور ایودھیا میں اس کی کٹیا بنوا دیں۔‘‘کلیم ہنسنے لگا۔

’’محمود غزنوی کو دھوتی پہنوائی اور گائے دہوائی اور پتہ نہیں کیا کیا۔‘‘امین نے بھی تفریح لی۔

’’ایسا ہے کہ اب کوئی دوسری بات نہیں ہوگی۔‘‘اقبال نے وعدہ کیا۔

’’یہ وعدہ بہت بار ہو چکا ہے۔ چلئے اٹھا جائے اب اسٹیشن چلتے ہیں کوئی نہ کوئی ٹرین مل ہی جائے گی۔‘‘فضل حق نے اٹھتے ہوء کہا۔

’’یہ آخری وعدہ ہے۔ چار بجے یہاں سے اٹھیں گے۔ اسٹیشن یہاں سے بس پانچ منٹ دور ہے۔ آخری چائے اور ہو جائے۔‘‘اقبال نے بھی کھڑے ہو کر فضل حق کا ہاتھ

پکڑلیا۔

''پکی بات!''فضل حق نے بیٹھنے سے پہلے تصدیق چاہی۔

''ایک دم پکی۔''اقبال نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ان کا بھی جانے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔''امین نے ہنستے ہوئے کلیم کے کان میں کہا۔

''صرف چائے سے کام نہیں چلے گا۔کٹلیٹ بھی منگاؤ۔''شمیر نے فرمائش کی۔

''ٹھیک ہے۔''اقبال نے بیرَر کو آرڈر لکھوایا۔

''اسے اچانک کیا ہوجاتا ہے؟ پتہ نہیں کس موڈ میں پہنچ جاتا ہے بھائی کہ بات میں سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور سب لوگ بھی اسی پھنس جاتے ہیں۔''کلیم نے اقبال کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سب کو بتایا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ سوامی نے سمجھدار فاضل کو کھڑاؤں کیوں نہیں دی؟''شمیر نے ضمیر سے سوال کیا۔

''فاضل اس کی کھڑاؤں چوری کرنا چاہتا تھا۔سوامی فوراً تاڑ گیا اور کھڑاؤں بغل میں دبالیں۔''ضمیر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔''اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں۔''

''یہ سوال تو ایسا ہے کہ یونیورسٹی داخلہ فارم میں اس کا جواب پوچھا جائے اور جو صحیح جواب دے بس اسی کا فارم پروسس کیا جائے۔''امین نے ہنستے ہوئے تجویز رکھی سب لوگ زور سے ہنسنے لگے۔

''کیا تجویز ہے۔میں کسی دن وائس چانسلر ہوگیا تو یہ کردوں گا۔''شمیر نے وعدہ کیا۔

''ہاں تو دوستو! ٹائم گزرتا جارہا ہے۔فضل صاحب کچھ بتارہے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے بعد کیا ہوا؟''اقبال نے سب کو متوجہ کیا۔

''۱۹۴۷ء آگیا اور ملک تقسیم ہوگیا اور کیا؟''امین نے شرارت کی۔

''یہ بارہ سال ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے سب سے اہم سال ہیں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کردی گئی ہیں۔مثلاً یہ کہ مسلمانوں نے اپنا حصہ لے لیا۔''فضل حق بھی موڈ

میں آ گئے۔

''تو کیا مسلمانوں کو حصہ نہیں ملا؟''شمیر نے معصومیت سے سوال کیا۔

''اگر حصہ مل گیا تو ہم کیوں یہاں بیٹھے ہیں۔ ہمارا تو کوئی حق نہیں رہا ملک میں۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''صرف مسلم اکثریتی علاوں کو دہلی سے آزاد کیا گیا تھا اور یہی مسلم لیگ نے ڈمانڈ کی تھی۔''کلیم نے یاد دلایا۔

''ہمارے چھیڑے سے پوچھو پھر وہی جامع مسجد ہے وہی منبر ہے۔ اب کی بار سوامی نہیں، ترشول نہیں، اونچی ٹوپی، چگی داڑھی اور شیروانی کی جیبوں میں انگوٹھے ڈالے، جناتی اردو میں پنڈت مہا بکو خطاب فرما رہے ہیں۔''فضل حق نے بیان کرنا شروع کیا۔

''جوتیاں بغل میں لائے تھے سوامی کی کھڑاؤں کی طرح یا باہر ہی چھوڑ آئے تھے؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''اقبال صحیح کہتا ہے کہ اسے کیوں لیے پھرتے ہو؟''فضل حق نے بھی غصہ میں کلیم سے پوچھا۔

''مگر یہ سوال نہایت معقول ہے اور جواب اشد ضروری۔''کلیم نے ضمیر کی تائید کی۔

''اس بار تو اچھا سوال کیا ہے۔''امین نے شرارتی مسکراہٹ کیساتھ کہا۔

''دو بڑے بڑے دانشور میرے ساتھ آ گئے۔ کیا بات ہے!'' ضمیر نے شمیر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

''مبارک ہو۔'' شمیر بھی مسکرایا۔

''جواب یہ ہے کہ ہمارے حضرت بحیثیت وزیر تعلیم تشریف لائے ہیں۔ ملک آزاد ہو چکا ہے۔ نہرو وزیر اعظم ہیں۔ جوتیاں باہر ہی چھوڑ آئے تھے کہ فی جوتی پچیس پولیس والے پہرہ دے رہے تھے۔''

''ماشاءاللہ! یہ ہوتی ہے پوزیشن۔ اتنی تو اکبر کے دربار میں بیربل کی بھی نہ تھی۔''امین نے پھر شرارت کی۔

''یہ غلط بات ہے۔ بیر بل سے نہ ملاؤ چھیڑے کو۔''

''کیوں نہ ملائیں؟''

''کہ وہ مسخرا تھا اور ہمارے حضرت فاضل عالم بلکہ عالم فاضل تھے۔''

''جی غلط کہہ رہے ہیں آپ۔ وہ فاضل نہ تھے بلکہ ضروری عالم تھے۔''

''یہ فاضل اور ضروری عالم کی بحث بالکل غیرضروری ہے کہ درویش اول کا وقت نہایت قیمتی ہے۔ وہ سلطنت غرباء میں بانٹ کر نہیں آیا ہے کہ ہمیشہ یہیں بیٹھا رہے۔ اسے واپس بھی جانا ہے۔'' اقبال نے تنبیہ کی۔

''جس وقت یہ خطاب شروع ہوا ملک بٹ چکا تھا۔ نہرو، ایڈونا اور ماؤنٹبیٹن کی مہربانی سے پنجاب اور بنگال کو مسلم اور ہندو اکثریتی ضلعوں کی بنیاد پر بانٹ دیا گیا تھا۔ ایک افراتفری کا عالم تھا ان علاقوں میں۔ لاکھوں ہندو مسلم اور سکھ خاندان اپنے اپنے گھروں سے اکثریتی علاقوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ مشرقی بنگال میں ڈھاکہ، چٹاگانگ وغیرہ سے لاکھوں ہندو شرنارتھی کلکتہ کی طرف جارہے تھے اور اتنے ہی مسلمان کلکتہ اور مغربی بنگال کے علاقوں سے ڈھاکہ کی طرف جارہے تھے۔ یہی صورت حال پنجاب، دہلی اور جموں وغیرہ کی تھی۔ بیل گاڑیوں، ریلوں اور پیدل چلنے والوں کے قافلے کے قافلے لاہور اور مغربی پنجاب سے امرتسر اور دہلی کی طرف بے سروسامانی کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔ صدیوں سے رہ رہے اپنے علاقوں سے لاکھوں سکھ اور ہندو خاندان، مغربی پنجاب سے امرتسر اور دہلی کی طرف آرہے تھے اور اتنے ہی مسلمان وحشت کے عالم میں جموں مشرقی پنجاب وغیرہ سے لاہور کی طرف بھاگ رہے تھے۔

''کیا بھیانک منظر رہا ہوگا۔''

''ایسا بھیانک کہ دنیا کی تاریخ میں آج تک اتنی بڑی آبادی نے ہجرت نہیں کی۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ لاکھوں ہندو مسلم اور سکھ خاندان اجڑ گئے بے شمار مارے گئے، ان گنت بچے یتیم ہوئے اور ہزارہا عورتوں کی عصمت دری کی گئی۔''

''مارے کیسے گئے؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

'' ان علاقوں کا سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ہر جگہ فسادات کی آگ لگی ہوئی تھی۔لاہور میں ہندوؤں کا قتل عام ہوا تو امرتسر اور جموں وغیرہ میں مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کیا گیا۔گاؤں دیہاتوں میں کتنے لوگ مارے گئے اس کا تو کوئی شمار ہی نہیں اور نہ کوئی انداز۔یہی حال مغربی اور مشرقی بنگال کا تھا۔فسادات کا سلسلہ جاری رہا مہینوں تک۔

''حکومت کیا کر رہی تھی؟''

''ماؤنٹبیٹن عیش کر رہا تھا۔اس موضوع پر بہت سی نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں جن میں خود انگریز تاریخ نویسوں نے وائسرائے کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔کئی اہم تصانیف اس موضوع پر شائع ہو چکی ہیں۔اسے کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ وہ جاننا چاہتا تھا کہ عوام پر کیا گزر رہی ہے۔''

''اور لیڈران نے اس کو متوجہ نہیں کیا؟''

''ان کا تو برسوں کا خواب پورا ہو رہا تھا وزارتیں بانٹی جا رہی تھیں۔آزاد ہندوستان کا پہلا وزیراعظم بننا کوئی معمولی بات نہ تھی۔کچھ ہی دن پہلے ابوالکلام کو کانگریس کی صدارت سے ہٹا کر نہرو کو صدر چنا گیا تھا کہ کانگریس کا صدر ہی وزیراعظم ہوتا۔''

''پاکستان کی حکومت نے بھی کچھ نہیں کیا؟''

''کون سا پاکستان؟ پاکستان کہاں تھا۔صرف اعلان ہوا تھا بٹوارے کا۔کسی کو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کون کون سے علاقے پاکستان میں جائیں گے۔افواہیں اڑ رہی تھیں۔عوام کو بس اتنا پتہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کو بھی بانٹ دیا گیا ہے۔''

''اس وحشت ناک خبر سے تو فسادات پھیلنے ہی تھے۔''

''ایک قیامت کا منظر تھا پورے مشرقی اور مغربی علاقوں میں۔حکومت کے پاس اتنی بڑی فوج تھی اور اتنی طاقتور بیوروکریسی۔مگر کہیں ایک پولیس والے کی ڈیوٹی تک نہ لگائی گئی تھی۔عوام کو بھڑکا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ انتظام نام کی کوئی چیز مہینوں تک نہ تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔جو جہاں جسے پا رہا تھا مار رہا تھا لوٹ رہا تھا۔ٹرینوں میں زندہ لوگ امرتسر سے بیٹھتے تھے اور لاشوں بھری ٹرین لاہور پہنچتی

تھی اور ایسی ہی ٹرین لاہور سے امرتسر آتی تھی۔''

''یا خدا! انسان وحشی ہو گیا تھا۔''

''وحشی سے بھی بدتر کہ وحشی کو صرف پیٹ کی آگ بجھانا ہوتی ہے۔''

''ایسے میں صرف ایک آدمی کو لوگوں کے قتل عام کا صدمہ تھا اور وہ تھا گاندھی۔ اسے کوئی خوشی نہ تھی ملک کے آزاد ہونے کی کہ وہ دوراندیش انسان تھا۔ باقی تمام لوگ خوشیوں میں مگن تھے۔''

''اپنا چھیڑا اس وقت کہاں تھا۔''

''دہلی کے بنگلے میں نہرو کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔''

''چائے پی رہا تھا؟'' شمیر نے سوال کیا۔

''اور کیا پیتا؟ شراب۔'' فوراً جواب آیا۔

''اور جناح صاحب کیا کر رہے تھے؟''

''ان کو تو پاکستان جانا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ حکومت تو دہلی میں تھی۔ وہاں تو صفر سے شروعات کرنی تھی۔ ماؤنٹبیٹن، جناح کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ انگلینڈ میں طالب علمی کے زمانے سے ہی نہرو اور ایڈونا کی پکی دوستی تھی۔ ماؤنٹبیٹن بھی نہرو کا دوست تھا۔ اسے کانگریس پلاننگ کر کے وائسرائے بنوا کر لائی تھی کہ اس سے پہلے وائسرائے لارڈ ویول انصاف پسند انسان تھا۔ لہٰذا ایڈونا کے ذریعہ کانگریس نے بنگال اور پنجاب کا بٹوارہ آخری وقت میں کروالیا۔''

''مگر ملک کے بٹوارے کی ڈیمانڈ تو مسلم لیگ نے کی تھی؟'' سوال آیا۔

''بنگال اور پنجاب کی نہیں مگر وہ بھی صرف ایک بارگین کاؤنٹر تھا۔ ۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن پلان پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے دستخط کر دیے تھے۔''

''یہ پلان کیا تھا؟''

''مختصر یہ کہ اس معاہدے کے بعد ملک متحد رہتا۔ ایک طرح سے ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کا چربہ تھا۔ ملک متحد رہتا اس سے اچھی کیا بات ہوتی۔ دونوں پارٹیاں مان بھی گئی

تھیں۔'' فضل حق نے بتایا۔

''جناح، نہرو، گاندھی اور حکومت برطانیہ سب مان گئے تھے؟'' ضمیر نے سوال کیا۔

''جی کاغذات سائن ہو گئے تھے۔ پوری دنیا سے مبارکباد مل رہی تھی حکومت کو کہ اس نے کانگریس اور مسلم لیگ میں معاہدہ کرا دیا۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''وہی جو نہ ہونا چاہیے تھا۔ دستخط کرنے کے بعد کانگریس کو اپنا بنیادی مقصد قیام یاد آیا کہ تعداد کی بنیاد پر حکومت حاصل کرنی ہے بغیر مسلمانوں کو سیاہ سفید میں قانونی حقوق دیے ہوئے۔ صرف وعدۂ انصاف پر مسلمانوں کو اپنے ساتھ لانا ہے مگر یہاں تو ہر بات سیاہ سفید میں لکھ دی گئی تھی مع جداگانہ انتخاب کے لہٰذا چند ہی دنوں میں آزاد کو ہٹا کر نہرو کانگریس کے صدر بن گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کانگریس بغیر کسی معاہدے کی پابندی کے پارلیمنٹ میں اکثریت کی بنیاد پر فیصلے کرے گی۔''

''یہ تو پھر وہی ۱۹۳۵ء والی بات ہوئی کہ کانگریس میں شامل ہو جاؤ۔'' شمیر نے کہا۔

''پوری دنیا کے سامنے کانگریس معاہدے سے مکر گئی؟'' ضمیر نے پوچھا۔

9.5 ہوا کیوں نہ غرقِ دریا

''اس واقعے کا ذکر تو آزاد نے بھی انڈیا ونز فریڈم میں کیا ہے۔ لکھا ہے کہ نہرو کا یہ کہنا غلط تھا۔ انھوں نے اس بیان کو ملک کو تقسیم کی بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔'' کلیم نے فضل حق کو یاد دلایا۔

''اس کے علاوہ بمبئی اور بہار میں چیف منسٹر شپ کے معاملے کا بھی ذکر کیا ہے۔'' امین نے بھی اپنی قابلیت دکھائی۔

''مگر یہ تو ۱۹۴۶ء کے واقعات ہیں۔ آپ کے حضرت کیوں کھل کر سامنے نہیں آئے۔ متحدہ ملک کی حمایت میں کوئی پریس کانفرنس کرتے، بیان دیتے، دھرنا دیتے۔'' شمیر نے پوچھا۔

''یہ بات تو ہے۔اگر آزاد اس وقت کھل کر سامنے آجاتے کہ کانگریس کی صدارت سے بھی انہیں ہٹادیا گیا تھا اور سچ بات بہ بانگ دہل کہتے ،تو میں سمجھتا ہوں کہ نہرو مشکل میں پڑ جاتے اور بٹوارہ نہ ہوتا۔''شمیر نے اندازہ لگایا۔

''ایسی ویسی مشکل! صدارت کرنی مشکل ہوجاتی اور کیبنٹ پلان نافذ ہوکر رہتا۔ جمعیۃ العلماء ہند بھی سامنے آجاتی اور ایک بار پھر کانگریس کا دروغ برسر عام ہوجاتا۔'' فضل حق نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پھر بٹوارہ بھی نہ ہوتا۔لاکھوں ہندو،سکھ اور مسلمان جو آزادی کے وقت مارے گئے نہ مارے جاتے اور ہندو مسلمان امن سے اس ملک میں رہتے۔''شمیر تصور میں کھو گیا۔

''تمام زندگی مسلم لیگ کی مخالفت کی مگر اب جس معاہدے پر بحیثیت کانگریس صدر ان کے اپنے دستخط تھے اور جس کا کالعدم ہونا انہیں برا بھی لگا اور بقول خود جو ملک کے بٹوارے کی بنیاد بنا،اس کی حمایت میں تو کھل کر سامنے آنا چاہیے تھا۔''ضمیر کو حیرانی تھی۔

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مولانا خود سب سے زیادہ بٹوارے کے ذمہ دار ہیں؟'' امین بولا۔

''بالکل ظاہر ہے۔اگر وہ اپنی کتاب میں یہ بات نہ لکھتے تو ہمیں پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ اتنے زیادہ مخالف تھے نہرو کے اس بیان کے۔اصل کتاب کے علاوہ ان تیس صفحات میں بھی، جو ان کی موت کے تیس سال بعد شائع ہوئے ،اسی بات کا ذکر کیا ہے انھوں نے اور نہرو کے اس بیان کو بٹوارے کی بنیادی وجہ بتایا ہے۔''فضل حق نے بتایا۔

''یعنی یہ کہ نہ جناح ذمہ دار ہیں اور نہ نہرو۔اگر کوئی ذمہ دار ہے تو آزاد کہ اس وقت جب نہرو کے بیان کی مخالفت ملک کی تاریخ بدل سکتی تھی،انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ زیادہ سے زیادہ کانگریس کیا کرتی ؟انہیں پارٹی سے نکال دیتی۔''کلیم نے اندازہ لگایا۔

''نکالنا آسان نہ تھا۔کانگریس کی ساری اخلاقی طاقت ختم ہوجاتی۔اگر بالفرض محال آزاد کو نکال بھی دیا جاتا تو وہ اور جمعیۃ العلماء ہند اپنی الگ سیاسی جماعت قائم رکھ سکتے

تھے۔پھر تو کانگریس صرف ہندو جماعت بن کررہ جاتی پھر ملک کا منظرنامہ کتنا پاک،صاف ہوتا۔کوئی بھید نہ رہتا۔کانگریس کی ساری چانکیہ نیتی دھری کی دھری رہ جاتی۔پوری دنیا کانگریس کوالزام دیتی۔انگلینڈ،یورپ اورامریکہ میں کانگریس بدنام ہوجاتی پھرکوئی طاقت کیبنٹ مشن پلان کونافذ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی کہ انگریز حکومت اورمسلم لیگ اب بھی اس کی حمایت میں تھیں۔مگرصدافسوس کہ ہوااس کاالٹا۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ نہ صرف آزاد نے مخالفت نہیں کی اورصرف خاموش رہے بلکہ باقی زندگی کے گیارہ سال سفید جھوٹ بولتے رہے اس معاملے میں۔انھوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ انڈیاونز فریڈم ان کی موت کے بعد شائع ہواوراصل تیس صفحات ان کی موت کے بھی تیس سال بعد شائع ہوں۔''

''کتاب میں بھی جھوٹ لکھ جاتا کون روک رہا تھا چھیڑے کو۔''کلیم نے کہا۔

''ہرشخص کے لیے سامان عزت ورسوائی اللہ کرتا ہے۔''امین بولا۔''بندے کواس میں کوئی قدرت نہیں۔قرآن کی مشہور آیت ہے۔پوری زندگی جھوٹ پرگزارنے والابھی آخر کار سچ لکھ کراپنی ابدی رسوائی کا سامان خود ہی کرگیا۔بندوں کواگر یہ اختیار ہوتا تو حق کبھی باطل پرفتح نہیں پاسکتا تھا۔صرف باطل ہی ہمیشہ دنیامیں سرخ رور ہتا۔''

''یہ نظام قدرت ہے۔اگرکسی کوبچشم خود یہ نظارہ دیکھنا ہےتو جامع مسجد دہلی اورکراچی کے مزار بس ایک نظر دیکھ آئے۔

ہوئے مرکےہم جورسواہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

نہرو کے سامنے ہی یہ کتاب شائع ہوکرآئی۔رپورٹرز نے پنڈت جی سے پوچھا کہ مولانا تو آپ کوبٹوارے کا ذمے دارقرار دے گئے ہیں اس کتاب میں۔نہرو نے نہایت عمدہ جواب دیا۔''فضل حق سانس لینے رکے۔

''کیاجواب دیا؟''

''اس نے حقیقت بیان کردی۔ جواب دیا کہ مولانا تاریخی پروسس سے زیادہ اہمیت ذاتیات کو دیتے تھے۔''

''میرا خیال ہے کہ آزاد کو تاریخی پروسس کے معنی بھی نہ پتہ ہوں گے۔'' امین بولا۔

''ایک مولانا آزاد ہی کیا۔ کسی بھی فاضل سے پوچھ لیجئے کہ بلکہ تمام فضلاء کو جمع کر کے سب سے پوچھ لیجئے اگر اس کے معنی بتا دیں۔'' کلیم نے دعویٰ کیا۔

''ایسا غضب مت کرنا۔ تمام فضلاء جمع ہو گئے تو پورا شہر خالی ہو جائے گا۔ مہینوں لوگ ابکائیاں لیتے پھریں گے۔'' امین نے شرارت سے فرضی ابکائی لی۔

''شبلی کا تربیت یافتہ جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہے۔'' فضل حق نے بیان کرنا شروع کیا ''اور خطاب ہے مسلمانان ہند سے......''

''یار اسی وجہ سے شاید شاہجہانی مسجد کی برکت ختم ہو گئی۔ کبھی سوامی کھڑا توحید و شرک کا اتحاد کرا رہا ہے۔ کبھی چھیڑا کھڑا ہوا سفید جھوٹ بول رہا ہے اور کبھی بخاری کھڑا ہوا ووٹوں کا سودا کر رہا ہے۔ کبھی چھوٹا بخاری آر ایس ایس کی حمایت میں فتویٰ جاری کر رہا ہے۔ کبھی نادر شاہ تلوار بے نیام کیے بیٹھا ہے اور دلی کی گلی کوچوں میں مسلمانوں کا قتل عام کرا رہا ہے اور کبھی اس کے زیر سایہ روہیلا، درویش صفت بادشاہ کی آنکھیں نوک خنجر سے نکال رہا ہے۔ واہ رے مسلمانان دہلی کی قسمت۔'' اقبال نے گریہ کھینچا۔

''وہ تو کہئے کہ بنوانے والا خود نہایت عابد تھا ورنہ اب تک تو اس کے مینارز میں بوس ہو گئے ہوتے۔'' شمیر بولا۔

''اتنے جھٹکے تو اس کے عظیم گنبد بھی نہیں سہار سکتے تھے مگر یہ کہ گھر خدا کا ہے۔'' امین نے مسجد کے قائم رہنے کی وجہ بتائی۔

''اس خطاب میں مہا بکو کی بکواس عروج پر ہے۔'' فضل حق بولے۔

''مگر اس نے کیا کہا؟'' ہم نے تو بڑی تعریفیں سنی ہیں اس تقریر کی کہ مسلمانوں کے بندھے ہوئے بستر کھلوا دیے۔'' ضمیر نے فضل حق سے پوچھا۔

''چاندنی چوک، دریا گنج، پہاڑ گنج اور ترکمان گیٹ کے ہزارہا مسلم خاندان کس نے

برباد کرائے۔ بے شمار لوگ قتل ہوئے دہلی شہر میں اور یہ وزیر تعلیم بنا ہوا سرسوتی بندنا کا پاٹھ پڑھتا رہا۔ واردھا اسکیم لاگو کرتا رہا۔ وزیراعظم اس کا ذاتی دوست تھا۔ ماؤنٹبیٹن گورنر جنرل تھا۔ دہلی کی ساری فوج اور پولیس اسکے اختیار میں تھی۔ مہینوں تک کہیں ایک بھی فوجی تو دور کی بات ہے پولیس والا تک نظر نہ آتا تھا۔ دہلی کی سڑکوں پر دعوت عام تھی مسلمانوں کی دولت اور عزت آبرو کی۔ کیا اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سکھوں کا قتل عام ہوا ہوگا حکومت کی سرپرستی میں، جو اس وقت مسلمانوں کا ہوا مگر یہ کہ مسلمان اپنے مرے ہوؤں کا شمار نہیں رکھتا۔ صرف جامع مسجد کے آس پاس پرانی دہلی کی گھنی آبادی کے علاقے بچ گئے اور وہ بھی ان کی اپنی ہمت کی وجہ سے۔'' فضل حق نے بتایا۔

''یہاں علی گڑھ میں بھی دودھ والی گلی میں چند مسلمان گھرانے صدیوں سے صرف اپنی ہمت کی بدولت جی رہے ہیں۔'' ضمیر کو یاد آیا۔

''اور آپ کو پتہ ہے کہ یہ تقریر جس کا اتنا چرچا ہے مسلمانوں کی محفلوں میں آزادی کے ایک سال بعد ہوئی۔''

''ایک سال کے بعد؟'' ضمیر کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''جی اکتوبر ۱۹۴۸ء میں۔ ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا۔ ایک سال میں تو ساری بستیاں ویران ہو چکی تھیں۔'' فضل حق نے بتایا۔

''کیا مُردوں کا مخاطب کرنے آیا تھا شیروانی اور چوڑی دار میں؟'' کلیم نے طنز کیا۔

''اس دن خاص طور سے مونچھوں پر خضاب لگا کر تاؤ دیا گیا تھا کہ نوک خنجر بھی شرم سے پانی ہو جائے۔ بھنویں چڑھی ہوئیں۔ گردن غرور سے اکڑی ہوئی اور الفاظ میں شمشیر کی کاٹ کہ بدلہ لینے کا وقت آ گیا تھا۔''

''کس سے بدلہ لینے کا وقت؟'' ضمیر نے پوچھا۔

''غریب مسلمان سے کہ اس نے آزاد کو ہمیشہ ٹھکرایا تھا۔''

''وہ خود اپنی پارٹی بناتا پھر شکایت ہوتی تو ٹھیک تھا۔ مگر یہ کہنا کہ میرے ساتھ تم بھی جماعت اغیار میں شامل ہو جاؤ، کوئی کیسے مان سکتا تھا؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''بالکل سامنے کی بات ہے۔احمق ترین آدمی بھی یہ سودانہیں کرسکتا۔''امین نے شعر پڑھا۔

تمہیں چاہیں تمہارے چاہنے والوں کو چاہیں
مرادل پھیر دے مجھ سے یہ سودا ہونہیں سکتا

''خیر،انھوں نے فرمایامگرآپ لوگ خود کیوں نہیں پڑھ لیتے اس تقریر کو؟'' خطبات آزاد میں مکمل متن شائع ہوا ہے۔''فضل حق نے بیان کرتے کرتے رک کرسوال کیا۔

''مگر کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ تقریر کبھی ہوئی ہی نہیں۔چھیڑے کی امیج بنانے کے لیے لکھوا کر شائع کردی گئی۔''اقبال نے اپنی معلومات ظاہر کیں۔

''امیج بنانے کے لیے؟''

''ظاہر سی بات ہے کہ لوگوں نے سوال کیا ہوگا کہ امام الہند کیا کررہے ہیں اس وقت،مستقبل میں مسلمان سوال کرتا کہ اس وقت ان کا کیا رول تھا۔اب اس کا جواب موجود ہے کہ مہا بکو نے اس وقت مسلمانوں کے بندھ ہوئے بستر کھلوادیئے۔''اقبال نے تجزیہ کیا۔

''ایک سال کے بعد!''شمیر حیران تھا۔

''یہ کون پوچھتا ہے۔پروپیگنڈہ بہت پرفریب چیز ہوتی ہے۔کتنے مسلمانوں نے اس تقریر کو پڑھا ہوگا اور کتنوں نے اس کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی؟''اقبال نے سوال کیا۔

''سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے صاف کہا کہ''وقت نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔جس کی وجہ سے تم سراسیمہ ہوگئے ہو۔تمہاری پریشانی اور وحشت اس لیے ہے کہ تم نے اس وقت کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا تھا۔''فضل حق نے اقتباس پیش کیا۔

''کیا مطلب؟''اس وقت کے لیے تیار نہیں کیا تھا۔''امین نے سوال کیا۔

''مطلب صاف ہے یار،جیسے میں نے تیار کررکھا تھا کہ وزیر بنا بیٹھا ہوں۔'' اقبال بولا۔

''کیا تمام مسلمان وزیر ہو جاتے؟''

''انھوں نے یہ بھی کہا کہ تم نے برسوں انگریزوں کی غلامی کو ہی اپنی زندگی سمجھ رکھا تھا۔تم نے برسوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی گزاری ہے۔اوران بتوں کو ہی اپنا خدا سمجھ رکھا تھا جو تمہیں داغ جدائی دے گئے۔''فضل حق نے ایک اور اقتباس سنایا۔

''حاکمانہ طمع کا کھلونا؟''کلیم حیران رہ گیا۔

''مطلب صاف ہے کہ مسلمان غلامی کر رہے تھے اور برادران وطن ملک کے لیے جانیں دے رہے تھے۔اس خیال کا پورا مضمون الہلال میں شائع کر چکے تھے کہ مسلمان آخر کس مرض کی دوا ہیں۔''

''اور داغ جدائی والی بات؟''کلیم نے پھر پوچھا۔

''مطلب مسلم لیگ سے ہے۔جبکہ اس وقت بھی ہندوستان کی پارلیمنٹ میں مسلم لیگ جداگانہ انتخاب قائم رکھوانے کے لیے لڑ رہی تھی اور آزاد اس کو ختم کرنے کی حمایت میں تقریریں کر رہا تھا، کہ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔قدئدملت محمد اسمٰعیل صاحب جن کو جناح صاحب نے ۱۹۴۸ء میں انڈین یونین مسلم لیگ کا صدر بنایا تھا، اپنی پوری طاقت سے پارلیمنٹ میں اس مسئلے پر اڑے ہوئے تھے۔سارے ریکارڈز موجود ہیں، کوئی بھی دیکھ لے۔جبکہ آزاد جداگانہ انتخاب کو ختم کرانے کے علاوہ اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے میں بھی کانگریس کے ساتھ تھا۔''

''کتنے تعجب کی بات ہے مسلم لیگ کے ممبران تقسیم کے بعد بھی پارلیمنٹ میں تھے اور مسلمانوں کے حقوق کی لڑائی لڑ رہے تھے۔''امین حیران رہ گیا۔

''جی کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کے ممبران تھے اور اس سے بھی زیادہ تعجب کی بات ایک اور ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ یہ کہ جس دن سے مسلم لیگ ۱۹۰۶ء میں بنی، وائسرائے کی کونسل ہو، جو اس وقت کی پارلیمنٹ تھی یا آزاد ہند کی پارلیمنٹ ہو، ایک دن کے لیے بھی وہ مسلم لیگ کے ممبران

سے خالی نہ رہیں یہ ایک روحانی معاملہ ہے۔ مسلم لیگ کبھی ختم نہیں ہوسکتی چاہے دشمن کتنی بھی کوشش کر کے دیکھ لیں۔''فضل حق نے دعویٰ کیا۔

''بنائی کس نے تھی آخر! چوبیس کیرٹ گولڈ تھے محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ۔'' اقبال نے کہا۔

''اور آج بھی ہندوستان کے ایک صوبے میں حکمران ہے اور مسلمانوں کے لیے 11% رزرویشن نافذ کرا چکی ہے۔ یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی تحریک بھی مسلم لیگ کے ایک ممبر پارلیمنٹ بنات والا صاحب کے بل سے ہوئی۔ جتنی بھی طاقت تھی پوری قوت سے پارلیمنٹ میں لڑائی مسلم لیگ نے ہی لڑی۔''فضل حق نے بتایا۔

''جتنی بھی طاقت؟''ضمیر نے پوچھا۔

''ارے بھئی مسلمان کہاں سپورٹ کرتا ہے کیرالہ کے علاوہ۔ دو ایم پی پہنچ جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں دو آدمی کیا کر سکتے ہیں۔ دس بیس ہوں تو بات بنے بھی۔ مگر مسلمان آزاد کے پیچھے دیوانہ ہے پچھلے پچاس سال سے۔''فضل حق نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

''سب مسلمان تو کانگریس میں نہیں ہیں؟''ضمیر نے سوال کیا۔

''ان کی سنو یار، کیسے کیسے ہیں یہاں۔''کلیم نے جھنجھلا کر کہا۔

''اس میں کیسے کیسے کی کیا بات ہوئی۔ زیادہ تر مسلمان تو کانگریس کے خلاف ہیں اب۔''ضمیر نے اپنی بات پر ضد کی۔

''تو تم نے بس اتنا سمجھا کہ سرسید کسی کانگریس نام کی جماعت کے خلاف تھے؟''امین نے پوچھا۔

''ظاہری بات ہے۔''

''چلئے اٹھا جائے۔ جب دن رات ساتھ بیٹھنے والے کا یہ عالم ہے تو عام مسلمان کی کیا خطا۔''کلیم نے جھنجھلا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بتاؤ نا؟''ضمیر نے کلیم کا ہاتھ پکڑ کر ضد کی۔

''سرسید نے طیب جی کو لکھا کہ میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں جو ہندوستانیوں کو ایک

قوم سمجھتی ہو۔‘فضل حق نے بتایا۔

’’یعنی؟‘‘

’’یعنی یہ کہ جنتا دل، سماجوادی وغیرہ وغیرہ،اسی لیے انھوں نے صرف کانگریس کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت بنائی۔ان کے انتقال کے بعد ۱۹۰۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں وقارالملک کی صدارت میں اسی کا نام مسلم لیگ رکھا گیا جو آج بھی انڈین یونین مسلم لیگ کے نام سے قائم ہے۔اب آیا سمجھ میں‘‘،فضل حق نے رسانیت سے تفصیل بیان کی۔

’’جی اب سمجھ میں آ گیا۔‘‘ضمیر نے کلیم کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

’’اتنی دیر لگاؤ گے تو بس ہو گیا کام۔‘‘امین نے ضمیر سے کہا۔

’’شکر کرو کہ دیر سے ہی سہی،میری سمجھ میں تو آ گیا۔کسی اور اولڈ بوائے کو ایک سال میں بھی سمجھا سکو تو بڑی بات سمجھنا۔‘‘ضمیر نے ہنستے ہوئے دعویٰ کیا۔

’’آزادی کے بعد حیدرآباد اور کیرالا کے مسلمانوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے سارے مسلمان آزاد کی پیروی کرتے آ رہے ہیں۔‘‘

’’وہ کیسے؟‘‘ضمیر نے پوچھا۔

’’آزاد کی بنیادی تھیسس تھی کہ مسلمان اپنی پارٹی نہ بنائیں اور ہمیشہ دوسروں کی جماعتوں میں شریک رہیں اور یہی مسلمان ۱۹۴۷ء کے بعد سے کرتا آ رہا ہے۔مذہبی پابندی کے ساتھ اس راہ پر گامزن ہے۔شمالی ہند کا مسلمان تو اپنی کسی بھی جماعت سے سخت نفرت کرتا ہے۔بنانے والا یا مسلم جماعت کے لیے کام کرنے والا سماج میں ذلیل ہو کر رہ جاتا ہے۔جامع مسجد کی تقریر کا بنیادی پیغام ہی یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی الگ جماعت بنا کر غلطی کی اور یہ کہ ملک کی تقسیم بھی اسی پارٹی نے کرائی۔جب کہ کتاب میں الٹی بات لکھی۔‘‘

’’اتنا بڑا جھوٹا تھا چھٹیرا۔‘‘شمیر نے حیرت جتائی۔

’’۱۹۵۰ء میں لکھنؤ میں مسلم کنونشن کیا۔اس میں بھی مسلم لیگ اور جناح صاحب

پرالزام عائد کیا۔''

''نہرواور کانگریس کے رول پر بھی تو کچھ کہا ہوگا؟''ضمیر نے معصومیت سے پوچھا۔

''اگر ایک لفظ بھی نکال دیتا تو شیخ عبداللہ کی طرح تمام زندگی جیل کی روٹیاں توڑتا۔'' فضل حق نے دعویٰ کرتے ہوئے کہا۔''شیخ عبداللہ کی قوم پوری اس کے ساتھ تھی پھر بھی جیل کی ہوا کھانی پڑی اور آخر میں معافی مانگ کر باہر آیا۔آزاد کی کیا حیثیت تھی۔تمام مسلمان اس کے خلاف تھے۔اگر دھوکے سے بھی نہرو کے رول کے بارے میں کچھ کہہ دیتا تو حکومت اس کی کھال کھنچوالیتی اور دہلی کی سڑکوں پر گدھے پر بٹھا کر جلوس نکلوادیتی امام الہند کا۔''

''اسی لیے یہ انتظام کیا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ کتاب شائع ہو؟''شمیر نے سوال کیا۔

''ظاہر ہے اور تیس صفحات کا،مرنے کے بھی تیس سال کے بعد۔'' فضل حق نے جواب دیتے ہوئے بتایا''آزادی کے بعد گیارہ سال زندہ رہا۔تین اہم تقاریر اس زمانے کی ہیں۔ایک جامع مسجد، دوسری لکھنؤ مسلم کنونشن اور تیسری علی گڑھ کے کنویکشن میں۔ تینوں جگہ تقسیم کے سلسلے میں نہرو کے رول پر کچھ بھی نہیں کہا اور صرف مسلم لیگ پر الزام تراشیاں کیں۔''

''لکھنؤ مسلم کنونشن کا کیا مقصد تھا؟''امین نے پوچھا۔

''پورے شمالی ہند میں مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر پٹائی ہوچکی تھی اردو ختم کردی گئی تھی،زمینداریاں ضبط کرلی گئی تھیں۔مسلم لیگ کے جو لیڈران بچ گئے تھے خوف کے مارے کانگریس میں شامل ہوگئے تھے یا ملک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔بس اب صرف مہا بکو تھا اور اس کی لفاظی۔لکھنؤ میں مسلمانوں کا کنونشن کیا اور یہ تجویز پاس کرائی کہ اب کبھی بھی مسلمان اپنی سیاسی جماعت نہیں بنائیں گے اور ہمیشہ کانگریس میں شامل رہیں گے۔''

''گویا تاقیامت مسلمانوں سے سیاسی غلامی کے پٹے پر دستخط کرالئے گئے۔''کلیم نے

تجزیہ کیا۔

''کسی نے مخالفت نہیں کی اس نامعقول تجویز کی؟''شمیر نے پوچھا۔

''ہر طرف سناٹا تھا۔خوف کا عالم تھا۔کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔آخر کار آزاد اپنی زندگی کے مشن میں کامیاب ہو ہی گیا۔جس مقصد کے لیے اس نے ۱۹۰۸ء میں سیاست شروع کی تھی۔مکمل بیالیس سال کے بعد وہ دن اس کی زندگی میں آیا کہ مسلمان سر جھکائے اس کے حضور میں کھڑے تھے اور تمام سیاسی عزائم دفن کرنے کا اعلان کر رہے تھے۔حد یہ کہ علی گڑھ بھی اسکے دروازے پر سرنگوں تھا۔ پچاس سال گزرنے کو آئے مگر مسلمان سر جھکائے پوری وفاداری سے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا ہے۔کسی بھی پارٹی میں شامل ہوسکتا ہے۔حد یہ کہ بی جے پی کی حمایت میں نکل کر آ سکتا ہے۔مگر اپنی جماعت بنانے سے اسے سخت نفرت ہے۔ہر پارٹی میں دیوانوں کی طرح نعرے لگاتا ہے، چندے دیتا ہے، لڑتا ہے، مگر ادھر دیکھ بھی نہیں سکتا جدھر دیکھنے کو آزاد منع کر گیا ہے اور سرسید تاکید کر گئے ہیں۔''

''اسی لیے ہم اپنی کتاب کا نام''مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد'' رکھیں گے۔''اقبال نے اپنا پلان بتایا۔

''کتنے مایوس کن حالات ہیں؟''کلیم حیران تھا۔

''تقسیم کے بعد ہی سہی، آخر آزاد نے اپنی منزل پا ہی لی۔''امین نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اب پورا ملک اس کا تھا۔کوئی اس کی مخالفت کرنے والا باقی نہ بچا تھا کہ پوچھتا حضرت یہ کیا بکواس کرتے پھر رہے ہیں۔کیوں اتنا سفید جھوٹ بول رہے ہیں لیکن صرف ایک جگہ اب بھی ایسی تھی جہاں انہیں منہ توڑ جواب دیا گیا اور وہی آج بھی ہماری امیدوں کا مرکز ہے۔''

''آزادی کے بعد؟''

''۱۹۵۲ء کے کنوکیشن میں مہمان خصوصی تھے۔اسٹیشن کا پٹا ہوا اب چار گھوڑوں کی بگھی میں یونیورسٹی کی سڑکوں پر شان سے گھوم رہا تھا۔سینٹرل لائبریری کا نام اس کے نام پر رکھ

دیا گیا تھا۔تعلیمی ادارے تو حکومت وقت کے وفادار ہوتے ہی ہیں مگر غلطی یہ ہوگئی کہ ذاکر حسین نے اسٹوڈنٹس یونین میں بھی ان کا استقبالیہ رکھوادیا۔وہاں بھی اپنی جناتی زبان میں سرسید کے سیاسی مشن اور مسلم لیگ کی مخالفت کی۔بس کیا تھا۔علی گڑھ میں زندگی کی حرارت ابھی باقی تھی۔جو ایک دن پھر ہماری سیاسی راہوں کو بھی منور کردے گی۔''

''مگر ہوا کیا؟''شمیر نے جلد بازی کی۔

''ہوا یہ کہ صدر یونین کھڑا ہوگیا۔اور اس نے بھی،ابھی علی گڑھ بے زبان نہیں ہوا تھا، مہا بکوہی کی جناتی اردو میں ڈائیلاگ بہ ڈائیلاگ ترکی بہ ترکی،ہر ہر الزام انہیں کے سر پر لا دریا۔لڑکوں کو تو آپ جانتے ہی ہیں۔پورا ہال اس کے ہر جملے پر تالیوں سے گونج رہا تھا اور مہا بکو کی پھر وہی حالت ہوئی کہ کاٹو تو خون نہیں۔''

''اسٹیشن کا منظر نظروں میں گھو گیا ہوگا؟''امین نے اندازہ لگایا۔

''شکر خدا کہ پورے ملک میں کہیں تو اس کو جواب دینے والے موجود تھے۔''کلیم نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''بڑے بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے والی حالت ہوئی۔''امین بولا۔

''طلباء تو پھر طلباء ہی ہوتے ہیں مگر اس کے بعد علی گڑھ کے قلم کاروں نے جو تعریفوں کے پل باندھنے شروع کیے ہیں تو پچاس سال گزرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ رکا نہیں ہے۔لیکن ایک بار ایسا ہوا کہ آزاد کے مداح سب کے سب کنیڈی ہال کمپلیکس سے منہ چھپا کر بھاگے۔''فضل حق نے بتایا۔

''وہ کیسے؟''

''موقع تھا مولانا آزاد صدی تقریبات کا۔ہمیں بھی وہاں بلا لیا گیا۔پروفیسر گوپی چند نارنگ صدارت کر رہے تھے۔مدح نگاروں نے ایک کے بعد ایک مقالے پڑھنے شروع کیے۔کوئی ولی اللہ بتا رہا تھا کوئی نبی اللہ کوئی دنیا کا سب سے بڑا مفسر کوئی سیاسی فلاسفر۔کوئی ان کے اسلوب کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ہندوستانی مسلمانوں اور علی گڑھ کا تو سب ہی مسیحا بتا رہے تھے۔مختصر یہ دنیا کی کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ تھی۔سننے والے

اونگھ رہے تھے خود اسٹیج پر بیٹھے لوگ بھی بے حس بیٹھے تھے کہ برسوں سے سمینارز میں یہ مضامین لغو سنتے چلے آرہے تھے کہ ہمارا نام پکارا گیا۔''

''پھر تو کام ہوگا آزاد کا؟'' امین نے اندازہ باندھا۔

''ہم نے شروعات میں ہی عرض کیا کہ حضرات یہ مقالہ مولانا کے اصل چہرے سے نقاب اٹھانے کی ادنیٰ سی کوشش ہے۔صدر صاحب کی اجازت سے ہم نے مقالہ کا عنوان پڑھا ''مولانا آزاد اور علی گڑھ تحریک'' اور بتایا کہ علی گڑھ تحریک اور مولانا آزاد کا رشتہ منفی رشتہ ہے جو میں اس مقالے میں ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔بس پھر کیا تھا کھٹاکھٹ کرسیاں ہٹنے کی آوازیں آنے لگیں اور آدھا ہال خالی ہوگیا۔''

''آدھا ہال خالی ہوگیا؟''،ضمیر نے پوچھا۔

''جی،وہ جانتے تھے کہ میں آزاد کا مخالف ہوں اور آج ان کی خیریت نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''مقالہ شروع کیا۔لوگ جاگنے لگے۔سر جھٹکا اور آنکھیں ملیں۔خود پروفیسر گوپی چند نارنگ میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر آگے جھک آئے۔ثبوت پر ثبت،الہلال و البلاغ سے،مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت اور انڈیا ونز فریڈم کا دروغ،سب طشت از بام کردیا بچاس منٹ میں جتنا بھی کر سکتے تھے۔ان کی تفسیر پر بھی خاصی نکتہ چینی کی۔''

''لوگوں کا ری ایکشن کیا تھا؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''بس وہ سب کے سب منہ کھولے ہوئے حیرت سے امام الہند کے سر سے ٹوپی اترتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔زندگی میں پہلی بار ایسی گفتگو حضرت کے بارے میں سنی تھی۔''

''پھر کیا ہوا۔''،شمیر نے جلدی کی۔

''میرا آخری مقالہ تھا۔اس کے بعد صاحب صدر نے طویل تقریر کی سمینار کے نتائج پر۔میں حیران رہ گیا اور قائل ہوگیا اس دن پروفیسر نارنگ کی دانشوری کا۔انھوں نے تقریباً آدھا گھنٹہ میرے مقالے پر تبصرہ کیا۔اتنی پرمغز اور دیانتدارانہ تقریر کی انھوں نے کہ بس۔اس زمانے کا پورا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا سرسید اور آزاد کے نظریات کے تعلق سے اور

ایک بات خاص طور سے مجھ سے مخاطب ہوکر کہی۔''

''کیا بات کہی؟''

''بس وہ ایک ایسا راز تھا کہ سرعام انھوں نے بیان کر دیا۔ جب تک میں بالکل نہیں جانتا تھا اس بات کو۔ انھوں نے کہا کہ آپ کی یہ کہانی نامکمل ہے اگر اس میں شبلی کا ذکر نہ آئے۔''

''علامہ شبلی نعمانی کا؟'' امین حیران ہوا۔

''اس وقت تک میں س بات کو نہیں جانتا تھا کہ اس معاملے میں شبلی کا رول کیا ہے۔ بس سرسید اور آزاد کے ہی تعلق سے پڑھ رکھا تھا۔ پڑھنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ آزاد کی علی گڑھ مخالفت کا اصل سوتر دھار کون تھا۔''

''اچھا اسی لیے آپ یہ کہتے ہیں کہ سرسید نے شبلی کو نوکری اور جوہر کو داخلہ نہ دیا ہوتا تو پورے ملک میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق ملتے اور تقسیم نہ ہوتی۔'' ضمیر نے سمجھتے ہوئے کہا۔

''لیکن اب تو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آزادی کے بعد انھوں نے علی گڑھ کو بچالیا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔'' امین نے اہم سوال پوچھا۔

''یہ بھی ایک زبردست پروپیگنڈہ ہے۔ سینٹرل یونیورسٹی کیا ہوتی ہے؟ پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے قائم کیا ہوا ادارہ۔ اس کی اٹونومس گورننگ باڈیز ہوتی ہیں۔ علی گڑھ کو صرف پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعہ ہی بدلا جا سکتا تھا۔ درودیوار سے جھگڑا تھوڑی ہوتا ہے۔ صرف قونین کا ہی کھیل ہوتا ہے۔ سو آزاد نے بحیثیت وزیر التعلیم ۱۹۵۲ء ترمیمی ایکٹ کے ذریعے علی گڑھ کو ختم کر دیا۔''

''علی گڑھ کو ختم کر دیا۔ کیا مطلب؟'' ضمیر اچھل پڑا۔

''علی گڑھ کا پیغام مسلم قومیت مٹا دیا گیا۔ ان کا ایکٹ پڑھئے جو ۱۹۵۲ء میں انھوں نے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں تبدیلیاں کر کے پاس کرایا۔ اقلیتی کردار کی تحریک، وائس چانسلر کی پٹائی، سپریم کورٹ کا فیصلہ، یہ سب انہیں کے ایکٹ کا شاخسانہ ہے۔''

''اس پر بات ہو چکی ہے۔'' امین نے بتایا۔

''پوری گفتگو ہو چکی ہے۔بس اتنا کہنا کافی ہے کہ طلباء اور اساتذہ میں جو مسلمانوں کی اکثریت قائم رہی وہ یہاں کے سینئر اساتذہ کے اپنے اختیارات کی وجہ سے رہی۔انہیں داخلے اور اپائنٹمنٹ کرنے کا پورا اختیار حاصل رہا جو ہر ادارے میں ہوتا ہے۔سو انھوں نے اپنے اختیارات مسلم طلباء کے حق میں استعمال کئے۔''فضل حق نے آخری بات کہی۔

''آخر میں بس یہ اور بتائیے کہ آزاد کے مسلم مخالف رویے کی بنیادی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔''کلیم نے فضل حق سے سوال کیا۔

''وہ بہت بڑا مسلم مخالف تھا اور میرا چیلنج ہے تمام مدح نگاران آزاد کو وہ اس کی تمام سیاسی زندگی سے جو ۱۹۰۸ء میں مسلمانوں کے خلاف بنگالی ہندوؤں کی پرتشدد مسلم مخالف تحریک کی حمایت سے شروع ہو کر............''

''بنگالی ہندوؤں کی مسلم مخالفت پرتشدد تحریک، یہ کیا تھی؟'' کلیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پروفیسر مشیر الحق تک نے لکھا ہے کہ مولانا کی سیاسی زندگی بنگالی ہندوؤں کی تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لیے چلائی جانے والی پرتشدد تحریک کی حمایت سے شروع ہوئی جو کہ بہت دشوار کام تھا اس لیے کہ یہ سب لوگ نہ صرف ہندو تھے بلکہ انتہائی مسلم مخالف بھی تھے لہذا ایک زمانے تک اروند گھوش وغیرہ ان پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔''

''مشیر الحق وہی جو کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''جی، ان کی مشہور کتاب ہے جو درحقیقت ان کی تھیسس ہے جس پر انہیں کسی کینیڈین یونیورسٹی سے .Ph.D ملی تھی اس میں اور بھی بہت سے دروغ مولانا کے بیان کیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ مولانا نے اپنے ''تذکرہ'' میں دعویٰ کیا تھا کہ ان کے دادا نے عربی زبان میں بارہ والیوم میں ایک کتاب لکھی تھی۔مشیر الحق نے لکھا کہ دنیا کی کسی لائبریری کٹیلاگ میں نہ اس نام کا کوئی رائٹر ملا اور نہ اس نام کی کوئی کتاب۔''

''اتنا بڑا جھوٹا تھا چھیٹرا!'' امین حیران رہ گیا۔

''اپنے وقت کے کئی بڑے بڑے علماء کا نام لے کر مولانا نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ لوگ

مجھے گھر پڑھانے آتے تھے۔مشیرالحق نے ان کے بارے میں بتایا کہ دوتو مولانا کی پیدائش سے پہلے ہی مر چکے تھےاورایک صاحب مولانا کے پانچ سال کی عمرتک پہنچنے سے پہلے۔''

''ہوسکتا ہے کہ ابھیمنیو کی طرح اپنی اماں کے پیٹ سے ہی پڑھا ہوا پیدا ہوا ہو۔'' کلیم نے ہنس کرکہا۔

''یہ بھی حضرت نے دعویٰ کررکھا تھا کہ مکے میں پیدا ہوئے تھے۔لہٰذا اپنے نام کے آگے مکی بھی لکھتے تھے۔''

''اور دوسرے مدینے میں پیدا ہوئے تھےاور مدنی لکھتے تھے۔''اقبال نے فوراً کہا۔

''بس نہ چلا ورنہ خودکواللہ،رسول ہی کی اولاد نہ بتادیتے۔''امین نے شرارت کی۔

'دنیا بھر کے عیسائی مخالف ہوجاتے کہ ایک اورابن اللہ (نعوذ باللہ) پیدا ہوگیا۔''شمیر نے تبصرہ کا۔

''دعویٰ نہ کیا لیکن کم بھی کبھی نہ سمجھا۔''اقبال نے کہا۔

''ہم کچھ بھی کرلیں،مشکل ہے کہ ہماری مغفرت ہوجائے۔اگراللہ کی رحمت کو جوش آگیا تب ہی بیڑا پار ہوسکتا ہے ورنہ گئے جہنم میں۔مگر یہ مدنی مکی وغیرہ تو بہت ہی بڑے تھے،اتنے بڑے کہ اگرخدانخواستہ ان کودوزخ میں ڈالنے کا فیصلہ ہوگیا تو دیکھنا کہ دنیا ملائک میں انقلاب زندہ باد کے نعرے گونجنے لگیں گے۔جنت دوزخ کا سارا کام کاج ٹھپ ہوکر رہ جائے گا۔ٹولز ڈاؤن کی بے مدت ہڑتال ہوجائے گی۔حضرت ابلیس تک آکرمریدین میں شامل ہوجائیں گے؟''امین کہتا چلا گیا۔

''ابے چپ کیا کیا کہہ رہا ہے؟''ضمیر نے ڈانٹ پلائی۔

''بس چالو ہوگیا۔کچھ سوچتا نہیں ہے۔''اقبال نے بھی کہا۔

''توبہ استغفار کرو۔''فضل حق نے مشورہ دیا۔

''توبہ ہم کریں تو بہ وہ نہ کریں،ابلیس تک جن کا مرید ہوگیا۔جو کام وہ اپنے دوستوں سے ساکن افلاک ہونے کے باوجود،آگ سے پیدا ہونے کے باوجود نہ کراسکا۔سب ایک

ہیNationalty کے تھے کیا مضبوط نیشنل ازم تھا۔ وطن ان سب کا ایک تھا اور قومیں وطن سے ہی بنتی ہیں۔ جو کام وہ اپنے ازلی ہم وطن دوستوں سے نہ کرا سکا اس خاک کی چٹکی نے کرا ڈالا۔ پرواز تو دیکھئے اس آدم خاکی کی......''

''ایک نہیں بلکہ دو کہیئے۔'' کلیم بھی موڈ میں آ گیا۔

''دونوں ساتھ ساتھ ہی رہیں گے وہاں بھی۔''

''خاموش ہو جاؤ اب بالکل۔'' فضل حق کو واقعی غصہ آ گیا۔

''مجھے خاموش کرا دیں۔ میں چپ ہو جاؤں گا مگر جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا۔ علامہ اقبال کو خاموش کرائیے۔ ان لوگوں کے ہی لیے تو وہ کہہ گئے ہیں عروج پتلۂ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔ آسمان چیر جائے گا مکی و مدنی کا نالۂ بے باک۔ کھلبلی مچ جائے گی آسمانوں میں۔ ابلیس کو پھر واپس بلایا جائے گا اور بالاتفاق ان دونوں کی مہربانی سے لیڈر چنا جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ان کو ساؤتھ افریقہ سے بلایا گیا تھا اور تمام اہل وطن پیچھے پیچھے چل دیئے تھے۔ نعرہ ہوگا کہ قومیت ایک ہے ہم سب کی۔ سب آگ سے پیدا کیے گئے ہیں اور ایک ہی وطن میں رہتے ہیں۔'' امین بولتا ہی رہا۔

'اپنی خیر مناؤ کہ پتہ نہیں وہاں کی فیصلہ ہو۔'' اقبال نے خدشہ ظاہر کیا۔

''اہل جہنم سے ہوں۔ لیکن ان کا ہر فارغ مرتے ہی رحمۃ اللہ علیہ ہو جاتا ہے اللہ کا فیصلہ ہوتا رہے گا۔ اس کا کون انتظار کرے۔ اور انتظار کس کو کرنا ہے بس ای میل سینڈ کرنا ہے کہ یہاں رحمۃ اللہ علیہ ہو چکے۔''

''اور یہاں یہ حال ہے کہ سرسید کے آگے بھی رحمۃ اللہ علیہ لکھنے میں ہاتھ کانپ کانپ جاتا ہے بلکہ جی چاہتا ہے کہ بریکٹ میں '' ؒ '' کی جگہ انگریزوں کا غلام لکھ دیں۔'' کلیم نے حالت بیان کی۔

''اس لاجک سے تو مکی مدنی و غیر ہندوؤں کے غلام ہو گئے؟'' ضمیر سیریس ہو گیا۔

''اب سات سمندر پار سے آقا منگانے سے آسان یہ ہے کہ پڑوسی کو ہی آقا بنالو۔

کا ہے کا جھنجھٹ پالنا۔ شوق غلامی ہی تو پورا کرنا ہے۔'' کلیم نے جواب دیا۔

''دیوبند کے فارغین تازہ کا مجمع تھا۔ میں عاصی بھی وہاں حاضر تھا۔ ذکر آیا کہ سر کا خطاب اس لیے کہ ملا کہ وہ انگریزوں کے غلام تھے۔ میں نے کہا بجا فرمایا، منظور ہے۔ بس اتنا سا اضافہ اور کریں کہ مدنی اور مکی غلام مشرکین تھے۔ پھر یہ طے کر لیا جائے کہ از روئے شرع اگر غلامی میں ہی فیصلہ کرنا ہے تو شارعین شرع اور مفتیان کرام کس کی غلامی کو ترجیح دیں گے۔'' اقبال نے واقعہ سنایا۔

''گردنیں لٹک گئی ہوں گی؟'' امین نے پوچھا۔

''کئی ایک تو مراقبے میں چلے گئے۔ کئی سال گزر گئے اس واقعہ کو ایک تو مارے شرم کے آج بھی وہیں بیٹھا ہے۔''

''اسے اٹھاؤ۔ ورنہ زندہ پیر کر مزار بن جائے گا اس جگہ۔'' امین نے تشویش ظاہر کی۔

''بھئی میں تو تنگ آ گیا تم لوگوں سے۔ یہاں پتہ نہیں کیا کیا شروع ہو جاتا ہے۔'' فضل حق نے جھنجھلاہٹ میں ہاتھ اٹھا دیئے۔

''آسمانوں میں ہڑتال کرا دی اس بار تو؟'' کلیم نے ہنستے ہوئے شکایت کی۔

''مگر یہ سلسلہ شروع تو تمہارے نامعقول سوال سے ہوا۔'' امین نے یاد دلایا۔

''کونسا سوال کیا میں نے؟''

''یہی کہ بنیادی وجہ بتا دیں آزاد کے مسلم مخالف رویے کی۔''

''اس سوال میں کیا بری بات تھی؟''

''بری بات نہ تھی بلکہ تمہاری حماقت تھی۔ فضل حق صاحب نے اتنی تفصیل سے چھیڑے کے عقائد پر بحث کی اس کی من گھڑت تفسیر کا حوالہ دیا۔ اس کے مذہب پر بھی سوال کھڑا کر دیا کہ وحدت ادیان کا قائل مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ سوال اب بھی باقی ہے تمہارے ذہن میں؟'' امین نے غصہ سے پوچھا۔

''ہاں اس پر تو میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ پھر تو میرا سوال فضول ہی تھا۔'' کلیم نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی۔

''بلکہ تم خود فضول ہو۔ ایسا سوال تمہارے دماغ میں آیا ہی کیسے؟'' اقبال نے بھی کلیم پر غصہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے تمام زندگی ایک دفعہ بھی اس نے کبھی مسلمانوں کے کسی مطالبے کی حمایت نہیں کی۔ ایک بیان بھی کبھی مسلم مفاد میں نہ دیا۔ ہمیشہ ہر بات کا ایک ہی جواب تھا کہ کانگریس تمہارے سارے مسائل حل کر دے گی حکومت اسکا حق ہے۔ رام راجیہ میں سب شانتی سے رہیں گے۔ ڈرنے کی کیا بات ہے وہ ہیں تو۔''

''بس یہ کہ عرضی نویس ہو جائے پوری قوم۔'' ضمیر نے آہ نکالی۔

''میری عرضی بھی قبول ہو کہ مجھے ٹرین پکڑنی ہے۔'' فضل حق نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں چار بج گئے۔ اسٹیشن چلتے ہیں۔'' اقبال نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

''سب لوگ اٹھ گئے۔ پیدل ہی اسٹیشن جانے کا فیصلہ ہوا۔ سڑک پر ٹریفک کا اژدھام تھا۔ بڑی مشکل سے راستہ بناتے ہوئے ریلوے روڈ گیٹ تک پہنچے۔ لوہے کا پل پار کر کے پلیٹ فارم نمبر تین پر پہنچے، جہاں ٹرین کے انتظار میں فضل حق سے سی آف ٹی کا مزہ لیا گیا۔ پندرہ منٹ بعد ٹرین آئی۔ سب لوگ گلے ملے۔ پھر ملنے کے وعدے ہوئے۔ ٹیلیفون نمبر دیے گئے۔ فضل حق سے پھر علی گڑھ آنے کا وعدہ لیا گیا۔ انھیں ایک معقول جگہ پر بٹھا کر چلتی ٹرین سے سب لوگ اتر گئے۔

○

(۱۰)ہنگامۂ محشر

10.1 رام جنم بھومی

''ست پتی سیارام کی جے'' مسجد کے گنبد پر کھڑا رام سیوک بار بار کدال اٹھا کر نعرہ لگاتا تھا اور پوری طاقت سے گنبد پر مارتا تھا۔

''یون پتر شری ہنومان کی جے'' ایک اور رام سیوک ہاتھ میں پھاوڑا لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔

''ہر ہر مہادیو ہر ہر مہادیو'' دوسرے گنبد پر کئی شردھالو ہاتھوں میں کدالیں لیے جے جے کار کر رہے تھے۔ ہزاروں رام سیوکوں کا ایک ہجوم تھا کہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ حلق پھاڑ پھاڑ کر سری رام اور ہنومان کی جے جے کار کر رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں ترشول تھا۔ کوئی پھاوڑا کدال لیے تھا۔ کچھ شردھالو تلواریں اور بھالا لیے ہوئے تھے۔ غرض کہ ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا۔ سب لوگ دیوانہ وار مسجد کی دیواریں اور گنبد توڑنے میں لگے ہوئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ صدیوں کی آرزوئیں پوری ہو رہی ہیں۔ ایک چیخ ہے کہ صدیوں بعد سینے کے باہر آئی ہے اور تمام مسلمانوں کو زندہ درگور کر کے رہے گی۔ ٹی وی کیمرہ زاویے بدل بدل کر مناظر دکھا رہا تھا۔ لانگ اور شارٹ شوٹس کا بڑی ہنرمندی سے استعمال کر رہا تھا۔ عمر رسیدہ سادھوؤں سے لے کر جینس ٹی شرٹ پہنے نوجوان، دیوانہ وار مسجد کے در و دیوار پر کدالیں چلا رہے تھے۔ ایودھیا کی تمام گلیاں اور راستے رام سیوکوں سے بھرے ہوئے سری رام کی جے جے کار کر رہے تھے۔ ایک انداز کے مطابق تقریباً ایک لاکھ رام سیوک بابری مسجد کو توڑ کر رام مندر بنانے کے لیے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔

ہزار ہا پولیس اور پی اے سی کے جوان مع اپنے ہتھیاروں کے مستعد کھڑے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ مسجد کی نہیں بلکہ رام سیوکوں کی حفاظت کے لیے وہاں تعینات کیے گئے ہیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بھی جے سری رام کا نعرہ لگا کر پن کما لیں۔

''دیکھو یہ پی اے سی والا کیسے قہقہہ لگا رہا ہے۔'' شکیل نے اقبال کو متوجہ کیا۔

ایک جوان دوسرے کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگا رہا تھا۔ اقبال صبح گیاہ بجے اپنے ایک دوست شکیل کے گھر میں بیٹھا ٹی وی نیوز دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈپارٹمنٹ جا رہا تھا کہ راستے میں اس کے ایک دوست اشوک جین نے روک لیا اور تشویشناک لہجے میں بتایا کہ رام سیوک بابری مسجد پر چڑھ گئے ہیں اور لگ رہا ہے کہ مسجد گرا کر ہی رہیں گے۔ اقبال وہیں قریب اپنے دوست شکیل کے گھر نیوز سننے پہنچ گیا۔

''سبھی جوان بہت خوش نظر آ رہے ہیں۔'' اقبال نے تبصرہ کیا۔ ٹی وی کیمرہ اس وقت جوانوں کو فوکس کیے ہوئے تھے۔

''کیوں نہ ہوں۔ آخر دھرم کا معاملہ ہے۔'' شکیل نے کہا۔

''ہاں دھرم کا معاملہ تو ہے ہی۔'' اقبال نے گہری سانس لی۔

''لگ رہا ہے کہ انتظامیہ دخل اندازی نہیں کرے گی اور آج بابر کی نشانی شہید ہو کر رہے گی۔'' شکیل نے افسوس ظاہر کیا۔

''صاف اعلان کیا جاتا ہے کہ بابر کی اولاد بھارت چھوڑو۔''

''طاقت کے غرور سے سرشار ہیں یہ لوگ۔'' شکیل نے کہا۔

''یہ صرف جھوٹا غرور نہیں ہے بلکہ حقیقت ہے۔ اس طاقت کے آگے مسلمان مکھی مچھر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔'' اقبال نے حقیقت حال بیان کی۔

''پھر ہم لوگوں کا کیا ہوگا؟'' شکیل کو تشویش نے آ لیا۔

''دھرم پریورتن بھی حل نہیں ہے۔'' اقبال نے پر تفکر لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟''

''فرض کر لو کہ سارے مسلمان ہندو ہو جائیں اور تمام مساجد میں مورتیاں استھاپت

کردی جائیں تو کیا ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں؟ پھر کون سا مسئلہ رہ جائے گا سوائے مغفرت کے۔''

''نہیں، بلکہ اور مصیبت میں پڑ جائے گا مسلمان۔''

''وہ کیسے؟''

''وہ اس لیے کہ پھر دھرم کے انوسار نیائے ہوگا۔ پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ مسلمان کو کس جاتی میں رکھا جائے؟''

''جاتی میں؟ وہ کیوں؟''

''جاتی وے وستھا ہی تو ہندو سماج کی بنیاد ہے۔ چاروں ورنوں میں سے ہم کسی میں نہیں رکھے جاسکتے۔ نہ برہمن، نہ چھتریہ، نہ ویشو، اور نہ شودر۔''

''پھر کہاں رکھے جائیں گے؟''

''اس کے لیے ایک اور وے وستھا کی جائے گی۔ ملیچھ آشرم کی۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ شودر سے نیچے ایک پانچواں ورن اور استھاپت ہو جائے گا۔ کہ یہ وہ ہندو ہیں جنھوں نے شتابدیوں تک ہندو دھرم کو بھرشٹ کیا اس کا بہشکار کیا۔ اس پاپ کی وجہ سے ہزاروں سالوں تک نہ صرف اچ جاتی کی بلکہ شودر کی بھی سیوا کرنی ہوگی۔ تب ہی اس مہا پاپ سے مکتی مل سکتی ہے۔''

''تمہارے بھی تخیل کا جواب نہیں ہے۔'' شکیل نے اعتراف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ کہ ایکشن کمیٹی والے کیا کر رہے ہیں اس وقت؟''

''انہیں تو پرائے منسٹر صاحب نے کئی دن سے دہلی بلا رکھا ہے۔ فائف اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ گفت و شنید جاری ہے حکومت سے۔''

''فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''اور کہاں ٹھہرایا جاتا ہے حکومت کے مہمانوں کو؟''

''اور وہ بھی جو سینہ ٹھوک کر کہتے تھے کہ پہلے میرا بیٹا شہید ہوگا پھر میں ہوں گا پھر بابری

مسجد شہید ہوگی۔ وہ بھی کسی ہوٹل میں ہیں؟''

''کل شام تو ہوم منسٹر نے ڈنر پر بلایا تھا ان لوگوں کو۔''

''قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ۔ مسجد تو شہید ہو رہی ہے۔ یہ لوگ کب شہید ہوں گے؟'' شکیل نے معصومانہ سوال کیا۔

''اب شہادت کیسے ہوگی۔ ایودھا جاتے، مقابلے میں مارے جاتے تو شہید ہوتے۔ اب تو بس ایک ہی راستہ ہے۔'' اقبال نے لاچاری دکھائی۔

''وہ کیا؟''

''شرم سے جمنا میں ڈوب مریں یا گولی مار لیں۔ شاید مرتبۂ شہادت حاصل ہو جائے۔''

''مگر یہ تو حرام ہے؟''

''جان بچانے کے لیے حرام کھانا جائز ہو جاتا ہے۔ دنیا کو منہ دکھا نہیں سکتے۔ لہٰذا منہ چھپانے کے لیے جمنا کا پانی جائز ٹھہرا۔ لال قلعہ کی فصیل سے جہاں شاہجہاں ممتاز کے ساتھ چہل قدمی کرتا تھا، وہیں سے چھلانگ لگانا بہتر رہے گا۔''

''لیجئے دیکھئے بریکنگ نیوز۔ کلیان سنگھ نے استعفیٰ دے دیا۔''

''اچھا ہی کیا۔ ورنہ مرکزی حکومت گورنر رول نافذ کر دیتی۔ اب مسجد کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنی شہادت کا ڈھول بجائے گا اور زیادہ ووٹ پائے گا اگلے الیکشن میں۔''

''تھوڑی دیر میں نرسمہا راؤ صاحب بھی کوئی اچھا سا بیان جاری کریں گے کہ حکومت کو کھید ہے اس سانحے پر کہ ڈھانچہ ڈھا دیا گیا۔''

''کیا خوب اتفاق ہے کہ یوپی میں بی جے پی کی حکومت ہے اور مرکز میں کانگریس کی۔ اب یوپی بھی مرکز کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب دیکھئے کانگریس کیا کرتی ہے۔ ابھی گولی چلانے کا حکم کر دے۔ یہ سب شردھالو دھوتی دبا کر بھاگتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مسجد اب بھی بچ سکتی ہے۔ جو نقصان ہوا ہے اس کو بنوا دے۔ ابھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا ہے۔''

''آپ اب پُر امید ہیں؟''

''جی''

''کس بات پر؟ کیا مرکز کو یہ سب پتہ نہ ہوگا کہ مسجد کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ایک ایک لمحے کی خبر ہوگی۔حکومت کی پوری توجہ ایودھیا پر ہی مرکوز ہوگی اس وقت۔وہ چاہتے تو اب تک دخل دے سکتے تھے مگر ابھی تک ایسا نہیں ہوا ہے اور امید بھی نہیں ہے۔''

''امید بھی نہیں ہے؟ کانگریس تو سیکولر پارٹی ہے۔''

''پھر تو حزب اللہ ہوگئی چھٹیرے کی۔''

''کیا کہا؟ چھٹیرا کیا؟'' شکیل چونکے۔

''تم نہیں سمجھو گے وہ ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا۔''

''یہ کون سے لطیفے کا وقت ہے۔''

''یہ ان لطیفوں کا وقت ہے جو بھیگی آنکھوں سے سنائے جاتے ہیں۔''

''بھیگی آنکھوں کے لطیفے؟''

''فرض کرو کہ کسی کا محبوب ساتھی بچھڑ جائے اور لوگ اسے صبر کی تلقین کریں۔یہ لطیفہ نہ ہوا؟ کسی اسٹوڈنٹ کے پاس امتحان کی فیس کے پیسے نہیں اور آپ اس سے کہیں کہ تو شاہین بچہ ہے اور ترا نالۂ بے باک آسمان چیر جائے گا، یہ لطیفہ نہ ہوا؟ اس وقت کوئی عالم فاضل، مشرقیت اور اسلامیت کو ایک ثابت کرے، یہ لطیفہ نہ ہوا؟ اور کتنے سناؤں۔''

''بات میں دم ہے۔'' شکیل نے اعتراف کیا۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' اقبال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے شام کو ملاقات ہوگی۔اپنے مکان میں کب شفٹ ہونے کا ارادہ ہے۔''

''بس تھوڑا سا پلاسٹر رہ گیا ہے۔چندروز میں ہال چھوڑ دوں گا۔''

''کئی سال ہوگئے وہاں رہتے ہوئے؟''

''تین سال گزر گئے دیکھتے ہی دیکھتے۔''

''ٹھیک ہے پھر شام کو کلب آتے ہیں۔''

''اگر کرفیو نہ لگا۔اچھا خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔'' اقبال نے ہاتھ ملایا۔اور باہر آ کر اسکوٹر اسٹارٹ کر کے ڈپارٹمنٹ

چلا آیا۔راستے میں جگہ جگہ طلباء کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔یونیورسٹی میں کہیں کلاس نہیں ہو رہے تھے۔زیادہ تر اسٹاف نیوز دیکھنے کے لیے گھروں کو روانہ ہو چکا تھا۔اقبال بھی تھوڑی دیر میں ہی ہال چلا آیا۔وہاں آ کر دیکھا کہ پرووسٹ صاحب کے ساتھ پوری ٹیم موجود تھی۔طلباء کا ایک ہجوم سا تھا۔آفس میں سب لوگ انتہائی غم زدہ اور مایوس دکھائی دے رہے تھے۔رفتہ رفتہ ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ہال کے دروازے بند کرا دیئے گئے تھے۔بس چھوٹی کھڑکیاں ہی کھلی ہوئی تھیں۔سارا سپورٹنگ اسٹاف اپنی اپنی ڈیوٹیز پر مستعد تھا۔ایڈمنسٹریشن کو ڈر تھا کہ طلباء کی طرف سے کوئی تشدد نہ ہو۔اتنے میں خبر آئی کہ پورے شمشاد میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔بلکہ شمالی ہندوستان کے ہر شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔شمشاد مارکیٹ والی روڈ پر سخت کرفیو نافذ کر دیا گیا۔رات آتے آتے حالات مزید خراب ہوتے چلے گئے کہ کارسیوک ابھی تک مسجد کو توڑنے میں لگے ہوئے تھے۔حکومت کی طرف سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ٹیلی ویژن رپورٹرز کو بابری مسجد کے پاس سے ہٹا دیا گیا تھا۔لیکن طلباء ٹیلی ویژن سے چپکے ہوئے تھے،شاید کہ کوئی اچھی خبر آئے۔مختلف شہروں میں فسادات پھوٹ پڑنے کی خبریں آنے لگیں۔پرووسٹ،وارڈنز اور سینئر طلباء نے تمام رات جاگتے ہوئے گزاری کہ طلباء تشدد پر نہ اتر آئیں۔پراکٹر نے بھی سو سے زائد ٹیچرز کی ڈیوٹی کیمپس میں لگائی جو تمام رات سڑکوں پر گشت لگاتے رہے۔صبح ہوئی تو اخبارات بابری مسجد کے ٹوٹے ہوئے گنبدوں کی تصاویر سے بھرے پڑے تھے۔معلوم ہوا کہ رات میں مسجد پوری طرح شہید کر دی گئی۔خبروں کے پھیلتے ہی مسلمانوں میں دہشت کا ماحول پیدا ہو گیا۔کارسیوکوں کی بہادری کے کارنامے سے برادران وطن میں خاص طور سے کٹر وادی ہندوؤں میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی اور چاروں طرف جے جے کار گونجنے لگی۔ہر ہر مہادیو اور جے شری رام کے نعروں کے ساتھ گولے داغے جانے لگے۔آتش بازی چھوٹنے لگی۔مٹھایاں بانٹی جانے لگیں۔ایسا لگتا تھا کہ مسجد نہیں توڑی گئی ہے بلکہ کوئی دکھتا ہوا پھوڑا جسم سے نکال دیا گیا ہے۔چاروں طرف اتسو کا ماحول تھا۔کرفیو صرف مسلم محلوں میں نافذ کیا گیا تھا کہ وہ جوش میں آ کر کچھ کر نہ بیٹھیں۔لہٰذا مسلمان اپنے

اپنے گھروں میں بند جے کار کے نعرے سن رہا تھا۔آسمان میں اڑتی آتش بازیاں اور گولے دیکھ رہا تھا۔تین دن بعد اخبارات میں مسجد کی جگہ چھوٹے سے مندر کی تصاویر شائع ہوئیں کہ یہاں اب رام للا کی مورتی استھاپت کر دی گئی ہے۔اتنی عظیم عمارت کو تین دن میں صاف میدان بنادیا گیا تھا۔اتنی بڑی کارروائی کتنے کم وقت میں مکمل کر لی گئی۔ نرسمہاراؤ نے ٹیلی ویژن پر اعلان کیا کہ حکومت بابری مسجد تعمیر کرانے کے لے وچن بدھ ہے۔زرخرید علماء،فضلاء سے گفتگو کرتے ہوئے دکھایا گیا۔فضلاء کرام وزیراعظم کے وعدے سے مطمئن ہو گئے۔دوسری طرف ہزار ہا شردھالو رام للا کے درشن کرنے چاروں طرف سے ایودھیا پہنچ رہے تھے۔اور ایودھیا نگری میں رام للا کے بن باس سے واپس آنے پر دیوالی کا سا اتسو منایا جا رہا تھا۔اتنی بڑی وجے پراپت ہونے پر سمست بھارت واسی اتی اتساہت تھے۔سیکڑوں شہروں اور قصبات میں فسادات پھوٹ پڑے۔سب سے زیادہ بھیانک فسادات مہاراشٹر اور گجرات میں ہوئے۔ہزاروں مسلمانوں کو قتل کیا گیا،ان کے مکانوں اور دوکانوں کو لوٹ کر جلا دیا گیا۔بمبئی اور سورت میں پولیس کی ملی بھگت سے بھیانک قتل عام ہوا۔صورت حال اتنی سنگین تھی کہ ان علاقوں سے مسلمان اپنے کاروبار اور مکان دکان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔علی گڑھ سے دہلی تک بھی سفر کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ بسوں اور ٹرینوں میں جہاں کہیں داڑھی والا مسلمان نظر آتا لوگ جملے کسنے کے ساتھ ساتھ گالیاں بھی دینے لگتے تھے۔طلباء سہمے ہوئے خاموش بیٹھ کر اپنی شناخت چھپا کر سفر کرنے لگے تھے۔ہندو نام سے رزرویشن کرانے میں ہی عافیت تھی مگر دو سال بعد ایک بڑے سانحے نے عوام کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالا۔پھر سفر کرنا ایک دم آسان ہو گیا لوگ کھڑے ہو ہو کر داڑھی والوں کو پریم پوروک استھان گرہن کرانے لگے۔

اتنا ہی نہ ہوا کہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔بلکہ صرف مہاراشٹر میں پچاس ہزار سے زائد مسلمان ٹاڈا میں بند کیے گئے۔اگلے پارلیمانی انتخاب میں بی جے پی کو شاندار کامیابی ملی۔یہ تحفہ تھا،عوام کی طرف سے اتنی بڑی اپلبدھی پر کہ دو سیٹوں والی پارٹی دیش کی سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری اور اس کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہو گئی۔عوام نے آر ایس ایس

کو ملک کی حکومت پیش کر دی۔ سمست دیش واسیوں کے آشیرواد سے پورے پانچ سال یہ حکومت چلی، جس میں پچیس سے زیادہ سیاسی پارٹیاں شریک تھیں۔ نہ جانے کتنے نامی گرامی سیکولر اور سوشلسٹ لیڈران، آر ایس ایس سر وسنچا لک کے آشیرواد سے منسٹر بن گئے۔

10.2 زہرِ مشرقیت

''ہے کوئی وطن دشمن ضمیر فروش، آپ نہیں جانتے اسے؟'' شمس کنول نے سوال کیا۔

''مگر میں نے یہ کتاب پڑھی ہے۔''

''اچھا پڑھی ہے آپ نے؟'' شمس کنول کو حیرانی ہوئی۔

''جی اچھی طرح پڑھی ہے۔ اس میں تو کچھ ایسا نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہے؟''

''کتاب پر گفتگو شروع کی میں نے۔ بھئی مجھ سے زیادہ کون جانے۔'' اقبال نے بتانا شروع کیا۔

''ظاہر ہے، ظاہر ہے۔'' فضل حق نے تائید کی۔

''پندرہ بیس منٹ میں بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔ بار بار پہلو بدلتے تھے۔ چہرے پر پریشانی کے آثار بڑھتے ہی جا رہے تھے۔'' اقبال بیان ہی کر رہا تھا کہ کلیم بھی وہاں آ گیا۔ دعا سلام کے بعد بیٹھتے ہی سوال کیا۔

''پریشانی کے آثار کہاں بڑھتے جا رہے تھے؟''

''لیجئے صاحب پھر شروع سے بتانا پڑے گا۔'' اقبال نے مایوسی سے جواب دیا۔

کئی سال کے بعد فضل حق دہلی سے آئے تھے۔ اخبارات میں اقبال کی کتاب پر تبصرے پڑھ پڑھ کر آخر انھوں نے ٹائم نکالا اور علی گڑھ دوستوں سے ملنے چلے آئے۔ اس وقت یہ لوگ یونیورسٹی اسٹاف کلب لاؤنج میں آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لاؤنج سے متصل پختہ چبوترے پر بیڈمنٹن کورٹس بنے ہوئے تھے اس کے آگے مہندی کی اونچی باڑھ کے پیچھے وسیع لان میں ٹینس کورٹس تھے، جن کے پیچھے باؤنڈری کے پاس اونچے

اونچے درختوں کی قطاریں تھیں۔ یہ مارچ کی آخری تاریخیں تھیں۔آسمان پر پورا چاند نور بکھیر رہا تھا۔ٹھنڈی من بھاون ہوا چل رہی تھی۔ ماحول انتہائی خوشگوار تھا۔گرین لیبل چائے،فرائڈ دال موٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ پی جارہی تھی۔

''یہ پھر سے کیا مراد ہے؟''کلیم نے جاننا چاہا۔

''پھر سے یہ مراد ہے کہ دوبارشروع کر چکا ہوں یہ قصہ۔ پہلے یہ امین آئے پھر شمیر آئے اوراب آپ آئے ہیں۔ ہر بارنئے سرے سے شروع کرنا پڑتا ہے۔''

''چلئے آخری باراور ہوجائے۔اب کوئی آنے والابھی نہیں ہے۔''فضل حق نے اقبال کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

''دہلی سےایک سہ ماہی رسالہ کتاب نما نکلتا ہےجس کا ہر بارکسی جانے مانے ادیب کو اعزازی ایڈیٹر بنایا جاتا ہے۔''اقبال نے پھر بیان کرنا شروع کیا۔

''ہاں ہاں مشہور رسالہ ہے۔چھوٹی تختی پر شائع ہوتا ہے۔''کلیم کوفوراًیادآ گیا۔

''ابھی کوئی ایک مہینہ پہلے ہمارے ایک دوست نے لاکر دکھایا۔اس شمارے کے اعزازی ایڈیٹر تھےشمس کنول صاحب۔''

''یہ نام سنا ہوا ہے۔بمبئی سے رسائل نکالتے رہے ہیں۔شاید مرادآباد کے رہنے والے ہیں۔''کلیم نے پھر کہا۔

''ہاں وہی۔تو جناب شمس کنول صاحب کا ایک طویل مضمون ''اردو کے موجودہ مصنفین'' کے عنوان سے شائع ہوا۔میرے بارے میں پوراایک پیراگراف لکھ مارا۔ کتاب پرتبصرہ کرتے ہوئے یہاں تک لکھا کہ یہ مصنف کوئی وطن دشمن ہےاورمولانا آزاد جیسے عالم بےمثل،مجاہدآزادی اور بے باک ادیب ومفسر نے جواحسانات عظیم ہندی مسلمانوں پر کیے ہیں،ان کا منکر ہونے کی وجہ سےاحسان فراموش بھی ہے۔اورنہ جانے کیا کیا۔ بہرحال ہم نے پڑھااورخوش ہوئے۔''

''خوشی کی کیابات ہوئی اس میں؟''شمیر نے پوچھا۔

''وہی جوحضرت غالب کوتھی ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔''

''گالیاں کھا کر یہ حال ہے۔''امین نے بھی تفریح لی۔

''آگے تو سنو۔ بہر حال وقت گزرتا چلا گیا۔ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ان سے ملاقات ہوگئی۔''

''کہاں ملاقات ہوگئی؟''کلیم نے سوال کیا۔

''مزمل کے سامنے سڑک پار گلی ہے جہاں ایک دوست کے گھر میں سرسید کا انتقال ہوا تھا۔اسی گلی میں پیدل چلا جا رہا تھا کہ دیکھا شمس کنول ٹائپ کا ایک شخص، زیرِ تعمیر مکان کے پاس سڑک پر کرسی ڈالے بیٹھا ہے۔''

''وہ یہاں کہاں سے آگئے۔''امین کو حیرانی ہوئی۔

''پہلے تو میں ہچکچایا کہ صرف ایک بار ان کی تصویر میگزین کے سرورق پر دیکھی تھی۔ پھر ہمت کر کے واپس آیا اور پوچھا کہ آپ شمس کنول صاحب ہیں، انھوں نے کہا جی میں ہی ہوں۔میں نے کہا حضرت میں آپ کی تحریروں کا بڑ امداح ہوں میری خوش نصیبی کہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔''

''اتنا گاڑھا شرف۔''

''ایک رائٹر کو کیا چاہیے۔فوراً کھڑے ہوگئے۔ایک ٹوٹی کرسی میرے لیے بھی مزدور سے منگوائی۔میں نے بیٹھ کر پوچھا کہ کیا اب علی گڑھ میں ہی رہنے کا ارادہ ہے۔ جواب دیا کہ یہ چھوٹا سا مکان بنوا رہے ہیں۔میں نے بتایا کہ ان کا تازہ مضمون کتاب نما میں پڑھا۔نہایت عمدہ تبصرہ ہے اردو کے موجودہ مصنفین پر۔''

''خوش ہوئے ہوں گے۔''شمیر نے اندازہ لگایا۔

''خوش! فوراً چائے کا آرڈر دیا نوکر کو۔''

''پھر کیا ہوا۔''

''میں نے پوچھا کہ یہ ''مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد'' کا مصنف کون ہے۔برا منہ بنا کر کہنے لگے، استغفراللہ چھوڑیے کس نامعقول کا ذکر لے بیٹھے، میں نے کہا آخر کچھ تو بتائیں، بولے، اجی لاحول بھیجیے، آپ نہیں جانتے؟ آپ کے علی گڑھ کا ہی کوئی ضمیر

فروش ہے، میں نے کہا آخر کچھ تو بتائیں، کہنے لگے جانے دیجئے صاحب وطن کے خلاف سازشیں کرنے والوں کی کمی تھوڑی ہے کہیں سے پیسہ مل گیا ہوگا۔ پکڑا جائے گا کسی دن۔''

''کیا حال ہوا ہوگا تمہارا؟'' کلیم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بس ضبط کر گیا۔ جی تو چاہ رہا تھا کہ کھری کھری سنا دوں۔ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔''

'برداشت کی داد دینی پڑے گی پھر کیا ہوا؟'' امین نے سوال کیا۔

''گاندھی تک کے خلاف کتنی کتابیں لکھ دیں لوگوں نے اور یہ حامیان آزاد پورا ملک اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ حد ہے غلط فہمی کی۔'' کلیم کو غصہ آ گیا۔ ''وہی حال ہے کہ:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

''ہاں پھر کیا ہوا؟'' شمیر نے پوچھا۔

''میں نے کہا کہ یہ کتاب تو میں نے بھی پڑھی ہے۔ پھر جو اس پر بولنا شروع کیا ہے تو وہ پلکیں جھپکانا بھول گئے۔ کتاب پڑھی ہو تو کچھ بولیں بھی۔ اخبارات میں تبصرے پڑھ کر لکھ مارا۔''

''کتاب کے نام سے ہی نتائج اخذ کر لیے ہوں گے۔'' فضل حق نے اندازہ لگایا۔

''جی بس یہ تو دوستوں کی مہربانی ہے۔ میرا خیال تھا کہ ''سرسید آزد اور ہندوستانی مسلمان'' نام ہونا چاہیے۔ مگر ان سب کو گنگا رام کو چار پائی سے اچھالنے کا شوق تھا سو وہ پورا ہو کر رہا۔''

'یہ گنگا رام کے اچھلنے کا کیا قصہ ہے؟'' فضل حق نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''یہ بھی ان کے نادر شہر سنبھل کا قصہ ہے۔'' کلیم نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''ایک ہم لوگوں کا دوست مصطفیٰ میرٹھی مسلم لیگ کے جلسوں میں تقاریر کرنے آتا تھا۔ لوگ اس کے بڑے دیوانے تھے لطائف کا ماہر تھا۔ ایک بار اس نے ماحول بنا کر کوئی نہایت جذباتی ڈائیلاگ بولا، بڑے کی بریانی کھایا ہوا مسلمان اچھل پڑا۔ اور نعرۂ

تکبیر لگنے لگا مگر مصطفیٰ خوش نہ ہوئے۔ فرمایا کہ ایسے نہیں اتنی زور سے نعرۂ تکبیر لگاؤ کہ گنگا رام اپنی چارپائی پر سے اچھل پڑے۔ بس پھر کیا گیا صاحب ہزاروں کا مجمع اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور جو نعرۂ تکبیر گونجا ہے، خدا جھوٹ نہ بلوائے کئی کلومیٹر تک آواز آ گئی ہو گی۔'' شمیر نے ہنستے ہوئے قصہ بیان کیا۔

'یہ ہے قوم کی نفسیات۔ ایک ڈائیلاگ اور بولتا مصطفیٰ تو جہاد کا نعرہ لگنے لگتا۔'' امین نے تبصرہ کیا۔

''شمس کنول والی بات رہی جاتی ہے۔'' فضل حق نے یاد دلایا۔

''جی پھر یہ ہوا کہ ان کی حالت خراب ہوتی چلی گئی ایک لفظ نہ بول سکے۔ آخر میں نے اٹھتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا اور بصد احترام عرض کیا کہ وہ ضمیر فروش ملک دشمن میں ہی ہوں۔''

''ہارٹ اٹیک ہو گیا ہو گا؟'' کلیم کو یقین تھا۔

''کچھ نہ پوچھو کہ کیا حالت ہوئی۔ کرسی جو ڈگمگائی ہے بس گرتے گرتے بچے۔ بڑی مشکل سے چند منٹ بعد کھڑے ہوئے، ہاتھ پکڑا اور دور تک میرے ساتھ ساتھ خاموش چلتے رہے۔ عجب شرمندگی کا عالم تھا آخر میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو کتاب دے جاؤں گا۔ پڑھ کر دوبارہ تبصرہ کر دیں عنایت ہو گی۔ دوسرے دن اپنی کتاب لے جا کر دی۔''

''پھر لکھا انھوں نے دوبارہ؟''

''نہیں، لکھ نہیں سکے۔''

''کیوں؟''

''جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔''

''اسی دن مر جانا چاہیے تھا۔ وہ سخت جان تھے کہ کچھ روز جھیل گئے۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے کتنوں کو صدمہ پہنچا ہو گا تمہاری تحریر سے۔ سخت جان ہی برداشت کر پائے گا۔ علامہ اقبال نے کیا صلاح دی تھی طلباء علی گڑھ کو۔ اتنے بڑے فلاسفر کی بات بھی تم نے نہ مانی۔

وصل کے اسباب پیا ہوں تیری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

''اور یہ بھی تو وہی کہہ گئے۔چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہ محشر یہاں۔محشر جگانے کے لیے بھائی راکھ میں چنگاری تلاش کررہے ہیں۔''فضل حق نے یاددلایا۔

''سید صاحب وصل کے اسباب ہی تو پیدا کر لیے تھے۔شبلی،آزاد،جوہر،مدنی وغیرہ نے جو تفرقہ ڈالا ہے بس اللہ ہی سمجھے گا۔یہ زہر مشرقیت ہے جو ان لوگوں نے اسلام کی شریانوں میں داخل کیا۔الہلال البلاغ پڑھیے۔ان لوگوں کے مضامین اور تقاریر پڑھیے۔میں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔اللہ رسول کو اپنی حمایت میں میدان سیاست میں نہیں اتارا۔ان کو ضرور اندازہ رہا ہوگا کہ کیا نتیجہ نکلے گا سرسید کی تعلیمی اور سیاسی پالیسی کی مخالفت کا۔جان بوجھ کر مدعی کے پیسے کے دم پر مخالفت کی جارہی تھ۔فضل صاحب کی ہر ہر بات سچ ثابت ہو کر رہی۔اگر آپ دیکھ لیں ان کی تحریریں تو شریف سے شریف آدمی بھی تلوار لے کر قتل کرنے نکل پڑے۔ہم نے تو صرف قلم ہی چلایا ہے۔''اقبال کو غصہ آ گیا۔

''اتنا غصہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''غصہ نہ آئے گا۔ان تبصرہ نگاروں کو دیکھئے،جس کے دل میں جو آرہا ہے لکھ رہا ہے اور وہ بھی بغیر پڑھے ہوئے۔یہ ہیں دانشوران قوم۔سید حامد نے تہذیب الاخلاق میں ایک مضمون کے درمیان میں میری کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مسیحا تو صرف رسول اللہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔بلکہ بات یہ ہے کہ اگر انھوں نے خود رسول اللہ کا نام نامی اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا۔''

''مسیحا تو اردو ادب میں کالی زلفوں سنہری رخساروں اور گلابی لبوں والوں کو بھی کہا جاتا ہے۔ہم نے تو کہیں ادب میں مسیحا کا لفظ رسول خدا کے لیے نہیں دیکھا۔ہاں حضرت عیسیٰ کے لیے ضرور یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔''فضل حق نے دعویٰ کیا۔

'ابن مریم ہوا کرے کوئی میرے دکھ کی دوا کرے کوئی۔''امین نے یاد دلایا۔

''جب کوئی جواب نہیں ہوتا تو نہ صرف ملا بلکہ ملا گزیدہ بھی اللہ رسول کو بطور ڈھال

استعمال کرتا ہے۔نعوذ باللہ۔''امین نے گالوں پر ہاتھ مار کرتوبہ کی۔

''ہم نے پورے تین سال لائبریری کی خاک چھانی۔تمام فائلیں دیکھیں تب جا کر تھیسس قائم ہوئی اور تبصرہ نگار ایسے قلم چلاتا ہے جیسے کہ سب کچھ اسے پتہ ہے۔''

''تم بھی بجھی ہوئی آگ میں چنگاری تلاش کرر ہے ہو۔''امین نے گریہ کیا۔

''مگر مرزا کی بھی تو سنئے۔''کلیم نے شعر پڑھا:

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

''یہ کسی ایرے غیرے کا دل نہیں ہے۔جسم ضرور دفن ہوگیا ہے مگر برصغیر کے ذرے ذرے میں سید صاحب کا دل دھڑکتا ہے۔ہر مسلمان کے دل میں ان کا چھوٹا سا گھر ہے۔اتنے سال گزرنے کے بعد بھی کسی قصبہ دیہات میں چلے جائے۔اعلان کرائیے کہ علی گڑھ کے استاد وطلباء خطاب کریں گے۔سیکڑوں سننے والے جمع ہو جائیں گے۔اسے کہتے ہیں دلوں پر حکمرانی۔اللہ جسے قبول عام دے اسے آزاد ٹائپ کے لوگ کیسے ختم کر سکتے ہیں۔پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔''فضل حق جذباتی ہو گئے۔

''اسی چراغ کو دوبارہ روشن کرنے کے لیے ایک ذرا سی چنگاری کی ضرورت ہے جو مجھے پورا یقین ہے کہ کیمپس کے کسی ہاسٹل میں، لائبریری کی کسی کتاب میں دبی ہے۔لوح تربت کا ذرا سا اشارہ چاہیے بس''اقبال بھی جذباتی ہوگیا۔

''مختصر یہ کہ وصل کے اسباب نہیں، سامان فراق کی تلاش ہے، ہمارے اقبال کو۔''امین نے اقبال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ارادے خطرناک ہیں۔''شمیر نے سر ہلایا۔

''اہل توحید کا وصل چاہتے ہیں۔کبھی اگر جامع مسجد جاتے ہیں۔تربت پر اگے ہوئے سبزے پر نظر پڑتی ہو تو بے ساختہ دل امید سے بھر آتا ہے۔''اقبال نے لحن میں اشعار پڑھے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

تماشا کہ اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

''مگر وصل کے اسباب پیدا کرنا کوئی آسان نہیں۔ نثر کی تو چھوڑیئے شاعری تک میں زہر مشرقیت سرایت کر چکا ہے۔'' کلیم کو قوم سے بالکل امید نہ تھی۔

''ہندوستانی مسلم ادیبوں کا ذکر چھوڑیئے۔ انہیں تو وصل وفراق کے معنی بھی نہ پتہ ہوں گے۔'' شمیر نے کہا۔

''بے نام شاعروں کی حیات و کارناموں پر ریسرچ کرنے والے وصل وفراق کو کیا جانیں۔ کسی کو تاڑ لیا وصال ہو گیا۔ نہیں ملاقات ہوئی فراق ہو گیا۔'' فضل حق نے تبصرہ کیا۔

''تخلیق کار تو تنقید نگار کو ادیب ہی نہیں مانتا کہ اس کا کام صرف بلا وجہ کی گفتگو کرنا ہوتا ہے۔ بڑے لوگوں کی تخلیقات پر لفاظی کر کے یہ خود کو بڑا سمجھنے لگتے ہیں۔'' امین نے تبصرہ کیا۔

''ایک اور ہمارے مہربان تنقید نگار ہیں، پاکستان میں بڑا نام ہے ان کا۔ انھوں نے روزنامہ نیشن میں تبصرہ لکھا ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے آزاد کے سلسلے کی سب سے اہم تصنیف ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' نہیں پڑھی۔'' ہمارے ایک دوست نے کٹنگ بھیجی۔ بس پڑھ کر میرا سر گھوم گیا۔ یار میں نے اس کتاب کا آٹھ جگہ حوالہ دیا ہے اور تبصرہ نگار لکھ رہا ہے کہ میں نے وہ کتاب ہی نہیں دیکھی۔''

''آٹھ جگہ۔''

''شاید انھوں نے بھی بغیر پڑھے لکھ دیا۔''

''میں نے بھی ایک طویل خط اخبار کو بھیجا کہ جس کتاب کے بارے میں تبصرہ نگار رقم طراز ہیں کہ میں نے وہ کتاب نہیں پڑھی اس کا حوالہ ان صفحات پر دیا گیا ہے۔ ذرا کتاب کھول کر بھی دیکھ لیں۔''

''یہ تو کمال ہو گیا۔ کیا سب مبصر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اتنا بڑا الزام لگا دیا بغیر کتاب کھولے ہوئے۔'' شمیر کو حیرانی تھی۔

''ان کی بھی شاید غلطی نہ ہو کہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک زمانہ میرے اوپر ایسا گزرا کہ میں سرسید کا اتنا مداح تھا کہ اگر میں ان کا زمانہ پاتا تو ان کی پرستش کرتا۔''

''بت پرستی اس کی سرشت میں شامل تھی۔'' امین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ایم اے صدیقی صاحب نے سوچا ہوگا کہ ایسا آدمی سرسید کا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔ شاید پھر وہی کتاب کا ٹائٹل آڑے آیا۔'' اقبال نے اندازہ لگایا۔

''محمد علی صدیقی نے تبصرہ لکھا تھا؟ وہ تو بڑا نام ہے پاکستانی دانشوری میں۔'' فضل حق نے پوچھا۔

''جی انھوں نے ہی لکھا۔ مگر حال ہی میں ان کی ایک شاندار تصنیف سامنے آئی ہے۔ سرسید اور جدت پسندی، بہت عمدہ تجزیہ ہے علی گڑھ تحریک کا۔ اس میں شاید اپنی غلطی سدھارنے کے لیے ہمارا نام بڑی عزت سے لیا ہے اور پورا ایک پیراگراف کتاب کی تعریف میں لکھا ہے۔'' اقبال نے بتایا۔

''موگمبو خوش ہوا؟'' کلیم نے پوچھا۔

''بیشک۔''

''پھر ایک چائے اور ہو جائے۔''

''کیوں نہیں۔ ابھی منگاتا ہوں۔'' اقبال نے بیئرر کو اشارے سے بلایا۔ چند ہی منٹ میں وہ چائے لے آیا۔

''اور یہ شافع قدوائی کون ہیں؟'' فضل حق نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

'ہمارے ایک دوست ہیں، جرنلزم میں استاد ہیں۔'' اقبال نے بتایا۔

''قومی آواز میں فل پیج ریویو تھا ان کا۔'' فضل حق کافی متاثر تھے۔

''بس مہربانی کی انھوں نے کہ اتنا طویل ریویو لکھا اس کے بعد جو سلسلہ شروع ہوا ہے تو بس اللہ دے اور بندہ لے۔ پورے چھ مہینے تک مراسلات کے کالم میں ''تبصرہ یا تبرہ'' کے عنوان سے مباحثہ چلا شاید ہی کوئی لکھنے والا ہو جس نے قلم نہ اٹھایا ہو۔''

''مگر افسوس یہ کہ زیادہ تر لوگوں نے صرف تبصرہ پڑھ کر اپنی آراء کا اظہار کیا۔کئی نیشنلسٹ تو ہتھے سے ہی اکھڑ گئے کہ حضرت امام الہند ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی ذات و صفات میں کوئی کمی تلاش کرنے کی جرات کرے۔'' شمیر نے وہ تبصرے پڑھے تھے اور محفوظ بھی کر لیے تھے۔

''اس پر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے ایک چاہنے والے تھے شفیق اللہ غازی حلیم کالج کانپور سے وابستہ ہیں۔کئی طویل مراسلے انھوں نے ہماری حمایت میں لکھے بنارس اور لکھنؤ کے اخبارات میں تبصرے بھی شائع کرائے۔خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن ہم لوگ سید شہاب الدین صاحب کے یہاں بیٹھے تھے۔ان دنوں ہم لوگ ان کی انصاف پارٹی میں لگے ہوئے تھے۔کیا کیا جلوس اور جلسے کرائے ان کے۔خیر وہ الگ بات ہے......''

''انصاف پارٹی میں؟'' فضل حق نے پوچھا۔

''جی، بلکہ ہم ہی لوگوں نے پارٹی بنوائی تھی کہ مسلم لیگ چل نہیں رہی تھی۔سوچا کہ شاید مسلمان نئے سیکولر نام سے ہی مسلم پارٹی میں آ جائیں۔ بہت سے بزعم خود اہل رائے یہ کہتے تھے کہ نام بدل جائے تو مسلمان اس میں آ جائے گا۔انہیں یہ پتہ نہ تھا کہ وجہ تاریخ سے لاعلمی ہے اور یہ کہ ایسی صورت میں پارٹی ایک شخص کی ملکیت ہو جائے گی اور اس کو بلیک میل کرنا، مرواد ینا یا رشوت دینا، کتنا آسان ہوگا۔اور یہی ہوا دسوں سال کی محنت خاک میں مل گئی۔ پتہ نہیں کس خوف یا لالچ سے اچانک ایک دن انھوں نے پارٹی ختم کر دینے کا اعلان کر دیا۔کارواں رہ گیا لیڈر بھاگ گیا۔'' اقبال نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا ''اور قوم کا یہ حال ہوا جیسے:

وہ مجھے چھوڑ کے یوں آگے بڑھا جاتا ہے
جیسے اب میرا سفر ختم ہوا جاتا ہے

''یہ تو ہونا ہی ہے اگر کوئی پارٹی ایک آدمی کی ملکیت ہے۔'' کلیم نے سوچتے ہوئے کہا۔

''خیر تو ہوا یہ کہ ہم لوگ شہاب الدین صاحب کے انتظار میں قہقہے اڑا رہے تھے دنیا

جہان کی بکواس ہورہی تھی۔ یہ حضرت بھی ان کے انتظار میں ایک طرف بیٹھے تھے۔کافی دیر کے بعد تعارف ہوا۔ جب مجھ سے ہاتھ ملایا اور یہ پتہ چلا کہ میں ہی مسیحا کون؟ کا مصنف ہوں۔تو ان کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی؟''

''کیا مطلب؟''امین نے پوچھا۔

''منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، بیچارے کا۔ان کے تصور میں کوئی نہایت بزرگ سفید داڑھی، ماتھے پر سجدے کا نشان اور نہایت متین، مسکراہٹ کو بھی لہولعب سمجھنے والے کسی شخص کا تصور تھا اور یہاں جینز اور ٹی شرٹ میں بال بکھرائے قہقہے اڑارہے تھے۔''

''ہاں یہی تصور ہے مسلمانوں میں نیک آدمی کا؟''فضل حق نے گریہ کیا۔

''بہرحال نہ ملاقات ہوتی تو اچھا تھا اس کے بعد انھوں نے نہ کبھی کوئی مراسلہ لکھا اور نہ کوئی ذاتی خط۔''

''ذاتی خطوط میں تو محترم مکرم عالی جناب نہ جانے کیا کیا لکھتے تھے۔میں نے کئی خط دیکھے تھے ان کے۔''شمیر نے بتایا۔

''اس بے چارے نے جب عالی جناب کو دیکھا ہوگا تو کیا گزری ہوگی۔''امین نے ہاتھ اٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''ایک مشہور پروفیسر تھے ابرار مصطفیٰ خاں۔ کہنے لگے بیٹا یہ کتاب تمہارے والد نے لکھی ہے۔وہ انہیں جانتے تھے۔میں نے کہا جی اور کیا کہتا۔اسی طرح ہمارے ایک لیکچرر دوست لکھنؤ کی کسی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے۔تذکرہ آگیا ہماری کتاب کا۔انھوں نے کہا کہ وہ تو میرا دوست ہے۔پھر کیا تھا سب بزرگوں نے ان کی اچھی خاصی مرمت کردی۔ بتا رہا تھا کہ کسی طرح انہیں یقین ہی نہیں آیا کہ تم میرے دوست ہو سکتے ہو۔''

''علم کا بوجھ چال ڈھال اور پہناوے سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔اس کا ایک خاص میک اپ ہوتا ہے۔تبھی لوگ عزت دیتے ہیں۔''فضل حق نے اپنا تجربہ بیان کیا۔

''دماغ میں ہونے کی شرط نہیں ہے بس میک اپ ہونا چاہیے۔''امین ہنسا۔

''جی میک اپ کی بات تو یہ ہے کہ آنکھوں میں کاجل ڈال کے تھوڑا سرخ رنگ

ڈالئے ،زلفیں بڑھایئے ،لمبا کالا چغا پہن کرداڑھی کوخضاب میں ڈبوکر ہاتھ میں عصا سنبھال لئے اور کہئے کہ میں جنات کا عامل ہوں اورخدا سے گفتگو کرتا ہوں تب بھی لوگ یقین کرلیں گے۔'' کلیم نے ہنس کرکہا۔

''سارے مذاہب کا کاروبار ہی پگڑی اوردستار کا مرہون منت ہے۔پگڑی ہٹادیجئے، چغے کوٹی شرٹ بنادیجئے دیکھئے کہ کون حضرت کے ہاتھ چومے گا۔اسی شخص کا ذرااچھامیک اپ کردیجئے پھر دیکھئے مریدین کی بہار۔'' امین نے ہاتھ پھیلائے۔

''چلئے خیر۔ بہت بہت مبارک ہو۔کہ نہ صرف یہ کہ تم نے ریسرچ کر کے کتاب شائع کرادی بلکہ شہرت بھی خوب ہوئی تبصرے بھی خوب ہوئے۔مجھے امید نہ تھی کہ تم یہ کر پاؤ گے۔'' فضل حق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''ہم نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ اب اس کام میں لگ جائیگا اور کر کے ہی دم لے گا۔'' کلیم نے یاددلایا۔

''آپ لوگوں کی بات سچ ہوئی۔آزادی کے اتنے سال بعد ہی سہی،دوسرا پہلو سامنے تو آیا۔'' فضل حق نے اطمینان کی سانس لی۔

''یہ سب آپ کی بدولت ہوا۔نہ آپ سے ملاقات ہوتی اور نہ یہ سب کچھ ہوتا۔تمام زندگی آزادکی مریدی میں گزرجاتی۔'' اقبال نے کہا۔

''یہ تاریخی حقیقت ہے کہ قوم میں ہر وقت دو گروہ ہوتے ہیں ایک دوسرے کے مخالف۔ان میں صرف ایک ہی گروپ حق پر ہوسکتا ہے۔یہ نہیں ہوسکتا کہ مغرب میں منزل بتانے والا بھی صحیح ہوااور مشرق میں بتانے والا بھی حق پر ہو۔'' شمیر نے تجزیہ کیا۔

''مگر یہاں تو معاملہ ہی دوسرا نکلا،یہ تو سازش نکلی۔لارینس آف عربیا بھی آزاد کی شاگردی پرفخر کرتا۔'' امین بولا۔

''بلکہ شیطان بھی ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا کہ حضرت یہ ترکیب سیاست تو میرے دماغ میں بھی نہیں آسکتی تھی۔یہ جو اونٹ کو آپ نے کس کیا ہے۔آج سے میں آپ کا شاگرد اور آپ مرشد۔'' شمیر نے مولوی اوراونٹ والے لطیفے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ اونٹ کو کِس کرنے کا کیا معاملہ ہے؟'' فضل حق نے حیرانی سے پوچھا سب لوگ زور زور سے ہنسنے لگے۔

''یہ شمیر بہت بدمعاش ہے۔'' امین نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''مگر یہ معاملہ کیا ہے؟'' فضل حق نے ضد کی۔

''ہے ایک لطیفہ مگر جانے دیجئے۔ پھر کبھی دہلی آکر سنائیں گے مزار مقدس کے قریب۔'' امین نے بھی بدمعاشی کی۔

''تاکہ گواہی بھی مل سکے اور اونٹ کو بھی تسلی ہو جائے۔'' کلیم کی ہنسی روکے نہیں رک رہی تھی۔

''ٹھیک ہے آپ لوگ اگلے مہینہ دہلی آئیں۔ میری فیملی کچھ دن کے لیے میرٹھ جا رہی ہے۔ بچوں کا ننہال ہے وہاں۔ آپ لوگ آئیں تو کچھ تفریح ہو جائے۔'' فضل حق نے دعوت دی۔

''چلیئے پھر اگلی محفل دلی میں جماتے ہیں۔ ہمارے کئی دوست وہیں نوکری کر رہے ہیں اور کچھ سیاست میں زور آزمائی۔ سب مل کر ہنگامہ کاٹیں گے۔'' کلیم نے پروگرام بنالیا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ بس اب دہلی میں ملاقات ہوگی۔'' اقبال نے تائید کی۔

''ٹھیک ہے چلتے ہیں اب۔'' فضل حق کے ساتھ ساتھ سب لوگ اٹھ گئے کلب سے نکل کر یہ لوگ باب سید تک پیدل نکل آئے۔

''یہ گیٹ بہت عمدہ بنوایا ہے وائس چانسلر نے۔''

''گیٹ تو اچھا ہے۔ مگر پلیٹ فارم اگر پانچ چھ فٹ اونچا ہوتا تو شان اور بھی بڑھ جاتی۔'' اقبال بولا۔

''اور یہ سائڈ گیٹ دونوں بھی ذرا اونچے ہوتے۔'' شمیر نے بھی رائے دی۔

''خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ مگر ذرا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں۔ جو ہمیشہ کے لیے لکھوا دیا گیا ہے۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے
خرمن باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

''سونے والا تو خیر اٹھ سکتا ہے میوزک اور شعر سن کر۔مگر یہ خرمن باطل شعلۂ آواز سے کیسے جلے گا؟'' کلیم نے سوال کیا۔

''اس کے لیے آہ آتشیں بھرنی پڑے گی۔شعر پڑھ کر مدعی پر بس پھونک ماردو وہ جل کر خاک ہو جائے گا۔'' امین نے ہنس کر جواب دیا۔

''خرمن باطل ہی نہیں بلکہ مکین کا بھی کام تمام ہو جائے گا۔'' شمیر نے بات بڑھائی۔

''یار ایک موڈرن یونیورسٹی کے دروازے پر ایسا شعر کندہ کرانے کے کیا معنی ہوئے؟ نوجوان طلبہ کیا معنی نکالیں گے؟'' فضل حق نے افسوس کیا۔

''یہی تو مسئلہ ہے۔مسلمان کا جتنا دل زندہ ہے دماغ اگر اس کا آدھا بھی زندہ ہوتا تو یہ حالت نہ ہوتی۔'' اقبال نے گریہ کیا۔

''سرسید زندہ ہوتے تو علامہ اقبال سے یہی گزارش کرتے کہ بھائی معاف کرو پہلے سے ہی جذباتی قوم کو اور جذباتی مت بناؤ۔'' شمیر نے اندازہ قائم کیا۔

''حالی کی طرح ان کو بھی قومی مرثیہ گو شاعر بنا دیتے۔اور وہ بھی تمام زندگی تعلیم و اخلاقیات پر حتیٰ کہ تجارت پر نظمیں لکھتے لکھتے زندگی کاٹ دیتے۔'' امین نے ہنس کر کہا۔

''سوشل ریفارم بھی ہمارے سید صاحب کا بڑا مسئلہ تھا۔'' اقبال نے سنجیدہ ہو کر کہا۔''ایک بیچارہ فطری شاعر کیسی شاعری کر کے چلا گیا۔اگر سید صاحب سے ملاقات نہ ہوتی تو گل و بلبل اور زلف و رخسار کے کتنے کیف آگیں افسانے لطیف طرزوں میں سناتا کہ قوالیوں اور مشاعروں میں ایک نیا انداز پیدا ہو جاتا۔دل کو کتنا سرور ملتا اور ذہن کیسا مدہوش ہو جاتا کہ زمانے کے تمام غم قوم بھول جاتی۔'' کلیم نے آہ بھری۔

''وہی حالت ہوتی جو خواجہ سرا نے نواب صاحب سے کہی تھی کہ موئے انگریزوں کو آنے تو دیجیے، ایسی جھاڑوں ماروں گی ان گوروں کے منہ پر کہ موئے بھاگتے نظر آئیں گے، ہاں۔'' امین نے مع ایکٹنگ کے بتایا۔

''مگر ہوا یہ کہ حالی سے مسدس لکھوائی، جسے ہم سب بھول گئے۔علامہ اقبال کی جگہ یہاں مسدس کے اشعار ہونے چاہیے تھے۔'' فضل حق نے رائے دی۔

''مسدس کے بارے میں کہا کہ اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا میں کیا کر کے آئے ہو، تو کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوائی۔''

''یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی تصانیف لکھنے والے کے نام پر یونیورسٹی میں کوئی ادارہ نہیں کوئی ہال بھی نہیں۔ جب کہ آزاد کے نام پر سنٹرل لائبریری ہے۔'' فضل حق نے شکوہ کیا۔

''جو قوم اپنے محسنوں کو یاد نہیں رکھتی بدنصیبی اسے آلیتی ہے۔'' اقبال بولا۔

''اب کیا پوری رات یہیں کھڑے رہیں گے۔'' فضل حق نے گھڑی دیکھ کر کیا۔

''لگتا ہے کہ آج رکشہ والوں نے ہڑتال کر رکھی ہے۔ چلئے اور آگے چلتے ہیں۔''

سب لوگ فیض گیٹ تک ٹہلتے ہوئے آ گئے جہاں ایک خالی رکشہ مل گیا۔ فضل حق نے سب سے ہاتھ ملایا دہلی آنے کا وعدہ لیا، اور امیر نشاں کی طرف چل دیے۔

○

(۱۱)انتا مسلم وانا مسلم

11.1 زندانِ یوسف

''الحمدللہ۔ انتا مسلم وانا مسلم۔''عبداللہ نے سینے پر ہاتھ رکھ کرخوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔'' آیئے میں آپ کوٹیکسی کراؤں۔''

اقبال اس وقت قاہرہ، ایئر پورٹ کے وسیع لاؤنج میں بیٹھا شہر جانے کا انتظار کررہا تھا۔وہ ابھی ابھی مصری ایئرلائن کی فلائٹ سے نئی دہلی سے قاہرہ پہنچا تھا۔یہ تقریباً سات گھنٹے کی نان اسٹاپ آرام دہ پروازتھی۔اسے قاہرہ سے بذریعہ ٹیکسی لیبیا کے مشہورشہر بن غازی جانا تھا۔بن غازی یونیورسٹی میں اسے دوسال کا ٹیچنگ اسائنمنٹ ملا تھا۔علی گڑھ سے تین سال کی ایکسٹرا آرڈینری چھٹی لےکر وہ بن غازی یونیورسٹی جارہا تھا۔لیبیا پر لاکر بی بم بلاسٹ کی وجہ سے بین الاقوامی پابندیاں عائدتھیں۔لہٰذاوہاں آنے جانے کےتمام ہوائی راستے بند تھے۔صرف زمینی راستے سے ہی لیبیا جایا جاسکتا تھا۔دوسرا سمندری راستہ بذریعہ مالٹا بھی کھلا ہوا تھا۔اقبال کواہرام مصراور قاہرہ دیکھنے کا بڑا تجسس تھا لہٰذا اس نے بذریعہ قاہرہ بن غازی جانے کا فیصلہ کیا اوراس وقت قائرہ ایئر پورٹ پرعبداللہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ اسے گھیرے کھڑا تھا۔یہ دونوں مصری ٹریویل ایجنٹ تھے۔گھنگھرالے چھوٹے چھوٹے بال، ہلکا سانولہ رنگ،اونچی ناک اور لمبے قد والا عبداللہ پینٹ اورشرٹ پہنے ہوئے تھا۔اس نے نہ جانے کیسے اس کا نام جان لیا تھا،اورکئی بار گلے مل کر مسلمان ہونے کی مبارکباد دے چکا تھا۔

''مجھے بنغازی بھی جانا ہے۔''اقبال نے اسے بتایا۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ ہماری اپنی ٹیکسیاں لیبیا جاتی ہیں واللہ انا مسلم و انتا مسلم، الحمدللہ ہم دونوں ہی مسلمان ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے اقبال کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

''میرے پاس تین دن کا ٹرانزٹ ویزا ہے۔'' اقبال نے بتایا۔

''پھر تو تینوں دن آپ ہمارے مہمان رہیں گے۔ اہرام، میوزم وغیرہ سب دکھائیں گے۔ یہاں ہوٹل وغیرہ اور تین دن بعد بنغازی کے لیے ٹیکسی کا سارا انتظام ہمارے ذمہ۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔'' عبداللہ پر جوش انداز میں بتانے لگا۔

''چلئے پہلے آپ کو ہوٹل لئے چلتے ہیں۔'' عبداللہ کے ساتھی نے اس کا ایئر بیگ اٹھالیا۔

''واللہ انا مسلم وانتا مسلم۔ آپ تو ہمارے بھائی ہیں۔'' عبداللہ نے بھی ایک سوٹ کیس ٹرالی پر رکھتے ہوئے کہا۔

''مگر یہاں سے عقابہ اسکائر کار کرایہ کتنا ہوگا؟'' اقبال نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ کسی ہندوستانی یا پاکستانی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ اس علاقے کے سارے لوگ جا چکے تھے۔ وہ سب سے آخر میں پلین سے اترا تھا۔ اسے اس وقت کسی ساتھی کی اشد ضرورت تھی۔ سارا لاؤنج خالی ہو چکا تھا۔ بس چند یورپین جوڑے بنچوں پر چپکے بیٹھے تھے۔ انہیں شاید کسی کا انتظار تھا۔

''صرف دوسو پاؤنڈ، آپ کے لیے خاص رعایت ہے۔''

''دوسو پاؤنڈ'' اقبال کو حیرانی ہوئی کہ وہ ایئر پورٹ سے عقابہ اسکوائر تک کا کرایہ کئی لوگوں سے معلوم کر کے آیا تھا۔ دہلی میں مصری ایمبیسی کے ایک ملازم سے اس کی دوستی سی ہوگئی تھی اسی سے معلومات فراہم کی تھیں۔

''جی دوسو پاؤنڈ۔ انا مسلم وانتا مسلم، صرف آپ کے لیے۔'' عبداللہ نے اس کے کندھے پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھا۔

''مگر میرے خیال سے وہاں تک صرف پچاس پاؤنڈ کرایہ ہے۔'' اقبال سمجھ گیا کہ یہ دونوں ایک دم فراڈ ہیں۔

''کسی نے غلط بتایا ہے آپ کو، ہم وہاں ہوٹل میں بھی چلیں گے اور پھر قاہرہ دکھائیں گے۔''اس نے لالچ دیا۔

''نہیں میں خود چلا جاؤں گا۔اقبال نے عبداللہ کے ساتھی کے ہاتھ سے ایئر بیگ لیتے ہوئے کہا۔اتنے میں عبداللہ نے ایک سیکورٹی آفیسر کو آواز دے کر بلایا

''کیا بات ہے؟''اس نے آتے ہی عبداللہ سے پوچھا۔

''یہ ہندوستانی مسلمان ہیں۔ہم لوگ بھی الحمدللہ۔مگر یہ مجھ پر یقین نہیں کر رہے۔'' عبداللہ نے اس سے شکایت کی۔اس کے علاوہ عربی زبان میں بھی کچھ کہا اس کی گفتگو سے اتنی بات ضرور واضح ہوئی کہ وہ دونوں دوست ہیں۔

''اپنے کاغذات دکھائیں؟''آفیسر کا لہجہ بدل گیا۔

''وہ تو سب چیک ہو چکے ہیں۔اسی لیے تو میں باہر آ گیا۔اقبال نے اپنا پاسپورٹ نکالتے ہوئے کہا۔

''اپنا سامان کھولئے؟''آفیسر نے دو پولیس والوں کو اور بلالیا اور اس کا سامان کھولنے کا اشارہ کیا۔انھوں نے فوراً ہی سوٹ کیس ایئر بیگ وغیرہ سب کھول دیئے۔

''ابھی ابھی سب چیکنگ ہو چکی ہے۔''اقبال نے احتجاج کیا۔لیکن اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ یہ لوگ مل کر اسے ٹھگنا چاہ رہے ہیں۔

''یہاں ٹیررسٹ بھی آتے ہیں۔''آفیسر نے سخت لہجے میں کہا۔

یہ سن کر اقبال کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ خوف کے مارے دہشت زدہ ہو گیا۔اتنے میں اس کا سارا سامان فرش پر پڑا تھا اور ایک ایک چیز اٹھا کر چیک کی جا رہی تھی۔اقبال نے اپنے کاغذات،کانٹریکٹ کی کاپی،بنغازی یونیورسٹی کے خطوط اور سرکاری ملازم ہونے کے تمام ثبوت آفیسر کو دکھائے۔کافی دیر تک کاغذات دیکھنے کے بعد آفیسر کو تسلی ہوئی اور وہ لوگ سارا سامان کھلا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔اقبال نے پھر کسی طرح تمام چیزوں کو سمیٹا اور ٹرالی ڈھکیلتا ہوا ایئر پورٹ کے باہر آ گیا۔لمبی سی گیلری پار کر کے وسیع وعریض باہری برآمدے میں ایک بنچ پر آ بیٹھا۔ایئر پورٹ کے سامنے وسیع میدان میں

سیکڑوں ٹیکساں مسافروں کے انتظار میں کھڑی تھیں کہ مصر دنیا بھر کے ٹورسٹوں کے لیے سب سے زیادہ دلچسپ مقام ہے اپنے اہرام اور قدیم تہذیب فراعنہ کے آثار کی وجہ سے۔ دنیا کی قدیم ترین ترقی یافتہ تہذیب کے باقیات یہاں ابھی جوں کے توں باقی ہیں۔لہٰذا ہر ملک کے ٹورسٹ یہاں جتھے بنا کر آتے ہیں۔اس وقت کوئی یورپین طیارہ اترا تھا۔ مسافر مرد، عورتیں، لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بغیر کسی الجھن یا خوف کے ٹورسٹ گائڈز کی رہنمائی میں ایئرپورٹ سے باہر آرہے تھے۔ گورے لوگوں کی یہاں بہت قدر تھی۔ سب ان کی عزت کرر ہے تھے اور ان سے خوفزدہ بھی لوگ رہے تھے لیکن ترقی پذیر ممالک کے مسافروں کی یہاں کوئی قدر نہ تھی۔ اقبال اس رویہ کا جیتا جاگتا ثبوت، خوفزہ باہر بنچ پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ٹیکسی والوں نے اسے گھیر لیا۔ بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا اور ذرا دور دوسری بنچ پر بیٹھ گیا۔اس کو خیال آیا کہ ترقی یافتہ قوم کا ہر فرد باعزت ہوتا ہے چاہے وہ جاہل ہی کیوں نہ ہو اور بیک ورڈ قوم کا ہر فرد بے عزت، چاہے پروفیسر ہی کیوں نہ ہو۔ سرسید نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ فرد کی نہیں دنیا میں قوموں کی عزت ہوا کرتی ہے۔ ذرا دیر ہی بیٹھا ہوگا کہ ٹیکسی والوں نے پھر اسے گھیر لیا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ یہاں سے جتنی جلد ہو سکے نکل لیا جائے۔لہٰذا ایک شریف ٹیکسی والے سے پچھتر پاؤنڈ کرایہ طے کر کے اس کے ساتھ چل دیا۔ یہ پرانے مال کی ٹویاٹا کار تھی۔

''آپ انڈیا سے ہیں، کیا نام ہے آپ کا؟'' ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے پوچھا۔

''اقبال، انڈیا سے ہی ہوں۔''

''مسلم؟''

''ہاں''

''الحمدللہ میرا نام جواد ہے۔''

''انڈیا میں مسلمان رہتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''رہتے تھے۔تم گاڑی چلاؤ اور ذرا خاموش رہو۔'' اقبال نے اسے تنبیہ کی۔

''رہتے تھے! کیا مطلب؟'' وہ باز آنے والا نہ تھا۔

''میرے مصر آنے کے بعد سب نے اسلام چھوڑ دیا۔بس اب کچھ نہ پوچھنا۔میں ذرا سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔''

''جی بہت اچھا۔مگر آپ کی باتیں بڑی مزے دار ہیں۔'' اس نے پھر بات نکالنا چاہی۔

''کوئی عربی کیسٹ لگا دو۔'' اقبال نے فرمائش کی۔

''آپ کو عربی آتی ہے۔''

''موسیقی کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔''

''لیجئے صاحب ام کلثوم کو سنئے۔'' اس نے کیسٹ لگاتے ہوئے کہا۔

اقبال آرام سے سیٹ پر سر ٹکا کر پھیل کر بیٹھ گیا۔ام کلثوم کی سریلی آواز گونجنی شروع ہوئی۔عربی میوزک کی لہروں پر عرب دنیا کی سب سے مشہور آواز کا سحر چلنا شروع ہوا۔اس نے عراق میں بھی ام کلثوم کو سنا تھا اور اپنے عرب دوستوں سے ان کی میوزک کی جان کاری بھی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی اور اچھی خاصی عربی بھی سیکھ لی تھی۔ملکۂ ترنم نور جہاں اور ام کلثوم کے آوازوں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے آواز میں وہی جل ترنگ کی سی کیفیت اور طوفانی لہروں جیسے اتار چڑھاؤ کے بعد پرسکون پانی کے ٹھہراؤ کا منظر کہ جیسے دل آہستہ آہستہ غم کی پہنائیوں میں ڈوبتا جا رہا ہے اور آنکھیں ہیں کہ اشکوں سے لبریز ہوتی جا رہی ہیں۔وہ کافی دیر تک آنکھیں بند کیے میوزک میں کھویا رہا۔تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ عقابہ اسکوائر پہنچے۔سڑک کے کنارے ٹیکسی روک کو ڈرائیور نے پوچھا۔

''لیجئے صاحب یہ آ گیا آپ کا عقابہ اسکوائر۔کس ہوٹل میں پہنچاؤں آپ کو؟''

اقبال ٹیکسی سے اتر آیا یہ ایک بہت بڑا سرکل تھا۔درمیان میں ایک وسیع عریض پارک جس میں بہت سے لوگ پیڑوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے۔دن کے دو بجے کا وقت تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے جن میں سے سورج کی روشنی چھن کر زمین پر پڑ رہی تھی۔پارک کے چاروں طرف چوڑی بہترین سڑک دائرے میں بنی ہوئی تھی۔

شہر کے مختلف راستوں سے آنے والی آٹھ سڑکیں اس دائرے میں آکر ملتی تھیں۔ سڑکوں پر چھوٹی بڑی سیکڑوں کاروں اور پبلک بسوں کا اژدہام تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے چوڑا فٹ پاتھ تھا۔ پیچھے اونچی اونچی عمارتوں میں ہر طرح کی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ دکانوں کے آگے بڑے بڑے اونچے کھلے برآمدے بنے تھے۔ سامنے دو عالیشان مساجد کے گنبد و مینار نظر آرہے تھے۔ ہر عمر کے مرد عوتیں، لڑکے لڑکیاں، پینٹ ٹی شرٹ اور جینس میں ملبوس اپنے اپنے راستوں پر گامزن تھے کچھ عمر رسیدہ لوگ عربی لباس بھی پہنے ہوئے تھے اور بہت سی عورتیں سر پر اسکارف بھی باندھے ہوئے تھیں۔

''ہوٹل کا نام تو میں نہیں جانتا مگر درمیانے درجے کے کسی اچھے ہوٹل میں پہنچادو۔'' اقبال نے جواب دیا۔

''آیئے بیٹھئے۔ آپ بھی کیا یاد کریں گے۔''

اقبال دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ کوئی پانچ منٹ کے سفر کے بعد ایک بڑے سے کھلے دروازے کے اندر عمارت کے پورچ میں ٹیکسی روک کو جواد اتر آیا۔

''لیجئے صاحب آپ کا ہوٹل۔''

اقبال نے ٹیکسی سے اتر کر دیکھا۔ وہ لوگ اس وقت چار منزلہ تھری اسٹار ہوٹل کے پورچ میں کھڑے تھے۔ سڑک اور ہوٹل کے درمیان ایک خوبصورت سالان بنا ہوا تھا۔ مسافر کو دیکھ کر فوراً ہی ہوٹل کے بیئرر نے سامان اتارنا شروع کر دیا۔

''ہاں بھئی یہ لو تمہارا کرایہ۔'' اقبال نے پیسے گن کر جواد کو تھما دیئے۔

''مگر یہ تو صرف ۷۵ پاؤنڈ ہیں۔'' اس نے شکایت کی۔

''اتنے ہی تو طے ہوئے تھے؟''

''مگر یہ تو بہت ہی کم ہیں۔'' جواد کے چہرے پر ایسے آثار تھے جیسے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوا ہے۔

''جتنے طے ہوئے تھے اتنے ہی دیئے ہیں۔''

''اتنے پیسوں سے کیا ہوگا؟'' اس نے ذرا جھک کر پیسوں سے اپنا ماتھا پیٹتے ہوئے کہا

''اتنی تو مہنگائی ہے۔''

''مہنگائی، کیا مطلب؟''اقبال کو بھی غصہ آ گیا۔

''واللہ یہ پیسے تو کچھ بھی نہیں ہیں۔''اس نے ہاتھ پھیلا کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔اس کے چہرے پر انتہائی تکلیف کے آثار تھے۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت مشکل میں گرفتار ہے۔اس کی آواز سن کر ایک دو مسافر بھی وہاں رک گئے اور ایک پولیس والا بھی نہ جانے کہاں سے آ ٹپکا۔اس نے آتے ہی پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

اقبال نے اس کو پوری بات بتائی مگر جواد عربی میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا پھر انگریزی میں بولا''مجھے پچاس اور چاہئیں۔''

''مگر ۷۵ پاؤنڈ ہی طے ہوئے تھے،اس سے پوچھئے؟''اقبال نے پولیس مین سے کہا۔مگر پولیس والے نے اقبال ہی سے پوچھا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟ ویزا ہے آپ کے پاس؟ لائیے پاسپورٹ دکھائیے۔''

اقبال نے چپکے سے پچاس پاؤنڈ گن کر جواد کو تھما دیئے۔وہ ایک دم مسکرانے لگا اور شکریہ ادا کر کے اپنی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔اقبال بھی جھنجھلاتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا۔

☆

''یہاں کوئی بھی نظر نہیں آ رہا۔یہ کیسا محلّہ ہے؟''اقبال نے اپنی برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر سے پوچھا۔

''گورغریباں ہے۔''جواب آیا۔

''قبرستان!''اقبال نے حیرت سے دہرایا۔وہ دوسری صبح پبلک بس میں اہرام اور میوزیم وغیرہ دیکھنے کے لیے نکلا تھا۔ہوٹل میں پتہ چلا تھا کہ اگر بس سے سفر کیا جائے تو شہر دیکھنا آسان ہوگا،لہٰذا اس نے ہوٹل سے آگے دو فرلانگ دور بس اسٹینڈ سے سٹی بس پکڑی۔اس وقت بس ایک ایسے محلے سے گزر رہی تھی جس میں ایک ایک کمرے اور چھوٹے سے برآمدے کے مکان قطار در قطار بنے ہوئے تھے۔گھروں کی چار دیواری

سے ایک دروازہ باہر اینٹوں کی گلیوں میں کھلتا تھا۔ ہر دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ داہنی طرف بازار تھے، رہائشی مکانات تھے، مگر بائیں طرف ڈھلان پر دور دور تک ایک ہی طرز کے مکانات بنے ہوئے تھے، جہاں ایک بھی شخص نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اقبال کو اندازہ ہوا کہ تہذیبی اثرات کتنے پائیدار ہوتے ہیں فراعنۂ مصر کے زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ مرنے والے کو بھی زندہ لوگوں کی طرح ہر چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ مکان، روٹی، کپڑا حتیٰ کہ زیورات وغیرہ تک۔ لہٰذا وہ اپنے مردوں کو اپنی حیثیت کے مطابق مقابر میں دفن کرتے تھے اور میت کے ساتھ ساتھ بہت سا کھانے پینے کا سامان، کپڑے اور زیورات بھی دفن کرتے تھے۔ اہرام اسی عقیدے کی وجہ سے وجود میں آئے۔ جتنا بڑا دفن ہونے والا اتنا ہی بڑا اس کا گھر۔ قبول اسلام کے باوجود بہت سی رسوم بدلی نہ جاسکیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اپنے مرنے والوں کے لیے مکانات بناتے ہیں، چاہے چھوٹے ہی سہی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندوستان میں اہل اسلام صدہا برس پرانی غیر اللہ سے مانگنے کی عادت ترک نہ کر سکے اور بزرگوں وصوفیاء کی قبروں کو اپنی حاجت روائی کا ذریعہ مان کر ان کی پوجا ارچنا کرنے لگے۔

قاہرہ بھی ہر شہر کی طرح نئے اور پرانے علاقوں میں بٹا ہوا ہے۔ پرانے محلوں میں تنگ گلیاں اور سڑک پر کھلتے نقشیں لکڑی کے خوبصورت دروازوں کے گھر ہیں۔ نئے شہر میں وہی ملٹی اسٹوریز دیدہ زیب گلاس بلڈنگس، شاپنگ مالس، فائیو اسٹار ہوٹلز اور چوڑی چار چار لینز کی خوبصورت چکنی سڑکیں۔ زمانۂ قدیم سے ہی قاہرہ ایک ترقی یافتہ شہر رہا ہے۔ ہر طرف خوبصورت میناروں اور بلند گنبدوں والی مساجد نظر آتی ہیں۔ کئی کئی منزلہ مساجد عام ہیں جن کا بڑا گنبد چار میناروں سے سجا رہتا ہے۔ شہر کا سب سے خوبصورت منظر درمیان میں بہتی ہوئی چوڑے پاٹ کی دریائے نیل ہے جس پر نہ جانے کتنے پل بنے ہوئے ہیں۔ دریا کے دونوں طرف لاتعداد اوپن ایئر ریستوران، نائٹ کلبس، ہوٹلز اور پارکس بنے ہیں۔ نیل کے کنارے ایک شام اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اقبال کو ''ہر شام ہے شام مصر یہاں'' کی یاد آئی۔ اس نے غور کیا تو واقعی شام ہوتے ہی موسم

نہایت خوشگوار ہوجاتا ہے اوراتنی مست کرنے والی ہوا چلتی ہے کہ بس آدمی مدہوش ہوجائے اوروقت کا پتہ ہی نہ چلے۔اسے لگا کہ مجازاًایک بارضرور یہاں آئے ہوں گے۔

اس وقت دوسیٹ والی گھوڑا گاڑی میں بیٹھا بلند ہوتی ہوئی اینٹوں کی سڑک پراہرام دیکھنے جارہا تھا۔ ہرطرف دنیا بھر کے ٹورسٹوں کی بھرمارتھی۔کچھ لوگ ٹٹوؤں پراورکچھ گاڑیوں پر جارہے تھے۔تقریباً دوکلومیٹر لمبا سفر تھا۔قاہرہ شہر کے باہر تین اہرام اور چٹانوں سے تراشاہوادیوتا کا چہرہ،دنیا کےٹورسٹ میپ پرخاص اہمیت رکھتا ہے۔دوردور تک ریت کے چٹیل میدان کے درمیان دیوہیکل اہرام عجب سا منظر پیش کرتے ہیں۔ جیسے بہت سی پراسرارقدیم کہانیاں ایک دم زندہ ہوکرسامنے آگئی ہوں۔لگتا تھا کہ فرعون اپنےلشکر کے ساتھ کسی طرف سے ابھی ظاہرہوجائے گا۔ریت بھری ہوائیں پیدل چلنا دوبھرکئے ہوئے تھیں کہ گھوڑا گاڑی کئی فرلانگ پیچھے پکی سڑک پراتاردی گئی تھی۔جیسے جیسےاہرام قریب آتا گیااس کی عظمت کا اندازہ واضح ہوتا چلا گیا۔سیکڑوں ٹن وزنی چٹانوں کی سیڑھیاں نما یہ عمارت جس کوحجم ہی اتنا بڑا کہ چاروں طرف گھومنے میں ہی آدھا گھنٹہ لگ جائے۔اگرسراٹھا کردیکھیں تو آدمی پیچھے الٹ جائے۔مقام حیرت تھا کہ اتنی اتنی وزنی چٹانیں تراشنااورپھران کواتنی بلندی تک پہنچانا کیسے ممکن ہوا ہوگا۔اس وقت جب کہ نہ کوئی مشینیں تھیں اورنہ کرینیں۔صرف انسانی طاقت،گھوڑوں،اونٹوں اورجانوروں کی مدد سے اتنی وزنی چٹانوں کو یہاں تک لانا اورپھرمنزل بہ منزل عمارت کی شکل دینا کسی معجزے سے کم نہیں لگتا۔دوردورتک کسی پہاڑ کے آثار بھی نظرنہیں آتے تھے کہ پتھروں کوتراش کروہاں سے لے آیا گیا ہوتا۔بس حدنگاہ تک ریت کا چٹیل میدان تھااوراس لقو دق میدان کے درمیان اونچے اونچے اہرام سراٹھائے کھڑے انسان کی بہادری اورتخیل کی داد دے رہے تھے۔عیسیٰ سے قبل ڈھائی ہزار سال پرانی یہ تہذب عجیب وغریب تخیلات اوراعتقادات کی بنیاد پرقائم تھی جس میں فراعنۂ مصرخدا کا درجہ رکھتے تھے اور مرنے کے بعد بھی انسانی روح کوتمام دنیاوی ضروریات کا حاجت مند ہوناتسلیم کیا جاتا تھا۔ان دوعقائد پر یہ پوری تہذیب قائم ہوئی اور ایسے عظیم الشان مقابر وجود میں

آئے۔ اتنے وسیع صحرا میں دنیا بھر کے ہزار ہا ٹورسٹ اہرام کے سائے میں بالکل چیونٹیوں کی مانند لگ رہے تھے۔اقبال کافی دیر تک ایک پتھر پر بیٹھا رہا اور پھر ہمت کر کے اوپر چڑھنا شروع کیا۔تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ آہستہ آہستہ اہرام پر چڑھتا رہا اس نے دیکھا کہ سب لوگ بجائے اوپر چڑھنے کے داہنی طرف ایک سیڑھی پر بڑھتے جارہے ہیں۔وہ بھی ان کے پیچھے چل پڑا۔تقریباً پندرہ منٹ کے بعد اس نے دیکھا کہ لوگ ایک چھوٹے سے پتھریلے دروازے کے اندر داخل ہو رہے ہیں۔وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اس میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک پتھریلی سرنگ سی تھی۔بمشکل ایک آدمی اس میں چل سکتا تھا۔ اندھیرا تھا کہ بڑھتا جارہا تھا۔معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ یہ راستہ آگے جا کر نیچے اترتا ہے اور وہاں زمین کے لیول پر حجرے بنے ہوئے ہیں جہاں شاہی خاندان کی ممیاں، بہت سے خزانے اور روزمرہ کی ضروریات کی تمام چیزوں کے ساتھ رکھی جاتی تھیں۔اس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔بمشکل تمام راستہ بناتا ہوا وہ واپس آ گیا۔اہرام سے نیچے اتر کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔تھکن کے مارے اس کی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔

☆

اسے ایک قافلے کی آہٹ سنائی دی،جس میں چند نوجوان اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اونٹوں پر سوار ایک صحرا میں سفر کر رہے تھے۔یہ قافلہ کنعان سے نکلا تھا۔

''افسوس کہ ہمارے بابا اس کی موجودگی میں ہم سے پیار نہیں کر سکتے۔'' ایک نے چھوٹے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ نہ ہو تو ہمیں اپنا حق مل جائے۔'' دوسرے بھائی نے سرگوشی کی۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں ہم بھی تو سنیں۔'' تیسرے نے اپنا اونٹ قریب لاتے ہوئے پہلے سے پوچھا۔

''وہی جو ہم سب کا مشترکہ غم ہے۔''اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''ہاں یہ تو ہے۔یہ ہے تو ہم کچھ بھی نہیں۔'' تیسرے نے ایک آہ بھری اتنے

میں چوتھا بھائی بھی قریب آ گیا اور چھوٹے کی طرف داری کی۔

''آخر ہے تو ہمارا ہی بھائی۔سب سے چھوٹا بھی اور ایسا خوبصورت۔مجھے تو بڑا پیار آتا ہے اس پر۔''

''تمہاری بھی کیا حیثیت ہے اس کے آگے۔بابا ہر وقت بس اسی کو دیکھتے رہتے ہیں۔اس کی ہر ضد پوری کی جاتی ہے۔'' پہلا بولا۔

''ایسا تو نہیں ہے آخر وہ ہم سب ہی کے بابا ہیں۔'' چوتھے نے پھر حمایت کی۔

''بس رہنے دو۔اس کے منہ سے نکلی ہر بات حکم بن جاتی ہے۔'' تیسرے نے اسے ڈانٹا۔

''چھوٹے بچوں کے ساتھ ہر گھر میں یہی ہوتا ہے۔''اس نے سمجھانا چاہا۔

''مگر ہمیں بالکل اچھا نہیں لگتا۔'' دوسرے نے اس کی بات کاٹی۔

''وہ دیکھو، درختوں کا جھنڈ۔لگتا ہے کوئی خیابان ہے۔چلو وہیں بیٹھیں گے۔'' پہلے نے دور کھجوروں کا جھنڈ دیکھتے ہوئے کہا۔

''چند ہی منٹ میں سب لوگ اونٹوں سے اتر کر درختوں کے سائے میں بیٹھ گئے۔دریاں بچھائی گئیں، کھانے پینے کا سامان بھی نکالا گیا اور اونٹوں کو باندھ دیا گیا۔''

''ارے یہاں تو ایک کنواں بھی ہے!'' دوسرے نے اشارہ کیا اور سب کنویں کے کنارے پہنچ گئے۔

''چلو پانی نکالتے ہیں۔بہت ٹھنڈا پانی ہوگا یہاں،'' جلدی جلدی ڈول ڈالا گیا۔مگر کنواں بالکل سوکھا نکلا۔پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔

''یہ تو بالکل سوکھا ہے۔'' پہلے نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے دوسرے سے کہا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' دوسرا فوراً ہی اسکی بات سمجھ گیا۔

''یہ بھی سگا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' تیسرے نے چوتھے کو سمجھایا۔

''سگے کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی۔مگر پھر بھی سب سے چھوٹا اور کتنا پیارا ہے۔'' چوتھے نے پھر طرف داری کی۔

''بس خاموش رہو۔'' پہلے نے اسے ڈانٹا۔

''اچھا بھائی جیسا آپ کہیں۔'' وہ مایوس ہوکر ایک کنارے آخر تھکن کے مارے سو گیا۔

''باقی بھائیوں نے اسکیم پر عمل کیا۔ چھوٹے کا کرتا اتروا کر اسے کنویں میں اتار دیا۔

☆

''بابابابا!'' سب نے آہ وزاری کرتے ہوئے پکارا۔

''میرا یوسف کہاں ہے؟'' انھوں نے بیقرار سوال کیا۔

''کھیل کھیل میں وہ ایک طرف نکل گیا اور......''

''اور کیا جلدی بتاؤ؟'' بزرگ باپ کی پراندوہ آواز گونجی۔

''بھیڑیا آ گیا۔'' جواب آیا۔

''بھیڑیا؟'' خوف ان کی رگ رگ میں اتر گیا۔

''جی بھیڑیا آ گیا......اور اور......'' بڑے نے بزرگ باپ کے ہاتھوں میں خون آلود کرتا تھما دیا۔ کانپتے ہاتھوں میں کرتا لیا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے آہ بھر کر کہا۔

''میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا۔''

''بابا ہماری کوئی غلطی نہیں۔'' بڑے نے صفائی دینی چاہی۔

''بس خاموش رہو۔ اللہ کی طرف سے میرا امتحان ہے۔ یاالٰہی میرے صبر کی لاج رکھ لے۔'' دونوں ہاتھوں میں کرتا اتھا کر اللہ کو پکارا اور بیہوش ہو گئے۔

☆

''وہی قافلہ، مصر سے کنعان کی طرف اناج سے لدے اونٹوں کو لیے جا رہا ہے۔ سارے بھائی وزیر باتدبیر کی عنایات کی تعریفیں کرتے نہیں تھک رہے ہیں۔

''بابابابا! یہ دیکھئے۔ اتنا سارا اناج لے کر آئے ہیں اور سارے پیسے بھی واپس مل گئے۔ ایک اونٹ پر اناج کے اندر ہماری یہ پوٹلی نکلی۔'' بڑے نے خوشی خوشی دیناروں کی پوٹلی بزرگ باپ کے ہاتھوں میں تھما دی۔

''مگر!......'' دوسرا بولا۔

''مگر کیا؟'' بیقرار صدا نکلی۔

''کہا ہے کہ اگلے سال اناج لینے آؤ تو اپنے دوسرے بھائی بن یامین کو بھی لے کر آنا۔'' بزرگ یہ سن کر کھڑے ہو گئے۔

''مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔''

''بس آپ بھی۔ اتنے سال گزر گئے اس کے غم میں روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں۔ مگر آج بھی اسکے آنے کی امید دل میں لیے بیٹھے ہیں۔'' بڑا شکوہ سنج ہوا۔

''خاموش نامعقول!'' بزرگ نے سخت ڈانٹ پلائی۔'' مشیت الٰہی کا کوئی رازداں نہیں۔''

☆

''یہ چور ہے۔ اس کو یہیں چھوڑنا پڑے گا۔'' ڈھونڈنے والوں نے سونے کا شاہی پیالہ بن یامین کے سامان سے نکال کر اعلان کیا۔

''نہیں، اس کے بدلے ہم میں جس کسی کو بھی چاہو رکھ لو۔'' بڑے نے گھبرا کر راستہ نکالنا چاہا۔

''نہیں صرف گنہگار کو سزا ملے گی۔'' صاف جواب آیا۔

''ہمیں وزیر کے سامنے لے چلو۔'' پھر عرض گزاری۔

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔''

''ساتوں بھائی وزیر باتدبیر کے سامنے پیش ہوئے اور کورنش بجالائے۔ گویا ستاروں نے چاند کو سجدہ کیا۔

''ہمارے بابا بن یامین سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ بڑی مشکلوں سے ہمارے ساتھ بھیجا تھا۔'' التجاء بھری آوازیں ابھریں۔

''پھر؟'' وزیر کی آواز گونجی۔

''اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ اس کو بھیڑیا کھا گیا۔'' بڑے نے آس بھرے لہجے میں بتایا۔

''بھیڑیا کھا گیا؟'' مسکرا کر پوچھا گیا۔

'جی بھیڑیا کھا گیا۔ اس کے بعد بابا ہم پر بالکل اعتماد نہیں کرتے۔ اس کے بدلے ہم میں سے کسی کو بھی رکھ لیجئے۔ بڑی عنایت ہوگی۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' جواب آیا۔

''مگر یوسف کے غم میں پہلے ہی ان کی روتے روتے آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ اگر اس کو بھی نہ پایا تو نہ جانے کیا ہو ہم پر رحم کریں۔'' فریاد کرتے کرتے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''سزا صرف گنہگار کو ملے گی۔'' وزیر اپنے اونچے تخت سے اتر آیا اور بڑے کے ہاتھوں میں اپنا کرتا تھماتے ہوئے کہا۔ ''بابا کے سر پر ڈال دینا آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔''

☆

''میں ہی یوسف ہوں۔'' وزیر نے بن یامین کو گلے لگا کر بتایا۔

''یوسف میرا چھوٹا بھائی؟'' بن یامین نے گلے لگ کر آنسوؤں کے دریا بہا دیئے۔

''ہاں میں ہی یوسف ہوں۔ اسی لیے میں نے تم پر الزام لگوا کر یہاں ٹھہرا لیا۔''

''مگر یہ بادشاہت، یہ سب ہوا کیسے؟ تمہیں تو بقول ان بھائیوں کے، بھیڑیا کھا گیا تھا۔'' بن یامین نے حیرت سے چاروں طرف عظیم الشان محل کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے سوکھے کنویں میں ڈال کر یہ لوگ چلے گئے۔ تین دن اسی اندھیرے کنویں میں کسی طرح پڑا رہا۔ ہر دم آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔ خوف کے مارے برا حال تھا۔ بس زندگی تھی کہ سانس چل رہی تھی۔ تیسرے دن ایک قافلہ وہاں اترا اور پانی کی تلاش میں ڈول ڈال دیا۔ میں نے نیچے سے پکارا۔ انھوں نے مجھے وہاں سے نکالا اور مصر کے بازار میں فروخت کر دیا۔''

''آہ اتنا بڑا فریب دیا ان بھائیوں نے؟'' بن یامین نے پھر بھائی کو گلے لگا لیا۔ دیر تک سینے سے آہیں نکلتی رہیں اور درد آنسو بن کر بہتا رہا۔

''بادشاہ کے ایک معتمد نے خرید لیا اس کی بیوی زلیخا نے جھوٹا الزام لگایا اور جیل میں

ڈال دیا گیا۔ بادشاہ نے خواب دیکھا کوئی تعبیر بیان نہ کر سکا۔ میں نے تعبیر بتائی کہ سات سال تک خوب بارشیں ہوں گی اور پھر سات سال سخت قحط ہوگا۔ بادشاہ نے مجھے ہی وزیر بنایا اور آج تم میرے پاس ہو۔''

☆

''باباباب! بن یامین چوری کے الزام میں پکڑا گیا۔'' ڈرتے ڈرتے بتایا گیا۔

''کیا کہا؟ بن یامین اور چوری! یہ تم لوگوں کی کوئی سازش ہے۔'' مارے صدمے کے بزرگ اپنی جگہ ڈھیر ہو گئے۔

''نہیں۔ آپ یقین کریں۔'' بتانے والے کے آنسو رواں ہو گئے۔

''ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔'' دوسرا بھی ہچکیوں سے رونے لگا۔

''تمہارے سچ کو میں خوب جانتا ہوں۔''

''وزیر نے یہ کرتا آپ کے لیے بھیجا ہے۔'' پہلے نے بزرگ کے ہاتھوں میں کرتا تھما دیا۔

''کرتا؟'' بزرگ نے حیرت سے پوچھا اور کرتا ہاتھ میں لے کر سونگھتے ہی کھڑے ہو کر نعرہ لگایا۔

''میرا یوسف'' کرتا چومتے چومتے آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

''کہا گیا تھا کہ سر پر ڈال لیں۔ آنکھوں کی روشنی واپس آ جائے گی۔'' بڑے نے کرتا لے کر بزرگ کے سر پر ڈال دیا اور دنیا روشن ہو گئی۔

11.2 عجائب کا خانۂ مصر

دوسرے دن اقبال قاہرہ کے سینٹرل میوزیم کے سامنے ٹکٹ کی لائن میں کھڑا تھا۔ مختلف ممالک کے سیکڑوں سیاح اس کے آگے پیچھے لائن لگائے ہوئے اپنی اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ چار منزلہ عظیم الشان سرخ پتھر کی دیدہ زیب عمارت تھی۔ پتھروں کے رنگوں سے سحر انگیز تاثر پیدا کیا گیا تھا۔ عمارت کے سامنے وسیع عریض لان تھا جس

میں جا بجا پتھروں کی مصوری کے قدیم نمونے استادہ تھے۔ بہتے شفاف پانی کی نالیاں تھیں اور کئی بڑے چھوٹے سنگ مرمر کے فوارے پانی اڑا رہے تھے۔ عمارت کے سامنے لان کے پار باؤنڈری کے پیچھے کاروں کے پارک کرنے کی وسیع جگہ چھوڑی گئی تھی۔ کچھ ہی دیر میں یامین کو ٹکٹ مل گیا اور وہ میوزیم کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ اچانک ایسا محسوس ہوا کہ جیسے دنیا پیچھے چھوٹ گئی اور پرانی طلسماتی دنیا کا دروازہ کھل گیا۔ سامنے انڈر گراؤنڈ فلور پر بڑا سا اوپن ہال نظر آیا، جس کی چھت عمارت کی آخری منزل کا بلند گنبد تھا۔ دونوں طرف دائروں میں اوپری منزلوں تک جانے کے لیے سرخ پتھر کی سیڑھیاں تھیں۔ ہر منزل پر بڑے بڑے دائرے نما برآمدے تھے۔ ان کے پیچھے وسیع عریض ہال اور چھوٹے بڑے کمرے تھے، جن میں قدیم مصر کی تہذیب کو محفوظ کیا گیا تھا۔

عمارت میں داخل ہوتے ہی سامنے سیڑھیاں اتر کر انڈر گراؤنڈ ہال میں فراعنہ کے زمانے سے بھی پہلے کی ایک بڑی سی شکستہ لکڑی کی کشتی رکھی ہوئی تھی۔ تقریباً پانچ ہزار سال پرانی یہ کشتی اس زمانے کے لوگوں کی مہارت کی داد دے رہی تھی۔ اقبال محو حیرت منزل بہ منزل جمع کیے گئے قدیم خزنے کو دیکھتا گیا۔ ایک منزل پر صرف زیورات کی نمائش تھی۔ ایک پر صرف فرنیچر کی کسی پر صرف مخطوطات اور کسی پر صرف پوشاکوں کی۔ ایک بڑے سے کمرے میں صدیوں پہلے میمائے گئے پرند اور دوسرے جانور شیشوں کی الماریوں میں رکھتے تھے۔ ایک کبوتر اڑنے کے لیے تیار تھا۔ کوئل کوک رہی تھی۔ نہ جانے کتنے طرح کی چڑیاں چہچہانے کے لیے تیار تھیں۔ چھوٹے بڑے کتے بھونکنے کے لیے منہ کھولے کھڑے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ زندہ نہیں ہیں۔ اتنے زمانے کے بعد بھی اپنی اصل شکل میں موجود تھے۔

ایک منزل پر صرف دیوی دیوتاؤں اور اس زمانے کے اعتقادات سے متعلق اشیاء کی نمائش تھی۔ عجیب وغریب شکلوں کی دیویاں اور دیوتا۔ ان کے متعلق رسومات کی تصاویر حیرت انگیز تاثیر بیدار کر رہی تھیں۔ لگا کہ ہر زمانے میں انسان اپنا خدا خود ہی تراشتا آیا ہے اور اصنام کے آگے سجدہ ریز ہو کر اپنی مکتی کی پرفریب خواہش کی تکمیل کی

آرزو کرتا رہا ہے۔

آخر میں اقبال چوتھی منزل کے اس خاص حصہ میں پہنچا جہاں بادشاہوں اور شہزادے،شہزادیوں کی صدیوں پرانی ممیائی ہوئی لاشیں رکھی تھیں۔فراعنۂ مصر کے مختلف زمانوں اور خاندانوں کے اہم لوگوں کی کئی ممیاں شیشے کے بڑے بڑے تابوتوں میں محفوظ کی گئی تھیں جو مختلف اہراموں سے حاصل کر کے یہاں لائی گئی تھیں۔ایک بڑے کمرے کے درمیان کسی خاص فرعون بادشاہ اور اس کی ملکہ کی ممیاں برابر رکھی ہوئی تھیں اور چاروں طرف دیواروں پر نقشوں اور تحریروں سے ان کی تاریخ بیان کی گئی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ دونوں ابھی ابھی اپنی پٹیاں اور خول اتار کر کھڑے ہو جائیں گے۔اقبال وہیں ایک کونے میں اسٹول پر بیٹھ گیا۔

☆

''وہ دیکھو وہ کیا ہے؟'' ملکہ نے ندی کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔ساری خدام اور غلام لڑکیاں ایک دم ملکہ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں اور ندی کی طرف دیکھنے لگیں، جہاں کسی بڑی ٹوکری میں کپڑوں کی پوٹلی سی نظر آ رہی تھی۔یہ ٹوکری پانی کی لہروں پر قلعے کی طرف بہتی چلی آ رہی تھی۔ملکہ اس وقت قلعہ میں سیر کرنے نکلی تھی اور اس وقت نیل کے کنارے والے محل کے بلند برج پر اپنے غلاموں کیساتھ خوبصورت شام کا لطف لے رہی تھی کہ یکا یک اس کی نظر ندی میں بہتی ہوئی ٹوکری پر پڑی۔اشارا پاتے ہی کئی غلام ندی میں کود گئے۔کنیزیں بھی برج سے نیچے اتر کر ٹوکری کا انتظار کرنے لگیں اور ملکہ وہیں دبیز قالین کے فرش پر تکیہ لگا کر بیٹھ گئی۔کچھ ہی دیر بعد کنیزیں دوڑتی،خوشی سے چہچہاتی ہوئی اوپر آئیں۔

''یہ دیکھئے! اس ٹوکری میں ایک بچہ نکلا۔''ان کی خوشی قابل دید تھی۔

''کیا کہا بچہ؟'' ملکہ یہ سنتے ہی حیرت زدہ سی کھڑی ہو گئی۔خدام لڑکیوں نے دوڑ کر بچے کو غلاموں سے لیا اور ملکہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔یہ مشکل سے ایک دو دن کا خوبصورت لڑکا تھا۔ممتا کی ماری ملکہ کا دل بے اختیار اس کی محبت سے بے قابو ہو گیا اور اس

نے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''یہ آج سے میرا بیٹا ہے۔ ہمارا شہزادہ'' ملکہ کی آنکھیں خوشی سے چھلک آئیں اور وہ اسے بے اختیار چومنے لگی۔ سوتا ہوا بچہ جاگ گیا اور زور زور سے رونے لگا

''دیکھو! اس کو شاید بھوک لگی ہے۔'' ملکہ نے بچے کو کنیز کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے حکم جاری کیا۔ ''اس کو دودھ پلانے کا انتظام کیا جائے۔''

مگر وہاں ساری کنیزیں کنواری لڑکیاں تھیں۔ ہر طرف تشویش کا ماحول پیدا ہو گیا۔ بچہ تھا کہ روئے جا رہا تھا۔ کئی کنیزوں کو خاص محل کی طرف دوڑایا گیا کہ شاید کسی غلام عورت کے دودھ اتر رہا ہو۔ مگر تھوڑی دیر بعد ہی وہ نامراد واپس آ گئیں۔ تشویش بڑھتی ہی جا رہی تھی کہ ایک کنیز نے ملکہ کو بتایا کہ اس کے پڑوس میں ایک اسرائیلی عورت کو بچہ ہونے والا تھا دیکھتی ہوں شاید وہ دودھ پلانے کے کام آ جائے۔

''پھر یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ دوڑتی ہوئی جاؤ اور اسے فوراً حاضر کرو۔'' حکم جاری ہوا۔ کنیز دوڑتی ہوئی زینہ اتر کر اپنے محلے کی طرف روانہ ہو گئی۔

ملکہ نے وزیر انتظام کی بھی فوراً حاضری کا حکم بھجوایا۔ وہ بھی چند منٹ میں حاضر ہو کر سجدہ ریز ہو گیا۔

''شہر میں جتنی بھی عورتوں نے بچہ جنا ہے ان سب کو حاضر کرو۔'' حکم پا کر فوراً الٹے پاؤں واپس ہوا اور انتظامات میں جٹ گیا۔

☆

''آہ تم نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا؟'' اسرائیلی عورت زار و قطار روئے جاری تھی۔ اسے کسی طرح چین نہ پڑ رہا تھا۔

''کوئی مجبوری سی مجبوری۔'' اسکا شوہر سر پکڑے، بیوی کے سرہانے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔

''مگر تم ٹوکری کہاں چھوڑ آئے؟'' عورت نے اپنے شوہر کا گریبان دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا ''مجھے اپنا بیٹا چاہیے۔ ہائے میرا بیٹا۔''

وہ کبھی دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹتی تھی اور کبھی شوہر کو جھنجھوڑتی تھی۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آرہا تھا۔

''میں ٹوکری کوندی میں بہا آیا ہوں۔ شاید خدا کو رحم آجائے اور اس کے پلنے کا کوئی انتظام ہو۔ یا خدا ہم مجبوروں پر رحم کر۔'' شوہر نے دونوں ہاتھ اٹھا کر زار زار روتے ہوئے دہائی دی۔

''ہائے میں کیسی بدنصیب ہوں۔'' عورت نے اپنا سینہ پیٹ لیا۔

''یہ تو سوچو کہ اگر وہ یہاں ہوتا تو اب تک فرعون کے لوگ اسے لے گئے ہوتے۔'' مرد نے سمجھانا چاہا۔

''یا خدا ہمیں اس دوزخ سے نکال یا فرعون کو غارت کر دے۔'' عورت نے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیئے۔ اتنے میں دروازہ زور زور سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

''شاید فرعون کے لوگ آ گئے؟'' مرد نے خوفزدہ ہو کر بیوی کو دیکھا۔

''آ گئے تو آ گئے۔ مار ڈالیں مجھے بھی۔ اب مجھے جی کر کیا کرنا ہے۔ ہائے میرا بچہ۔'' عورت نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے شاہی کنیز کو کھڑا پایا۔

''میں تمہارے لیے خوشخبری لائی ہوں۔'' کنیز نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

''خوشخبری؟'' سوال کیا گیا۔

''مجھے اندر آنے دیں۔''

''ہاں ہاں آؤ۔ مگر خوشخبری اور ہماری تقدیر میں؟'' عورت نے اسے راستہ دیتے ہوئے گریہ کیا۔

''میں بھی ایک اسرائیلی ہوں۔ پچھلے سال میرے چھوٹے بھائی کو انھوں نے قتل کر دیا۔'' کنیز رونے لگی۔

''پھر؟''

''میں نے تم لوگوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ تمہارا بچہ زندہ ہے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔

''کیا کہا، میرا بیٹا زندہ ہے؟'' عورت کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

''میں تمہیں اس کے پاس لے جانے آئی ہوں۔ ملکہ نے دریا سے وہ ٹوکری نکلوائی اور تمہارے بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔''

''سنا آپ نے!'' عورت اپنے شوہر کے گلے سے چمٹ گئی۔ مارے خوشی کے اسکا برا حال تھا۔

''خدا بڑا کارساز ہے۔'' مرد نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر شکر کیا۔

''بچے کو دودھ پلانے والی کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور عورت وہاں بلائی جائے، میرے ساتھ چلو۔ تمہارا بیٹا بھوکا ہے۔''

''میرا بیٹا بھوکا ہے؟'' عورت نے کنیز کا ہاتھ پکڑا اور دوڑتی ہوئی محل کی طرف چل دی۔

☆

''میں نہ کہتا تھا کہ بیگمات میں سے کسی کا بچہ گود لے لو۔ مگر تم نے میری سنی ہی نہیں۔ آج ہمارا بیٹا ہی ہمارا دشمن ہو گیا۔'' فرعون نے ہاتھ ملتے ہوئے بیوی سے شکایت کی۔

''نہیں میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔ میں اسے سمجھا لوں گی۔'' اس کی آواز میں دم نہ تھا۔

''وہ کھلے عام میری خدائی کا انکار کرتا پھر رہا ہے۔''

وہ دونوں اس وقت خاص محل میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ فرعون بار بار اٹھ کر ٹہلتا تھا اس کی پریشانی قابل دید تھی۔

''ایسا تو آج تک نہ ہوا۔'' بیوی افسوس سے بولی۔

''کون ہے پورے عالم میں جو ہماری خدائی کا منکر ہو اور اس کا سر گردن پر باقی رہ جائے اور شانوں سے جدا نہ ہو۔''

''بیشک'' فوراً تائید کی گئی۔

''ہم زندگی اور موت دیتے ہیں۔ ہم ہی روٹی دیتے ہیں اور بھوکا بھی مارتے

ہیں۔ساری رعایا ہمارے آگے سجدہ ریز رہتی ہے۔مگر خود ہمارا ہی بیٹا......'' وہ بیقراری سے ہاتھ ملتے ہوئے قالین پر ٹہل رہا تھا۔

''ایک باراوراسے معاف کردیجئے۔اب آئے گا تو میں سمجھالوں گی۔'' ممتا سسک پڑی۔

''نہیں،اب وہ یہاں نہیں آسکتا اس کے سر پر ایک خون کا الزام بھی ہے۔'' فرعون نے اٹھ کر جاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔

☆

''خبردار ہوجاؤ! دیکھو! سنو! کہ خدا کا پیغام آپہنچا۔بنی اسرائیل کی رہائی کا حکم صادر ہو چکا۔جھوٹے خداؤں کو سجدہ گناہ عظیم ہے۔صرف خدائے واحد ہی لائق پرستش ہے۔اسی کی عبادت میں انسانوں کی فلاح ہے۔وہ دن دور نہیں کہ میزان قائم کی جائے گی اور تمام انسان اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے۔فرعون بھی ہماری آپ کی طرح صرف ایک انسان ہے۔اپنے اعمال کا نتیجہ اس کے سامنے آکر رہے گا۔وہ کوئی خدا نہیں ہے۔خدا وہ ہے جس نے کائنات کو حق پر قائم کیا۔ہر چیز کو صرف اپنے حکم سے پیدا کر دیا۔اور وہی ایک دن سب کو جمع کرے گا۔وہی جلاتا ہے،وہی مارتا ہے،وہی رزق دیتا ہے،وہی بھوکا مارتا ہے۔بنی اسرائیل پر مظالم کی انتہا ہو چکی۔ہمیں غلامی کی زندگی جینے پر مجبور کر دیا گیا جھوٹے خدا کے حکم سے ہمارے لڑکوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔بس اب یہ ظلم اور نہیں سہا جائے گا۔اٹھو اور خدائے واحد کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوجاؤ کہ وہی ہماری کشتی کو کنارے لگائے گا......'' موسیٰ،شہر سے باہر لمبا چغا پہنے،ایک ٹیلے پر کھڑے ہوئے بنی اسرائیل کو خطاب کر رہے تھے۔ان کی کھچڑی داڑھی اور بال ہوا میں لہرا رہے تھے کہ اتنے میں شور اٹھا۔

''وہ آگئے'' کسی نے دور اشارہ کیا۔

''دیکھو وہ فرعون کے آدمی!'' ایک نے انہیں دیکھتے ہی کہا اور تمام لوگ اپنی جان بچا کر بھاگنے لگے۔

''رک جاؤ۔ کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' موسیٰ پکارتے رہے لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔

''تم ہی موسیٰ ہو؟'' فوجیوں نے انہیں گھیر لیا۔

''ہاں میں ہی موسیٰ ہوں اور فرعون کی خدائی کا منکر بھی۔''

''گرفتار کر لو اسے۔''

☆

''ہاں اب کیا کہتے ہو؟'' فرعون نے موسیٰ سے سوال کیا۔ وہ سونے اور جواہرات کے اونچے تخت پر بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ہزار ستون کا انتہائی اونچی شاندار چھت کا دیوان خاص تھا۔ سارے وزراء اور امراء زرق برق لباس پہنے، ہتھیار سجائے ہوئے اپنی اپنی جگہ پر مستعد کھڑے تھے۔ کافی دیر تک سجدہ ریز رہنے کے بعد انہیں ابھی ابھی کھڑے ہونے کی اجازت ملی تھی۔ صرف موسیٰ ہی نے اسے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''میں تمہاری خدائی کا انکار کرتا ہوں۔''

''پھر یہاں کون خدا ہے؟'' فرعون نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ہر طرف باادب ہنسی پھیل گئی۔ سب لوگ موسیٰ کو استہزائیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

''خدا وہ ہے جس نے ہم سب کو پیدا کیا۔ ساری کائنات اس کے حکم سے قائم ہوئی۔ وہی زندگی دیتا ہے اور موت بھی۔'' موسیٰ کی آواز گونجی۔

''موت اور زندگی دینے والے تو ہم ہیں۔ کتنے سالوں سے بنی اسرائیل کے تمام لڑکوں کو ہم موت دیتے ہیں۔'' فرعون نے موسیٰ کی بات کاٹ کر گرجدار آواز میں کہا۔

''بیشک بیشک'' کہتے ہوئے تمام درباری ایک بار پھر سجدہ میں چلے گئے۔

''ان میں سے جس کی کہو، ابھی زندگی چھین لیتے ہیں۔ دیکھو اپنے پیچھے دیکھو!'' فرعون کے اشارے پر آگے کھڑے ہوئے بڑے وزیر کو سیکورٹی والے اٹھا کر چلے اور دیوان خاص کے باہر کھلے میدان میں اس کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھا دیا۔ یہ منظر دیکھ کر تمام درباری ایک بار پھر سجدے میں چلے گئے اور زور زور سے پکارنے لگے۔

''رحم یا خدا! تو ہی زندگی اور موت دینے والا ہے۔رحم کر رحم کر اے خدا!''

''سن اے خدائے کاذب! موت تجھے بھی ایک دن آئے گی، جیسے تیرے اجداد کو آلیا۔تیرے ظلم کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا۔''موسیٰ نے اپنے عصا کو اشارہ دیتے ہوئے کہا۔''یہ دیکھ اپنے پیروں کے پاس۔''

موسیٰ کی گرجدار آواز سن کر سب درباری کھڑے ہو گئے۔پورے دیوان میں ہزاروں مینڈک ٹراتے پھدکتے ہوئے ظاہر ہو گئے۔فرعون اپنے تخت پر مینڈک دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔تمام حاضرین اپنی اپنی جگہ اچھلنے کودنے لگے۔عجب طرح کی سراسیمگی ہر طرف پھیل گئی۔کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا یہ ماجرا کیا ہے۔سب کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔اتنے میں موسیٰ نے پھر اپنے عصاء سے اشارہ کیا اور سارے مینڈک ٹائب ہو گئے۔فرعون بھی اپنی جگہ بیٹھ گیا اور غلام نے باادب ہو کر اسے سفید جام پیش کیا۔جام اٹھا کر منہ سے لگایا ہی تھا کہ موسیٰ کی آواز پھر گونجی۔

''تیرے جام میں شراب نہیں،خون ہے نادان۔''سب نے حیرت سے دیکھا کہ سفید جام کا رنگ سرخ ہوتا چلا گیا اور فرعون نے گھبرا کر جام اپنے ہاتھ سے دور پھینک دیا۔ایک وزیر زیرک، جو نہایت غور سے سارا معاملہ دیکھ رہا تھا آگے بڑھا،تخت چوم کر سجدہ کیا اور گویا ہوا۔

''یہ تمام معاملہ سوائے جادو کے کچھ نہیں ہے،اے خدائے یقیں۔''

فرعون بھی اس کی بات سن کر ہوش میں آ گیا اور بولا۔

''جادو کے زور سے تو عوام کو بہکانا چاہتا ہے؟ ہماری خدائی کسی جادو کی محتاج نہیں۔اگر ایسا ہی ہے تو ایک دن جادگروں کو جمع کیا جائے گا اور پھر دیکھتے ہیں کہ کون بڑا جادوگر ہے۔آج سے تین مہینے بعد پورے چاند کی رات میں جادوگری کا مقابلہ ہوگا۔تمام عوام کو بھی وہاں حاضر کیا جائے گا۔دنیا دیکھے گی کہ تیرا جادو کیسا بے اثر ہے۔''

''نہایت بجا فرمایا۔''وزیر زیرک نے تائید کی۔

''اگلا چاند نکلنے تک تمام بڑے جادوگروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔''

فرعون نے موسیٰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم صادر کیا۔" لے جاؤ اسے قید خانے میں ڈال دو۔"

پورا شہر اس عجیب وغریب مقابلے کو دیکھنے کے لیے وسیع وعریض میدان میں جمع تھا۔عورتیں،مرد، بچے،سب کے سب بیقراری کے عالم میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ایسا مقابلہ نہ کبھی سننے میں آیا تھا نہ دیکھنے میں۔آسمان پر پورا چاند روشنی بکھیر رہا تھا۔تمام میدان ہزار ہا مشعلوں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ساری تیاریاں مکمل تھیں۔ملک کے تمام بڑے بڑے جادوگر اپنے خاص لباس میں ملبوس فرعون کے تخت کے نیچے درباریوں اور امراء کے ساتھ ہاتھ باندھے باادب کھڑے تھے۔موسیٰ بھی ان کے ساتھ کھڑے لاپرواہی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔اتنے میں شور اٹھا اور فرعون اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ میدان میں داخل ہوا۔تمام لوگ ایک دم سجدے میں چلے گئے۔فرعون تیس گھوڑوں کی بگھی سے اتر کر اونچے تخت پر فروکش ہوگیا۔اسکے بیٹھتے ہی بڑے بڑے ڈرم بجائے جانے لگے۔مختلف سازوں کی آوازوں سے پورا میدان گونجنے لگا۔عوام نے کھڑے ہوکر فرعون کے استقبال میں تالیاں بجانی شروع کردیں۔فرعون نے مسکرا کر چاروں طرف دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر عوام کے استقبال کو شرف قبولیت بخشا اور مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ کیا۔اس کا اشارہ پاتے ہی تمام جادوگر اپنے اپنے ہاتھوں اور جیبوں میں طرح طرح کے ٹوٹکے لے کر بیچ میدان کی طرف چلے۔جہاں ایک بڑے دائرے میں مشعلوں سے روشنی کی گئی تھی۔موسیٰ بھی ان کے پیچھے اپنا عصاء ہاتھ میں لئے چلے اور انکے ساتھ ایک لائن میں کھڑے ہوگئے۔کافی دیر تک ایک ایک جادوگر آگے بڑھتا تھا اور اپنے بے مثال کرتب دکھاتا تھا۔لوگ بار بار حیرت سے دوچار ہوتے تھے اور میدان تالیوں سے گونجنے لگتا تھا۔ایک جادوگر نے ایسا سماں باندھا گویا پورا میدان پانی سے بھر گیا ہے اور پانی ہے کہ بڑھتا ہی جارہا ہے لوگوں کی خوف کے مارے چیخیں نکل گئیں۔دوسرے نے ایک نہایت بلند مینار زمین سے نکال کر آسمان کی طرف بڑھتے ہوئے دکھایا تیسرے نے ہوا میں اڑ کر پورے میدان کا ایک چکر لگایا۔غرض یہ کہ لوگ ایسے ایسے کرتب دیکھ کر حیرت اور خوشی سے

مدہوش تھے کہ اصل مقابلہ شروع ہونے کا اعلان ہوا۔سارے جادوگر ایک طرف لائن بنا کر کھڑے ہوگئے ۔ان کے بالمقابل تنہا موسیٰ آنکھیں بند کیے مشغول بندگی ہوگئے ۔

''یاخدائے ذوالجلال،اے مالک ومعبود! آج اس ناچیز بندے کی عزت وآبرو تیرے ہاتھ میں ہے۔کلمۂ حق کو کامیاب اور باطل کو فنا کر۔تمام زمانہ حق کو فنا کرنے جمع ہوا ہے۔میری خطاؤں کو بخش دے اوراس ناچیز کو فتحیاب کر،آمین۔''

سارے جادوگروں نے طرح طرح کے کرتب ڈالے۔موسیٰ خاموشی سے کھڑے دیکھتے رہے۔پھر اچانک جادوگروں نے اپنی جیبوں سے رساں نکال کر میدان میں ڈال دیں جو فوراً ہی بڑے بڑے اژدہے بن کر موسیٰ کو ختم کرنے ان کی طرف پھنکارتے ہوئے بڑھنے لگے۔تمام لوگ حتیٰ کہ فرعون بھی حیرت اور خوشی سے کھڑا ہوگیا کہ اب موسیٰ کا خاتمہ قریب ہے۔موسیٰ بھی خوفزدہ ہوکر پیچھے ہٹے کہ کان میں ندا آئی۔

''ڈرو نہیں موسیٰ،تم بھی اپنا عصا زمین پر ڈال دو۔''

موسیٰ نے فوراً ہی اپنا عصا بڑھتے ہوئے اژدہوں کے سامنے ڈالدیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک نہایت بڑے اژدھے میں بدل گیا اور بڑھ کر باری باری جادوگروں کے سانپوں کو نگل گیا۔ یہ دیکھ کر ہر طرف پر سناٹا چھا گیا۔اورسب خاموش ہوکر اپنی جگہ بیٹھ گئے فرعون بھی جھنجھلا کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ تمام جادوگر ایک دم سجدے میں چلے گئے اور خدائے واحد کا اقرار کرنے لگے اور کھڑے ہوکر سب نے ایک زبان فرعون کی خدائی سے انکار کیا اور موسیٰ کے حق پر ہونے کا اعلان۔ یہ دیکھتے ہی فرعون نے اپنی فوجوں کو اشارہ کیا اور وہ جادوگروں کو گرفتار کرنے آگے بڑھیں۔جادوگر بھی میدان چھوڑ کر بھاگے۔عوام کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ان میں بھی افراتفری مچ گئی اور جس کو جدھر جگہ ملی بھاگنے لگا۔موسیٰ بھی اس افراتفری کے عالم میں فرعون کی فوجوں سے بچ کر نکل آئے۔

☆

''یہ تم ہمیں کہاں لے آئے؟ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کی فوجیں۔''ایک

بوڑھے نے موسیٰ کا دامن پکڑ لیا۔

''آہ اس موت سے تو فرعون کی غلامی اچھی تھی۔'' دوسرے شخص نے فریاد کی۔

''کتنے نادان تھے ہم لوگ کہ اس کی باتوں میں آ گئے۔'' تیسرے نے آہ وزاری کی۔

''وہاں اپنے مکان تھے دوکانیں تھیں۔لڑکوں کو مار دیا جاتا تھا تو کیا ہوا گھر تو تھا۔ یہاں اس ویرانے میں اب کیا ہوگا۔'' چوتھے کو اپنا گھر یاد آنے لگا۔

''بھوک پیاس اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہم سب یہیں دفن ہوجائیں گے یا فرعون کی فوجیں آلیں گی۔'' پانچواں سر پکڑ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔

اندھیری سرد رات کی تیز ٹھنڈی ہواؤں میں بنی اسرائیل کا قافلہ سمندر کے کنارے کھڑا رہ گیا تھا کہ آگے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔تمام اہم لوگ موسیٰ کو گھیرے کھڑے اپنی قسمت کو رو رہے تھے اور پریشانیوں کا الزام ان کے سر ڈال رہے تھے۔ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کچھ نہ کر دیں۔مگر موسیٰ کو قتل کر کے بھی کیا حاصل تھا۔

میدان سے نکل کر موسیٰ شہر میں ایک حامی کے گھر میں چھپ گئے اور خاموشی سے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ایک دن حکم الٰہی کی تکمیل میں اپنی قوم کے ساتھ مصر چھوڑ دیا۔ایک مقررہ رات میں بیک وقت تمام بنی اسرائیل اپنی اپنی سواریوں، گدھوں، گھوڑوں،اونٹوں اوراونٹ گاڑیوں پر جو کچھ بھی تھوڑا بہت سامان زندگی لے سکتے تھے،موسیٰ کی رہبری میں گھر بار چھوڑ کر نکل پڑے۔دوسرے دن فرعون کو جب ان کی ہجرت کا پتہ چلا تو وہ بھی اپنی فوج تیار کر کے ان کے پیچھے پیچھے نکلا۔کئی دنوں کے مسلسل سفر کے بعد اس وقت یہ قافلہ ٹھٹھرتی اندھیری رات میں سمندر کے کنارے کھڑا تھا۔ پیچھے فرعون کی فوج آ رہی تھی اور آگے جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

''ہاں کہاں ہے وہ ارض موعود، جس کے خواب دکھا کر ہمیں یہاں لائے تھے۔'' ایک نوجوان نے طیش میں آ کر موسیٰ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''ابھی فرعون کی فوج آیا چاہتی ہے۔دیکھو! وہ مشعلوں کی روشنی نظر بھی آنی شروع ہوگئی۔دیکھو! دیکھو۔'' دوسرے نوجوان نے سب کو مخاطب کیا۔انھوں نے پلٹ کر دیکھا تو

دور اندھیری رات میں ہزاروں جگنو سے چمک رہے تھے۔صاف ظاہر تھا کہ فرعون کا لشکر بھی قریب آ چکا ہے۔موسیٰ نے بھی یہ منظر دیکھا اور دوڑ کر ایک اونچی چوٹی پر کھڑے ہوکر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر مناجات کی۔تیز ہوا سے ان کی داڑھی و سر کے بال لہرا رہے تھے اور نگاہیں آسمان پر تھیں۔

''یا اللہ، مجھے راستہ دکھا۔ یہ تیرے بیکس و مجبور بندے بس ایک تیرے سہارے جھوٹے خدا کے شکنجے سے نکل آئے ہیں۔یا خدا ہمیں بے یارو مددگار نہ چھوڑ۔'' دعا کر کے سجدے میں گر گئے اور نالہ کرنے لگے۔اتنے میں ایک زور کی بجلی کڑکی اور ندا آئی۔

''اٹھ اور دل کو تھام! اپنا عصا سمندر پر مار، راستہ مل جائے گا۔''

یہ سنتے ہی موسیٰ اپنی جگہ سے اٹھے اور سب کو اپنے پیچھے آنے کے لیے پکارتے ہوئے سمندر کی طرف دوڑ پڑے۔پورا قافلہ بھی ان کے پیچھے سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔

''خدا کے حکم سے راستہ دے۔'' یہ کہہ کر موسیٰ نے اپنا عصا سمندر پر مارا ہی تھا کہ زور کے دھماکے کے ساتھ سمندر دو حصوں میں بٹ گیا۔پانی کی دو دیواروں کے درمیان راستہ صاف نظر آنے لگا۔موسیٰ سجدۂ شکر بجالائے اور قافلے کو اس میں اترنے کے لیے کہا۔وہ ہچکچائے اور سمندر میں اترتے ہوئے ڈرنے لگے لیکن پیچھے پلٹ کر دیکھا تو فرعون کی افواج چند ہی میل دور رہ گئی تھی لہٰذا سوائے اترنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔سب سے آخر میں موسیٰ راستے میں اترے۔اتنے میں فرعون کی فوج بھی کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ان کے پیچھے فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ سمندر میں اتر گیا اور تیزی سے موسیٰ کا پیچھا کرنے لگا۔ دوسرے کنارے پہنچ کر موسیٰ نے پھر اپنا عصا سمندر پر مارا اور راستہ بند کرنے کا حکم دیا۔اور فرعون مع اپنی فوج کے سمندر میں غرق ہو گیا۔

11.3 مکین بے مکاں

آخر ایک گھنٹے انتظار کے بعد امگریشن آفیسر فواد اپنے دفتر میں آیا۔وہ کوئی تیس سال کا مصری جوان تھا اس نے آتے ہی مصلّٰی فرش پر بچھا دیا اور نماز شروع کرنے سے پہلے

اقبال سے چند منٹ کی مہلت مانگی۔

''پانچ منٹ میں ابھی آپ کا کام کرتا ہوں۔''

''اقبال اس وقت مصر لیبیا بارڈر کراس کرنے کے لیے آخری مصری پوسٹ سلّوم کے امیگریشن آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔نماز سے فارغ ہوکر فواد نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں کہئے۔''

''میں دو گھنٹے سے اپنے پاسپورٹ کا باہر انتظار کر رہا تھا۔کتنے ہی لوگ میرے بعد آئے اور اسٹیمپ لگوا کر چلے گئے۔''

''میں ابھی دیکھتا ہوں۔''اس نے اقبال کا نام پاسپورٹ نمبر نوٹ کر کے ٹیلیفون اٹھا کر کسی سے بات کرنے کے بعد اقبال کو بتایا۔

''آپ کا پاسپورٹ پولیس چیکنگ میں گیا ہوا ہے۔''

''کیوں؟''

''انڈیا یا پاکستان اور افغانستان سے آنے والے مسلم مسافروں کی خاص چیکنگ ہوتی ہے۔''

''آخر کیوں؟''اقبال کو غصہ آنا شروع ہوگیا۔

''دہشت گردی کے شک میں۔''

''میں آپ کو ٹیرورسٹ نظر آتا ہوں؟''اقبال نے پوچھا۔

''یہ تو پولیس ہی بتائے گی۔''اس نے بھی سختی سے جواب دیا۔

''پولیس کب تک بتائے گی؟ سیکڑوں مسافر آئے اور چلے گئے۔ہماری ٹیکسی کے باقی تمام مسافروں کی کلیرنس ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا۔''

''آپ آدھے گھنٹے بعد یہاں آیئے۔''فواد نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

اقبال اٹھ کر باہر آ گیا اور جہاں سیکڑوں مسافر آ جا رہے تھے۔بہت سے لائنوں میں اپنے کاغذات لیے کھڑے تھے۔کتنے ہی ہوٹلوں میں بیٹھے حقہ اور کافی پی رہے

تھے،شطرنج کھیل رہے تھے۔ہوائی راستے بند ہونے کی وجہ سے یہ بارڈر پوسٹ پورے افریقہ اور ایشیا سے لیبیا جانے والوں کے لیے سب سے اہم راستہ بن گیا تھا۔اقبال نے سڑک پر کھڑی اپنی سات سیٹوں والی ٹیکسی کے قریب آ کر دوسرے مسافروں کو بتایا کہ ابھی آدھا گھنٹہ اور انتظار کرنا پڑے گا۔

''بہت ٹائم ہو گیا،اب اور انتظار نہیں کر سکتے۔'' مصری مسافر نے ڈرائیور سے گاڑی چلانے کے لیے کہا۔سات مسافروں میں صرف وہی انڈیا سے تھا۔دو مصری،دو عراقی، ایک لیبی اور ایک سوڈانی تھا۔یہ سب لوگ قاہرہ سے بنغازی جا رہے تھے۔

''پلیز صرف آدھا گھنٹہ اور دیکھ لیں۔اس کے بعد مجھے چھوڑ کر چلے جائیں۔'' اقبال نے ڈرائیور کی خوشامد کی جو اس کا سامان نکالنے کے لیے ڈگی کھول چکا تھا۔باقی سب کے پاسپورٹ آدھے گھنٹے کے اندر اندر مل گئے تھے صرف اسی کا رکا ہوا تھا ڈرائیور نے ایک نہ سنی اور اس کا سوٹ کیس نکال کر سڑپ کر ڈال دیا۔

''آدھے گھنٹے کی ہی تو اور بات ہے۔ہم لوگ انتظار کر لیں گے۔یہاں سے ٹیکسی ملنا بہت مشکل ہوتا ہے۔آخر یہ پڑھانے جا رہے ہیں۔اتنا حق تو بنتا ہے استاد کا۔'' سوڈانی نے اقبال کی طرفداری کرتے ہوئے سب سے کہا جو ٹیکسی سے اتر کر کھڑے ہو گئے تھے۔یہ سن کو لیبین بھی اقبال کی حمایت میں آ گیا۔

''نہیں کوئی بات نہیں ہے اور تیس منٹ سہی۔''

''دو گھنٹے گزر گئے ہیں صرف ان کے انتظار میں۔مجھے لوٹ کر بھی آنا ہوتا ہے۔'' ڈرائیور نے اپنی کہی۔

''نہیں اس طرح چھوڑ کر جانا صحیح نہیں ہے۔ایک عراقی نے اقبال کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔آخر کار ڈرائیور نے پھر سوٹ کیس ڈگی میں رکھتے ہوئے وارننگ دی۔

''گھڑی دیکھ کر تیس منٹ بعد میں چلا جاؤں گا۔سامان یہیں سڑک پر ملے گا۔''

اقبال دوڑتا ہوا پھر فواد کے آفس میں پہنچا تو وہاں ایک بنگلہ دیشی احمد بھی کھڑا تھا اس نے بتایا اس کا پاسپورٹ بھی پولیس چیکنگ میں گیا ہوا ہے۔اسے بھی پریشان ہوتے

ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے۔

''آفیسر کہاں ہے؟'' اقبال نے اس سے پوچھا۔

''ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔''

احمد نے اتنا ہی بتایا تھا کہ فواد ہاتھ میں پاسپورٹ لیے اندر آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک مصری بھی تھا۔

''یہ دونوں پاسپورٹ آپ لوگوں کے ہیں۔ کلیرنس مل گئی ہے۔'' اس نے پاسپورٹ مصری کو تھماتے ہوئے بتایا۔''ان کی ٹیکسی میں آپ لوگ لیبیا جائیں گے۔'' مصری نے پاسپورٹ لئے اور چلتا بنا۔ اقبال اور احمد حیران کھڑے رہ گئے۔

''آخر کیوں؟ ہماری ٹیکسی پہلے ہی باہر کھڑی ہے۔'' احمد نے عربی میں زور زور سے بولنا شروع کیا۔

''نہیں، اس کے پیچھے جاؤ۔'' فواد نے حکم دیا۔

اتنا سن کر احمد کو جو غصہ آیا ہے تو اس نے عربی میں زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ آس پاس کے آفس سے بھی لوگ نکل آئے۔ اقبال کو بھی سخت غصہ آ گیا اس نے بھی لوگوں کو اپنی بات بتانی شروع کی۔ حالات خراب ہوتے دیکھ کر فواد نے کسی طرح اس مصری ڈرائیو کو واپس بلایا اور پاسپورٹ ان لوگوں کے حوالے کر دیئے۔ بعد کو پتہ چلا کہ اس طرح پسماندہ ممالک کے مسافروں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی ٹیکسیوں میں سفر کریں۔

☆

''یہ کون لوگ ہیں؟ کیوں نو مینس لینڈ میں پڑے ہوئے ہیں؟'' اقبال نے باہر دیکھتے ہوئے اپنے پاس بیٹھے عراقی سے پوچھا۔

''یہ فلسطینی ہیں۔'' جواب ملا۔

''فلسطینی؟''

''لیبیا سے ان کو نکال دیا گیا ہے اور مصر ان کو لے نہیں رہا ہے۔ ٹرانزٹ ویزا تک نہیں دے رہا ہے لہذا یہاں پڑے ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' اقبال نے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا جہاں سیکڑوں بوسیدہ ٹینٹ تیز ہوا میں اڑے سے جارہے تھے۔ادھ ننگے بچے ریت میں کھیل رہے تھے۔عورتیں ٹنکیوں سے بالٹیوں میں پانی بھربھرکر لارہی تھیں۔کچھ کپڑ دھورہی تھیں، کچھ اسٹوو پر کھانا بنانے کی کوشش کررہی تھیں۔ٹنکیوں پر بڑا بڑا یو این او لکھا ہوا تھا۔غالباً یو این او نے کچھ ضروریات زندگی فراہم کرائی تھیں۔بہت سے مرد ٹنٹوں کے باہر گروپ بنائے اپنے اڑتے ہوئے کپڑے سمیٹے بیٹھے باتیں کررہے تھے۔یہ تقریباً ایک کلومیٹر چوڑی نومیز لینڈ تھی،جس میں یہ فلسطینی غیر انسانی زندگی جینے پر مجبور تھے۔

''جب سے یاسر عرفات نے اسرائیل سے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کیا ہے۔یہ لوگ یہیں رہ رہے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''کچھ سمجھ میں نہیں آیا؟'' اقبال کی حیرانی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

''ہوا یہ کہ کرنل قدافی صاحب بہت ناراض ہوگئے یاسر عرفات سے۔اورانھوں نے سارے فلسطینیوں کو لیبیا چھوڑنے کا حکم دے دیا۔راتوں رات ٹرکوں میں بھرکر لیبیا کی سرحد کے باہر کردیا گیا۔ویزا، پاسپورٹ، کاغذات کچھ لینے کی مہلت تک نہیں دی اور مصر نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں آنے نہیں دیا۔اس لیے یہ بیچارے یہاں پڑے رہ گئے۔''

''یاسر عرفات کے عمل کی سزا ان بیچاروں کو کیوں؟''

''یہ عرب دنیا ہے۔آپ نہیں سمجھیں گے۔'' عراقی نے بتایا۔جو کسی زمانے میں انگلینڈ سے انجینئرنگ کرکے آیا تھا۔

''مگر کچھ تو لاجک ہو؟'' اقبال کو غصہ آگیا۔

''لاجک کبھی دنیائے اسلام میں رہی ہے؟ یہاں تو ہمیشہ طاقت کے بل بوتے پر سب کچھ ہوتا آیا ہے۔جس کی لاٹھی میں دم ہوا مالک بن بیٹھا۔علماء، فقہا اور تاجر مزدور سب اس کے غلام اور ماتحت۔وہ سب کی زندگی کا مالک۔یہی رہا ہے اسلامی طرز حکومت۔کوئی ذرا عقلمند ہوا تو ہر تقریر میں قرآن وحدیث کا حوالہ۔بس سارے اللہ رسول کے اختیارات اسے حاصل ہوگئے۔چاہے جس کو زندہ رکھے، چاہے جس کو مارے، جس کو چاہے روٹی دے

چاہے جس کو بھوکا مارے۔ یہی رہی ہے پوری تاریخ اسلامیہ۔ ڈیڑھ ہزار سال بس اسی طرح گزر گئے اور بھی نہ جانے کتنا زمانہ یوں ہی گزرے گا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مذہب بھی سیاست کے تابع کر دیا گیا؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''بیشک! جیسی سیاست ویسا مذہب۔ اگر حکمراں آل رسول سے ہے تو اس کی حکمرانی یوں ثابت ہو گئی اور اگر آل رسول میں سے نہیں ہے تو خلافت اسلامیہ کا نظریہ تو ہے ہی حق پر ثابت کرنے کے لیے۔''

''کیا بات ہے۔ آپ نے تو ساری تاریخ اسلامیہ کو ایک جملے میں بیان کر دیا مگر ہمارے فقہاء اور دانشور کیا کرتے رہے۔''

''وہ کیا کرتے؟ انہیں تو فقہ اسلامی سے ہی فرصت نہ ملی۔ نماز کے فرائض وسنن وغیرہ۔ وضو کے واجبات، اٹھنے بیٹھنے اور سونے کی سنتیں۔ شادی اور طلاق کے مسائل۔ یہ کم بڑے کام تھے ان لوگوں کے لیے؟ ہاں ایک اور اہم کام میں ہزار سال سے لگے ہوئے ہیں یہ لوگ کہ بس کسی طرح عقل کا ستعمال نہ ہونے پائے۔ مسلمان سوچنے نہ لگے۔ عقل سے بہت ناراض ہیں یہ لوگ۔''

''عقل سے ناراض؟ صحیح کہا آپ نے۔'' اقبال کو اپنے خیالات کی تائید سے مزا آ رہا تھا۔

''جی، بس عقل کا تو استعمال ہی نہیں کرنا ہے۔ جو ہم نے فرما دیا، جو ہم نے تفسیر کر دی، جو ہم نے حدیث بیان کر دی، حرف آخر ہے۔ آپ کو صرف سر جھکانا ہے ذرا سوال کیا تو دین سے خارج۔''

''تو پھر کیا اسلام اہل دانش کے لیے نہیں ہے؟'' اقبال نے پوچھا۔

''پوچھیے، ان سے؟ مگر اب کیا پوچھنا ہے۔ اب تو جو صدیوں سے ہم نے بویا ہے کاٹنے کا وقت ہے۔ فصل تیار ہے اور ہمیں تو کاٹنا بھی نہیں ہے۔ کاٹنے والے مغرب سے آ چکے ہیں۔ کسی کے سر پر ٹوپی اور کسی شانے پر سر نہیں رہے گا۔'' عراقی نے یہ کہہ کر دوسری

طرف منہ پھیر لیا۔

''صرف مغرب سے ہی نہیں آئے ہیں، مشرق میں بھی فصل کاٹی جارہی ہے۔بس آپ کو پتہ نہیں ہے۔ ہمارا تو مرثیہ لکھنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔'' اقبال نے اپنے آپ سے کہا۔اتنے میں ٹیکسی لیبین بارڈر پوسٹ میں داخل ہوگئی۔

جیسے اچانک موسم بالکل بدل گیا۔ ہر طرف ایک عجیب سناٹا۔ ہر شخص کے چہرے پر ایک ہی تاثر، ہر آدمی مشینی انداز میں اپنے کام پر لگا ہوا نہ خوشی نہ غم۔ جیسے سب نے ایک ہی ماسک پہن رکھا ہو۔سامان چیکنگ کرنے والے سے لے کر سیکوٹی اور کسٹم آفیسر تک سب کے چہرے ایک سے نظر آ رہے تھے۔ مشینی انداز میں چلتے پھرتے اور اپنا کام ایمانداری سے کرتے روبوٹ لگ رہے تھے۔ ہر طرف ہر آفس میں کرنل قدافی کی قدآدم تصاویر لگی ہوئی تھیں۔کہیں وہ مسکرا رہے تھے اور کہیں پستول نکالے کھڑے تھے۔اقبال نے ہمسفر عراقی سے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اب نہیں۔اب کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہ نومینس لینڈ تھی کہ اتنی گفتگو کر لی۔کسی بھی عرب ملک میں کہیں بھی ذرا مذہب اور سیاست یا سوسائٹی کی بات کی اور زندگی ختم۔ حکمرانوں کے پورٹریٹ دیکھو اور سر جھکا کر چلتے بنو۔'' اتنا کہہ کر عراقی آگے بڑھ گیا۔اقبال نے لیبین سے کچھ بات کرنی چاہی تو اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔اقبال بھی کسٹم کی لائن میں لگ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' سامان چیک کرنے والے نے کلیات غالب نکال کر اقبال سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''کیا مطب؟'

''مطلب یہ کہ یہ کیسی کتاب ہے۔لگ تو عربی کی طرح رہی ہے۔''

''یہ اردو زبان ہے اور شاعری ہے۔'' اقبال نے بتایا۔

''کوئی سیاست وغیرہ تو نہیں ہے اس میں؟'' اس نے شکی نظروں سے اقبال

کو دیکھا۔

''سیاست؟ جی نہیں یہ صرف شاعری ہے۔''

''شاعری بھی تو سیاسی ہوتی ہے؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''آپ رکھ لیں۔ اگر چاہیں۔'' اقبال عاجز آ گیا۔

کچھ دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر سامان میں واپس رکھ دی۔ اقبال نے خدا کا شکر ادا کیا کہ غالب دوبارہ گرفتار ہونے سے بچ گئے۔

❍

(۱۲) میجر کرنل جنرل

12.1 مظلوم فلسطینی

کسی جرمن کمپنی نے یونیورسٹی کا نیا کیمپس بنایا تھا۔ جو میڈیٹریرین کے کنارے ایک بہت وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔ بہت شاندار عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ یونیورسٹی لائبریری کی کئی منزلہ عمارت تھی جہاں ہر موضوع پر ہر طرح کی کتابیں مہیا کی گئی تھیں۔ پرانا کیمپس شہر کے اندر تھا۔ جسے صرف دس سال پہلے ہی یہاں شفٹ کیا گیا تھا۔ بنغازی نہایت ہی خوبصورت شہر تھا۔ سمندر سے ایک بڑی نیچرل نہر شہر کے اندر آ کر ایک وسیع جھیل بناتی تھی۔ جھیل کے چاروں طرف بڑے بڑے لان تھے۔ ان کے پیچھے سرکلر چوڑی سڑکیں تھیں اور سڑکوں کے پیچھے دو فائیو اسٹار ہوٹلز سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے ریسٹورنٹ اور شاپنگ مالس تھے۔ نہر کے اوپر ایک آرک نما خوبصورت پل بنا ہوا تھا جس پر کھڑے ہو کر سمندر اور شہر دونوں کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ پورا شہر سمندر کے کنارے بسا ہوا تھا۔ شہر اور سمندر کے درمیان بیچیز کو نہایت عمدہ طریقے سے ڈولپ کیا گیا تھا۔ اوپن ایئر ریسٹورنٹ اور بہت سے ہوٹل سمندر کے کنارے کنارے نہایت حسین منظر پیش کرتے تھے۔ اہل شہر بھی بہت زندہ دل تھے۔ ہر چھٹی کے دن پورا شہر تقریباً خالی ہو جاتا تھا۔ سب لوگ اپنی فیملیز کے ساتھ بچوں کی سائیکلیں اور کھانے پینے کا سامان واسٹوو وغیرہ کے ساتھ سمندر کے کنارے ٹینٹ لگا کر بس سے جاتے تھے۔ عربی جبے اور عمامے زیادہ تر جمعہ کی نماز میں مساجد میں نظر آتے تھے جن میں نماز کے بعد تالے لگا دیئے جاتے تھے۔ باقی سب دن لوگ پینٹ شرٹ اور کوٹ وغیرہ پہنتے تھے۔ زیادہ تر لڑکیاں

اسکرٹ جینس ٹی شرٹ اوراسکارف پہنتی تھیں۔یونیورسٹی نوجوان لڑکے لڑکیوں کا خوبصورت مجموعہ تھی۔لڑکیوں کی تعدادلڑکوں سے زیادہ تھی جو پڑھائی لکھائی میں بھی لڑکوں سے آگے نظرآتی تھیں۔

کیمپس کے اندر ہی مین گیٹ کے داہنی طرف جرمن کمپنی کے آفیسرز وغیرہ کے چھوڑے ہوئے مکانات تھے۔جواب ٹیچرزکو رہنے کے لیے دئے گئے تھے۔اقبال بھی یہاں ایک کمرے کے چھوٹے سے گھر میں رہ رہا تھا۔ یہاں تقریباً پچاس پروفیسر رہتے تھے۔مختلف ممالک اور مختلف مضامین کے ماہرین۔سب سے زیادہ تعداد یہاں عراقیوں کی تھی جوگلف وار کے دوران اپنا ملک چھوڑ کر تلاش معاش میں مختلف ممالک میں نوکریاں کررہے تھے۔کئی لوگ سیریا، جارڈن، فلسطین، الجیریااور لبنان کے تھے۔آٹھ دس لوگ سوڈانی تھے اوراتنے ہی مصری بھی۔دو بنگلہ دیش سے تھے۔ہندوستان سے فقط اقبال تھا اور پاکستانی کوئی نہ تھا۔ایک پولینڈ سے آیا تھا۔غرض یہ کہ یہ جگہ بین الاقوامی مرکز سا بن گئی تھی۔خاص طور سے مسلم ممالک سے تعلق سے۔زیادہ تر لوگ تنہا ہی رہ رہے تھے۔صرف چندلوگ ہی اپنی فیملیز کے ساتھ تھے۔اس لیے بہت جلد سب میں رابطہ قائم ہوگیا ایک دوسرے کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا شروع ہوگیا۔اقبال کو بھی مختلف ممالک کے لوگوں سے دوستی کرنے کا خاصا شوق تھا۔لہٰذا بہت جلد وہ ان سب میں گھل مل گیا۔

اس کے ڈپارٹمنٹ میں کل دس لوگ تھے۔ایک لیبین ۳۵ سالہ خاتون جو پچھلے سال ملیشیا سے ایم ایس سی کرکے آئی تھی ڈپارٹمنٹ کی چیر پرسن تھی۔ہائی ہیل کے جوتے موزے اور ٹخنوں تک لمبا عبا پہنے وہ ہر وقت سر پر اسکارف باندھے رہتی تھی۔نہایت خوش گفتاراور ہمیشہ مسکراتے رہنا اس کا کام تھا۔دو بنگلہ دیشی تھے جوکئی سالوں سے وہاں کام کررہے تھے۔ ایک فلسطینی نوجوان تھا جو پچھلے ایک سال سے پڑھارہا تھا۔ دوعراقی اور باقی لیبین تھے۔ اقبال کے کلاس میں چالیس طلباء تھے جن میں آدھی لڑکیاں تھیں۔لڑکیوں کے روے میں ہچکچاہٹ اور بے جا شرم بالکل نہ تھی۔وہ برابری کے درجہ پر طلباء اور ٹیچرز سے تعلق رکھتی تھیں۔زیادہ تر لڑکیاں اسکرٹ شرٹ پہنتی تھیں اور کئی لمبے

عبا سے ڈھکی رہتی تھیں اور سر پر اسکارف باندھتی تھیں۔ تمام طلباء انتہائی ملنسار اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ ملاقات کے وقت گلے مل کر گالوں پر ہلکا سا بوسہ دینا ان کا خاص اسٹائل تھا۔ بلکہ پوری عرب دنیا میں ملاقات کا یہی طریقہ ہے لیکن مرد و عورتیں صرف ہاتھ ملانے پر اکتفا کرتے تھے۔ چیمبر میں آنے کے بعد بھی پہلے ہر طالب علم ٹیچر سے ہاتھ ملاتا تھا پھر اپنی پرابلم بتاتا تھا۔

سیاسی حالات یہاں ویسے ہی تھے جیسے کسی بھی مسلم ممالک میں بنوامیہ کے زمانے سے ہی رہے ہیں۔ شخصی آزادی کا تصور تک خواب وخیال تھا۔ بلکہ مسلم سماج سے یک قلم خارج کر دیا گیا تھا۔ جس شخص نے بھی تلوار کے زور پر حکومت حاصل کر لی بس وہ خدا بن بیٹھا۔ ملک کی ساری دولت اس کی، عوام اس کے غلام ہر مخالفت کرنے والے کا سرعام قتل، نہ صرف مخالفت کرنے والا قتل کر دیا گیا بلکہ مخالفت نظریات کا حامل بھی زندہ نہ بچا۔ لیبیا میں بھی یہی صورت حالت تھی۔ قدافی صاحب ملک کے بلاشرکت غیرے مالک تھے۔ تیل کی تمام دولت ان کے خاندان کی ملکیت تھی۔ وہی پورا بجٹ بناتے تھے وہی خرچ کرتے تھے۔ فوج پولیس سب ان کے ذاتی خدمت گار تھے جن کا کام صرف یہ تھا کہ ملک کا کوئی شخص ان کی مخالفت میں سوچ بھی نہ سکے۔ ان کے خاص باڈی گارڈز میں صرف لڑکیاں رکھی جاتی تھیں۔ جن کو ہر سال بدل دیا جاتا تھا۔ صرف انہیں مردوں کی حاضری ممکن تھی جن کو وہ خود یاد کریں۔ حکومت کا اہم ترین شعبہ اندرونی جاسوسی کا شعبہ تھا۔ جس کا کام تمام لوگوں کی فائلیں بنانا اور ان کے نظریات وخیالات کا حساب کتاب رکھنا تھا۔ ہر تیسرا شخص حکومت کا مخبر تھا۔ لہٰذا تمام لوگ ذاتی گفتگو میں بھی اظہار وفاداری کرنا نہیں بھولتے تھے۔ صرف خاص وفادار ہی اہم عہدوں پر تعینات کئے جاتے تھے۔ ورنہ وفاداری تو پہلی شرط تھی ہر نوکری کے لیے۔ ہر چوراہے، دفتر، کلاس روم اور یونیورسٹی کے مین گیٹ کے علاوہ ہر ڈپارٹمنٹ کے دروازے پر وہ مسکراتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ملک میں کسی طرح کا اخبار یا مضمون نہیں چھپ سکتا تھا بس وہی جس کی اجازت حکومت سے حاصل ہو۔ ٹیلی ویژن ہر وقت ان کی مدح میں گیت اور شاعری نشر کرتا رہتا تھا۔ خبروں

میں زیادہ تر موصوف ہی چھائے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ مساجد میں خطبہ بھی ان کا پڑھا جاتا تھا۔ سارے امام ان کے ذاتی نوکر تھے۔ ان کی کتاب ''گرین بک'' ہر جگہ دستیاب تھی بالکل مفت اور ہر گھر میں پائی جاتی تھی۔ ہر لائبریری میں موجود تھی۔ اقبال کا پہلے یہ خیال تھا کہ کسی سے یہ کتاب لکھوائی گئی ہوگی اور اپنے نام سے شائع کرادی مگر پڑھنے اور نادر نظریات جاننے کے بعد اندازہ ہوا کہ ضرور موصوف ہی نے یہ کتابچہ لکھا ہوگا کہ حکومت اور طاقت کے نشے میں چور مدہوش انسان ہی ایسے نادر خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ اقبال کے لیے ایسے ماحول میں زندہ رہنا بہت مشکل تھا۔ ایک بار پھر مسلم ملک میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ وہی شخصی حکومت کا ظالم نظام۔ ہندوستان کے برٹش جمہوری نظام میں پلنے بڑھنے اور پوری طرح سماجی وسیاسی زندگی گزارنے کے بعد قلب ونظر کی جیل میں زندگی کرنا آسان نہ تھا۔ صرف کلاس میں پڑھایئے اور گھر آ کر سو جایئے۔ اقبال اپنے چیمبر میں بیٹھا اکثر خیالات میں گم رہتا تھا۔

''سر میں آ سکتا ہوں۔'' اقبال نے سر اٹھا کر دیکھا تو اشرف، فلسطینی ٹیچر اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

''بالکل تشریف لائیں۔'' اقبال نے اٹھ کر اشرف سے ہاتھ ملایا۔

''کیسا لگ رہا ہے آپ کو لیبیا۔'' اس نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

''بس ٹھیک ہے تم سناؤ کیا حال ہے۔''

''ہم تو عجب مشکل میں پھنس گئے ہیں۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''ہم سے مطلب؟''

''فلسطینی جو بچ گئے ہیں۔''

''اب نیا کیا ہوا؟''

''کل ہی آرڈر آیا ہے کہ جتنے فلسطینی طلبا اور اساتذہ لیبیا میں ہیں دو مہینے کے اندر ملک چھوڑ دیں۔'' اس نے پریشان ہو کر بتایا۔

''اس کی کیا لاجک ہے؟''

''لا جک! سر آپ اسلامی دنیا میں ہیں یہاں اس کا کیا کام؟ لا جک تو غزالی اپنے ساتھ لے گئے۔''

''مگر پھر بھی؟''

''حکمرانوں کی مرضی ہی قانون ہے، انصاف ہے حتیٰ کہ اسلام بھی وہی ہے۔ حکم صادر ہو چکا ہے نفاذ ہونا ہی ہے۔ آپ میری اتنی مدد کر دیں کہ علی گڑھ میں پی ایچ ڈی میں داخلہ کرا دیں۔''

''پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن کچھ مشکل نہیں ہے میرے کئی پروفیسر دوست ہیں آسانی سے ہو جائے گا مگر؟'' اقبال نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر کیا؟''

''دو مہینہ میں تو نہیں ہوسکتا چند مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ سال میں دو بار پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن ہوتا ہے۔''

''یہ تو مشکل ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''چلئے داخلہ ہو جائے، چار مہینے کہیں گزار لوں گا۔''

''کہاں گزار لو گے۔ تم کیا اکیلے ہو؟''

''نہیں دو بہنیں ہیں۔ بوڑھے والد ہیں۔ والدہ کا انتقال بہت پہلے ہو گیا تھا۔''

''پھر کیا کرو گے؟''

''کیا کریں گے۔ نومینز لینڈ میں ہی رہیں گے۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اقبال اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''سر آپ پریشان نہ ہوں۔ شاید ہم فلسطینیوں کی تقدیر ہی میں در در کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں پانچ سال کا تھا۔ ہمارا گاؤں غزہ پٹی میں تھا۔ بچوں کے ساتھ میں میدان میں کھیل رہا تھا کہ کھیتوں کی طرف سے کسان بھاگتے ہوئے آئے اور بتایا کہ اسرائیلی فوجوں نے قریب ہی ڈیرا ڈال دیا ہے۔ گاؤں کے سارے لوگ جمع ہو گئے اور طے ہوا کہ کل تک گاؤں خالی کر دینا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا جب

اسرائیلی جہاز بمباری کرنے آتے تھے، مجھے تو بہت مزہ آتا تھا۔ ٹھائیں ٹھائیں کی آوازیں۔ ہم بچوں نے اس کا کھیل بنالیا تھا۔ دوسرے ہی دن جس کو جو سواری ملی، گھوڑوں، اونٹوں، گھوڑا گاڑیوں اور گدھوں پر جتنا بھی سامان لیا جا سکتا تھا لے کر قافلہ چلا۔ اسرائیلی فوجیوں نے کچھ نہیں کہا بس چند نوجوانوں کو اتروا کر لے گئے۔ کئی دن کے سفر کے بعد ہم لوگ جارڈن پہنچے۔ وہاں ریلیف کیمپ میں رہنے لگے۔ وہیں ایک اسکول میں میرا داخلہ کرادیا گیا۔ سال گزرتے چلے گئے ایک دن جارڈن کی فوج نے بھی فلسطینیوں پر حملہ کیا اور ہم لوگوں کو جارڈن بھی چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔ میرے والدین یو این ریفیو جی کارڈ لیے کسی طرح مصر پہنچے۔ پھر ایک دن وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور اب دس سال سے لیبیا میں رہ رہے ہیں۔ یہیں سے میں نے ایم ایس سی کیا اور ابھی چند مہینے پہلے یہ نوکری ملی تھی کہ یہاں سے بھی جانے کا حکم آ گیا۔ سارا مسئلہ یہ ہے کہ قدافی صاحب......'' یہ کہہ کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گیلری میں کوئی جا رہا تھا۔

''کیوں کیا ہوا؟''

''آپ کے پاس بیٹھنے میں یہی مشکل ہے۔ کسی دن میں بے موت مارا جاؤں گا۔ یہاں کوئی انکا نام اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا۔'' اس کی گھبراہٹ حیرت انگیز تھی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب صاف ہے سیاسی ذکر ناقابل معافی جرم ہے۔ اگر کوئی سن لے تو پھر دوسرے ہی دن سیکورٹی والے اٹھا کر لے جائیں گے۔''

''پھر؟''

''پھر دنیا کی کوئی طاقت پتہ نہیں لگا سکتی کہ کہاں گئے۔''

''حیرت ہے۔'' اقبال نے اٹھ کر دروازہ پوری طرح بند کر دیا۔ ''اب کہو آرام سے۔''

''کیمپ ڈیوڈ معاہدے سے کرنل صاحب بہت ناراض ہیں اور ان کے جرم کی سزا ہمیں دی جارہی ہے۔ پہلے طلباء اور ٹیچرز کو رہنے کی اجازت تھی مگر اب وہ بھی ختم کر دی گئی

ہے۔میرا ایک دوست انجینئرنگ فائنل ایئر میں ہے اسے بھی امتحان چھوڑ کر جانا ہوگا۔''

''پھراس کی ڈگری کا کیا ہوگا؟''اقبال نے حیرت سے پوچھا۔

''ڈگری اب کہاں سے ہوگی۔''

''مگر یہ تو بھیانک جرم ہے کسی نوجوان کا کیریئر چھین لیناحتیٰ کہ ڈگری تک۔''

''مگر کوئی لاجک بھی تو ہونی چاہیے!''اقبال نے پھر زور دیا۔

''سر لاجک اور اسلامی دنیا میں!''اشرف نے کھڑے ہوکر کہا اور اقبال کے پیچھے سمندر کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول کر کھڑا ہوگیا۔

''ہاں تم کہہ رہے تھے کہ لاجک غزالی اپنے ساتھ لے گئے۔''اقبال بھی اس کے برابر آکر سمندر دیکھنے لگا۔

''دور سمندر کے اوپر جو دھند نظر آرہی ہے۔بس ایسی ہی دھند تمام اہل اسلام کے دل و دماغ اور آنکھوں پر حجت الاسلام ہزار سال پہلے ڈال گئے۔جسے تبرک سمجھ کر مسلمان اپنے چہرے پر ملتا رہتا ہے۔جو ذرا آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔پوری اسلامی دنیا اس کی آنکھیں زبردستی بند کرادیتی ہے۔قال اللہ وقال الرسول کی اتنی آوازیں اس کے کانوں میں ڈالی جاتی ہیں کہ اسے بھی اسی میں خیریت نظر آتی ہے کہ وہ بھی اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کرلے۔''

''مگر قال اللہ وقال الرسول میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟''اقبال نے سوالکیا۔

''مجھے بالکل اعتراض نہیں لیکن اگر کوئی قال اللہ سے یہ سمجھائے کہ اپنی عقل بالکل استعمال مت کرو۔جو علماء فرما گئے وہی حرف آخر ہے۔کوئی سوال مت کرو کہ حضرت امام جو تشریح فرما گئے وہی حرف آخر ہے۔یہ تو ایسا ہوا جیسے علماء اوران کی تصانیف خدانخواستہ رسول اورقرآن کے برابر ہوگئیں۔سیاسی اغراض پورا کرنے کے لیے احادیث وضع کی گئیں اورمخالفین کا منہ بند کرنے کے لیے استعمال کی گئیں۔''

''احادیث بنائی گئیں؟''

''جی بالکل ثابت ہے۔امام بخاری ومسلم نے کئی لاکھ احادیث جمع کیں اور ریسرچ

وتحقیق کے بعد صرف چند ہزار احادیث کو باقی رکھا ان میں بھی صحیح اور موضوع کی میزان قائم کی۔ مطلب صاف ہے کہ لاکھوں جھوٹی احادیث لوگ بیان کر رہے تھے۔ یہ حضرات اگر ریسرچ نہ کرتے تو اب تک اور کروڑوں احادیث بیان کر دی گئی ہوتیں۔ ہر گھر میں ایک فقیہ ہوتا اور ہر ایک کا اپنا اسلام۔ اب بھی کون کہہ سکتا ہے کہ رائج احادیث میں کتنی صحیح ہیں اور کتنی گڑھی گئی ہیں۔''

''یہ بات تو صحیح کہہ رہے ہو تم مگر تمہارا موضوع تو سائنس ہے۔ اسلام کا شوق کب سے پیدا ہوا۔'' اقبال نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں ہائی اسکول کر رہا تھا۔ کہ علماء کے دو گروپ میں زور سے آمین کہنے کے اوپر بڑا فساد کھڑا ہو گیا کئی لوگ زخمی بھی ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ اگر اتنی سی بات لے کر مسلمان آپس میں جھگڑا کر سکتے ہیں تو پھر ان کی تمام پرورش ہی غلط ماحول میں ہوئی ہے اور اسلام کو بالکل غلط پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا میں نے خود قرآن و احادیث اور بڑے بڑے اماموں کے نظریات کو پڑھنا شروع کیا۔ کئی سال لگانے کے بعد پتہ چلا کہ محض لفاظی ہے۔ احادیث اور قرآنی آیات سے غیر ضروری مطالب نکال کر اپنے اپنے مریدین اور گروپ بنانے کی خواہش نے یہ رنگ دکھایا۔ عقل کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا گیا اور سوال کرنا بہت بڑا گناہ۔ سوالات انسان کو الحاد کی طرف لے جاتے ہیں۔ لہٰذا عقل سے پیدل مسلمان کو اندھا بہرا بنا کر لوگ اس سے فٹ بال کھیلتے رہے۔ سوال وہ کر نہیں سکتا۔ لا جک وہ استعمال نہیں کر سکتا۔ لہٰذا مسلمان دنیا کی تمام قوموں کے لیے محض فٹ بال ہو کر رہ گیا۔''

''بالکل صحیح نتیجہ نکالا تم نے۔'' اقبال نے سوچتے ہوئے تائید کی۔

''یہ جو آپ اسلامی ممالک میں سیاسی نظام دیکھ رہے ہیں۔ نظام کہنا تو بالکل غلط ہے۔ وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ بس ایک ماقبل تاریخ کا بھیانک منظر ہے۔ حکومت کیسے قائم ہوگی۔ کیا اس کا فلسفہ ہوگا۔ ایسی کسی بحث میں کوئی امام و فلسفی آج تک نہ پڑا۔ بس نماز روزہ حج زکوٰۃ کے مسائل عقائد کی درستی۔ پورے ڈیڑھ ہزار سال سے یہی

لکھاجارہا ہے اور یہی بیان کیاجارہا ہے۔علم بس اتنا ہے جوقرآن وحدیث سے پتا چلے۔عمل صرف نماز روزے کا نام ہے۔کہتے ہیں کہ دنیا کے سارےعلوم قرآن میں ہیں۔بہت بنیادی بات ہے کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے۔اس میں ایٹم بم بنانے کا فارمولا کہاں ہے؟ موبائل بنانے کا فارمولہ کہاں ہے؟ حکومت چلانے کے لیے ہزاروں قوانین چاہئیں۔چند جرائم کی سزا کے علاوہ قرآن میں صرف ہدایت ہے۔اس کی روشنی میں عقل استعمال کر کے آگے بڑھا جائے یہی انسانی عقل کا امتحان ہے۔''

''بات تمہاری بالکل درست ہے۔''اقبال سوچنے لگا کہ بیت المقدس سے نکالے جانے والے مسلمان کو اتنا تو سوچنا ہی چاہیے۔''اچھا پھر کاغذات کب لا رہے ہو؟ایسا کرو کل آجاؤ یہیں بیٹھ کر لکھ لیں گے۔''

''میں نے کئی جگہ اور درخواستیں بھیج رکھی ہیں۔ریسرچ ٹاپک پر بھی آؤٹ لائن لکھ رکھی ہے۔بس کل لے آؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔اس دوران کسی وکیل سے مل کر عدالت سے اپنے نکالے جانے کے خلاف اسٹے حاصل کرلو۔''اقبال نے مشورہ دیا۔

''سر،آپ بالکل نہیں جانتے۔حکومت کے حکم کے خلاف سوچنا ہی ناقابل معافی جرم ہے۔عدالت کا جانے کا تصور بھی کیا تو گردن دھڑ سے الگ نظر آئے گی۔''اشرف نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

''میں بار بار بھول جاتا ہوں کہ اسلامی دنیا میں ہوں۔''اقبال نے سر پکڑ کر اعتراف کیا۔وہ اس کی گفتگو سے نہایت ڈسٹرب ہوگیا اور اپنے چیمبر سے نکل کر یونہی کیمپس میں گھومنے لگا۔کچھ دیر بعد وہ ڈاکٹر شمس الحق کے چیمبر کے باہر کھڑا تھا۔شمس الحق نے کافی سال پہلے علی گڑھ سے فزکس میں ایم ایس سی کیا تھا اور بمبئی آئی آئی ٹی سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پچھلے دس سال سے بنغازی یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔صرف علی گڑھ کے تعلق کی بنیاد پر مکان ملنے تک اقبال ایک مہینہ ان کے گھر رہا تھا۔اس سے پہلے وہ ان کو جانتا تک نہ تھا۔

''کہیے کب آئے؟'' شمس الحق نے پیچھے سے آتے ہوئے کہا۔ وہ کلاس لے کر ڈسٹر اور رجسٹر ہاتھ میں لیے آرہے تھے۔

''بس ابھی آیا۔'' اقبال نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''آیئے بیٹھیں۔ میں ذرا چائے کے لیے کہہ کر آتا ہوں۔ اور ہاتھ تو آپ نے صاف کر ہی دیئے۔'' انھوں نے ہنستے ہوئے چیمبر کھول دیا۔ تھوڑی دیر بعد چائے پیتے ہوئے انھوں نے پوچھا۔

''اور کیا ہورہا ہے۔''

''بس جی رہے ہیں۔''

''خوش رہو۔ زیادہ سوچا مت کرو۔ پہلے سال ہر ایک پر یہی گزرتی ہے۔ رفتہ رفتہ عادت پڑ جاتی ہے۔ میں بھی صرف ایک سال کے لیے آیا تھا۔ اب پورے دس سال گزر گئے ہیں اور آرام سے ہوں۔'' انھوں نے سمجھایا چاہا۔

''کوشش تو کر رہا ہوں مگر یہ دماغ چلتا ہی رہتا ہے۔''

''موسم دیکھو کتنا اچھا ہے ہر وقت کیسی خوشگوار ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی ہے میڈیٹرینین کلائمٹ ہے۔ کوئی ہیومڈٹی نہیں۔ بس کبھی کبھی مغرب سے گرم ہوائیں چلتی ہیں وہ بھی ایک یا دو دن بس۔ پھر وہی سمندری ٹھنڈی ہوا۔ اچھا خاصا پیسہ ملتا ہے۔ انڈیا میں کہاں بچت۔ کھانے کو ہر عمدہ خالص چیز میسر ہے۔ وہاں تو خالص کا تصور تک نہیں۔ دو چار سال رہوگے، گھر بنا لوگے، اور کیا چاہیے۔''

''ابھی ابھی اشرف آیا تھا۔'' اقبال نے بتایا۔

''کون اشرف، وہ فلسطینی؟''

''ہاں فلسطینی، کہہ رہا تھا کہ ہم سب کو دو مہینے کے اندر لیبیا چھوڑ دینے کا حکم آیا ہے میں نے کہ دیا کہ عدالت سے اسٹے لے لو۔'' اقبال نے بتایا۔

''کیا کہا؟ عدالت سے اسٹے؟ کیا پتہ وہ بھی مخبر ہو۔ یہاں ہر دوسرا شخص انفارمر ہے۔ تم مجھے بھی مرواؤ گے؟ انھوں نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا'' آؤ میرے ساتھ آؤ۔

ایک چیز دکھاؤں تمہیں۔ شاید سمجھ جاؤ۔ کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ ہر طرح سمجھا کر دیکھ لیا۔ ہم چار پانچ ہی تو علی گڑھ کے لوگ ہیں تم سب کو مرواؤ گے۔ سب نکال دیئے جائیں گے تمہاری وجہ سے۔'' ان کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ڈپارٹمنٹ سے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر افضال انصاری بھی مل گئے۔ وہ بھی فزکس ڈپارٹمنٹ میں استاد تھے اور علی گڑھ سے چھٹی لے کر آئے ہوئے تھے۔

''افضال صاحب! ان کی سنئے؟'' شمس الحق نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''کیا کوئی نئی بات ہوگئی۔'' انھوں نے اقبال سے ہاتھ ملا کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہر روز نئی بات ہے۔ بس تعلقات ختم کرنے پڑیں گے۔'' شمس الحق نے غصہ سے کہا۔

''ہوا کیا؟''

''وہ فلسطینی اشرف ہے نا ان کے ڈپارٹمنٹ میں۔ اس کو بھائی مشورہ دے کر آئے ہیں کہ عدالت سے نکالے جانے کے خلاف اسٹے لے لو۔''

''یہ کبھی نہ سدھریں گے۔'' افضال انصاری نے بھی پریشان ہو کر کہا۔'' وہاں بہت سے عرب دوست بھی ان کو مل گئے ہیں۔ بس ہر وقت ان سے دوستی چلتی رہتی ہے۔ دنیا جہان کی سیاست اور مذہب پر گفتگو ہوتی ہے۔ کچھ عراقی، مصری اور سوڈانی ہیں۔ سب اپنی فیملیز کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ اکیلے رہ رہے ہیں۔ شام ہوئی اور یہ سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ تو شکر ہے کہ کوئی لیبین وہاں نہیں رہتا ورنہ اب تک تو علی گڑھ میں نظر آتے۔''

''آیئے آپ بھی چلیں۔'' شمس الحق نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کہاں؟''

''بس اسٹیڈیم تک۔''

چند منٹ میں ہی وہ لوگ اسٹیڈیم پہنچ گئے۔ یہ ایک بہت بڑا فٹ بال گراؤنڈ تھا۔ چاروں طرف تماشائیوں کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ وہ لوگ چلتے ہوئے بیچ میدان میں پہنچ گئے جہاں ایک افتادہ سا اونچا پلیٹ فارم بنا ہوا تھا۔

''میرا پہلا ہی سال تھا۔'' شمس الحق نے کہنا شروع کیا۔'' اسی جگہ جہاں ہم کھڑے

ہیں دو ٹیچرز اور تین طلباء کو پھانسی دی گئی تھی۔ان کی لاشیں کئی دن تک یہاں لٹکی رہی تھیں۔یونیورسی کے ہر اسٹوڈنٹ اور ملازم کی یہاں حاضری ضروری تھی۔کسی کی مجال نہ تھی کہ غیر حاضر ہو جائے۔پورا اسٹیڈیم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا سیکڑوں سیکورٹی والے مجمع کی طرف رائفلیں تانے کھڑے تھے۔پورا منظر لائیو ٹیلی کاسٹ کیا جا رہا تھا۔ٹیچرز اور طلباء کو یہاں لایا گیا۔کالے کپڑے پہنائے گئے اور سب کے سامنے یہاں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ طلباء نے انتظامیہ کے سامنے کچھ مطالبات رکھے تھے۔بات بڑھتی گئی۔طلباء کا جوش بڑھتا گیا۔بس اچانک ایک دن لیڈرز کو گرفتار کرلیا گیا اور ان کے ٹیچر سرپرستوں کو بھی۔سیکڑوں طلباء کو یونیورسٹی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا گیا۔اتنی بھیانک حقیقت ہے دنیائے اسلام کی۔یہاں بس یہی اصول سدا سے رائج رہا ہے۔آزادیٔ رائے، ڈبیٹ، ڈسکشن، مشورہ، یہ سب الفاظ یہاں کی کسی ڈکشنری میں نہیں پائے جاتے اور جو یہ چاہتا ہے اس کے لیے زمین کے اوپر نہیں زیر زمین مسکن بنا دیا جاتا ہے اور صدیوں تک بنایا جاتا رہے گا۔آیئے اب چلیں۔'' یہ کہتے ہوئے شمس الحق چبوترے سے اتر آئے۔

12.2 ہمشیرۂ ہٹلر

وقت گزرتا گیا سالانہ امتحان کا زمانہ آ گیا۔اقبال کے دل و ماغ پر ہر وقت خوف چھایا رہتا۔اس نے زیادہ تر عرب دوستوں سے تعلقات ختم کر دیئے۔وہ خود اپنے ماحول کے ستائے ہوئے تھے۔سوائے افسوس کرنے اور غم اٹھانے کے کوئی فائدہ نہ تھا۔ایک دن بازار میں اسے بصرہ یونیورسٹی کا ایک عراقی دوست نظر آ گیا۔دونوں خوب جم کر گلے ملے۔اقبال کو بالکل امید نہ تھی کہ کبھی نوفل سے پھر ملاقات ہوگی۔نوفل بصرہ یونیورسٹی میں کیمسٹری پڑھاتا تھا۔دونوں پڑوس ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے خاصے قریب ہو گئے تھے۔

''یہاں کیسے؟'' اقبال نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''کتنی عجیب بات ہے۔اتنے سالوں کے بعد ہم پھر مل گئے۔'' اس کی خوشی بھی قابل دید تھی۔

''مگرتم لیبیا میں کب سے ہو؟'' اقبال نے پوچھا۔

''بس ایک ہی مہینہ ہوا ہے۔یہیں میڈیکل کالج میں جگہ مل گئی ہے۔اسی کیمپس میں رہتا ہوں۔اورتم؟'' نوفل نے سوال کیا۔

''میں بھی ایک سال سے یہاں ہوں۔سائنس فیکلٹی میں۔'' اقبال نے بتایا۔

''اور رہتے کہاں ہو؟''

''نئے کیمپس میں مکان دیا ہے اور بھی کئی عراقی وہاں رہتے ہیں۔''

''ہم لوگ بس کھڑے ہی رہیں گے؟ آؤ پہلے میں تمہیں اپنی بیوی سے ملواؤں۔''

وہ اقبال کا ہاتھ پکڑ کر برابر کے جنرل اسٹور میں لے گیا جہاں اس کی بیوی اپنے تین چار سال کے لڑکے کو لیے کھڑی تھی۔

''یہ میرا بیٹا ہے اور یہ ہیں میری محترمہ۔'' اقبال نے اس کی بیوی سے ہاتھ ملایا۔وہ حیران ہو رہی تھی۔

''حیران نہ ہو۔یہ میرے بہت پرانے دوست ہیں، ہندوستانی ہیں۔بصرہ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور اب یہاں پڑھا رہے ہیں، کتنے سال کے بعد ہم ملے ہیں۔''

اس نے خوشی خوشی وفا کو بتایا۔اس کی بیوی کا نام وفا تھا وہ تقریباً ۳۵ سال کی خوبصورت عورت تھی، اس نے اسکرٹ اور شرٹ پہن رکھی تھی۔اقبال نے اس کے بیٹے پرویز کو اٹھا کر پیار کیا۔''بہت پیارا بیٹا ہے۔''

''آؤ چلو کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھتے ہیں، وہیں باتیں ہوں گی۔'' نوفل نے اپنی بیوی سے کہا۔

''چلتے ہیں پہلے کچھ خریداری کر لیں۔'' وفا سامان خریدنے لگی۔اقبال نے دیکھا کہ انڈوں کی کریٹ خریدتے وقت اس کی آنکھیں چھلک آئیں۔

''یہ رونے کیوں لگیں۔'' اقبال نے آہستہ سے نوفل سے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بیٹھ کر بتائیں گے۔ بس اتنا سمجھ لو کہ ہمارا بیٹا زندگی میں پہلی بار انڈے کی شکل دیکھ رہا ہے۔'' نوفل نے گہری سانس لیتے ہوئے بتایا۔

''پہلی بار؟'' اقبال اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''ہاں اب بصرہ میں انڈے صرف لکھ پتی خرید سکتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا؟'' اقبال حیران رہ گیا۔

''مسلسل جنگوں نے ہمیں بالکل تباہ کر دیا۔ پہلے آٹھ سال ایران سے جنگ چلتی رہی۔ اس کے بعد صدام حسین نے کویت پر قبضہ کر لیا پھر دنیا کے چھبیس ملکوں نے مل کر ہم پر حملہ کر دیا۔'' نوفل نے بتایا شروع کی۔

''گلف وار؟''

''جی گلف وار۔ تمام عرب ورلڈ اور پوری دنیا نے مل کر عراق کو تباہ کر دیا۔ غلطی حالانکہ صدام حسین کی ہی تھی۔ مگر امریکہ نے پہلے صدام کو ہری جھنڈی دکھائی۔ اور جب اس نے کویت پر قبضہ کر لیا تو حملہ کر دیا۔ پورا کویت اب امریکہ کی ملکیت بن گیا ہے۔''

''ہاں یہ تو ہوا۔'' اقبال نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''تم نے تو دیکھی ہی ہے وہاں کی زندگی۔ ایران عراق جنگ کے باوجود ہم سب کتنے مطمئن اور خوش رہتے تھے۔ پیسے کی کیا فراوانی تھی۔ عرب دنیا میں سب سے طاقتور اور بڑی فوج ہماری تھی۔ اسرائیل کو صرف ہمیں سے خطرہ تھا۔ لہٰذا ہمارا ملک ہمارے لوگ سب فقیر بنا دیئے گئے۔ تمہارے زمانے میں ایک دینار میں تین ڈالر ملتے تھے اور آج کل یہ حالت ہے کہ ایک ڈالر میں دو ہزار دینار ملتے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟ ایک ڈالر میں دو ہزار دینار؟'' اقبال کا منہ مارے حیرت کے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''اب نہ وہاں روٹی ہے اور نہ گوشت۔ بس کسی طرح لوگ جی رہے ہیں۔ یو این او کے ذریعے ہی ہم کچھ تیل بیچ سکتے ہیں۔ یعنی یو این ہمیں روٹی کھلائے گی تو ہم کھائیں گے۔''

''یہ تو پھر سیاسی لڑائی کہاں رہی، یہ تو پوری عراقی عوام کو سزا دی جارہی ہے۔''

''ظاہر سی بات ہے۔دوائیں تک میسر نہیں ہیں۔لاکھوں بچے صرف بھوک اوردوائیں نہ ملنے سے مر چکے ہیں۔''نوفل نے پرویز کو گود میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ایسے بھیانک حالات ہیں! جنت کو دوزخ بنا دیا، یواین او نے۔''

''ان سے پوچھو جو جنت میں پیدا ہوئے اوردوزخ میں زندگی کاٹ رہے ہیں۔''نوفل کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''مجھے یاد آیا۔ابھی کچھ سال پہلے امریکہ کی یہودی فارن منسٹر البرائٹ سے پوچھا گیا تھا کہ کئی ملین بچے صرف دواؤں اور کھانے کی کمی سے عراق میں مر گئے ہیں اس کے جواب پر تو ہٹلر بھی شرمندہ ہوکر رہ گیا ہوگا۔اس نے جواب دیا تھا کہ یہ بہت چھوٹی قیمت ہے امن کے لیے۔''

''وہ تو ہٹلر کی بڑی بہن ہے۔مگر ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ کوئی ان سانحات کو سلیقے سے لکھ کر پیش کرنے والا تک نہیں وہ ابھی بھی ہر سال جرمنی میں قتل عام کی برسی مناتے ہیں۔'' نوفل نے افسوس جتایا۔

''ریسرچ اور تحقیق کی کوئی روایت ہمارے یہاں نہیں ہے۔''اقبال نے بھی گریہ کیا۔

''اب چلیئے نا، بیٹے کو نیند آرہی ہے۔''وفا نے نوفل سے بچے کو لیتے ہوئے کہا۔

''مگر ابھی تک کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ایسا کرتے ہیں کہ یہیں کولڈ ڈرنک منگاتے ہیں۔''

نوفل نے کوک کا آڑڈر دیا۔کچھ دیر بعد پھر ملنے کا وعدہ ہوا،ایڈریس دیے گئے اور رخصت ہو گئے۔

☆

''عراق پر حملہ ہونا ہی تھا۔''اقبال نے کہا۔

''کیوں ہونا تھا؟ صدام حسین ایک دم سیکولر آدمی ہیں۔تم تو رہے ہو عراق میں وہاں کی پوری سوسائٹی قدامت پرستی سے بالکل دور رہی ہے۔بن لادن کے نیٹ ورک سے صدام حسین یا کسی بھی عراقی کے تعلق ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' نوفل نے سب کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ لوگ اس وقت ڈاکٹر المالکی کے گھر میں کھانا کھا کر چائے پی رہے تھے۔ڈاکٹر مالکی کا تعلق بغداد سے تھا اور وہ کئی سال سے بنغازی یونیورسٹی میں سیاسیات پڑھا رہے تھے کسی زمانے میں لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی تھی۔آج انھوں نے اپنے کئی دوستوں کو کھانے پر بلا رکھا تھا۔جن میں مصر کے ڈاکٹر فواد تھے جو قاہرہ یونیورسٹی سے ڈیپوٹیشن پر کیمسٹری پڑھانے آئے ہوئے تھے۔ایک بالکل نوجوان تقریباً ۲۵ سال کا الجزئین احمد نجاد تھا جو اسی سال پیرس سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرس کر کے آیا تھا انجینئر نگ کالج میں استاد تھا۔بہت ذہین اور اسمارٹ لڑکا تھا۔دنیا بھر کی انتہا پسند تنظیموں کا پوری طرح سے حامی تھا۔خاص طور سے الجیریا کی اسلامی جماعتوں سے اسے بہت ہمدردی تھی۔ایک معمر ڈاکٹر اسماعیل دمشق سے آئے تھے۔وہ ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں کے لیے سماجیات پر لیکچرز دینے بنغازی یونیورسٹی آئے ہوئے تھے۔نوفل کے علاوہ سب یونیورسٹی کیمپس میں رہتے تھے۔سبھی لوگ تنہا رہ رہے تھے لہٰذا آپس میں خوب دوستی اور تعلقات ہوگئے تھے۔شام کو سب لوگ مل بیٹھتے تھے اس طرح سب کا وقت اچھا خاصا گزر رہا تھا کسی طرح کی مخبری کا ڈر بالکل نہ تھا لہٰذا کھل کر ہر موضوع پر گفتگو ہوتی تھی۔اس وقت بھی القاعدہ کے امریکہ پر حملے کے بعد کی صورت حال پر کافی دیر سے بحث سی ہو رہی تھی۔

''مگر کچھ بھی کہئے۔ان واقعات نے دنیا بدل دی۔چاہے افغانستان کے بعد امریکہ عراق پر بھی قبضہ کر لے۔مگر گیارہ ستمبر کے بعد کی اور پہلے کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' احمد نے تجزیہ پیش کیا۔

''وہ کیسے؟'' اقبال نے سوال کیا۔

''وہ ایسے کہ پرجوش نہتے نوجوان کے ہاتھ ایک ہتھیار آ گیا ہے پوری اسلامی دنیا صدیوں سے کسی بھی ہتھیار سے محروم تھی۔لہٰذا ہر جنگ میں ان کو شکست ہوتی گئی۔صدیوں بعد پہلی بار کوئی ایسا نظریہ نکل کرآیا ہے۔جس کی کوئی کاٹ مغربی دنیا کے پاس نہیں ہے۔چندنوجوانوں کا کوئی بھی گروپ بن لادن کے نام پرجمع ہوکراپنی کارروائی کرسکتا ہے۔''

''تم بہت خوش ہو؟''المالکی نے پوچھا۔

''خوش تو خیر ہم جب بھی تھے جب تمام فلسطینیوں کو اجاڑکر اسرائیل بنادیا گیا۔خوش تو ہم اب بھی ہیں جب صرف بغداد پراتنے بم گرائے جارہے ہیں۔ جتنے دونوں ورلڈ وار میں نہیں گرائے گئے۔ہماری خوشیاں تو انگنت ہیں۔صرف دوٹاورز کا صدمہ ان سے برداشت نہ ہوسکا۔ایک ہمارادل دیکھیں کہ کتنے زخموں کو پھولوں کی طرح سہلارہے ہیں۔''احمد نے لمبی تقریرکرڈالی۔وہ کافی جذباتی ہوگیا تھا۔

''مگراس کا نتیجہ کیا نکلے گا کبھی سوچا ہے؟''ڈاکٹرفواد نے پوچھا۔

''صدیوں سے مسلمان غلامی کی زندگی جی رہا ہے۔اس سے خراب نتیجہ اور کیا نکلے گا؟مگر ہاں تمام دنیااب سنجیدگی سے ہمارے مسائل پربھی غورکرنے پرمجبورہوگی۔''

''وہ کیوں؟''اقبال نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ اب اس میں ان کا بھی مفادوابستہ ہے۔خطرہ اب ان کے سرپربھی منڈلارہا ہے اورخطرہ بھی ایسا کہ پتہ نہیں کہ کدھر سے موت اور بربادی آن پکڑے عذاب الٰہی کی طرح۔دنیا میں کتنی جگہ تباہی لاچکے ہیں اب مظلوم لوگ بھی۔لہٰذا ظالم کا جاگنا بھی ضروری ہے۔وہ اس لیے کہ ان میں ایک بڑا طبقہ دانشوروں کا بھی ہے۔ان کے سماج میں ہرمسئلہ پرکھل کرڈبیٹ ہوتی ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔وہ کوئی اسلامی دنیا تو ہے نہیں کہ حکم آقا اور تربیت مرشد ہی حرف آخر ہے۔''اقبال نے تائیدکی۔

''ڈبیٹ ہی توان کا سب سے بڑاہتھیار ہے۔ہرمسئلہ پرہرپہلو سے ہزارہا مضامین

شائع ہوتے ہیں۔ کتنے سمینار کرائے جاتے ہیں۔ پھر ٹی وی وغیرہ پر کھلے عام مباحثہ ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ پبلک بالکل صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتی ہے اور حکومت بھی عوامی رائے کو ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔'' المالکی نے بھی اپنی رائے دی۔

''احمد نے بالکل ٹھیک کہا۔ مغربی ممالک میں دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ ہے جس کا کام ہی صرف ریسرچ اور تحقیق ہے۔'' فواد نے احمد کی تائید کی۔

''اب یہی دیکھ لیجئے کہ اسلامیات پر کتنی زبردست ڈبیٹ تمام مغربی دنیا میں جاری ہے اب وہ جاننا چاہتے ہیں کہ آخر اسلام ہے کیا؟ کمیونسٹ نظام کی شکست کے بعد اسلام کو مغرب نے دشمن مانا ہے۔ ہسنگٹن کی تھیسس کیا ہے؟ یہی کہ بس اب دنیا میں جنگ دو تہذیبوں کی ہے اسلامی اور مغربی۔''

''اور ظاہری بات ہے کہ ہر معاملے کی جڑ تک پہنچنا اس کو بالکل ٹھیک پہنچانا مغرب کا صدیوں سے وطیرہ رہا ہے۔ لہٰذا اب تاریخ میں پہلی بار وہ اسلام کو جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یوں تو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے ہی یہ کوششیں شروع ہو چکی تھیں لیکن ۹/۱۱ کے بعد یہ کاوشیں اپنے عروج پر ہیں۔ مغربی دنیا میں لاکھوں قرآن کی کاپیاں بک چکی ہیں۔'' فواد نے بتایا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو بہت نیک فال ہے کم از کم عیسائیت اور اسلام میں دوری کم ہوگی۔ خود ویٹکین میں بھی ایسا شعبہ اب کافی فعال ہو گیا ہے۔ قرآن عیسائیوں اور یہودیوں کو اہل کتاب قرار دیتا ہے۔ مسلم علماء کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے بات کریں۔'' المالکی نے کہا۔

''مجھے ایک دلچسپ بات یاد آئی اس ذکر سے۔ ہمارے ایک دوست ہیں آسٹریلیا سے قرآنیات پر ریسرچ کرنے علی گڑھ آئے ہیں۔ اسلام اور عیسائیت پر بات ہو رہی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ پہلے یہودی اور عیسائی نہ ہو۔''

''کیا مطلب؟ اقبال تم بھی خوب نکالتے ہو۔'' مالکی نے اقبال کو گھور کر دیکھا۔

''مطلب یہ کہ ہمیں موسیٰ کو بھی ویسے ہی ماننا ہے جیسے یہودی مانتے ہیں۔تو میں یہودی ہوگیا۔پھر عیسیٰ کو بھی پیغمبر خدا ماننا ہے ان کی کتابوں کو بھی ماننا ہے۔سو میں عیسائی ہوگیا۔اس کے بعد ہی میں آخری پیغمبر محمد پر یقین لاسکتا ہوں۔میں تب جا کر مسلمان ہوا۔ پہلے یہودی پھر عیسائی بنا اور پھر مسلمان بننے کے لائق ہوا۔''

''کیا خوب تھیسس ہے۔''المالکی نے ہنستے ہوئے تالی بجائی۔

''کیا نظریہ ہے! بہت مار کھاؤ گے۔''فواد نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

''کیا میں صرف آخری پیغمبر محمد پر ایمان لا کر مسلمان ہوسکتا ہوں؟ نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ پہلے مجھے ابراہیم،موسیٰ،عیسیٰ اور تمام قرآنی نبیوں پر ایمان لانا ہے جن کا نام قرآن میں درج ہے اور ان کی کتابوں پر بھی۔تب ہی میں مسلمان ہوسکتا ہوں۔''

''یوں بھی تمہاری بات سچ ہے اور یوں بھی۔''ڈاکٹر اسماعیل نے پہلی بار منہ کھولا۔

''آپ بھی اقبال کی تائید میں آ گئے؟''المالکی نے ان سے سوال کیا۔

''کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے عیسائیوں اور یہودیوں کو یہ بات بتائی جائے اور یہ بھی کہا جائے کہ بس محمد کو اور ماننا ہے پھر ہم سب ایک ہی ہو جائیں گے پھر کس بات کا جھگڑا؟ دنیا ایک ہو جائے گی۔''المالکی نے اقبال کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

''آخر ایک آل ابراہیم کی ہی تو بات ہے۔بھائیوں میں کیسا فساد۔''فواد نے ہنستے ہوئے کہا۔سب لوگ ہنسنے لگے۔

''اقبال تم بہت شیطان ہو۔ہندوستانی مسلمان بھی سوچ سکتا ہے یہ پہلی بار معلوم ہوا۔''المالکی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دوسری طرف ہمارے علماء تو یہ بتاتے آئے ہیں کہ اسلام اگر کہیں ہے تو وہ صرف انڈیا میں ہے''اقبال نے بتایا۔

''واقعی؟''

''جی واقعی۔''اقبال نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''پھر تو جا کر دیکھنا پڑے گا۔''فواد نے فوراً کہا۔

''جانے کی ضرورت نہیں ہے میں بتائے دیتا ہوں۔اس کی وجہ ہے ظاہری رسوم اور دکھاوے پر زور۔بس اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ورنہ تو وہ توحید کے معنی تک نہیں جانتے۔'' اقبال نے بتایا۔

''پھر کاہے کا اسلام؟اگر توحید ہی نہ رہی تو پھر اسلام کہاں رہا۔'' ڈاکٹر اسماعیل نے خیال ظاہر کیا۔

''انڈیا کی بات جانے دو۔مگر آج اقبال نے بہت عمدہ ترکیب بتائی عیسائیوں اور یہودیوں سے دوستی کرنے کی۔'' فواد نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔

''کیا خوب بات نکالی ہے۔'' المالکی نے تائید کی۔

''بات تو خیر کچھ بھی نہیں ہے۔مگر احمد کی بات سے میں متفق ہوں کہ گیارہ ستمبر کے بعد دنیا بالکل بدل گئی ہے۔جیسے کسی نے تاریخ کا ورق الٹ دیا ہو۔اب یہی دیکھ لیجئے کہ دنیائے اسلام میں جمہوریت لانے کی بات کہی جارہی ہے۔دینی مدارس کا نصاب تبدیل کرنے کی بات کی جارہی ہے۔سعودی عرب اور پاکستان میں تو غالبًا نیا نصاب نافذ بھی کردیا گیا ہے۔یہ وہی بنیادی تبدیلیاں جو دنیائے اسلام کو بھی ترقی یافتہ بنادیں گی۔''

''اگر ہم نے دل سے مان یا تب؟'' فواد نے شرط لگادی۔

''بیشک،مگر اب دانشوران مغرب نے ان دووجوہ کی نشاندہی کرلی ہے اور وہ بزور طاقت کام کرا کر ہی دم لیں گے۔سیاسی طاقت ہے ان کے پاس۔ہمارے حکمراں ان کو منع نہیں کرسکتے۔جو کام ہزار سال میں نہ ہوسکا،گیارہ ستمبر کی وجہ سے چند ہی سالوں میں مکمل ہوسکتا ہے۔''

''دیکھتے جائیے بطن مستقبل میں کیا ہے۔'' ڈاکٹر اسماعیل پرامید نہ تھے۔

''امید پر دنیا قائم ہے۔'' المالکی نے کہا۔

''مگر صرف عقلمندوں کی۔'' ڈاکٹر اسماعیل نے پھر مایوسی دکھائی۔

''اب اٹھا جائے بہت دیر ہوگئی۔'' فواد نے اٹھتے ہوئے کہا۔سب لوگ اٹھ گئے۔ڈاکٹر المالکی سب کو باہر تک چھوڑنے آئے۔

12.3 شرمندۂ حسرتِ تعمیر

اس دن جب اقبال العشرین روڈ پر اپنے پاکستانی دوست عباس کے گھر پہنچا تو دن کے چار بجے بھی پوری سڑک سنسان پڑی تھی۔ بس چند ایک دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور اکا دکا کاریں ہی سڑک سے گزر رہی تھیں۔ ہر طرف ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ عباس ایک کنسٹرکشن کمپنی میں انجینئر تھے اور کئی سالوں سے پانچ منزلہ عمارت کی تیسری منزل کے ایک فلیٹ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ان کی عمارت کے سامنے کچھ آگے بڑھ کر ایک تین منزلہ عمارت کو بلڈوزر گرانے میں لگے ہوئے تھے۔ کھلے ٹرکوں میں ملبہ بھرا جا رہا تھا۔ اقبال یہ منظر دیکھ کر حیران سا ہوا۔ مگر کسی سے پوچھنا مناسب نہ جان کر وہ سیڑھیاں چڑھ کر عباس کے گھر پہنچ گیا۔

''آیئے تشریف لائیں۔ ہم لوگ انتظار ہی کر رہے تھے۔'' عباس نے گھنٹی کی آواز سن کر دروازہ کھول دیا۔

''میں نے کہا کہ ذرا جلد چلا جائے۔ وہاں بھی اکیلا بور ہو رہا تھا۔''

''ارے کیوں نہیں۔ یہ تو اسی دن طے ہو گیا تھا کہ آپ جلد آئیں گے۔''

''انکل۔ اسلام علیکم۔'' تین سالہ فرخ نے اپنا ننھا ہاتھ پیشانی سے لگا لیا۔ اقبال نے اسے اٹھا کر پیار کیا۔

''بیٹا کیسے ہو۔ بہت پیارا بیٹا ہے۔ امی نے آج تو نہیں ڈانٹا۔''

''ڈانٹا تھا۔ وہ تو روز ہی ڈانٹتی ہیں۔'' اس نے منہ بنا کر بتایا۔

''ہر دم شرارتیں جو کرتا رہتا ہے۔'' مسز عباس نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے شکایت کی۔

''آداب بھابھی کیسی ہیں آپ۔'' اقبال نے فرخ کو فرش پر اتار دیا۔

''مہمانوں کے انتظار میں کچن میں لگے ہوئے ہیں۔''

''یہ تو ہے۔ دعوت میاں کرے اور کام کرے بیوی۔'' اقبال نے ہنستے ہوئے عباس

کو دیکھا۔

''کام تو ہمیں بھی کرنا پڑتا ہے بازار سے سارا سامان لانا اور فرخ کو سنبھالنا۔'' عباس نے بچے کا ہاتھ پکڑ کر صفائی دینی چاہی۔

''رہنے دیجئے بس آپ۔'' مسز عباس نے مسکراتے ہوئے میاں کو ڈانٹا۔

''ساری میڈم۔ بار بار یہی غلطی کرتا ہوں۔'' عباس نے ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''اب ٹھیک ہے ورنہ تو گوشت جل ہی جاتا۔'' مسز عباس ہنستے ہوئے کچن کی طرف چل دیں۔

''بیٹھو نا۔'' عباس نے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھالیا۔

یہ ایک بڑا سا ڈائننگ کم ڈرائنگ روم تھا۔ درمیان میں ہلکا سفید جارجٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ دوسری طرف ڈائننگ ٹیبل کے پاس، دیوار سے لگی ہوئی کراکری رکھنے کی الماریاں سجی ہوئی تھیں۔ صوفے کے سامنے کونے میں ایک بڑا سا ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ صوفے کے پیچھے ایک دروازہ باہری بالکنی میں کھلتا تھا۔

''اور سب خیریت ہے۔''

''جی بس اللہ کا شکر ہے جس نے لیبیا بھیج دیا۔'' اقبال نے ہنس کر جواب دیا۔

''یہ شکایت ہے یا شکر؟'' انھوں نے سوال کیا۔

''کبھی شکایت کبھی شکر۔''

''کیا مطلب؟''

''شکر یہ اس بات کا کہ کچھ پیسہ جمع ہو جائے گا اور شکایت یہ کہ یہاں کیوں بھیج دیا۔''

''یہاں میں کیا خرابی ہے۔'' سوال آیا۔

''بس نظر نظر کا پھیر ہے۔ بقول غالب:

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کی شاد نہیں

''یہ تو بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ ہر جگہ ہر محفل میں ایک لڑائی سی تھی۔'' اقبال نے افسوس کے ساتھ بتایا۔

''وجہ نہ بتاؤ تمہارے نظریات سے میں نے کچھ اندازہ لگا لیا ہے۔''

''ہمارا علی گڑھ بھی کیا ہے۔ بس سید بابا ایک چنگاری سی چھوڑ گئے ہیں جو ہر دم جلتی بجھتی رہتی ہے کہ ہائے میری قوم۔ دنیا میں کوئی سانحہ ہو۔ ہندوستان میں ہر روز کوئی نہ کوئی وبال ہے۔ روز کوئی نہ کوئی صدمہ مسلمانوں کو جھیلنا پڑتا ہے۔ بس اس کی سرجری ہمیں کرنی ہے اور زخموں کی گہرائی دیکھ دیکھ کر رونا ہے۔''

''تکلیف دہ صورت حال ہے۔''

''سرسید کی تعلیمی پالیسی کی سب تعریف کرتے ہیں بلکہ مسلمان احسان مند اور مرہون منت ہیں لیکن جہاں ان کی مذہبی ہدایات یا سیاسی نظریات کی بات کی اور لوگ ناراض ہوئے۔''

''وہ کیوں؟''

''اس میں ان کی بھی کچھ خطا نہیں ہے۔ اتنا فریب دیا گیا ہے۔ ان کے مذہبی نظریات کو لے کر کہ بس اللہ ہی سمجھے گا۔ حالانکہ وہ مسلم تاریخ کے عظیم مجدد تھے سیاسی نظریات اور کارنامے تو بالکل بھلا دیئے گئے۔ اس میں بھی فریب کیا گیا بس یہی بات ہم کہہ دیتے ہیں لہٰذا ہر محفل میں ایک جنگ سی چھڑ جاتی ہے۔''

''ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ وہاں تو اتنی لائبریریاں ہیں۔ تحقیق کریں اور طے کردیں اس مسئلے کو۔'' انھوں نے معصومیت سے کہا۔

''یہ ہو نہیں سکتا۔''

''کیوں نہیں ہوسکتا؟''

''اس کی ایک بنیادی نفسیاتی وجہ ہے جو نظریہ بچپن سے انسان سنتا چلا آتا ہے۔ وہی ایک زمانے میں آکر خود اس کی ذات بن جاتا ہے۔ اسے یہ یاد نہیں کہ کب کس نے یہ نظریہ اس کے معصوم ذہن و دماغ میں ڈال دیا اور وہ تمام زندگی اس نظریے کی حفاظت میں

باالفاظ دیگر اپنی ذات کی حفاظت میں گزار دیتا ہے۔اسی وجہ سے ہر محفل میں ہماری ایک لڑائی سی ہو جاتی ہے۔''

''پھر تم ہی اپنا مشن ختم کر دو۔''

''یہ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''کیوں؟''

''اس کا جواب مرزا دے گئے ہیں۔کہا ہے:

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
حسرت لذت آزار رہی جاتی ہے
جادۂ راہ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادۂ غیر از نگۂ دیدۂ تصویر نہیں

''لیجئے چائے پیجئے!'' مسز عباس ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھیں۔

''بیوی ہو تو ایسی ہو۔'' عباس نے چائے لیتے ہوئے کہا۔

''سامان تو آپ ہی لاتے ہیں نا۔'' طنز کیا گیا۔

''سامان سے کیا ہوتا ہے۔چائے تو ہوٹلوں میں بھی ملتی ہے مگر جو مزا آپ کے ہاتھوں میں ہے وہ کہاں۔'' عباس نے خوشامد کی۔

''اچھا بنائیے مت اور ذرا باہر سے لیموں لے کر آیئے۔گھر میں ایک بھی لیموں نہیں ہے۔''

''ابھی لاتا ہوں سرکار۔''

''چلئے میں بھی چلتا ہوں۔'' اقبال نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''میں بھی چلوں گا۔'' پاپا کی گود میں بیٹھا فرخ بھی بول پڑا۔

''ہاں ہاں بیٹا، آپ بھی چلیں گے۔'' اقبال نے اسے گود میں اٹھا لیا کچھ دیر بعد وہ

تینوں نیچے سڑک پر سبزی کی دکان کی طرف جا رہے تھے جو وہاں سے ایک فرلانگ دور تھی۔ راستے میں بلڈوزر کی جانے والی عمارت کے پاس سے بھی گزر ہوا۔

''یہ عمارت کیوں گرائی جا رہی ہے؟'' اقبال نے رک کر عباس سے سوال کیا۔

''رکو نہیں بیوقوف۔'' عباس نے اقبال کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

''کیوں کیا بات ہے؟''

''شمس الحق ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ اتنے دن گزر گئے مگر تم نہیں سمجھے۔ چلتے رہو میں بتاتا ہوں۔ بالکل پلٹ کر نہیں دیکھنا۔'' عباس خاصے پریشان نظر آنے لگے تھے۔

''ہاں کیا بات ہے؟'' اقبال بھی ایک دم سیریس ہو گیا۔

''یہ تین منزلہ عمارت میرے ایک جاننے والے کا گھر تھا۔ اس کا بڑا بیٹا حکومت کا باغی ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں حقیقت کیا ہے مگر محلے میں یہی خبر ہے۔'' عباس نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔

''پھر؟''

''پھر کیا۔ بس اس کا گھر گرایا جا رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اقبال کی حیرت کی حد نہ رہی۔

''یہ اسلامی دنیا ہے میرے بھائی۔ گھر کا ایک فرد بھی حکومت کی مخالفت کرتا ہے تو پورا خاندان برباد کر دیا جاتا ہے تاکہ اوروں کو عبرت ہو۔ محمود شادی شدہ ہے اس کا ایک بچہ بھی ہے، دو چھوٹے بھائی اور دو بہنیں بھی ہیں۔ سب اس گھر میں آرام سے رہتے تھے۔ وہ میرا بھی شناسا ہے خاموش آدمی ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ کوئی بغاوت کرے گا۔ مگر ہر مخالف یہاں باغی ہی کہلاتا ہے۔ پرسوں ہی خفیہ پولیس کے لوگ آ کر اس کے باپ کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے گئے اور کل سے یہ مکان گرایا جا رہا ہے۔ اتنا ٹائم بھی نہیں دیا گیا کہ وہ اپنا سامان ہی نکال سکتے۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ انصاف عدالت کچھ بھی نہیں ہے یہاں؟'' اقبال نے حیرانی ظاہر کی۔

''یہاں یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ہمیں کیا۔ نوکری کرنے آئے ہیں۔ سر جھا کر کام کرتے رہو اور دو چار سال میں چلتے بنو۔'' عباس نے سبزی فروش سے لیموں اور پیاز وغیرہ خریدتے ہوئے کہا۔ واپسی کا راستہ خاموشی سے طے ہوا۔

کچھ ہی دیر میں باقی مہمان بھی آ گئے مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ مسز عباس اور مسز شمس الحق نے میز پر کھانا لگانا شروع کیا ہی تھا کہ ہر طرف سے مغرب کی اذانوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ خواتین نے اپنے سر دوپٹوں سے ڈھک لیے اور فرخ اپنے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے بیٹھ گیا۔

''کیا دعا مانگ رہے ہو بیٹا'' اقبال نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''انکل آپ کے لیے کیا مانگوں۔'' اس نے معصوم چہرہ اٹھا کر پوچھا۔

''ماشاء اللہ آپ نے خوب ٹریننگ دی ہے۔'' اقبال نے عباس کی تعریف کی۔ اذانیں ختم ہی ہوئی تھیں کہ نیچے سے زور زور سے عربی میں پر جوش آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ جیسے کوئی تقریر کر رہا ہو۔

''یہ کیا ہے؟'' عباس نے خود سے سوال کیا اور دروازہ کھول کر بالکنی میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ساتھ تجسس کے مارے اور سب لوگ بھی وہاں آ گئے۔ چند ہی منٹ میں نیچے دور داہنی طرف سے ایک لینڈ کروزر نظر آنی شروع ہوئی جس پر بڑے بڑے مائک لگے ہوئے تھے۔ کار کے اندر کوئی پر جوش عربی میں تقریر کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتی کار کے پیچھے فوجی ٹرکوں کا ایک قافلہ آنا شروع ہوا۔ فوجی اپنی بندوقیں دونوں طرف آبادیوں کی طرف تانے ہوئے تھے۔ قافلے کے درمیان ایک اور لینڈ کروزر تھی جس کے بڑے سے بونٹ پر لکڑی کا کراس سا ٹکا ہوا تھا اور اس پر ایک لاش لٹکی ہوئی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سب دہل گئے۔ عورتوں کی چیخیں سی نکل گئیں۔ جیسے ہی وہ کار قریب آئی، عباس کے منہ سے ''محمود'' نکلا اور وہ جلدی سے اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ سب لوگ بھی اندر آ گئے۔ بالکنی کا دروازہ بند کر لیا گیا۔ اقبال نے اسی لمحہ طے کر لیا کہ کل ہی استعفا دے دینا ہے۔

کچھ دنوں بعد قاہرہ سے دہلی واپسی کے سفر میں دل و دماغ پر تمام راستے طرح

طرح کے خیالات یلغار کرتے رہے۔

خیال جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش
شراب خانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

○